نورِستان

شہید حکیم محمد سعید

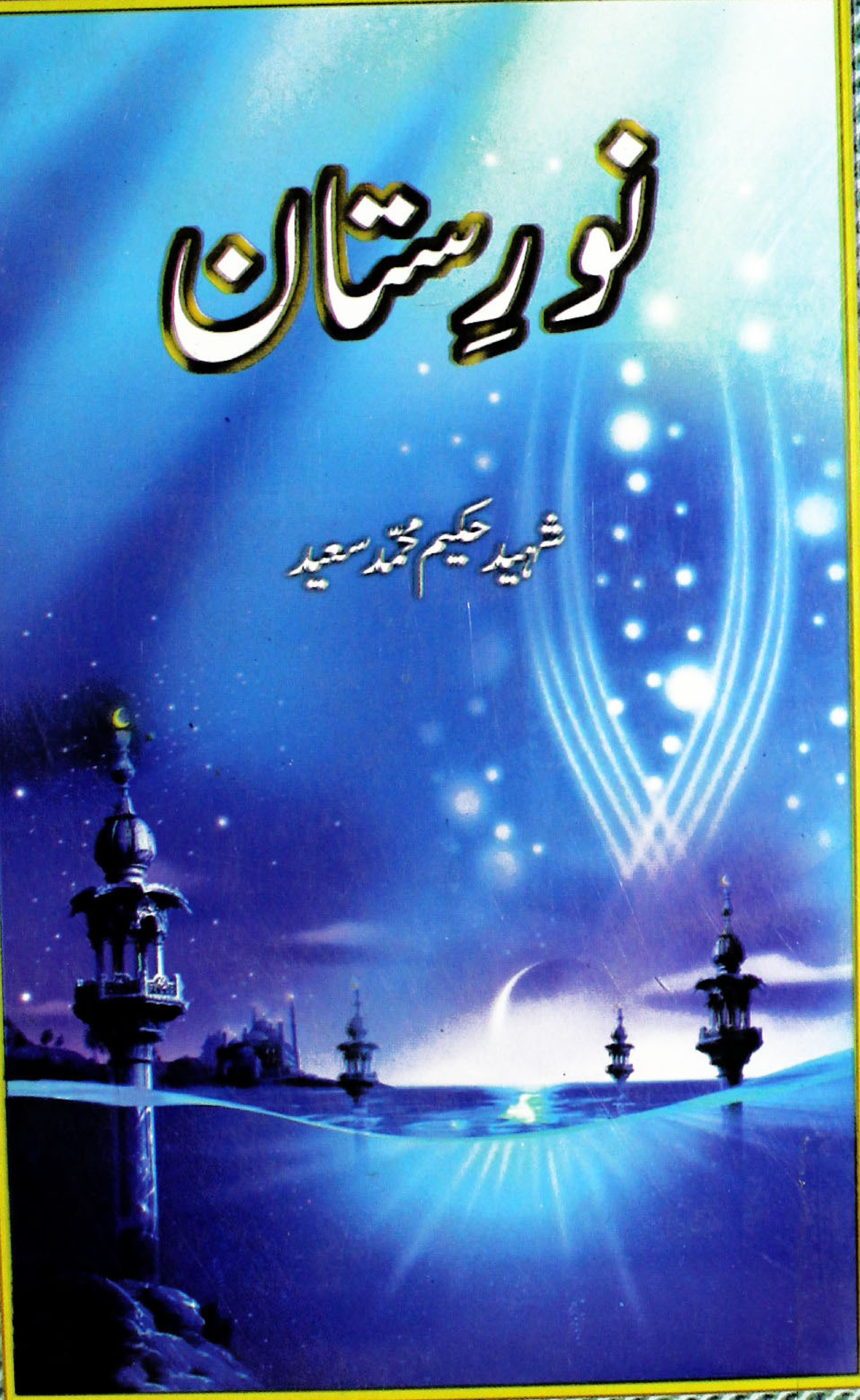

Marfat.com

نورِستان

قرآنِ حکیم اور ہماری زندگی

مؤلف

شہید حکیم محمد سعید

ہمدرد فاؤنڈیشن پاکستان، کراچی

Marfat.com

مجلس ادارت

سعدیہ راشد

مسعود احمد برکاتی　　ڈاکٹر سید فرحت حسین

نام کتاب	:	نونہال نورستان
مؤلف	:	شہید حکیم محمد سعید
ناشر	:	ہمدرد فاؤنڈیشن پاکستان، ہمدرد سینٹر، ناظم آباد ۳، کراچی
طابع	:	جے اے انٹر پرائز، کراچی
اشاعت اول	:	جولائی ۱۹۸۴ء
اشاعت دوم	:	دسمبر ۱۹۸۴ء
اشاعت سوم	:	مارچ ۱۹۹۱ء
اشاعت چہارم	:	جولائی ۲۰۱۱ء
تعداد اشاعت	:	ایک ہزار
قیمت	:	تین سو (۳۰۰) روپے

جملہ حقوق محفوظ

ویب سائٹس websites

ہمدرد فاؤنڈیشن پاکستان	:	www.hamdardfoundation.org
ہمدرد لیبارٹریز (وقف) پاکستان	:	www.hamdardlabswaqf.org
ادارۂ سعید	:	www.hakimsaid.info

Marfat.com

ترتیب

شعاعِ اوّل ۱۱

ایمانیات ۱۳

توحید ۱۴
توحید کا اسلامی تصوّر ۱۸
توحید اور مرکزیت ۲۱
وحی ۲۵
تصوّرِ آخرت اور انسانی اعمال ۲۹
ایمان روشنی ہے کفر تاریکی ہے ۳۲
یقینِ محکم ۳۶
مسلمانوں سے اسلام کے تقاضے ۴۰

قرآن کی روشنی ۴۳

قرآنِ حکیم کی تکریم ۴۴
تلاوتِ قرآن کے فضائل ۴۸
آزادی اور قرآن ۵۲
حیاتِ دنیا کا تصوّر قرآن کی روشنی میں ۵۶
قرآنِ حکیم سے مسلمانوں کا تعلق ۵۹
ایک آیت کا پیغام ۶۲

رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم ۶۷

Marfat.com

رسالت کے فرائض	۷۱
رسول اللہؐ قرآن کے آئینے میں	۷۵
رسولؐ کی اطاعت	۷۹
حضورؐ بحیثیت سربراہِ ملّت	۸۲
خلقِ عظیم	۸۶
ختم نبوت	۸۹
عبد اور معبود	**۹۳**
بندگی ایک نعمت ہے	۹۴
اللہ سے محبت کا معیار	۹۷
حُبِ الٰہی کے تقاضے	۱۰۰
اللہ سے عہد	۱۰۴
ذکرِ الٰہی اور ثابت قدمی	۱۰۸
خشیتِ الٰہی	۱۱۱
اسوۂ ابراہیمی	۱۱۵
اللہ کے محبوب بندے	۱۱۹
خودی اور عبدیت	۱۲۳
اللہ سے سرکشی کا انجام	۱۲۶
اللہ کو بھول جانا	۱۳۰
حقوق اللہ	۱۳۴
برکاتِ رمضان	**۱۳۷**
استقبالِ رمضان	۱۳۸
رمضان المبارک	۱۴۱
روزہ، رمضان اور صحت	۱۴۵
۲۷ رمضان المبارک	۱۴۸

Marfat.com

روزہ اور صحت ۱۵۳

علم و حکمت ۱۵۷

علم کی فضیلت ۱۵۸
علم و فضیلت ۱۶۱
دین میں علم کی اہمیت ۱۶۴
اسلام کی نظر میں علم و عالم کا مقام ۱۶۸
احترام علم و حکمت ۱۷۲
علم و حکمت ۱۷۶
تعلیم ۱۸۰

تزکیۂ نفس اور عمل ۱۸۵

تزکیۂ نفس ۱۸۶
تربیتِ نفس ۱۸۹
تقویٰ ۱۹۳
دل کا اطمینان ۱۹۷
حقوقِ نفس ۲۰۰
دین میں استقامت ۲۰۳
شکرِ خداوندی ۲۰۶
اخلاصِ نیت اور اخلاصِ عمل ۲۱۰
محاسبۂ عمل ۲۱۳
عملِ صالح ۲۱۷
برائیوں سے اجتناب ۲۲۰
زندگی میں عمل کی اہمیت ۲۲۳
عملِ پیہم ۲۲۷

Marfat.com

تہذیبی اقدار اور تقاضے ۲۳۱

اسلامی تہذیب کے بنیادی عناصر ۲۳۲
اتحادِ اُمّت ۲۳۵
تعاون علی الخیر ۲۳۸
امن ۲۴۱
زندگی برتنے کی اسلامی تعلیم ۲۴۵
شرفِ انسانی ۲۴۸
حرّیت ۲۵۱
حرّیت و آزادی ۲۵۴
فلاحی ریاست کا تصوّر ۲۵۸
انفاق فی سبیل اللہ ۲۶۲
اسلام کا نظامِ تعزیرات ۲۶۵

انسان اور معاشرہ ۲۶۹

معاہدات ۲۷۰
معاشرتی آداب ۲۷۴
رسموں کی پابندی ۲۷۸
آدابِ محفل ۲۸۲
آدابِ مجلس ۲۸۵
اجتماعی فلاح ۲۸۸
اصلاحِ معاشرہ ۲۹۱
حقوق العباد ۲۹۵
رنگ و نسل کا امتیاز ۲۹۸
حیّ علی الجہاد ۳۰۲
مسلمان کا لباس ۳۰۶

Marfat.com

زکوٰۃ کی معاشرتی اور معاشی حیثیت	۳۱۰
اسلام میں اجتماعیت کی اہمیت	۳۱۳

آوازِ اخلاق ۳۱۷

اخلاق سب سے بڑی طاقت ہے	۳۱۸
آوازِ اخلاق	۳۲۲
اچھے اخلاق کی اہمیت	۳۲۶
دین اور اخلاق	۳۳۰
انسان کی شرافت	۳۳۳
خوب سے خوب تر	۳۳۶
صدق	۳۴۰
خدمتِ خلق	۳۴۴
حسنِ سلوک	۳۴۸
فرائض کی انجام دہی	۳۵۱
میانہ روی	۳۵۴
اعتدال	۳۵۹
غم خواری و ہمدردی	۳۶۳
ہمدردی اور ایثار	۳۶۶
ایک دوسرے کی مدد	۳۷۰
خوش کلامی	۳۷۳
حلم و بُردباری	۳۷۵
شرم وحیا	۳۷۸
محنت ومشقت	۳۸۱
جاں فشانی	۳۸۵
شجاعت	۳۸۹
حلال روزی اللہ کا فضل ہے	۳۹۲

Marfat.com

دیانت ۳۹۶
کاروباری دیانت ۴۰۱
عدل و احسان ۴۰۵

سماجی برائیاں ۴۰۹

بے جا تمنائیں ۴۱۰
فرائض سے کوتاہی ۴۱۴
کام چوری خیانت ہے ۴۱۸
ذخیرہ اندوزی اور چور بازاری ۴۲۲
حسد ۴۲۵
غیبت ۴۲۹
خیانت ۴۳۳
نفاق ۴۳۷
بدگمانی ۴۴۰
حرص و طمع ۴۴۳
کھانے پینے کی چیزوں میں ملاوٹ ۴۴۷
امتیازِ رنگ و نسل ۴۵۱

صاحبِ ایمان کا کردار ۴۵۵

مردِ مومن ۴۵۶
مومن کا کردار ۴۶۰
مومن کی پہچان ۴۶۳
فراستِ مومن ۴۶۷
قومی کردار ۴۷۱
استقلالِ فکر ۴۷۵

Marfat.com

صحت و زندگی

زندگی صحت سے عبارت ہے	۴۸۰
عبادات اور انسانی صحت	۴۸۴
صحت نعمت ہے	۴۸۷
اسلام اور صحتِ جسمانی	۴۹۱
صحت اور اسلام	۴۹۴
صحتِ جسم وطہارتِ فکر	۴۹۷
حفظِ صحت	۵۰۱
صحت اور تن درستی	۵۰۵
صحتِ جسمانی	۵۱۰
صحت و طہارت	۵۱۴
پاکیزگی اور صحت	۵۱۸
صفائی اور پاکیزگی	۵۲۲
صحت وصفائی	۵۲۶
قلب اور صحت	۵۳۰
تیمار داری	۵۳۴
پانی، حیات آفریں نعمت	۵۳۸
شجر کاری	۵۴۲

Marfat.com

Marfat.com

شعاعِ اوّل

حکیم محمد سعید

حجۃ الاسلام حضرت امام غزالیؒ نے کیمیائے سعادت میں لکھا ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر (نیکی کا حکم دینا اور برائی سے روکنا) واجب ہے۔ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جنھیں اگر ہم زمین میں اقتدار بخشیں تو وہ نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ دیں گے، نیکی کا حکم دیں گے اور برائی سے منع کریں گے۔

نورِ عالم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

نیکی کا حکم دو ورنہ اللہ تعالیٰ تم میں سے بدترین کو تم پر مسلّط کر دے گا، پھر تم میں سے بہترین کی دعا بھی قبول نہ ہوگی۔

نشری تقریروں کا یہ مجموعہ جو آپ کے سامنے "نورستان" کی صورت میں موجود ہے، اسی جذبے کا نتیجہ ہے۔ میں ہمیشہ ایمان داری کے ساتھ اس بات کا قائل اور حامی رہا ہوں کہ ہمارے تمام مسائل کا حل قرآن حکیم اور سنّتِ رسولؐ میں موجود ہے۔ اگر قرآن و سنّت دورِ جاہلیت کے شرک، بت پرستی، توہم، خودسری، جُوا، شراب، فحاشی، ظلم وجور، رہزنی اور بدامنی وغیرہ کا قلع قمع کر کے اُن کی جگہ تہذیب و شرافت اور علم و اخلاق لاسکتے ہیں، اگر قرآن و سنّت دورِ جاہلیت کی نسل و قومیت پرستی، قبائلی تفاخر، امیری اور غریبی کا امتیاز، طبقاتی کشمکش، نفرت و عداوت اور ظلمت و جہالت کے بجائے اخوت، مساوات، محبت، خود شناسی و خدا شناسی، امن، فارغ البالی اور حقیقی مسرت لاسکتے ہیں تو اس دور کے تمام مسائل کا حل بھی پیش کرتے ہیں۔

میری تمام تحریریں اور تقریریں اسی موقف پر مبنی ہیں۔ میں نے ان نشری تقریروں میں کوشش کی ہے کہ اپنے دور، اپنے معاشرے اور اپنے ماحول کے مسائل کو قرآن و سنّت کے حوالے سے پیش کیا جائے۔ عبادات ہوں یا معاملات، اخلاقِ سیئہ ہوں یا اخلاقِ حسنہ ان کی کسوٹی قرآن و سنّت ہیں۔

چوں کہ میرے مخاطب تمام افرادِ ملّت ہیں جن سے مجھے بے حد پیار ہے اور جن کا میرے دل میں احترام ہے، اس لیے میں نے یہ کوشش بھی کی ہے کہ زبان اور پیشکش کا انداز دونوں آسان ہوں۔ نشری تقریر میں وقت کی پابندی بھی ضروری ہوتی ہے لہٰذا ان تقریروں میں کم سے کم الفاظ میں پیغام کو پہنچانے کی کوشش کی گئی ہے۔

Marfat.com

میں ریڈیو پاکستان کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے مجھے اس کارِ خیر کے لیے موقع اور سہولت بہم پہنچائی۔ ان تقریروں کو اللہ تعالیٰ نے مقبولیت بخشی۔ ملک کے علاوہ دوسرے متعدد ملکوں خصوصاً ہندوستان کے لوگوں نے بھی ان کو سنا اور خواہش ظاہر کی کہ ان کو دوام بخشنے کے لیے مرتّب اور شائع کیا جائے۔ چناں چہ یہ کتاب اپنے دل کی آواز کے ساتھ ساتھ ان کرم فرماؤں کی دلی خواہش کی تعمیل بھی ہے۔

نشری تقریروں کے موضوعات کا انتخاب ضرورتِ وقت کے ماتحت ہوا ہے، لیکن ان کو کتابی شکل میں لانے میں کئی صورتیں سامنے آئیں۔ مثلاً کیا انھیں تاریخی ترتیب دی جائے یا موضوع وار مرتب کیا جائے یا مختلف موضوعات کو یکے بعد دیگرے رکھا جائے۔ اس پر غور کرنے کی وجہ یہ ہوئی کہ عبادات و معاملات اور اخلاق کی تقریروں میں قرآن مجید کی آیاتِ مبارکہ اور احادیث شریفہ اور بعض دلائل کا بار بار بیان ناگزیر ہوتا ہے۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک موضوع پر تقریر ہو چکی ہوتی ہے، لیکن معاملہ اس قدر اہم ہوتا ہے کہ اس پر تاکید مزید کی ضرورت ہوتی ہے۔ میرے خیال میں کلمۂ حق کی تکرار، تکرارِ حسنہ کا درجہ رکھتی ہے۔ چناں چہ میں اس نتیجے پر پہنچا کہ تقریروں کو موضوع وار مرتب کیا جائے، کیونکہ اس طریقے سے حوالہ و استفادہ زیادہ آسان ہو جاتا ہے۔

میں اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتا ہوں کہ جس نے مجھے اس کارِ خیر کی توفیق عطا فرمائی۔ آخر میں، میں اپنے تمام رفقائے عزیز کا شکر گزار ہوں جنھوں نے کتاب کی تیاری اور طباعت میں غیر معمولی لگن اور محنت کر کے اسے پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔

Marfat.com

اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط
(النور: ۳۵)

اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔

ایمانیات

Marfat.com

توحید

اسلام کا پہلا اور اساسی عقیدہ توحید ہے، دوسرے سارے عقائد اور سارے اعمال اسی پر مبنی ہیں۔ اگر توحید اپنی حقیقی صورت میں موجود ہے تو رسالت، وحی اور آخرت پر ایمان بھی درست ہے، اور نماز و روزہ، حج و زکوٰۃ جیسے اعمال بھی نتیجہ خیز اور ثمر آفریں ہیں۔ قرآنِ پاک میں سب سے زیادہ آیات توحید ہی کے سلسلے میں نازل ہوئی ہیں، اس لیے کہ اسلام جن عقائد و افکار کی بنیاد پر نظامِ زندگی کی تعمیر کرنا چاہتا ہے اس کی حقیقی روح توحید ہی ہے۔

توحید کی فلسفیانہ اور عارفانہ تشریحات جو بھی ہوں، مگر ہم صاف اور سادہ الفاظ میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ توحید کا مطلب قولاً اور عملاً اللہ تعالیٰ کو ایک ماننا ہے، اور اسی کی عبادت کرنا، اسی کے سامنے جھکنا، اسی سے مدد مانگنا، اسی کے حضور عاجزی اور التجا کرنا، اسی کی بارگاہ میں دستِ سوال دراز کرنا، خالق و مالک اسی کو سمجھنا، اسی کے قانون کو قانون ماننا اور نفع و نقصان کو اسی کی جانب سے سمجھنا ہے، اور مختصر یہ کہ اس کی عبادت اور بندگی میں کسی کو کسی حیثیت سے اور کسی درجے میں شریک نہ ٹھہرانا عقیدۂ توحید کی مکمل صورت ہے۔

ہمیں یہ یقین رکھنا چاہیے کہ اُلوہیّت اپنے معنی و مفہوم کی پوری وسعت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی پاک و بلند ذات کے لیے مختص ہے۔

وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ۝ (البقرہ: ۱۶۳)

یعنی: تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے، اس رحمٰن و رحیم کے سوا اور کوئی عبادت کے لائق نہیں۔

توحید پر زور دیتے ہوئے اور اللہِ واحد ہی کے الٰہ ہونے پر قطعیت کی مہر ثبت کرتے ہوئے قرآنِ مجید بتاتا ہے کہ اللہ نے تمام پیغمبروں کو جس کام پر مامور فرمایا ہے، وہ قرآن کے الفاظ میں یہ ہے:

۔۔۔ اَنْ اَنْذِرُوْٓا اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاتَّقُوْنِ ۝ (النحل: ۲)

یعنی: اے گروہِ پیغمبران، لوگوں کو اس حقیقت سے خبردار کر دو کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں، تو تم سب لوگ مجھی سے ڈرو۔

توحید فطرت کا تقاضا ہے اور ایک ایسا عقیدہ ہے جو ہر آئین کی رو سے مُسلّم ہے۔ دنیا کے پہلے بشر یعنی حضرت آدم علیہ السلام بھی مُوحّد تھے اور انھوں نے توحید ہی کی تعلیم دی۔ تمام انبیائے کرام علیہم السلام

Marfat.com

نے اپنی اپنی امتوں کو توحید ہی کی تعلیم دی اور تاکید کی کہ وہ اللہ تعالیٰ کو ایک مانیں اور نبی آخر الزماں ؐ نے اس توحید کی عظیم ترین حقیقت کے سارے پہلو اپنی امت کے سامنے مکمل طور پر واضح کر دیے اور سختی کے ساتھ اسی عقیدے پر قائم رہنے کی تاکید فرمائی بلکہ لوگوں کو اس کی تبلیغ و تلقین کرنے کا بھی حکم دیا۔

اقوام و ملل اور ادیان و مذاہب کی تاریخ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ توحید ایک عالمگیر تعلیم ہے مگر امتوں نے انبیائے کرام کی اس عالمگیر تعلیم کو کبھی تو فراموش کر دیا کبھی اس کی صورت بگاڑ دی۔ اس لیے قرآنِ مجید نے اس اساسی عقیدے پر سب سے زیادہ زور دیا اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو ہر اس بات سے روکا جس سے مسلمانوں کی انفرادی یا اجتماعی زندگی میں شرک کے در آنے کا امکان تھا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کفار کو جب ایمان کی دعوت دی تو اساسی مسئلہ اللہ تعالیٰ کے وجود کو تسلیم کرنے کا نہیں تھا بلکہ توحید یعنی اللہ کو اس کی ذات و صفات میں ایک ماننے کا تھا۔ قرآنِ پاک نے اس بات کی شہادت دی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کو مانتے تھے۔ وہ یہ بھی اعتراف کرتے تھے کہ تمام مصائب سے نجات دلانے والا، ہر قسم کی مشکلات کو رفع کرنے والا، مایوسیوں اور ناامیدیوں سے بچانے والا اللہ ہی ہے، مگر تضاد یہ تھا کہ کافرانہ معاشرہ صدیوں سے شرک اور بت پرستی کی گمراہیوں میں مبتلا تھا، اور اس حقیقت کو تسلیم نہیں کرنا چاہتا تھا کہ پوری کائنات ایک ہی خالق کی حکمتِ تخلیق کا نتیجہ ہے اس لیے کہ اس صداقت کے اعتراف سے ان کے آباؤ اجداد کی قائم کردہ روایات کی تکذیب لازم آتی تھی اور ان بت پرستانہ عقائد پر ضرب پڑتی تھی جنھوں نے اُن کی عقل و فکر پر قبضہ کر رکھا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب نبی کریم ؐ نے خالص توحید کا اعلان فرمایا اور صاف لفظوں میں یہ ارشاد فرمایا کہ اللہ کے سوا کوئی ذات عبادت اور پرستش کے لائق نہیں تو انھیں سخت تعجب ہوا کیوں کہ ان کا عقیدہ یہ تھا کہ یہ اصنام بھی عبادت کے لائق ہیں، ان کو چھوڑ کر صرف ایک اللہ کی عبادت کس طرح کی جا سکتی ہے؟ ان کے اسی ردِ عمل کا اظہار قرآن نے ان الفاظ میں کیا ہے:

أَجَعَلَ الْآلِهَةَ إِلَٰهًا وَاحِدًا ۖ إِنَّ هَٰذَا لَشَيْءٌ عُجَابٌ ○ (ص : ۵)

یعنی: کیا (ایسا شخص سچا ہو سکتا ہے کہ) جس نے بہت سے معبودوں کی جگہ ایک ہی اللہ کو ماننے کی تلقین کی ہے۔ یہ تو بڑی عجیب بات ہے۔

دراصل قرآن مجید کے مطالعے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ خالص توحید کے عقیدے کی تبلیغ کے سلسلے میں یہ دشواری صرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پیش نہیں آئی بلکہ ہر نبی کو اپنے اپنے عہد میں اسی مشکل کا سامنا تھا۔ انبیائے کرام ؑ کے نزدیک یہ مسئلہ بنیادی اہمیت رکھتا تھا کہ جو لوگ ایک اللہ سے عقیدت و نیاز کا رشتہ منقطع کر کے مختلف بتوں اور معبودوں کے سامنے جھک رہے ہیں انھیں خالص اور مکمل توحید کی

Marfat.com

طرف کس طرح لایا جائے؟ اور کس طرح اس شرک کا استیصال کیا جائے کہ جو صدیوں سے ان کے دلوں کی گہرائیوں میں راسخ ہو چکا ہے اور ان کی طبیعتوں میں رچ بس گیا ہے؟ اللہ کا حکم سنا کر انبیائے کرام نے ان کو شرک اور بت پرستی سے پاک کیا۔

قرآنِ پاک نے بھی توحید کو اساسی مسئلہ قرار دیا ہے اور اس عقیدے کے حق میں بڑے واضح اور نہایت معقول دلائل پیش کیے ہیں۔

وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِیَعْبُدُوا اللّٰہَ مُخْلِصِیْنَ لَہُ الدِّیْنَ۝۵ (البینہ: ۵)

یعنی: انھیں اس کے سوا کوئی اور حکم نہیں دیا گیا تھا کہ وہ صرف اللہ کی بندگی کریں، دین کو اس کے لیے خالص کر کے۔

قرآن نے یہ کہہ کر شرک کی تمام راہوں کو مسدود کر دیا، اس نے یہ بتایا کہ خالص توحید یہ ہے کہ انسان اُس کی ذات اور اُس کی صفات میں بھی کسی کو شریک نہ ٹھہرائے، کیوں کہ اس کی ذات بے مثل ہے، یکتا ہے، بالکل پاک ہے اور تمام عیوب سے مبرّا اور تمام نقائص سے منزّہ ہے، نہ اس کے علم میں کوئی کمی ہے نہ اُس کی قدرت میں کوئی نقص کہ اسے پورا کرنے کے لیے کسی اور کی ضرورت ہو۔ وہ ہمیشہ رہے گا، اس کو فنا وزوال نہیں ہے۔ اُس کا علم ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے، حیات وموت اُسی کے قبضۂ قدرت میں ہیں، وہ تمام موجودات کا بلا شرکتِ غیرے خالق ومالک ہے، زمین وآسمان کا ہر گوشہ اُس کی نظر میں ہے اور کوئی چیز اس کے احاطۂ قدرت سے باہر نہیں ہے، ذرّہ ذرّہ اپنے اسلوب وانداز میں اسی کی تسبیح کر رہا ہے، اسی کی تقدیس کر رہا ہے، اُسی کی حمد وتعریف کر رہا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی یہ وحدانیت، اُس کی ذات وصفات کی یہ تنزیہہ وتقدیس کافروں کے لیے عجیب سی چیز ہے۔ انھوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ آپ جس اللہ کو تنہا مالک وخالق بتا رہے ہیں اور ہر چیز میں جس کو یکتا اور واحد سمجھنے کی تاکید کر رہے ہیں اُس کے بارے میں یہ تو بتایئے کہ آخر وہ کس قبیلے سے ہے اور کس سے وراثۃً یہ پوری کائنات اس کو ملی ہے؟ اس کا نسب کیا ہے؟

اس سے یہ صاف پتہ چلتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے لیے تنزیہی صفات کے تصور سے یکسر ناآشنا تھے، مگر یہ اعتراف مشرکانہ تھا، وہ ذات وصفات دونوں میں شرک جیسے گھناؤنے جرم اور بدترین گناہ کا ارتکاب کرتے تھے۔ اسلام کا یہ احسان ساری دنیا پر ہے کہ اس نے الوہیّت کا ایسا تصور پیش کیا جس میں مکمل وحدانیت ہے اور ایسے پاک اور مقدس خالق سے ہماری بندگی کا رشتہ جوڑا کہ جو نہ کسی کا باپ ہے، نہ اس کا کوئی بیٹا ہے، جو بالکل یکتا وتنہا ہے، وہ کسی کا محتاج نہیں، کوئی اس کے برابر اور اس کا ہمسر نہیں قرآن شریف کی سورۂ اخلاص کا نزول ان ہی کافروں کے جواب میں ہوا جس میں اللہ تعالیٰ کی توحید کے ساتھ ساتھ ذات وصفات کی تنزیہ اور تقدیس کی بھی پوری پوری وضاحت فرما دی گئی۔

Marfat.com

توحید ایک ایسا مسئلہ ہے جس کی ضرورت ہر دور میں رہی ہے، اور ہمیشہ رہے گی۔ تمام انبیاءؑ نے اپنی بعثت کا مقصد اسی کو قرار دیا ہے۔ یہ ایک خاص نصب العین کا نام ہے اور ایک خاص تصورِ حیات سے عبارت ہے۔ اس سے فرد اور معاشرے کے لیے ایک خاص قسم کی ذہنی اور روحانی غذا حاصل ہوتی ہے۔ اس عقیدہ و تصور سے فکر و عمل میں ایک انقلاب برپا ہوتا ہے۔ مؤحّد کو صرف اللہ پر بھروسہ ہوتا ہے۔ اس کا توکل اس میں ایسی طاقت پیدا کرتا ہے کہ دنیا کی کوئی چیز اسے خوف زدہ نہیں کر سکتی اور نہ کسی حرص میں اسے مبتلا کر سکتی ہے۔ وہ ایک اللہ کے سامنے سرِ نیاز جھکا کر سارے خداوندانِ باطل کو ٹھکرا دیتا ہے۔ اس جادۂ حق پر کبھی کبھی اسے تنہا بھی سفر کرنا پڑتا ہے، لیکن یہ یقین اس کے لیے مایۂ تسکین ہوتا ہے کہ اللہ اس کے ساتھ ہے۔ وہ کبھی کسی کو مالکِ حقیقی سمجھ کر اس کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاتا۔ اس میں عزتِ نفس ہوتی ہے، ہمت ہوتی ہے، شجاعت ہوتی ہے، وہ ہر چیز کو اللہ کی طرف سے سمجھتا ہے، اس لیے صبر و رضا کا پیکر ہوتا ہے۔ وہ سارے انسانوں سے باہمی محبت اور احترامِ انسانیت کے جذبے کے ساتھ پیش آتا ہے، اس لیے کہ جانتا ہے کہ سب کا خالق خدائے واحد ہی ہے۔ انسانی اخلاق و کردار کی یہ بلندیاں اسی عقیدۂ توحید کی وجہ سے ہیں۔ جو نظامِ زندگی اس پر مبنی ہوگا وہ ہر اعتبار سے ارفع اور اعلا ہوگا، ہر ایک کے لیے امن و عافیت کا گہوارہ ہوگا، کیوں کہ یہ عقیدۂ توحید اس بات کا بھی متقاضی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اور اقتدار کو اخلاق، تہذیب، تمدن، معاشرت، معیشت، سیاست، قانون، عدالت، صلح اور جنگ سارے انسانی معاملات میں تسلیم کیا جائے اور اسی کا قانون قانون ہو۔

Marfat.com

توحید کا اسلامی تصوّر

سورۃ الانعام میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

قُلْ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ وَّاِنَّنِیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ۝ (الانعام: ۱۹)

یعنی: "اے رسول ان کو صاف صاف بتا دیجیے کہ عبادت کے لائق تو صرف ایک اللہ ہی ہے۔ اور یہ کہ میں تمہاری ان مشرکانہ حرکتوں سے انتہائی بیزار ہوں۔"

تمام انبیائے کرام جو اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھیجے گئے ان کی دعوت کا سب سے پہلا اور سب سے اہم جزو یہ تھا کہ "اس مالکِ حقیقی کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو۔"

اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ (یوسف: ۴۰)

انسان کی تخلیق کے بعد پہلا سوال جو اللہ نے انسان سے کیا وہ یہ تھا کہ "اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ"

یعنی: "کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟" انسانوں نے جواب دیا کہ بے شک تو ہمارا پروردگار ہے، "ہم گواہی دیتے ہیں۔" قَالُوْا بَلٰى ۝ شَهِدْنَا (الاعراف: ۱۷۲)

توحید اسلامی زندگی اور اسلامی معاشرے کی اصل بنیاد اور روح ہے۔ توحید کا عقیدہ ہی وہ بنیادی عقیدہ ہے جس کو مان کر انسان، انسان بنتا ہے۔ بہترین انسان وہ ہے جو بہترین بندہ ہو اور بندہ بن کر ہی انسان میں وہ اخلاقی صفات پیدا ہو سکتی ہیں جو انسانیت کی معراج اور بہترین انسانی معاشرے کی ضامن ہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بندہ کس کا؟ یعنی کیا بہترین انسان ہونے کے لیے یہی کافی ہے کہ انسان کسی کا بھی بندہ بن جائے؟ کسی کو پوجنے لگے، کسی کی عبادت کرنے لگے اور کیا ایسی صورت میں بھی اس میں وہی اخلاقی صفات پیدا ہو جائیں گی جو دنیا میں فلاح و بہبود کی ضمانت ہوتی ہیں اور آخرت میں نجات کا باعث ہوتی ہیں؟ اس سوال کا جواب نفی میں ہے۔ بہترین انسان ہونے کے لیے محض بندہ بن جانا کافی نہیں ہے۔ خدائے واحد کا بندہ بننا ضروری ہے کیوں کہ اللہ کو واحد ماننے سے ہی انسان میں بہترین عبد اور بندہ ہونے کی خوبیاں پیدا ہو سکتی ہیں۔ یہاں ہم ایک خاص نکتے کی وضاحت کرنا چاہتے ہیں جس سے توحید کے اسلامی مفہوم کو سمجھنے میں بڑی آسانی ہوگی۔

Marfat.com

جہاں تک اللہ کی یکتائی کے اثبات کا تعلق ہے اس کی اہمیت بہ ظاہر زیادہ نظر نہیں آتی کیوں کہ اس دنیا کی ہر چیز اپنی جگہ یکتا ہے۔ کوئی دو چیزیں، کوئی دو انسان بجنسہ یکساں اور ایک جیسے نہیں ہیں۔ تھوڑا بہت فرق ضرور ہے۔ تو پھر اللہ تعالیٰ کے واحد اور یکتا ہونے میں کیا خاص بات ہے اور زندگی پر اس کے کیا خاص اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ غور کیجیے، تو اس سوال کے جواب ہی میں توحید کے اسلامی تصور کی عظمت پوشیدہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کو ایک ماننا اور اس کی وحدانیت پر ایمان اسی وقت اہم ہو سکتا ہے جب ہم اس کو تمام صفات کے ساتھ مانیں یعنی اللہ کی جملہ صفات کے ساتھ اس کو واحد تسلیم کریں تو اس سے ہماری زندگی میں ایک انقلاب پیدا ہوگا۔ ورنہ کسی بت کو ایک ماننے اور اللہ تعالیٰ کو واحد ماننے میں کوئی فرق نہ ہوگا۔

لا الٰہ الا اللہ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کائنات میں کوئی الٰہ نہیں ہے بس ایک اللہ ہی اللہ ہے۔ قرآن حکیم نے ہمیں اللہ کی صفات بتادی ہیں اور یہ صفات قرآن حکیم ہی نے بتائی ہیں ورنہ جہاں کہیں خدا کا تصور موجود ہے وہاں بھی اللہ کی مکمل صفات کے ساتھ نہیں ہے۔ قرآن حکیم ہمیں بتاتا ہے کہ اللہ یعنی بندگی کا مستحق وہ ہو سکتا ہے جو ہمیشہ سے ہو اور ہمیشہ رہے۔ وہ کسی کا محتاج نہ ہو، اس کی قدرت کی کوئی انتہا نہ ہو، اس کے تمام کام حکمت کے ساتھ ہوں۔ وہ سب پر غالب ہو، وہ سب کچھ جانتا ہو، ہر چیز اس کی پیدا کردہ ہو، اس کے کسی کام میں کوئی دوسرا دخل نہ دے سکتا ہو، اس کے کسی کام میں کوئی نقص نہ ہو، وہ مجسم عدل ہو، وہ ہر قسم کے نفع اور نقصان پر قادر ہو، سزا اور جزا کا اس کو پورا پورا اختیار ہو، ہر ایک کو اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہو اور اس کا کوئی شریک اور ساتھی نہ ہو۔

اللہ کی ان صفات کے ساتھ ساتھ، قرآن حکیم ہمیں یہ بھی بتاتا ہے کہ اس کائنات میں اللہ کے سوا کوئی ایسی ذات نہیں ہے جس میں اللہ کی یہ صفات پائی جاتی ہوں۔ اب اس بات پر غور کیجیے کہ اللہ کی ان صفات پر ایمان لانے کے بعد انسان کی زندگی اور انسانی معاشرے پر اس کے کیا کیا اثرات پڑتے ہیں۔ ایک انسان پر عقیدۂ توحید کا سب سے بڑا اثر یہ پڑتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا فرماں بردار اور اس کے قانون کا پابند ہو جاتا ہے۔ وہ ہر چیز کو، ہر عمل کو احکامِ الٰہی کی روشنی میں دیکھتا ہے۔ لہٰذا اس کے تمام اعمال ایک اصول، ایک ضابطے میں ڈھل جاتے ہیں اور وہ کوئی ایسا عمل نہیں کر سکتا جو اللہ کو پسند نہ ہو۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ بُرے اعمال سے محفوظ رہتا ہے۔

لا الٰہ الا اللہ کہنے والا انسان کبھی مایوس نہیں ہوتا۔ اس کو یقین ہوتا ہے کہ اس کا اللہ

Marfat.com

بے حد کریم ہے اور زمین و آسمان کے تمام کھلے چھپے خزانوں کا مالک ہے۔ اللہ چاہے گا تو دنیا کی تمام نعمتیں اور راحتیں اس کو میسّر آجائیں گی اور تمام مشکلات چٹکی بجاتے میں دور ہو جائیں گی۔

اسی طرح ایک توحید پرست بے حد نڈر اور بے خوف ہوتا ہے۔ ایک خدا کا خوف اس کے دل سے تمام دوسرے خوف نکال دیتا ہے وہ بہادر اور جَری ہوتا ہے، وہ بزدل نہیں ہوتا عقیدۂ توحید انسان کو خود دار و خود اعتماد بنا دیتا ہے۔ کیوں کہ وہ ایک اللہ کے سوا کسی کے آگے جھکنا پسند نہیں کرتا۔ وہ کسی سے مرعوب نہیں ہوتا، لیکن اس کے ساتھ وہ متکبر بھی نہیں ہوتا، بلکہ منکسر ہوتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ غرور اور گھمنڈ اللہ کو پسند نہیں ہے۔ وہ تمام انسانوں کو برابر سمجھتا ہے۔ اس کا عقیدہ ہوتا ہے کہ اللہ کے تمام بندے احترام کے لائق ہیں۔ چھوٹائی بڑائی کا معیار اگر کوئی ہے تو بس نیک اعمال ہیں۔ جو زیادہ متقی ہے وہی اللہ کے نزدیک قابلِ اکرام ہے۔ اعمالِ صالحہ کے علاوہ فضیلت اور عظمت کے تمام معیار جھوٹے ہیں۔ نسل، رنگ، وطن، دولت، خاندان، ان میں سے کوئی چیز انسانی عظمت کا معیار نہیں ہے۔ یہی عقیدہ انسان کو بے نیاز بھی بنا دیتا ہے، یعنی وہ ایک عظیم حقیقت کا علم بردار ہونے کی وجہ سے چھوٹی چھوٹی باتوں اور معمولی معمولی فائدوں سے بے نیاز ہو جاتا ہے اور اس کی ساری توجہ آخرت کے فائدے اور اللہ کی خوش نودی حاصل کرنے پر لگی ہوتی ہے۔

عقیدۂ توحید کا یہ اسلامی مفہوم ذہن میں رکھنے سے بہ آسانی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس کے اثرات انسان اور انسانی معاشرے پر کتنے دُور رس ہوتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اس عقیدے کی بنیاد پر قائم ہونے والا معاشرہ اعلا اخلاقی خصوصیات کا حامل ہوتا ہے اور ایسا معاشرہ نوعِ انسانی کے لیے بڑی رحمت ثابت ہوتا ہے۔ اور یہی وہ خصوصیت ہے جو ایک مسلم معاشرے کو دوسرے تمام معاشروں سے ممتاز کرتی ہے۔

Marfat.com

توحید اور مرکزیت

اللہ ایک ہے! وحدہ لاشریک لہٗ!! اس کا کوئی شریک نہیں ہے، وہ واحد ہے۔

ہمارا دین اسلام ہے۔ اسلام ہمارا دین ہے۔ اس دین کا ایک نظام ہے اور اس نظام کی بنیاد اور اساس توحید ہے یعنی اللہ کو ایک اور واحد ماننا اور تسلیم کرنا۔ دین کا سارا نظام توحید سے روشن ہے۔ نظامِ دین میں توحید کو وہی جگہ اور مقام حاصل ہے کہ جو جسمِ انسانی میں دل کو حاصل ہے۔ ہم اس حقیقت سے بہ خوبی آگاہ ہیں اور آشنا ہیں کہ اگر دل بیمار اور ضعیف ہو جائے تو انسانی جسم بھی بیمار و بے کار ہو جاتا ہے، لیکن اگر دل صحت مند ہے اور اچھا ہے تو انسان کا جسم بھی صحت مند اور تن درست ہوگا۔ اگر یہ بات آپ کی سمجھ میں آجاتی ہے تو آپ کو بڑی آسانی کے ساتھ یہ سمجھ لینا چاہیے کہ دین کے نظام سے توحید کو اگر الگ کر دیا جائے تو پھر یہ نظام ہی باقی نہیں رہے گا۔

دین کی عمارت تین چیزوں پر قائم ہے: توحید، رسالت اور معاد۔

لیکن واقعہ یہ ہے کہ رسالت اور معاد دونوں توحید کے تابع ہیں اور اسی کے تحت آتے ہیں۔ رسالت کا جزوِ توحید ہونا یوں ثابت ہے کہ اللہ ہی کو شارع اور قانون ساز ماننا توحید کے مقتضیات میں سے ہے، یعنی توحید کا یہ تقاضا ہے کہ ہم اللہ سبحانہ وتعالیٰ کو شارع اور قانون ساز تسلیم کریں۔ چوں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے احکام و قوانین اپنے رسول کے ذریعہ سے بھیجتا ہے اس لیے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول ماننا اور زندگی کے ہر شعبے میں ان کو واجب الاطاعت ماننا اور تسلیم کرنا توحید کا جزو لاینفک ہے۔ جو شخص اللہ تعالیٰ کو ایک کہتا ہے، واحد تسلیم کرتا ہے لیکن رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کی پیروی سے منحرف ہے وہ قطعی مشرک ہے۔ اس کو توحید سے دور کا بھی کوئی واسطہ نہیں ہے۔

جب ہم نے اس انداز سے حقیقت کو تسلیم کر لیا تو یہ بات واضح ہو گئی کہ رسالت تابعِ توحید ہے اور یہی حال معاد کا ہے کہ وہ بھی مختلف پہلوؤں سے توحید کے تحت ہے اور معاد

Marfat.com

کی ساری روح توحید ہے۔ آپ نے دیکھا ہے اور پڑھا ہے کہ قرآنِ کریم میں توحید اور معاد کا بیان اکثر ساتھ ساتھ ہوا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اسلام اور دین کا سارا نظام توحید سے روشن ہے۔ اگر دین کو ایک جسم تسلیم کر لیا جائے تو اس جسم کی رُوح توحید ہے۔ اگر دین کو آنکھ کہا جائے تو اس کا نقطۂ بصارت توحید ہے۔

اللہ ایک ہے، اللہ وحدہٗ لاشریک ہے۔

سارے انبیائے کرام نے ہمیشہ اور ہر حال میں اپنی دعوت کا آغاز توحید سے کیا ہے۔ دعوتِ توحید کی مخالفت ہر دور میں ہوئی ہے۔ شدید سے شدید مخالفتوں نے سر بلند کیے، مگر اللہ کے ان عظیم و جلیل بندوں نے ان مخالفتوں کی ذرّہ برابر پروا نہ کی اور عظیم و عظیم تر قربانیاں دے کر بنی نوعِ انسان کے لیے ایک سیدھا راستہ متعیّن کر دیا۔ یہ صراطِ مستقیم توحید سے عبارت ہے۔

ہمیں یقین کرنا چاہیے، یاد رکرنا چاہیے کہ سب سے بڑا حق، اللہ کے حق کا اقرار ہے۔ توحید اللہ کے حق کا اقرار ہے۔ سارے حق و انصاف اور عدل و قسط کی یہی بنیاد ہے۔ جو انسان اس حق کو نہیں پہچانتا وہ کسی کے حق کو بھی نہیں پہچان سکتا، یہاں تک کہ وہ اپنے نفس کے حق کو بھی نہیں پہچانتا۔ انسان جب اس فہم و ادراک سے محروم ہوتا ہے تو انصاف سے دُور اور ظلم و تعدّی سے قریب ہو جاتا ہے۔ موجودہ زمانے کے ظالم اور ناشکر گزار انسانوں سے جو ناانصافیاں اور مظالم ظہور میں آ رہے ہیں وہ اس صورتِ حال کی مثال ہیں۔

اللہ ایک ہے، وہ وحدہٗ لاشریک ہے! عقیدۂ مسلم کی یہی بنیاد ہے۔ دین کی یہی اساس ہے۔ اسی مقام سے دین کا پہلا قدم اٹھتا ہے اور اسی مقام پر اس کا آخری قدم پڑتا ہے۔ یہی دین کا دائرہ ہے اور دین اسی وقت تک محفوظ ہے جب تک وہ اس دائرے کے اندر ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ توحید دین کا صرف ایک جزو نہیں ہے، توحید دین کا ایک ثلث نہیں ہے بلکہ توحید سارے دین کو محیط ہے، توحید سے باہر دین کا کوئی تصوّر نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کے سارے انبیا اسی نکتے اور نقطے سے اپنا کام شروع کرتے ہیں اور اسی مقام پر ختم کرتے ہیں۔

یہی راز ہے کہ قرآنِ مجید و فرقانِ حمید توحید سے شروع ہوتا ہے اور توحید پر ختم ہوتا ہے۔ قرآنِ کریم کی پہلی سورۂ فاتحہ ہے جس کی اصل رُوح اللہ تعالیٰ کی شکر گزاری اور کامل تفویض و تسلیم ہے۔

الحمد للہ رب العٰلمین ۝ الرحمٰن الرحیم ۝ ملک یوم الدین ۝ ایاک نعبد

119405

Marfat.com

وایاك نستعین ۝ اھدنا الصراط المستقیم ۝ صراط الذین انعمت علیھم ۝
غیر المغضوب علیھم ولا الضالین ۝ (الفاتحہ)

ترجمہ: "سب تعریفیں اللہ کے لائق ہیں جو مربّی ہے ہر ہر عالم کا۔ جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔ جو مالک ہے روزِ جزا کا۔ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے درخواستِ اعانت کرتے ہیں۔ بتلا دے ہم کو راستہ سیدھا، راستہ ان لوگوں کا جن پر تو نے انعام فرمایا ہے، نہ راستہ ان لوگوں کا جن پر تیرا غضب کیا گیا اور نہ ان لوگوں کا جو راستہ گم کر بیٹھے۔"

قرآنِ مجید کے آخر میں سورۂ نصر میں فتح مکہ کی بشارت اور سورہ لہب میں باطل کی شکست کی پیش گوئی کے بعد سورۂ اخلاص رکھی گئی ہے کہ جو خالصاً توحید کی سورہ ہے:

قل ھو اللہ احد ۝ اللہ الصمد ۝ لم یلد ۝ ولم یولد ۝ ولم یکن لہ کفوًا احد ۝
(الاخلاص)

ترجمہ: "کہو وہ اللہ ہے، یکتا۔ اللہ سب سے بے نیاز ہے (اور سب اس کے محتاج ہیں) نہ اس کی کوئی اولاد ہے اور نہ وہ کسی کی اولاد۔ اور کوئی اس کا ہمسر نہیں ہے۔"

یہ اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ دین کا مرکزی لفظ توحید ہے۔ اور اب دین اپنے مرکز پر پہنچ گیا ہے۔ اس کے بعد معوذتین ہیں۔

قل اعوذ برب الفلق ۝ من شر ما خلق ۝ ومن شر غاسق اذا وقب ۝
ومن شر النفّٰثٰت فی العقد ۝ ومن شر حاسد اذا حسد ۝ (الفلق)

ترجمہ: "کہو میں پناہ مانگتا ہوں صبح کے رب کی، ہر اس چیز کے شر سے جو اس نے پیدا کی ہے اور رات کی تاریکی کے شر سے جب کہ وہ چھا جائے اور گرہوں میں پھونکنے والیوں کے شر سے اور حاسد کے شر سے کہ جب وہ حسد کرے۔"

قل اعوذ برب الناس ۝ ملك الناس ۝ الٰہ الناس ۝ من شر الوسواس ۝
الخناس ۝ الذی یوسوس فی صدور الناس ۝ من الجنۃ والناس ۝
(الناس)

ترجمہ: "کہو میں پناہ مانگتا ہوں انسانوں کے رب، انسانوں کے بادشاہ، انسانوں کے حقیقی معبود کی اس وسوسہ ڈالنے والے کے شر سے جو بار بار حملہ کرتا ہے جو لوگوں کے دلوں میں وسوسے ڈالتا ہے خواہ جنوں میں سے ہو خواہ انسانوں میں سے۔"

ان دونوں سورتوں کی آیاتِ کریمہ شیطان کی آفتوں سے اس خزانۂ توحید کی حفاظت

Marfat.com

کر رہی ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ شیطان کی سب سے بڑی کوشش یہ ہے کہ انسان کو توحید کے نقطے سے ہٹائے اور اس کو شرک میں مبتلا کر دے اور اللہ کے بندوں کو دوسرے بندوں کی بندگی میں مبتلا کر دے۔ انسان جب اس مرکز سے ہٹ جاتا ہے اور توحید و دین سے راہِ فرار اختیار کرتا ہے تو وہ دنیا کی ہر معمولی طاقت کے سامنے تک سرنگوں ہو جاتا ہے۔ مگر جو انسان اللہ کا بندہ ہوتا ہے، توحید اس کا عقیدہ اور دین اس کا منتہا ہوتا ہے، وہ دنیا کی ہر طاقت کا باغی ہوتا ہے اور صرف اللہ کا وفادار ہوتا ہے۔ وہ اللہ ہی کو خالقِ دو جہاں مانتا ہے وہ صرف اسی کی اطاعت کرتا ہے۔ وہ اللہ ہی پر اعتماد کرتا ہے، اور صرف اللہ ہی سے مدد کا طالب ہوتا ہے۔

تسلیم و رضا کی معراج یہ ہے کہ انسان خود کو بالکلیہ اللہ تعالیٰ کے حوالے کر دے۔ کوئی مشکل اور مصیبت آئے تو اللہ تعالیٰ ہی سے رجوع کرے۔ ہر حال میں انسان کی نظر اللہ کی طرف ہو۔ انسان کی پسند اللہ کی پسند کے تحت ہو، اس کی محبت اللہ کی محبت کے تابع ہو۔ اللہ کی ذات میں، صفات میں اور حقوق میں، اس کی یکتائی کو تسلیم کرے اور کسی پہلو سے کسی انداز سے ان امور میں کسی کو شریک نہ ٹھہرائے، نہ کسی فرشتے کو، نہ کسی جن کو، نہ کسی نبی کو، نہ کسی ولی کو اور نہ اپنی ذات کو۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۚ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِیْلِهٖ ؕ

(سورۃ الانعام : آیت ۱۵۴)

ترجمہ: (اللہ کی ہدایت یہ ہے کہ) یہی میرا سیدھا راستہ ہے۔ اسی پر چلو، دوسرے راستے پر نہ چلو، کیوں کہ وہ تمھیں پراگندہ کر دیں گے۔

ہم نے وعدہ کیا تھا، ہم نے عہد کیا تھا کہ ہم پاکستان میں اللہ کی حکومت قائم کریں گے۔ اللہ تعالیٰ نے پاکستان بنا دیا۔ اب ذرا غور کیجیے کہ اس پاکستان میں ہم نے کون سا قانون نافذ کیا ہے؟

ہمیں سمجھ لینا چاہیے، ہمیں یقین کر لینا چاہیے اور ہمیں اس کو قولِ فیصل قرار دے لینا چاہیے کہ اگر ہم وعدہ خلافی کریں گے تو ہم ضرور اپنے مرکز سے دور ہوں گے اور یہ لامرکزیت ہمیں کبھی سر بلند اور سرفراز نہیں ہونے دے گی۔

Marfat.com

وحی

ہم اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے احکام اور اپنی ہدایات انبیائے کرام پر وحی کے ذریعے سے نازل فرماتا رہا ہے۔ قرآن حکیم میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

اِنَّآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ كَمَآ اَوْحَيْنَآ اِلٰى نُوْحٍ وَّالنَّبِيّٖنَ مِنْۢ بَعْدِهٖ ۚ وَاَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَعِيْسٰى وَاَيُّوْبَ وَيُوْنُسَ وَهٰرُوْنَ وَسُلَيْمٰنَ ۚ وَاٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا ۔ (النسا: ۱۶۳)

یعنی: ”اے نبی! ہم نے تم پر وحی نازل کی جیسے نوح اور ان کے بعد کے تمام انبیاؑ پر نازل کرتے رہے ہیں (مثلاً) ابراہیم، اسماعیل، اسحٰق، یعقوب اور ان کے خاندان اور عیسیٰ، ایوب، یونس اور ہارون پر اور جیسے ہم نے داؤد کو زبور دی۔“

اسی طرح ہم اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ وحی کا یہ سلسلہ اس ذات گرامی پر ختم ہوا جسے قرآن نے خاتم النبیین کا خطاب عطا فرمایا ہے۔ عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ وحی کی صداقت اور اس کی حقانیت پر بس ایمان اور اعتقاد ہی کافی ہے، لیکن ذرا غور کیجیے تو بات اس سے کہیں زیادہ غور و تأمل کی ہے اور فکر و تدبر کی متقاضی معلوم ہوتی ہے۔

اس سلسلے میں آگے بڑھنے سے پہلے یہ حقیقت ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ اسلام میں ہر عقیدے کا براہِ راست تعلق انسان کی عملی اور واقعاتی زندگی سے ہے۔ اور اسلام اس عقیدے کو جس سے انسان کی زندگی غیر متعلق رہے، کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ انسان کی عملی زندگی میں وحی کے برحق ہونے کا اقرار کس طرح موثر ہوتا ہے اس کو یوں سمجھیے کہ اس کائنات میں انسان کی حیثیت کسی نئے شہر میں ایک نووارد کی سی ہے جسے نہ یہ معلوم ہو کہ یہاں خطرات سے محفوظ زندگی گزارنے کی جگہ کون سی ہو سکتی ہے، نہ اس بات کا علم کہ زندگی کی بقا کا سامان اسے کہاں ملے گا اور نہ وہ یہاں کے راستوں سے واقف ہو۔ ایسے ناواقف اور نووارد کے لیے راہ پانے کی جو صورتیں عقلاً ممکن ہیں یہ ہیں کہ یا تو وہ اپنی عقل سے کام لے اور اس اجنبی شہر کا نقشہ خود بنائے، اُس کی راہوں کا تعین کرے۔ پُر خطر اور مامون مقامات کا کھوج لگائے اور یہ دریافت کرے کہ اسے زندگی گزارنے اور باقی رکھنے کے لیے جن چیزوں کی ضرورت ہے وہ اس شہر کے کس کس حصے میں مل سکیں گی۔ اگر کوئی مسافر محض اپنی عقل اور سوجھ بوجھ کے سہارے ان سب باتوں کو معلوم کرنے کی ٹھانے تو اُس

Marfat.com

کی عمر کا ایک بڑا حصہ محض اس تلاش میں گزر جائے گا، اور یہ عین ممکن ہے کہ اس تلاش کے دوران ہی کوئی پُر خطر مرحلہ آجائے۔ اس لیے یہ راہ کامیابی کی راہ نہیں ہو سکتی۔

اب دوسری صورت یہ ہے کہ آدمی کوئی رہ نما تلاش کرے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ رہ نما کس کو بنایا جائے اور کون اس منصب کا حق دار ہو سکتا ہے۔ اس جگہ تفصیلات کو چھوڑ کر صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ محض خوش عقیدگی کی بات نہیں بلکہ اس کے ساتھ صدیوں پر پھیلی ہوئی انسانی تاریخ گواہ ہے کہ اللہ نے اس کائنات میں آنے والے انسان کی راہ نمائی کے لیے ہر دور میں رہبر مقرر فرمائے ہیں۔ ایسے رہبر جنھیں وحی کے ذریعے سے کائنات کے بارے میں یہ علم دیا گیا کہ اس کی کون سی راہیں پُر خطر اور مہلک ہیں اور کون سی راہوں پر چلنے والا اس امر کی ضمانت پا لیتا ہے کہ زندگی کا سفر اس کے لیے بے خطر ہی نہیں بلکہ ابدی صلاح و فلاح کا عنوان بھی ثابت ہوگا۔ ایسے رہبر کی صداقت پر ایمان دراصل اس علم کی حقانیت پر ایمان ہے جو انبیائے کرامؑ کو وحی کے ذریعے سے دیا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ منبعِ علم یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات والا صفات پر ایمان، اس کی بھیجی ہوئی وحی پر یقین اور اس وحی کے امین یعنی اللہ کے رسولؐ کی صداقت و حقانیت کا اقرار دونوں درحقیقت ایک دوسرے سے منسلک اور جزو لاینفک ہیں۔

جب ہم زندگی کی راہوں پر سرگرم سفر ہوتے ہیں تو ہم میں سے ہر فرد کے لیے ایسے لمحات آتے ہیں جہاں ہمیں کسی رہ نمائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور میں تو کہتا ہوں کہ زندگی کے ہر لمحے اور ہر سانس ہمیں اس رہ نمائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایسے کسی مرحلے پر جو لوگ محض اپنی عقل پر بھروسا کر کے چل پڑتے ہیں ان کے بارے میں یہ کہنے میں مجھے کوئی تکلف اور تامل نہیں کہ وہ ہلاکت کی راہ پر گام زن ہوتے ہیں۔ اسی طرح جو لوگ دوسروں کی دیکھا دیکھی چلتے ہیں یا بلا تحقیق دوسروں کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے دیتے ہیں ان کے بارے میں قرآن مجید کی یہ آیت سُن لیجیے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اسی طرح آنکھیں بند کر کے دوسروں کو اپنا قائد اور رہ نما بنانے والے جب بے راہ روی کے جرم میں روزِ حساب پکڑے جائیں گے تو چلّا چلّا کر کہیں گے:

رَبَّنَآ اِنَّآ اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَآءَنَا فَاَضَلُّوْنَا السَّبِيْلَا ۝ رَبَّنَآ اٰتِهِمْ ضِعْفَيْنِ مِنَ الْعَذَابِ وَالْعَنْهُمْ لَعْنًا كَبِيْرًا ۝

(الاحزاب: ۶۷-۶۸)

یعنی: "اے ہمارے رب! ہم نے اپنے سرداروں کا کہا مانا اور ایسے لوگوں کے پیچھے چل پڑے جو ہمیں بظاہر بڑے معلوم ہوتے۔ آج معلوم ہوا کہ انھوں نے ہمیں تباہی کے راستے پر لا ڈالا تھا۔ اے اللہ! انہیں دگنا عذاب دے

Marfat.com

اور انھیں اپنی لعنت کا مستحق بنا۔"

انھیں بارگاہِ قدسی سے جو جواب ملے گا وہ یہ ہو گا کہ یہ بات تم نے اس وقت کیوں نہ سمجھی ؟ اب تم دونوں عذاب اور لعنت میں برابر کے گرفتار ہو۔ ان دونوں راہوں کے بجائے تیسرا اور ہر خطرے اور ہلاکت کے ہر شائبے سے محفوظ راستہ وہ ہے کہ جو انبیا کی رہ نمائی میں ملتا ہے اور وہ درحقیقت وحی کا بتایا ہوا راستہ ہے۔

قرآنِ حکیم میں اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے کہ آپؐ ان خصوصیات سے متصف ہیں۔

يَأْمُرُهُم بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ ۚ فَالَّذِينَ آمَنُوا بِهِ وَعَزَّرُوهُ وَنَصَرُوهُ وَاتَّبَعُوا النُّورَ الَّذِي أُنزِلَ مَعَهُ ۙ أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ٥ (الاعراف: ۱۵۷)

یعنی: "لوگوں کو بھلی باتوں کا حکم دیتے ہیں اور انھیں بُری باتوں سے روکتے ہیں، پاک چیزیں ان کے لیے حلال اور ناپاک چیزیں حرام قرار دیتے ہیں اور ان سے نارو ا بوجھ اتارتے اور ان کی گردنوں سے گم راہی کے طوق ہٹاتے ہیں۔ تو جو لوگ ان پر ایمان لائے جنھوں نے ان کا ساتھ دیا اور ان کی مدد کی اور وحی کا جو نور انھیں عطا ہوا ہے اس کی پیروی کی، وہ مراد پانے والے ہیں۔"

اس آیتِ مبارکہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ وحی کے اتباع اور وحی لانے والے یعنی رسولؐ کی پیروی کی راہ ہی انسان کے لیے راہِ نجات ہے۔

آج امتِ مسلمہ پر زبوں حالی چھائی ہوئی ہے اور آج ہم ہر طرف سے خطرات میں گھرے ہوئے ہیں۔ ہماری یہ حالت ہے کہ ہم اپنے ہم وطنوں میں بھی محفوظ نہیں ہیں اور ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگیوں میں مومن کی شانِ امتیاز جسے قرآن وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ٥ (البقرہ: ۱۱۲) کا عنوان دیتا ہے، مفقود ہے۔ ہم اپنی زندگی اور اپنے ملکوں اور اپنے گھروں کی حفاظت کے لیے بھی دوسروں کے محتاج ہو کر رہ گئے ہیں اور ہم نے باوجود کثرتِ تعداد کے اور باوجود کثیر وسائل کے آج اقوامِ عالم کی صفوں میں پست ترین مقام اپنے لیے انتخاب کر لیا ہے اور امامتِ اقوام کے منصب سے اتر کر دوسروں کے دستِ نگر اور ان کی چشم و ابرو کے اشاروں پر چلنے والے، اغیار سے تحفظات کی بھیک پر گزارا کرنے والے بن گئے ہیں تو اس ساری نکبت و خواری کا سبب یہ ہے کہ آج ہم نے وحی کے اس سراجِ منیر کو توڑ ڈھانک کر ایک طرف رکھ دیا ہے جس کی روشنی ہمارے لیے راحتِ روح اور حیات بخش ہوتی اور ایسی اقوام و ملل کو اپنا راہ نما

Marfat.com

بنالیا ہے جو خود گم کردہ راہ ہیں۔

ہماری اس بدنصیبی کا کوئی ٹھکانا ہے کہ ہم نے انھیں اپنا محافظ اور قائد سمجھ لیا ہے جو فی الحقیقت ہم سے راہ نمائی کے محتاج ہیں۔ اگر ہم ان ہی کے ہاتھوں میں ہاتھ دیے چلتے رہے اور اس یدِ بیضا سے ہم نے صرفِ نظر کرلیا جو اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ نے ہماری آستینوں میں دے رکھا ہے تو دنیا میں تو تباہ ہوتے ہی رہیں گے، بربادیوں کی ذلّتوں سے ہر روز ہمیں سامنا رہے گا اور اس کے ساتھ قیامت میں جب ہم اللہ کے دربار میں حاضر ہوں گے تو یہ ذلّت وہاں بھی ہمارا ساتھ نہ چھوڑے گی۔ ہم اپنی بے راہ روی پر اور اپنے خود ساختہ اماموں پر لعنت کرتے رہیں گے اور اللہ کی لعنت ہم پر مسلّط رہے گی۔

یہ محض اللہ کا فضل و احسان ہے کہ اس گئی گزری حالت کے باوجود اس نے ہمارے بارے میں ابھی یہ فیصلہ نہیں فرمایا کہ وحی کی روشنی سے روگردانی کرنے والی اس قوم کے دلوں پر مہر لگادی جائے۔ ابھی اللہ کی دی ہوئی مہلت باقی ہے۔ اگر ہم میں سے ہر فرد اور ساری ملّتِ اسلامیہ یہ طے کرلے کہ اس مہلت سے فائدہ اٹھانا ہے اور وحی کی روشنی کو اپنا راہ نما بنانا ہے تو حالات کو بدلتے دیر نہیں لگے گی۔

ہم اپنی کھوئی ہوئی عزّت آج بھی واپس لے سکتے ہیں بشرطیکہ وحی پر ایمان کی تجدید کریں۔ وحی بھیجنے والے اللہ کے رحم و کرم کا دامن تھام لیں اور وحی لانے والے رسولؐ کی قیادت میں خود کو منظم کرلیں۔

میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ ہمیں اس مہلت سے فائدہ اٹھانے کی توفیق دے اور ہمارے دن پھیر دے۔ آمین۔

Marfat.com

تصوّرِ آخرت اور انسانی اعمال

اسلام کے نظامِ عقائد و ایمانیات میں تین عقائد بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔ ایک ایمان باللہ، دوسرے ایمان بالرسول اور تیسرے ایمان بالآخرت۔ ان تینوں میں ایمان بالآخرت کو اس بنا پر خصوصی اہمیت حاصل ہے کہ جو شخص اپنی بے بصری کی بدولت یہ سمجھتا ہو کہ موت ہی زندگی کا اختتام ہے اور اس کے بعد اسے کچھ پیش ہی نہیں آنا ہے تو اسے اللہ اور رسول پر ایمان لانے کی کوئی ضرورت ہی محسوس نہ ہوگی، نہ وہ یہ پسند کرے گا کہ ایمان لا کر خواہ مخواہ اپنے عیش کو مکدر کرے۔

قرآن مجید اسی بنا پر عقیدۂ آخرت کو قبولِ حق کی استعداد کی اساس اور اصل قرار دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ قُلُوْبُهُمْ مُّنْكِرَةٌ (النحل:۲۲)

یعنی: "جو لوگ آخرت کو نہیں مانتے وہی حق کے منکر ہیں۔"

اسی طرح ایک اور جگہ ارشاد ہے:

وَاِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ عَنِ الصِّرَاطِ لَنٰكِبُوْنَ ۝ (المومنون:۷۴)

یعنی: "آخرت کے منکر ہی راہ مستقیم سے گریزاں ہیں۔"

کفار و مشرکین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے طرح طرح کے مطالبے کرتے تھے اور یہ کہتے تھے کہ اگر تم یہ کام کر دکھاؤ تو ہم تم پر ایمان لے آئیں گے۔

ان کے مطالبات میں سے ایک مطالبہ قرآن کے الفاظ میں یہ بھی تھا:

بَلْ يُرِيْدُ كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ اَنْ يُّؤْتٰى صُحُفًا مُّنَشَّرَةً (المدثر:۵۲)

یعنی: "دراصل ان میں سے ہر آدمی یہ چاہتا ہے کہ رسول کے سچا ہونے کے ثبوت کے طور پر اسے ایک کھلا صحیفہ لا کر دے دیا جائے۔"

قرآن مجید ان کے اس مطالبہ پر جو تبصرہ کرتا ہے وہ یہ ہے کہ اس بے ہودہ مطالبے کا اصل سبب یہ ہے کہ:

Marfat.com

كَلَّا ۖ بَل لَّا يَخَافُونَ الْآخِرَةَ (المدثر: ۵۳)

یعنی: "یہ سب کچھ نہیں! سیدھی بات یہ ہے کہ یہ آخرت سے نہیں ڈرتے۔"

قرآن مجید عقیدۂ آخرت کو اتنی اہمیت دیتا ہے کہ مقدمۂ قرآن یعنی سورۂ فاتحہ میں اللہ نے جہاں اپنی جامع صفات بیان فرمائی ہیں ان میں اپنی اس صفت کو خاص طور پر بیان کیا ہے کہ وہ "مَالِكِ يَوْمِ الدِّينِ" ہے۔ آگے چل کر سورۂ بقرہ میں جہاں قرآن مجید سے استفادہ کی شرائط بیان ہوئی ہیں ان میں بھی آخرت پر یقین کا خاص طور پر ذکر کیا ہے:

وَبِالْآخِرَةِ هُمْ يُوقِنُونَ ۝ (البقرہ: ۴)

پھر سارا قرآن جس بات پر سب سے زیادہ زور دیتا ہے وہ یہ ہے کہ انسان اس دنیا میں چند روز کے لیے آیا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَسَتُرَدُّونَ إِلَىٰ عَالِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ (التوبہ: ۱۰۵)

یعنی: "وہ دن دور نہیں کہ تم سب غیب و حاضر کو جاننے والے کے دربار میں پیش کیے جاؤ گے۔"

اور یہ کہ جب یہ پیشی ہوگی تو پھر ہر فرد کی ساری زندگی کا حساب ہوگا۔

إِنَّ إِلَيْنَا إِيَابَهُمْ ۝ ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا حِسَابَهُم ۝ (الغاشیہ: ۲۶)

یعنی: "ان سب کو ہماری ہی طرف لوٹ کر آنا ہے اور پھر ہم ان سے حساب لیں گے۔" اور ساتھ ہی یہ کہ "اس روز انسان کو صرف اپنے کیے کا بدلہ ملے گا۔"

وَأَن لَّيْسَ لِلْإِنسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ ۝ (النجم: ۳۹)

نیز یہ کہ اس دن نہ کوئی سعی و سفارش کام دے گی نہ کوئی کسی کے کام آئے گا یہاں تک کہ:

يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ أَخِيهِ ۝ وَأُمِّهِ وَأَبِيهِ ۝ وَصَاحِبَتِهِ وَبَنِيهِ ۝ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَأْنٌ يُغْنِيهِ ۝ (عبس: ۳۴-۳۷)

یعنی: "ایسا دن کہ آدمی اپنے بھائی سے بھاگے گا، اور اپنے ماں باپ سے اپنی بیوی سے اور بیٹے سے، اس دن تو ہر شخص ایسی مصیبت میں مبتلا ہوگا کہ اسے اور کچھ یاد ہی نہ رہے گا۔"

اور اگر کوئی یہ چاہے کہ کچھ دے دلا کر اپنی جان چھڑا لے تو یہ بھی ممکن نہ ہوگا:

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْ أَنَّ لَهُم مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا وَمِثْلَهُ مَعَهُ لِيَفْتَدُوا بِهِ مِنْ عَذَابِ يَوْمِ الْقِيَامَةِ مَا تُقُبِّلَ مِنْهُمْ ۖ (المائدہ: ۳۶)

یعنی: "یہ ناشکرے اگر اس روز چاہیں گے کہ ساری زمین اور اتنا ہی کچھ اور دے کر اپنی جان چھڑا لیں اور اس روز کے عذاب سے بچ جائیں تو ان کا یہ فدیہ قبول نہ کیا جائے گا۔"

Marfat.com

قیامت کا دن ایسا ہوگا کہ کوئی کسی کے کام نہ آئے گا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس دن جو فیصلہ ہوگا وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہوگا:

ذٰلِكَ يَوْمُ الْخُلُوْدِ ۝ (قٓ: ۳۴)

یہ ساری آیات آخرت کا جو تصور و ایمان دیتی ہیں یہ ایسا تصور و ایمان ہے کہ اگر ہر وقت ذہن میں رہے تو ناممکن ہے کہ انسانی اعمال پر اس کا اثر نہ پڑے۔ ایسا انسان کہ جو آخرت پر یقین رکھتا ہے اس کے طرزِ ماندو بود، نشست و برخاست، بول چال، عادات و اطوار، سلوک اور چلن، حتیٰ کہ اس کی گفت گو اور خاموشی، اس کے مختلف امور میں دل چسپی لینے یا ان سے بچنے تک سے یہ عیاں ہوگا کہ یہ وہ آدمی ہے جو اس کائنات کے مالک اور حاکم اور اس کے نظام کو چلانے والے اللہ وحدہٗ لاشریک پر ایمان رکھتا ہے اور اس نے پوری دل جمعی اور اطمینانِ قلب کے ساتھ اللہ کے نبیؐ کو اپنا قائد و رہ نما اور مُطاع قرار دیا ہے۔ اور وہ شخص کہ جو آخرت پر یقین و ایمان رکھتا ہے وہ لازماً اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ اس دنیا میں کی ہوئی کوئی نیکی اکارت نہیں جائے گی۔ اور کوئی بدی ایسی نہیں جس کے نتائج کا کل کی زندگی میں اسے سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔

آپ خود سوچیے کہ ان تصورات کا حامل اگر کوئی فرد ہو تو کیا وہ اندھیرے میں ہیرے کی طرح دمکتا نہ محسوس ہوگا۔ اور اگر کوئی ملّت ہو تو کیا وہ اس اندھیری دنیا میں ظلمتوں کے اس سیلاب میں مینارۂ نور نہ معلوم ہوگی۔ آج ملّتِ اسلامیہ کے افراد اور ان افراد کی وجہ سے ساری ملّت پر جو نکبت و بدحالی طاری ہے اور جو بے وقعتی مشرق سے لے کر مغرب تک ہمارا مقدر بن گئی ہے اس کی وجہ آپ بھی جانتے ہیں اور میں بھی۔ واقعہ یہ ہے کہ آج ہمارے اعمال، اہلِ ایمان اور ہدایتِ ربّانی کے آگے سرِ تسلیم خم کر دینے والے اہلِ اسلام کے سے اعمال نہیں ہیں۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ دنیا اور اس کے بعد کی زندگی کے بارے میں ہمارا تصور وہ نہیں رہا جو اللہ نے ہمیں بتایا، جسے رسولؐ نے پیش کیا ہے اور جس کی توضیح و تشریح کتابِ ہدایت نے کی ہے۔ اگر ہم بحیثیتِ فرد اور بحیثیتِ ملّت و جماعت کے اس تصورِ آخرت کو دوبارہ اپنے ذہنوں میں تازہ کر لیں تو ہم اپنے اعمال کے آئینے میں دنیا کو وہ خاکہ دکھا سکتے ہیں جسے سامنے رکھ کر اگر انسانیت اپنی زندگی کی راہ متعین کرلے تو ابدی نجات اس کا مقدر بن جائے۔ اس تصور کو تازہ کرنے کی ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ ہے کہ ہم قرآنِ کریم کو حرزِ جاں بنا لیں اور اُن راہوں کو اختیار کریں اور ان راستوں پر چلیں جن کی رہ نمائی ہادیِ برحق، نورِ مجسّمؐ نے فرمائی ہے۔

Marfat.com

ایمان روشنی ہے، کفر تاریکی ہے

ایمان اور کفر انسانی لغت کے دو لفظ ہیں اور یہ دو لفظ معانی و مفاہیم کے اعتبار سے ایک دوسرے سے قطعاً اور کلیتہً مختلف ہیں۔ حیاتِ انسانی میں یہ دو لفظ بہ یک وقت اور بہ یک آن جمع نہیں ہو سکتے۔ یعنی یہ نہیں ہو سکتا کہ کوئی انسان ایک ہی وقت میں صاحب ایمان ہو اور کافر بھی۔ اور نہ یہ ممکن ہے کہ ایک ہی انسان کے دل میں بہ یک وقت اللہ اور غیر اللہ بیٹھے ہوں۔ دنیا اور آخرت کی حقیقت کی روشنی میں اگر ہم تاریخ عالم پر ایک عمیق اور گہری نگاہ ڈالیں اور حقائق و عبر کی ہر داستان پر غور و فکر کریں تو ہم دیکھیں گے کہ حیاتِ انسانی کا ہر انقلاب اور وجودِ ارض کا ہر لمحہ متضاد فکری توانائیوں کے تابع رہا ہے اور آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد کی تاریخ قطعی طور پر ایمان اور کفر کے انقلابات سے عبارت ہے۔ ان تقریباً چودہ سو سالوں میں اسلام نے ایمان کا نہایت واضح تصور دیا اور ایمان اور کفر کی بڑی واضح تعریف کر کے اس کرۂ ارض کو ایک عظیم انقلابِ فکر اور روشنیِ ایمان سے روشناس کیا اور حیاتِ انسانی کے معانی و مفاہیم میں وہ عظمت پیدا کی کہ تاریخِ عالم جس سے نا آشنا تھی۔

انسان اس دنیا میں قدم رکھتا ہے تو اُسے اپنے اطراف ایک وسیع اور عریض کائنات بکھری ہوئی نظر آتی ہے۔ اس وسیع کائنات کا ایک ایک ذرّہ انسان کو اس امر کا یقین دلاتا ہے کہ وہ انسان کے فائدے کے لیے اور اس کے استعمال کے لیے بنایا گیا ہے۔ اس کائنات کو اور جو کچھ اس میں ہے اس کو استعمال کرنے والے اور اس سے استفادہ کرنے والے انسان دو طرح کے ہوتے ہیں: ان میں ایک گروہ اُن انسانوں کا ہے کہ جو زندگی بھر ایک لمحے کے لیے بھی یہ سوچنے کی زحمت نہیں کرتے کہ وہ محسن کون ہے جس نے بلا طلب اور بلا استحقاق انسان کے لیے یہ خوانِ نعمت بچھا رکھا ہے۔ ایسا آدمی جو اپنے اس محسن اور اس کائنات کے خالق اور مدبّر کو جاننے کی کوئی کوشش ہی نہ کرے وہ اس کا حق کیسے ادا کر سکتا ہے۔ ایسے احسان ناشناسوں اور

Marfat.com

خود غرضوں کو جو يَتَمَتَّعُونَ وَيَأْكُلُونَ كَمَا تَأْكُلُ الْأَنْعَامُ (محمد: ۱۲)

یعنی: "جانوروں کی طرح بے حسی کے ساتھ اس کائنات کی نعمتوں سے متمتع ہوتے ہیں اور کچھ نہیں سوچتے کہ یہ نعمتیں کس نے پیدا کی ہیں اور وہ ان کو دے کر انسان سے کیا چاہتا ہے۔"

ان کو قرآن کافر کہتا ہے۔

یہ خدا کو نہ جاننے والے، اُسے نہ پہچاننے والے اور اس کے احسانات کا حق ادا نہ کرنے والے انسان جو قرآن کے الفاظ میں جانوروں سے بھی گئے گزرے ہیں نہ صرف یہ کہ خدا کو نہیں جانتے، بلکہ اس کے ساتھ ہی اپنے اس جرم کی پاداش میں خود اپنے عرفان کی بے بہا نعمت سے محروم کر دیے جاتے ہیں۔

قرآنِ کریم کا ارشاد ہے:

نَسُوا اللّٰهَ فَأَنْسَاهُمْ أَنْفُسَهُمْ ط (الحشر: ۱۹)

یعنی: "انھوں نے خدا کو بھلا دیا خدا نے خود انھیں اپنی ہی نظروں سے اوجھل کر دیا۔"

اب اس شخص کی بدنصیبی اور حرماں بختی پر غور کیجیے جو نہ خود کو جانتا ہو، نہ خدا کو پہچانتا ہو، نہ اسے یہ معلوم ہو کہ اس کائنات کا خالقِ کائنات سے کیا تعلق ہے۔ اس کی یہ لاعلمیاں اور جہالتیں کتابِ ہدایت اور منبعِ نور یعنی قرآنِ حکیم کے الفاظ میں

ظُلُمٰتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ ط إِذَا أَخْرَجَ يَدَهُ لَمْ يَكَدْ يَرَاهَا ط (النور: ۴۰)

یعنی: "تہہ در تہہ اندھیرے کہ ہاتھ کو ہاتھ نہ سجھائی دے" کی مصداق ہیں۔

اس بدنصیب اور حرماں بخت انسان کے مقابلے میں اس کائنات اور اس کی ان گنت و بے شمار نعمتوں سے استفادہ کرنے والوں کا ایک اور گروہ ہے جو اپنے خالق کا شناسا ہے اور اپنے محسن کو جانتا ہے جس نے قدم قدم پر اس کے لیے سامانِ زیست و حیات اور آسائشوں کا انتظام فرمایا ہے۔ وہ اپنے اس محسن کو پہچانتا ہے تو اُسے اس احسان شناسی کا بدلہ یہ ملتا ہے کہ اللہ جو خود نُورُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ ہے، اسے اور اس کے قلب و نگاہ کو نور عطا فرما دیتا ہے، اس کے دل کو ایمان کی روشنی عطا ہوتی ہے تو وہ یہ دیکھ لیتا ہے کہ وہ خود کیا ہے۔ اسے معلوم ہو جاتا ہے کہ کس نے اس پر یہ احسانات کیے ہیں اور اس نے یہ کائنات کس کے لیے اور کیوں بنائی ہے۔ اسے یہاں کس طرح رہنا ہے اور کیا کرنا ہے۔

یہ احسان شناسی، یہ حق شناسی اور یہ خود شناسی ہی درحقیقت وہ روشنی ہے

Marfat.com

جسے ایمان کا نام دیا گیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ (الشوریٰ: ۵۲)

یعنی: "آپ نہ تو کتاب سے واقف تھے نہ ایمان کے بارے میں جانتے تھے۔ لیکن ہم نے آپ کو یہ روشنی عطا کی اور اسے ذریعۂ ہدایت بنایا۔"

اب یہ دیکھیے کہ ایمان کیا ہے۔ ایک حدیث کے الفاظ ہیں:

اِنَّ لِلْاِيْمَانِ فَرَائِضَ وَشَرَائِعَ وَحُدُوْدًا وَّسُنَنًا فَمَنِ اسْتَكْمَلَهَا فَقَدِ اسْتَكْمَلَ الْاِيْمَانَ وَمَنْ لَّمْ يَسْتَكْمِلْهَا لَمْ يَسْتَكْمِلِ الْاِيْمَانَ۔

یعنی: حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ "ایمان نام ہے کچھ فرائض کی تکمیل کا، بعض قوانین و احکام کی پابندی کا اور کچھ تعلیمات کی پیروی کا۔ تو جس نے ان امور کی تعمیل کی اس نے اپنا ایمان مکمل کر لیا اور جو ان سے عاجز رہا اس کا ایمان مکمل نہیں ہو سکتا۔"

ان ہی فرائض و احکام اور قوانین و تعلیمات کے مجموعے کا نام شریعت ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اس لائی ہوئی شریعت کے بارے میں فرمایا ہے کہ:

شَرِيْعَةٌ بَيْضَاءُ لَيْلُهَا كَنَهَارِهَا

یعنی: "یہ شریعت بیضا جس کی رات بھی دن کی طرح روشن ہے۔"

حق یہ ہے کہ زندگی اللہ تعالیٰ کی ایک نعمت ہے۔ یہ نعمت دوسری نعمتوں کی طرح ایک آزمائش ہے۔ انسان کی دنیوی زندگی ایک امتحان ہے۔ ایک طرف زندگی کی آسائشیں اور راحتیں ہیں، دوسری جانب مصیبتیں اور پریشانیاں ہیں۔ دونوں صورتوں میں انسان کو سخت آزمائشوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ ان آزمائشوں سے انسان کو جو چیز کامیابی اور خوبی کے ساتھ عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت بخشتی ہے وہ ایمان کی قوت ہے۔ اگر انسان یقین و ایمان سے خالی ہو تو وہ نہ صرف یہ کہ زندگی کی مشکلات کا مقابلہ نہیں کر سکتا بلکہ زندگی کی راحتوں سے بھی صحیح معنی میں لطف اندوز نہیں ہو سکتا۔ ایمان کی عدم موجودگی بے مقصدی کے مترادف ہے۔ ایمان سے عاری انسان ایک ایسے مسافر کے مانند ہے جو تنگ و تاریک راستوں کی صعوبتیں تو برداشت کر رہا ہو، لیکن منزل معلوم نہ ہونے کی بنا پر منزل پر پہنچنے کے لطف کے تصور سے محروم ہو۔ زندگی کی کٹھن راہوں میں، مسائل کی پیچیدگی میں، وسائل کی کمی میں جو روشنی انسان کو بھٹکنے سے بچاتی ہے، جو روشنی اس کے عزم کو بلند رکھتی ہے وہ روشنی

Marfat.com

ایمان کی روشنی ہے۔ ایمان ایک ایسی روشنی ہے کہ جو مایوسی اور مشکلات کی رات میں صبح کے نور کی طرح ہے۔

کتابِ ہدایت یعنی قرآنِ حکیم کا مقصدِ نزول کفر کی تاریکی کو ایمان کی روشنی میں بدل دینا ہے۔ قرآنِ حکیم کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

كِتَابٌ أَنزَلْنَاهُ إِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ ۙ (ابراہیم:۱)

یعنی: "یہ کتابِ عظیم ہم نے آپ پر اس لیے نازل کی ہے کہ آپ لوگوں کو تاریکی سے نکال کر روشنی میں پہنچا دیں۔"

حضرت رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایمان کی اصل چھ چیزیں قرار دی ہیں:

۱۔ اللہ تعالیٰ پر ایمان لانا۔
۲۔ اللہ تعالیٰ کے فرشتوں پر ایمان لانا۔
۳۔ اللہ تعالیٰ کی کتابوں پر ایمان لانا۔
۴۔ اللہ تعالیٰ کے رسولوں پر ایمان لانا۔
۵۔ قیامت کے دن پر ایمان لانا۔
۶۔ تقدیر پر ایمان لانا۔

ایمان شرعی کے متعلق تمام محدثین کا مذہب یہ ہے کہ دل سے ماننا، زبان سے اقرار کرنا اور اعضا سے عمل کرنے کا نام ایمان ہے، یعنی تصدیق بالجنان، اقرار باللسان، عمل بالارکان۔ اس کی تشریح اس طرح ہے کہ ایمان اللہ کے پیغمبر پر اُس کے لائے ہوئے مکمل پیغام کے بارے میں کامل اعتماد کا نام ہے۔

Marfat.com

یقینِ محکم

انبیائے کرام علیہم السلام انسانوں کو جن باتوں پر ایمان و عمل کی دعوت دیتے ہیں ان کے بارے میں ہمیں یہ سمجھ لینا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ان پر کامل یقین اور غیر متزلزل ایمان مطلوب ہے، اس لیے کہ ہمارے سارے اعمال و افعال کا سرچشمہ ہمارا اعتقاد ہے اور انبیائے کرام ہیں ان کی لائی ہوئی ہدایتوں پر ہمیں اگر راسخ اعتقاد نہ ہو تو ہمارا کوئی کام درست نہیں ہو سکتا۔ قرآن پاک میں فرمایا گیا:

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ.... (النسا: ۱۳۶)

یعنی: اے لوگو جو ایمان لائے ہو ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر

یہاں ایمان کے باوصف دوبارہ جس بات کا حکم دیا جا رہا ہے وہ یقینِ محکم ہے۔ یہ ایک اصولی بات ہے کہ کسی دستور پر عمل کے تقاضے سے پہلے اس کی خوبی اور اس کی سچائی کے یقین کا مطالعہ کیا جائے کیوں کہ اگر اس دستور کی برتری اور اچھائی پر ہمیں مکمل یقین نہ ہو تو ایمان و دیانت کے ساتھ اس پر عمل کرنا ہمارے لیے ممکن نہیں ہے اور ایسے کمزور اور غیر یقینی عقیدہ و فکر کا کوئی اثر ہمارے قلب و ضمیر پر کبھی مترتب نہیں ہو سکتا اور جب قلب اصلاح پذیر نہ ہو تو اعمال میں انقلاب کس طرح پیدا ہو سکتا ہے؟ ایمان کا اصل مقصد تو اسی مصدرِ ارادہ و عمل یعنی قلب کی اصلاح ہے۔ اس کی اصلاح یقینِ محکم کے بغیر نہیں ہو سکتی، اس لیے علم و اعتقاد کی اس پختگی اور اس یقینِ محکم کی دعوت دی جا رہی ہے کہ جو فکر و عمل کی دنیا میں حقیقی انقلاب برپا کر سکے۔ اہلِ ایمان کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ انھیں معمولی سا شبہ بھی نہیں ہوتا۔ نصِ قرآنی ہے:

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ ثُمَّ لَمْ یَرْتَابُوْا وَجٰھَدُوْا بِاَمْوَالِھِمْ وَاَنْفُسِھِمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۝ (الحجرات: ۱۵)

یعنی: "حقیقت میں تو مومن وہ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے، پھر انھوں نے کوئی شک نہ کیا اور اپنی جانوں اور اپنے مالوں سے اللہ کی راہ میں جہاد کیا، وہی سچے لوگ ہیں۔"

اس آیت میں جس شک و شبہ کا ذکر کیا گیا ہے وہ اس ذہنی کیفیت کا نام ہے کہ جو یقینِ محکم کے برعکس ہے۔ آپ تھوڑی دیر کے لیے سب سے پہلے عقیدۂ توحید پر غور کر لیجیے کہ جو اسلام کا پہلا اور بنیادی عقیدہ

Marfat.com

ہے۔ اگر کوئی شخص زبان سے اس کا اظہار کرتا ہے اور وہ اس پر ایمان کا دعوا کرتا ہے تو لازمی طور پر اللہ کے سوا کسی اور کی بندگی اور حاکمیت کے داغ دھبے سے اس کی پوری زندگی کا دامن پاک ہونا چاہیے۔ اس کے سوا کسی اور کا قانون اس کے لیے قابلِ قبول نہیں ہونا چاہیے۔ اس کی زندگی کا سارا نظام اس کی نازل کردہ ہدایت پر مبنی ہونا چاہیے۔ اسے غیر اللہ میں ان تمام صفات کا پوری جرأت اور بے باکی سے انکار کر دینا چاہیے کہ جو معبودِ برحق کے لیے خاص ہیں۔ اپنی امیدوں اور اپنی آرزوؤں، نیز اپنی ترجیحات اور اپنی خواہشات کے سلسلے میں اپنا یہ احتساب ضرور کر لینا چاہیے کہ ان سے اس عقیدۂ توحید کی نفی تو نہیں ہوتی؟ اگر اپنے دعوے کے باوجود ہم احکامِ الٰہی کے پورے پورے اتباع کے بجائے غیر اللہ سے خائف ہیں اور اللہ کے ساتھ ساتھ کسی دوسرے کو بھی اپنے طرزِ عمل سے نفع و نقصان کا مالک سمجھتے ہیں تو یہ دعوا کس طرح صحیح ہو سکتا ہے؟ اور ایسے علم و عقیدہ کو کس طرح پختہ اور شک و شبہ سے پاک کہا جا سکتا ہے؟ زیادہ سے زیادہ اسے رسمی اعتقاد کہا جا سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کو رسمی اعتقاد کے بجائے مستحکم عقیدہ اور کمزور ایمان کے بجائے محکم یقین مطلوب ہے۔ اسی لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حکم ہوا:

قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ؕ (الانعام: ۷۱)

یعنی: "(اے پیغمبر) کہہ دو کہ اصلی ہدایت صرف اللہ ہی کی ہے۔"

آپؐ قرآنِ پاک کی صورت میں جو نظامِ حیات لائے، اگر ہماری خواہش اور ہمارا عمل مکمل طور پر اس کے تابع نہیں تو کمالِ ایمان اور یقینِ محکم کی دولت ہمیں حاصل نہیں ہو سکتی۔ جس طرح درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے اسی طرح ایمان کی قوت اور کمزوری کا اندازہ عمل سے ہوتا ہے۔ قرآنِ پاک کا ایک طرزِ خطاب یہ بھی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے انعامات کا ذکر اس طرح کرتا ہے "اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ"۔ جس کا مفہوم یہ ہے کہ اگر تم اپنے ایمان کے دعوے میں کامل ہو اور پختہ علم و یقین رکھتے ہو، مثلاً:

وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ (آلِ عمران: ۱۳۹)

یعنی: "اور تم ہی غالب رہو گے اگر تم مومن ہو۔"

گویا بلندی اور غلبے کو صرف ایمان نہیں، بلکہ کمالِ ایمان اور یقینِ محکم کا نتیجہ قرار دیا گیا ہے کیوں کہ یہ خطاب اہلِ ایمان ہی سے تھا۔ یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ کسی اصول اور ضابطے کی سچائی کا یقینِ محکم انسان میں عزم و عمل پیدا کرتا ہے۔ اس میں ہمت و شجاعت پیدا کرتا ہے۔ ایک شخص جب توحید و رسالت کا اقرار کر کے حلقۂ اسلام میں داخل ہو جاتا ہے تو قرآنی نظامِ زندگی کو اپنانا اس کا انفرادی فرض نہیں ہوتا بلکہ پورے اجتماعی نظام میں اس کے نفاذ کی جد و جہد بھی اس پر واجب ہو جاتی ہے۔ اب آپ غور فرمایئے کہ جو شخص اس نظام سے متعلق علم و عقیدہ کی اس منزل پر نہ ہو جسے یقینِ محکم کہتے ہیں، اس کی

Marfat.com

اچھائی اور سچائی کو خود اپنے لیے بھی بہ جان و دل تسلیم نہ کر سکا ہو اور کوئی خلش اس کے دل میں رہ گئی ہو تو وہ کس طرح دوسروں کو اس نظام کے قبول کرنے کی دعوت دے گا؟ اگر وہ عام فضا سے متاثر ہو کر راہِ حق میں دوسروں کا شریکِ سفر بھی ہو جائے گا تو اس کی رفتار میں دلی جوش اور اس کی گفتار میں اخلاص نہیں ہو گا اور قول و عمل میں جب یہ ہم آہنگی نہ ہو گی تو ایمان و یقین کی برکتوں سے خود اس کی زندگی بھی محروم رہے گی، اور اس کا وجود مسلمانوں کے لیے بھی در خور اعتنا نہ ہو گا۔

ہمیں اس امر کا بھی احساس رکھنا چاہیے کہ انفرادی اور اجتماعی ساری خوبیوں کا سرچشمہ یقینِ محکم اور ایمانِ کامل ہی ہے۔ قرآن کمالِ ایمان کی صفت رکھنے والوں کے طرزِ عمل کی نشان دہی اس طرح کرتا ہے:

اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذَا دُعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اَنْ يَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ○ (النور: ۵۱)

یعنی: "ایمان والوں کا کام تو یہ ہے کہ جب اللہ اور رسول کی طرف بلائے جائیں، تاکہ رسول ان کے مقدمے کا فیصلہ کریں تو وہ کہیں کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی۔"

اللہ اور اس کے رسول کی ایسی اطاعت جس میں نہ حیلہ جوئی ہو اور نہ تذبذب، نہ تردّد ہو اور نہ تغافل، نہ کسل ہو اور نہ بے دلی، بلکہ مکمل مستعدی کے ساتھ ہو، تو یہ ایمانِ کامل کی شان اور یقینِ محکم کی پہچان ہوتی ہے۔

ایمانیات کا ایک اہم حصہ آخرت کا اقرار بھی ہے۔ دراصل یومِ جزا و سزا ہی پر ایمان سے زندگی کے متعلق ہمارے تصوّر میں تبدیلی آتی ہے اور ہم یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ یہ دنیا سب کچھ نہیں ہے، اور یہ کہ ہم اپنے تمام اعمال کے لیے اللہ تعالیٰ کے حضور جواب دہ ہوں گے، اور ہمارا ظاہر و باطن سب اس پر عیاں ہے اور چھوٹے سے بڑے عمل تک کوئی چیز اس کے محاسبے سے بچ نہیں سکتی تو ہمارے اندر ذمّہ داری کا شعور پیدا ہوتا ہے۔ ہم کسی چیز کو حتیٰ کہ اپنی جان کو بھی اپنی ملکیت نہیں سمجھتے اور ہمیں یہ احساس ہوتا ہے کہ دنیا میں ہم دراصل مرضیٔ الٰہی کی تکمیل کے لیے آئے ہیں، اور اصل کامیابی آخرت ہی کی کامیابی ہے کیوں کہ یہ زندگی فانی ہے اور وہ زندگی جو اس کے بعد آئے گی باقی رہنے والی ہے، لیکن یہ صفات کسی کمزور ایمان کے نتیجے میں نہیں پیدا ہوں گی، بلکہ یقینِ محکم کے فیضان سے پیدا ہوں گی، اسی لیے قرآن پاک نے آخرت کے سلسلے میں مومنوں کی صفت اس طرح بیان کی:

وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ○ (البقرہ: ۴)

یعنی: "اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔"

یعنی اللہ تعالیٰ کو آخرت کا معمولی اعتقاد اور سرسری تصور مطلوب نہیں بلکہ یقینِ کامل مطلوب ہے،

Marfat.com

ایسا یقین جیسے انسان اپنی آنکھوں سے روزِ جزا اور اس کے مناظر کو دیکھ رہا ہو۔ اس یقین کے بغیر اس میں نہ خدا ترسی پیدا ہو گی، نہ تقویٰ ہو گا اور نہ اخلاق و اعمال میں درستی آئے گی۔ اسی لیے آخرت کے ذکر کے ساتھ یومنون کے بجائے یوقنون کا لفظ استعمال فرمایا گیا ہے۔

اب اگر ہم سے کوئی ایسی بات سرزد ہوتی ہے کہ جو یقینِ آخرت کے خلاف ہو تو ہمیں سمجھ لینا چاہیے کہ ہمارا یقین عملی طور پر شک اور تردد میں بدل گیا ہے، یا پھر عملاً ہم اپنے آپ کو آخرت پر یقین رکھنے والا انسان ثابت کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ قول و عمل کا یہ تضاد اہلِ ایمان کا شیوہ نہیں۔

جہاں کہیں ہمارے عمل میں کوئی خامی یا اخلاق میں کوئی کوتاہی نظر آئے تو اس کے اسباب کی جستجو کے لیے دور جانے کی ضرورت نہیں ہے، ہمیں اپنے ایمان کا جائزہ لے لینا چاہیے کہ کہیں اس میں کوئی کمزوری تو نہیں آگئی ہے؟ ایسا تو نہیں ہے کہ ہمیں توحید، رسالت اور آخرت پر پختہ یقین نہیں رہ گیا ہے۔

آج ہمارے سامنے بے شمار مسائل ہیں۔ سیاسی بھی ہیں، اقتصادی بھی، قومی بھی ہیں، ملی بھی۔ قرآنِ پاک سارے مسائل کا حل پیش کرتا ہے اور وہ حل یہ ہے کہ اس مبارک کتاب کو بہ حیثیت ایک مکمل نظامِ حیات کے نہ صرف قبول کیا جائے بلکہ اس کے تمام ضوابط عملاً ہر شعبۂ زندگی میں بہ روئے کار لائے جائیں۔ اگر ہمارے سامنے اقتصادی اور عمرانی مسائل سر اٹھائیں تو ان کا حل کسی اور نظام میں تلاش کرنے کے بجائے ہمیں ایمانِ کامل اور یقینِ محکم کے ساتھ قرآنِ پاک میں تلاش کرنا چاہیے۔ اسی میں ہماری فلاح اور یہی ہمارا تشخص ملّی ہے۔

Marfat.com

مسلمانوں سے اسلام کے تقاضے

ہادیِ برحق نورِ مجسم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے روئے زمین کے تمام انسانوں کو اللہ کا پیغام سنایا اور خود اس پر حتماً و کاملاً عمل کر کے دکھایا۔ اللہ کا یہ پیغام آخری پیغام ہے جو اس نے اپنے محبوب بندے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی وساطت سے دنیا میں بھیجا، اور یہ اعلان کر دیا کہ آپ کی ذاتِ قدسی صفات آخری رسول کی حیثیت سے اس دنیا میں آئی ہے اور اب کوئی اور پیغمبر نہیں آئے گا۔ اسی طرح اللہ کا کلام قرآنِ حکیم کی شکل میں ابد تک کے لیے بھیجا گیا ہے۔ اب نہ کوئی پیغمبر ہوگا اور نہ کوئی تازہ حکم اللہ تعالیٰ کی جانب سے نازل ہوگا۔

رسول اللہ ﷺ کی ذمہ داریوں کا اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں متعدد جگہوں پر ذکر کیا ہے۔ مثلاً سورۃ جمعہ میں فرمایا کہ:

يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ (الجمعہ: ۲)

یعنی: "آپ لوگوں کو اللہ کی آیات سناتے اور ان کو پاک صاف کرتے اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتے ہیں"۔

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا انسانوں کا تزکیہ اور کتاب و حکمت کی تعلیم ہی مقصود بالذات تھی یا یہ کسی اور عظیم تر مقصد کی تیاری تھی؟ قرآنِ حکیم میں رسول اللہ ﷺ کی تشریف آوری کی غرض و غایت یہ بتائی گئی ہے کہ:

هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ (الفتح: ۲۸)

یعنی: "اللہ نے آپ کو سامانِ ہدایت اور دینِ حق دے کر اس غرض سے مبعوث کیا ہے کہ آپ اس طریقِ زندگی یعنی اسلام کو تمام دیگر طریق ہائے زندگی پر غالب کر دیں"۔

اس کا صاف اور واضح مطلب یہ ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کے فرائض میں صرف مسلمانوں کی تعلیم و تربیت ہی شامل نہ تھی بلکہ یہ سارا اہتمام صرف اس لیے تھا کہ ایک ایسی جماعت تیار ہو جائے جو رسول اللہ ﷺ کے بعد آپ کے مقاصد کو بروئے کار لائے اور اسلام کی تعلیم جو آپ ﷺ کی وساطت سے دنیا والوں کے سامنے پیش کی گئی ہے اس پر عمل کرنے اور اسے دوسرے انسانوں تک پہنچانے والے لوگ دنیا میں ہمیشہ موجود رہیں۔ کیوں کہ جب پیغمبروں کے آنے کا سلسلہ منقطع کر دیا گیا تو ضروری تھا کہ اس کا کوئی متبادل انتظام کر دیا

Marfat.com

جائے۔ چناں چہ مسلمانوں سے کہا گیا ہے: كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ (آل عمران: ۱۱۰)

یعنی، "تم دنیا کی بہترین امّت ہو جسے انسانوں کی ہدایت اور رہبری کے لیے مامور کیا گیا ہے۔"

اس سے ظاہر ہے کہ مسلمانوں سے اسلام کے تقاضے یہ ہیں کہ وہ آں حضرتؐ کی تعلیم پر اس طرح عمل کریں کہ وہ اپنے قول و فعل میں انسانیت کے لیے نمونہ ثابت ہوں اور لوگوں کی رہبری اور ہدایت کا فرض ادا کریں۔

یعنی مسلمانوں سے اسلام کے تقاضے دو گونہ ہوئے۔ خود اسلامی شریعت پر عمل کرنا اور دوسروں کو اسلامی تعلیمات سے آگاہ کرنا۔ اسلامی تعلیمات سے آگاہ کرنے اور انھیں تمام طریق ہائے حیات پر غالب بنانے کے لیے طریقہ اور اصول یہ بتایا گیا کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو ہر مسلمان کے بنیادی فرائض میں شامل کر دیا گیا، یعنی اسلام مسلمانوں سے صرف یہی نہیں چاہتا کہ سیلاب آئے تو اپنا دروازہ بند کر لیں اور دامن کو تر نہ ہونے دیں، بلکہ اسلام اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ کفر و شرک کے سیلاب میں ڈوبنے والوں کو بچانا بھی مسلمانوں کی ذمّہ داری ہے۔ گوشہ نشین ہو کر راہبوں اور سادھوؤں کی طرح اپنے کو دنیا سے الگ کر لینا اسلام کی تعلیم کے قطعاً منافی ہے۔ اسلام تو یہ چاہتا ہے کہ دنیاوی آلودگیوں اور کفر و شرک کی آندھیوں سے دامنِ عصمت کی حفاظت کی جائے اور کفر و شرک کا سدِ باب کر کے ابنائے جنس کو بچانے کی کوشش کی جائے۔ یہی اصل اسلام اور حقیقی ایمان ہے۔ اسی طرح مسلمانوں کے فرائض میں یہ باتیں شامل ہیں کہ وہ خود کو اسلامی تعلیمات کے سانچے میں ڈھالیں اور عقائد اور عبادات کی پابندی کے ساتھ اپنے معاملات کو بھی درست رکھیں، دنیا میں خیر کی تبلیغ کریں اور شر کا سدِّ باب کریں۔

آپ یقین کیجیے اور اس حقیقت کو تسلیم کر لیجیے کہ یہ بنیادی فرائض اس وقت تک ادا نہیں ہو سکتے جب تک مسلمان اس حقیقت کو نہ سمجھ لیں کہ دنیا میں مجبوروں اور کم زوروں کی طرح زندہ رہنا مسلمان کی شان کے خلاف ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

أَنتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ (آلِ عمران: ۱۳۹)

یعنی، "اگر تم ایمان کی شرائط کی تکمیل کرو گے تو دنیا میں سربلند رہو گے۔"

اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ سچا ہے اور جب تک مسلمان مومن بن کر اقتدار اپنے ہاتھ میں نہ لیں گے اس وقت تک امر و نہی کے فرائض بھی ادا نہیں کر سکتے، پاکستان اور عالمِ اسلام کے مسلمان جب تک اپنی زندگیوں میں اسلامی انقلاب برپا نہیں کریں گے سربلند اور سرفراز نہیں ہو سکتے۔ اس حقیقت کے پیشِ نظر سب سے بڑی ذمّہ داری پاکستانی مسلمانوں پر عائد ہوتی ہے۔ برصغیر کے لاکھوں مسلمانوں نے اپنی عزّت و آبرو، اپنی جان، اپنا مال، اور غرض اپنا سب کچھ پاکستان کے نام پر قربان کر دیا۔ یہ سب

Marfat.com

انھوں نے اسلام کی خاطر کیا اور اسلام کی تعلیمات کو نافذ کرنے کے لیے انھوں نے مسلمانوں کے لیے ایک علاحدہ وطن حاصل کرنے کی جدوجہد کی جس کا نام پاکستان ہے۔ اس لیے قدرتی طور پر پاکستانی مسلمانوں پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اپنا وعدہ پورا کریں اور شہدا کی قربانیوں کو ضائع نہ کریں۔ یعنی یہاں پاکستان میں اسلامی شریعت کے نفاذ کی ہر طرح کوشش کریں اور سب سے پہلے اپنا یہ فرض ادا کریں کہ خود اپنی زندگیوں کو اسلام کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کریں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ دنیا میں جہاں جہاں مسلمانوں کی حکومتیں قائم ہیں وہاں اسلام کے تقاضوں کی تکمیل کی کوشش کی جانی چاہیے۔

اللہ کا شکر ہے کہ ساری دنیا کے مسلمان اب ایک دوسرے سے قریب تر ہوتے جاتے ہیں اور واعتصموا بحبل اللہ جمیعا و لا تفرقوا کا مفہوم اب ان کی سمجھ میں آگیا ہے، اور وہ اب یہ بھی محسوس کرنے لگے ہیں کہ دنیا کی کوئی طاقت بھی قابلِ اعتماد نہیں ہے اور نہ ان کی دوست ہے۔ ان کا اعتماد صرف اللہ پر ہونا چاہیے۔ اللہ پر ایمان، اپنی صفوں میں ناقابلِ شکست اتحاد کی تشکیل اور دنیاوی سربلندی کے لیے وسائل پر قابو پانا، یہی بنیادی ضرورتیں ہیں۔ اگر مسلمان ایک ہو جائیں اور سائنس اور ٹکنالوجی کی جانب متوجہ ہوں تو کم سے کم ممکن وقت میں وہ ایک اہم اور موثر طاقت کی حیثیت سے عالمی نقشہ پر ابھر سکتے ہیں۔ اس وقت وہ اسلام کا پیغام زیادہ کامیابی کے ساتھ غیر مسلموں تک پہنچا سکیں گے اور ان کی آواز میں وزن اور اثر ہوگا۔ اس لیے کہ اسلامی اخلاق و کردار کے ساتھ اگر طاقت بھی ہو تو پھر کوئی طاغوتی نظام ان کے سامنے ٹک نہیں سکتا۔ حق آئے گا اور پوری طاقت سے آئے گا اور باطل مٹ کر رہے گا اس لیے کہ دنیوی امن و امان کی خاطر اسے مٹ جانا ہی ہے۔

قرآن مسلمانوں سے خطاب کرتا ہے اور ان کو راہ دکھاتا ہے کہ زمین اور آسمانوں میں جو کچھ ہے، اس کی تلاش کرو اور جدوجہد کرو اور تحقیق کا عمل جاری رکھو۔ جب تک مسلمان قرآن کو اپنا رہنما بنائے رہے تحقیق و تلاش اور ترقی و تعمیر ان کا طرۂ امتیاز رہا ہے اور انھوں نے دنیائے علوم و فنون کو وہ کچھ دیا کہ جس پر آج کا قصرِ علم و حکمت تعمیر ہوا اور جس پر تسخیر قمر منتج ہوئی ہے۔ مگر آج کا مسلمان قرآن سے دور ہے اور اسی لیے وہ علم و حکمت کے میدانوں میں پیچھے رہ گیا ہے۔ اس کی اسی غفلت کی وجہ سے سوپر پاورز عالم وجود میں آئی ہیں، حالانکہ خود مسلمان کو اس کرۂ ارض پر سوپر پاور ہونا چاہیے۔ قرآنِ حکیم نے مسلمان کا یہی مقام متعین کیا ہے۔

اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ ہمیں توفیق عطا فرمائیں کہ ہم تعلیماتِ قرآن پر عمل کریں اور دنیا میں مقامِ عزت و شرف حاصل کریں۔

Marfat.com

كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۵

(ابراھیم: ۱)

یہ کتاب ہے جس کو ہم نے تمھاری طرف نازل کیا ہے تاکہ تم لوگوں کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لاؤ۔

قرآن کی روشنی

Marfat.com

قرآنِ حکیم کی تکریم

قرآن کریم اللہ تعالیٰ کی وہ آخری اور مکمل کتاب ہے جس کی فضیلت، برکت، تقدس اور عظمت کا ذکر خود اللہ تعالیٰ نے کیا ہے۔ اس مبارک کتاب میں اس کے جو صفاتی نام آئے ہیں ان پر غور کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ خداوند تعالیٰ کی وہ نعمتِ عظمیٰ ہے جس کی ناقدری کا خیال بھی گناہ عظیم ہے۔ اس لیے پروردگار عالم نے جہاں اس کتاب کی فضیلت کا ذکر فرمایا ہے وہیں اس کے ادب و احترام اور اس کے اکرام و تکریم کی بھی پوری پوری تاکید فرمائی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کی تقدیس و حرمت کا اگر شعور نہ ہو تو اس کی برکتوں سے محرومی یقینی ہے۔ ایسے آدمی کو ہدایت نصیب ہو سکتی ہے نہ خدا کا عرفان ہو سکتا ہے، نہ مقام رسالت کا ادراک ہو سکتا ہے، نہ زندگی کے اصول اور قوانین اس کی سمجھ میں آ سکتے ہیں۔ اس لیے خداوند تعالیٰ نے ہمیں اس سرچشمۂ ہدایت سے سیر ہونے کے ساتھ اس کی تکریم کا حکم بھی دیا ہے۔ قرآنی احکام کے ساتھ ساتھ فرمان نبوی بھی ہمارے سامنے ہے، اسوۂ صحابہ بھی موجود ہے جن کی روشنی میں ہم یہ کہنے کا حق رکھتے ہیں کہ اس کی تکریم تقاضائے ایمانی ہے اور جس نے اس کے اکرام و احترام میں کوتاہی کی، اس کے ایمان میں ضعف و خلل ہے۔ چوں کہ یہ ایمان کا تقاضا ہے اور اس کا حکم خدا اور اس کے رسول نے دیا ہے، اس لیے ہمارا یہ فرض ہے کہ اس کے اکرام و احترام میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھیں۔

اس سلسلے میں شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے بڑی اچھی بات کہی ہے کہ اس کا تعلق ظاہر و باطن دونوں سے ہے۔ اس کے باطنی احترام کا تقاضا یہ ہے کہ اس کو مُنَزَّل من اللہ سمجھا جائے اور اس کے متعلق ہر شبہے اور وسوسے سے اپنے دل کو پاک رکھا جائے۔ مُسند احمد کی ایک حدیث ہے کہ "اس شخص کو اس کتاب عظیم سے کوئی فائدہ نہ پہنچے گا جس کے دل میں کسی طرح کا شک ہو۔" اس لیے اس کا باطنی احترام تو یہی ہے کہ اسے حرف بہ حرف، نقطہ بہ نقطہ وحیِ الٰہی سمجھا جائے اور اس نسبت کو ملحوظ رکھا جائے۔ جو اس کو

Marfat.com

رب ذوالجلال سے ہے۔ یعنی جب عظمت و کبریائی اور تقدس اللہ کی ذات میں ہے تو اس کے کلام میں بھی یہی صفات ہیں اور حق یہ ہے کہ جس طرح ذات باری تعالیٰ ساری عظمتوں اور حکمتوں کا سرچشمہ ہے اس کی نازل کی ہوئی یہ کتاب بھی اس نسبت سے اپنے اندر تنزہ، تقدس، حکمت اور عظمت رکھتی ہے۔

اس کی دوسری نسبت یہ ہے کہ یہ کتاب مبارکہ وہ ہے جو اللہ کے آخری پیغمبر حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی، جس کی روشنی میں آپؐ نے نوع انسانی کے لیے ایک ابدی اور عالم گیر نظام حیات عطا فرمایا۔

اس کی تیسری نسبت یہ ہے کہ حضرت جبریلؑ اسے لے کے آئے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک پر اس کا نزول ہوا۔ ان نسبتوں کی وجہ سے یہ کتاب ایسی مکرم و محترم ہے جس کے مجد و شرف کا اعلان خود خداوند تعالیٰ نے ان الفاظ میں فرمایا:

إِنَّهُ لَقُرْآنٌ كَرِيمٌ ۝ فِي كِتَابٍ مَّكْنُونٍ ۝ لَّا يَمَسُّهُ إِلَّا الْمُطَهَّرُونَ ۝ (الواقعہ: ۷۷ تا ۷۹)

ترجمہ: یہ بڑی عزت والا قرآن مجید ہے، لوح محفوظ میں لکھا ہوا ہے اس کو صرف پاک لوگ ہی چھوتے ہیں۔

دوسری آیت:

كَلَّا إِنَّهَا تَذْكِرَةٌ ۝ فَمَن شَاءَ ذَكَرَهُ ۝ فِي صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ ۝ مَّرْفُوعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ ۝ بِأَيْدِي سَفَرَةٍ ۝ كِرَامٍ بَرَرَةٍ ۝ (العبس: ۱۱ تا ۱۶)

ترجمہ: یہ قرآن نصیحت ہے جو کوئی چاہے اس سے نصیحت حاصل کرے، قابل عزت و احترام اوراق میں لکھا ہے جو بلند مقام پر ہیں اور پاک ہیں۔ نہایت نیک اور مکرم ہاتھوں سے اس کی کتابت ہوئی ہے۔

تیسری جگہ ارشاد ہوا:

بَلْ هُوَ قُرْآنٌ مَّجِيدٌ ۝ فِي لَوْحٍ مَّحْفُوظٍ ۝ (البروج: ۲۱، ۲۲)

ترجمہ: یہ قرآن مجید بلند شان والا ہے۔ لوح محفوظ میں لکھا ہوا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں قرآن حکیم کی تکریم کے دو احکام صادر فرمائے ہیں۔ پہلا حکم تو یہ ہے کہ اس کتاب کے تقدس کا تقاضا یہ ہے کہ اسے وہ چھوئے جو پاک ہو، ناپاک انسان اسے ہرگز ہاتھ لگانے کی جرأت نہ کرے۔ فقہا کے نزدیک تو مصحف کا جزدان تک لائق احترام ہے اور بغیر طہارت کے اسے چھونے کی اجازت نہیں ہے۔ یہ دنیا کی اور کتابوں کی طرح نہیں ہے، یہ نور ہدایت ہے۔ اس کے قرب کے لیے طہارت جسمانی شرط اولین ہے۔

Marfat.com

دوسری آیت میں اس کی تکریم کے اس پہلو کی طرف ہمیں متوجہ کیا گیا کہ اس کی رفعت شان کا تقاضا یہ ہے کہ اسے بلند مقامات پر رکھا جائے۔ اس کی طرف پاؤں نہ پھیلائے جائیں اسے پسِ پشت نہ رکھا جائے، اس کے اوپر کوئی چیز نہ رکھی جائے، اس کے اوراق کو پھینکا نہ جائے۔ اخبارات، رسائل یا دیگر کتب کے ان صفحات کو جن پر اس کی آیات لکھی گئی ہوں عام استعمال میں نہ لایا جائے، اس کے اوراق کو جلایا نہ جائے۔ اگر بوسیدہ وخستہ ہو کر منتشر ہونے لگیں تو زمین میں دفن کیے جا سکتے ہیں۔ اس مصحف پاک کو اہانت کے خدشے سے بچانے کے لیے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دشمن کی سرزمین میں اسے ساتھ لے جانے سے منع فرمایا ہے۔

جب اس کی آیات پڑھی جائیں تو حکم خداوندی ہے کہ "اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم" پڑھ لیا جائے اور اس کے بعد "بسم اللہ الرحمن الرحیم" پڑھی جائے۔ حضرت جبریلؑ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی طرح قرآن پاک سناتے تھے اور صحابہ کرامؓ بھی اسی طرح پڑھتے تھے۔

اس کی تکریم کا ایک ظاہری پہلو یہ بھی ہے کہ اس کتاب مقدس کی آواز جہاں سے بھی آئے اور جب بھی کوئی اس کی آیات پڑھے سارے لوگ ساکت وصامت ہو جائیں اور اس کی طرف ہمہ تن متوجہ ہو جائیں۔ جہاں بھی اللہ تعالیٰ کی اس مبارک کتاب کی آیات پڑھی جا رہی ہوں، وہاں شور وشغب کرنا یا غیر سنجیدہ حرکات کا ارتکاب کرنا اس کتاب کی توہین اور رحمت خداوندی سے محرومی کا سبب ہے۔

وَإِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوا لَهُ وَأَنصِتُوا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ (الاعراف: ۲۰۴)

ترجمہ: اور جب قرآن پڑھا جائے تو خاموش ہو جاؤ اور اسے غور سے سنو تاکہ تم پر خدا کی رحمت نازل ہو۔

قرآن شریف کی تعظیم میں یہ بات بھی شامل ہے کہ ہم اسے سمجھیں اور اس پر عمل بھی کریں چنانچہ اس کا باطنی تقاضا یہ ہے کہ اسے صرف محرابوں، طاقوں اور الماریوں کی زینت بنا کر نہ رکھا جائے بلکہ نہایت صحت، خوش الحانی اور ترتیل کے ساتھ اس کی تلاوت کی جائے اور تدبر سے بھی کام لیا جائے۔ مضامین کے لحاظ سے قلب میں پیدا ہونے والی کیفیات اور تاثرات کا بھی اندازہ کیا جائے۔ اگر ذکر عذاب پر خوف طاری نہ ہو، اگر جنت کی بشارت پر بشاشت پیدا نہ ہو، اگر جہاد کے حکم سے حرارتِ ایمانی

Marfat.com

نہ پیدا ہو، اگر عظمت و کبریائی کے ذکر سے دل مائل بہ سجود نہ ہو تو اس کی تکریم کا حق ادا نہیں ہوا۔

کتاب اللہ کی تعظیم کا تقاضا یہ بھی ہے کہ جس نظام حق کے برپا کرنے کا حکم دیا گیا ہے اس کی جد وجہد میں اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ صرف کر دیا جائے۔ اس کی تعظیم صرف تلاوت تک محدود نہ رکھی جائے بلکہ اس کے احکام کو انفرادی اور معاشرتی نیز قومی و ملی زندگی پر منطبق کیا جائے۔ اور ہر موڑ پر اس سے روشنی حاصل کی جائے۔ قرآن کی تعظیم کا ایک اہم تقاضا یہ بھی ہے کہ انسانی ہدایت کے لیے اس کو سب سے بڑے ماخذ کی حیثیت سے تسلیم کرنے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دی جائے۔ جب اس کا فیصلۂ ناطق سامنے آ جائے تو ساری زبانوں کو گنگ ہو جانا چاہیے اور تسلیم و رضا کی پوری شان کے ساتھ سر جھکا دینا چاہیے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہی وہ کتاب ہے جس سے بعض لوگوں کو خداوند تعالیٰ بلند کرتا ہے اور بعض لوگوں کو ذلیل و خوار کرتا ہے۔ اس ارشاد کا مطلب بہت واضح ہے کہ جو لوگ اس کی تعظیم و تکریم اور اس پر عمل کے تقاضوں سے روگردانی کرتے ہیں، خدا انھیں رسوا کر دیتا ہے اور جو اس کی تعظیم کا پورا حق ادا کرتے ہیں، خدا ان کو بلندی عطا فرماتا ہے۔

قرآن حکیم وہ دولتِ دارین ہے جس پر ہمیں فخر بھی کرنا چاہیے اور ظاہری و باطنی تعظیم و تکریم کا حق بھی ادا کرنا چاہیے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ہر امّت کو ایک شرف عطا فرمایا ہے، اِس امّت کے لیے سب سے بڑا شرف اور اِس کے لیے سب سے بڑا سرمایۂ افتخار قرآن شریف ہے۔

Marfat.com

تلاوتِ قرآن کے فضائل

حضرت امام غزالیؒ نے حضرت امام احمد ابن حنبلؒ کے متعلق یہ لکھا ہے کہ انھوں نے خواب میں پروردگارِ عالم سے پوچھا کہ خداوندا! تیری کون سی عبادت تجھ سے سب سے زیادہ قریب کرتی ہے؟ ارشادِ باری تعالیٰ ہوا کہ تلاوتِ قرآن ہی وہ عبادت ہے جس کے ذریعے سے ایک بندے کو میرا سب سے زیادہ تقرب حاصل ہوتا ہے۔ یہ اگرچہ خواب ہے اور اسے سند و حجت نہیں قرار دیا جا سکتا، مگر حدیثِ نبوی کے مفہوم سے یہ بات مکمل مطابقت رکھتی ہے اس لیے اس کی اہمیت کو نظرانداز بھی نہیں کیا جا سکتا۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ تم میں سب سے بہتر وہ لوگ ہیں جو قرآن سیکھتے اور سکھاتے ہیں۔ تعلیم و تعلّم، تلاوت سے کوئی الگ چیز نہیں ہے، بلکہ اسی عمل کا ایک پہلو ہے، اس لیے تلاوت خیر العمل ہے، اور اس کے کرنے والے اخیارِ امت ہیں۔

ہمارے ہاں اہلُ اللہ کی اصطلاح عام ہے، ابن ماجہ کی حدیث ہے کہ آں حضرتؐ نے فرمایا کہ اہل اللہ سے وہ لوگ مراد ہیں جو تلاوتِ قرآن کرتے ہیں۔

مشکوٰۃ کی حدیث ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے دن تین شخص مُشکِ اَسْوَد کے ٹیلوں پر ہوں گے، ان میں ایک وہ شخص بھی ہوگا جو اللہ کی رضا جوئی کے لیے قرآن کی تلاوت کرتا ہے۔

حضرت ابو امامہ باہلیؓ کہتے ہیں کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قرآن کے ہر حرف پر دس نیکیوں کا ثواب ملتا ہے، میں یہ نہیں کہتا کہ "الٓمٓ" ایک حرف ہے، بلکہ الف ایک حرف ہے، لام ایک حرف ہے اور میم ایک حرف ہے۔ یہ بھی حضورؐ کا ارشاد ہے کہ مومن کو چاہیے کہ اپنے نفس کو قرآن کی تلاوت کی طرف مائل کرے، کیوں کہ تلاوتِ کلامِ پاک ہی اللہ اور اس کے رسول سے محبت کا ثبوت ہے، محبوب کی خوبو، عادت اور گفتگو، محبت کرنے والے کے لیے دل پذیر ہوتی ہے۔ قرآن پاک کلامِ الٰہی ہے، اس لیے مومن کے دل میں اس کی گہری محبت ہونی چاہیے۔ گفتارِ محبوب کو بار بار دہرانے والے، محبوب کے التفات اور اس کی توجہ کا مرکز بنتے ہیں۔ اسی ضابطے کے تحت تلاوت کرنے والے کی طرف رحمتِ خداوندی متوجہ ہوتی ہے۔

Marfat.com

حضرت عمرو بن العاص رضؓ فرماتے ہیں کہ قرآن کی ہر آیت جنّت کا ایک درجہ اور گھر کا چراغ ہے،
حضرت ابوہریرہ رضؓ نے فرمایا ہے کہ جس گھر میں قرآن پڑھا جاتا ہے وہاں برکت ہوتی ہے اور جہاں نہیں پڑھا جاتا وہاں تنگی پیدا ہوتی ہے۔

حضرت سفیان ثوری نے فرمایا ہے کہ جب کوئی شخص تلاوت کرتا ہے تو فرشتے اس کی دونوں آنکھوں کے درمیان بوسہ دیتے ہیں۔

بیہقی کی حدیث ہے کہ خالد بن عقبہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا: یا رسول اللہ میرے سامنے قرآن پڑھیے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اِنَّ اللّٰہَ یَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ، کی تلاوت آخر رکوع تک فرمائی، خالد بن عقبہ نے درخواست کی یا رسول اللہ دوبارہ پڑھیے، آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دوبارہ تلاوت فرمائی۔ انھوں نے بے ساختہ کہا: اس میں تو حلاوت ہے، اس کا باطنی حصّہ قطرۂ باراں کی طرح حلاوت رکھتا ہے، اور ظاہری حصہ شیریں پھلوں کی طراوت و تازگی رکھتا ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضؓ کی روایت ہے کہ قیامت کے دن قرآن سے بڑھ کر کوئی شفیع نہیں، تلاوت پروردگارِ عالم کی بارگاہ میں شفاعت کا موجب ہوگی۔ یہ صحیح ہے کہ تلاوت کی بہترین صورت یہ ہے کہ وہ فہم معنیٰ اور تدبّر کے ساتھ ہو، لیکن تلاوت کی فضیلتوں اور برکتوں سے وہ بھی محروم نہ ہوگا جو صرف قرأت کرتا ہے۔ محض آیاتِ الٰہی کی تلاوت بھی ثوابِ عظیم رکھتی ہے۔ کثرتِ تلاوت سے بھی تدبّر کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور معانی کا انکشاف ہونے لگتا ہے۔ دراصل تلاوتِ کلامِ پاک ایک اہم ترین عبادت ہے، اور عبادت کے لیے فہم ضروری نہیں ہے، بلکہ یہ یقین رکھنا کافی ہے کہ وہ اللہ کی بندگی کر رہا ہے، اور وہ اس کے حضور اپنا سر جھکا رہا ہے۔ قرآن کی تلاوت کے فضائل حاصل کرنے کے لیے یہ یقین کافی ہے کہ وہ اللہ سے ہم کلام ہے۔ اور جو کچھ وہ پڑھ رہا ہے، وہ پروردگارِ عالم کے ارشادات ہیں۔

مُلّا علی قاری نے مرقات میں حافظ ابن حجر کے حوالے سے لکھا ہے کہ قرآن مجید کی قرأت اور تلاوت پر ثواب بہر حال حاصل ہے، خواہ کوئی سمجھ کر پڑھے یا بغیر سمجھے پڑھے، کیوں کہ الفاظِ قرآن کی ادائی بھی ایک عبادت ہے، اور اس تلاوت کی فضیلت کے لیے بہت کافی ہے کہ فہم کے بغیر بھی اس کو باعثِ اجر و ثواب بنایا گیا ہے۔

اس سے پہلے حضرتِ امام احمد بن حنبلؒ کے خواب کا ذکر آچکا ہے، عبدالوہاب شعرانی نے لکھا ہے کہ حضرت احمد بن حنبلؒ کی درخواست یہ بھی تھی کہ کیا کوئی بغیر سمجھے پڑھے تو اس کو بھی

Marfat.com

ثواب ملے گا اور اسے بھی تقرب حاصل ہوگا؟ جواباً فرمایا گیا تھا کہ فہم کے بغیر بھی اسے تقرب حاصل ہوگا۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے اپنے رسالہ "چہار باب" میں لکھا ہے کہ "قرآن شریف کی تلاوت، تکبیر، تسبیح، صوم و صدقہ نافلہ، سب سے افضل ہے۔" لہٰذا ہر مسلمان کے لیے لازم ہے کہ ہر روز کچھ قرآن ترتیل و تجوید کے ساتھ پڑھتا رہے، کیوں کہ اس کی فضیلت صحیح حدیثوں میں بکثرت وارد ہے۔ اگر معنیٰ سمجھ سکے اور اس پر مطلع ہو سکے تو بہتر ہے، ورنہ تلاوتِ قرآن کے وقت یہ تصور ذہن میں رکھے کہ یہ اللہ کا کلام ہے، اس میں جن باتوں کا حکم ہے اور جن باتوں سے منع کیا گیا ہے، یا جو واقعات بیان کیے گئے ہیں، وہ سب سچے ہیں اور ان سب پر میرا ایمان ہے۔

ان تصورات کے ساتھ تلاوت سے قلب میں خشوع اور خضوع کی کیفیت پیدا ہو سکتی ہے اس صورت میں یہ تلاوت، فہمِ معنیٰ کے ساتھ تلاوت سے بلند اور بہتر ہو جائے گی۔

پچھلی صدی میں محدثانہ طرز کی سیرت نگاری میں ایک نمایاں مقام رکھنے والے نامور عالم مولانا عبدالرؤف قادری دانا پوری اپنی کتاب اَصَحُّ السِّیَر میں لکھتے ہیں کہ بے علم اگر قرآن کو اللہ کا کلام سمجھ کر پڑھ لیتا ہے تو خشوع و خضوع اس پر غالب ہوتا ہے۔

مقصودِ اصلی یہی ہے۔ اگر بہ نظرِ غور دیکھا جائے تو اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ بسا اوقات معانی کی تحقیق اور مسائل کے استخراج میں ذہن الجھ جاتا ہے، اسی لیے امام ابو حنیفہؒ کے تمام سوانح نگاروں نے یہ لکھا ہے کہ وہ تدبر کے ساتھ کلام پاک الگ پڑھتے تھے اور خشوع و خضوع کے ساتھ تلاوت الگ کیا کرتے تھے۔

اللہ تعالیٰ نے حکم صادر فرمایا:

اُتْلُ مَآ اُوْحِیَ اِلَیْکَ مِنَ الْکِتٰبِ وَ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ۔ (عنکبوت: ۴۵)

یعنی: "جو کتاب آپ پر نازل کی گئی ہے آپ اس کی تلاوت کریں اور نماز قائم کریں۔"

مومنین صالحین کی صفت بیان کی گئی ہے:

یَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ (البقرہ: ۱۲۱)

یعنی: "اہلِ ایمان قرآن کی تلاوت کا حق ادا کر دیتے ہیں۔"

اس کی فضیلت کا اندازہ اس سے بھی کیا جا سکتا ہے کہ سورۂ مُزّمّل میں اللہ تعالیٰ نے اس مقدس کلام کی اہمیت کے پیش نظر رسول اللہؐ کو حکم دیا کہ:

رَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِیْلًا (المزمل: ۴)

Marfat.com

یعنی "قرآن کو ٹھہر ٹھہر کر پڑھا کرو۔"

صحیح حدیث ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ کرام، مثلاً حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ اور دیگر صحابہ کرامؓ سے فرمائش کر کے کلام اللہ سنتے تھے۔

یہ اللہ تعالیٰ کا وہ کلام ہے، جس کی تلاوت بھی فضیلت رکھتی ہے اور جس کا دیکھنا اور چھونا بھی اجر و ثواب رکھتا ہے، پروردگار عالم ہمیں اس کی تلاوت کی توفیق عطا فرمائے۔

عزیزانِ وطن!

پاکستان میں نفاذ شریعت اسلامی کا مقدس عمل جاری ہے، اور نفاذ شریعت اسلامی کے متعدد تقاضے ہیں۔ ان میں ایک تقاضا، اور یقیناً اہم تر تقاضا یہ ہے کہ تعلیم قرآن پر بدرجۂ کمال توجہ کی جائے۔ والدین اپنے بچوں کے لیے تعلیم قرآن کا انتظام کریں۔ مساجد و مدارس میں تعلیم قرآن کے بہترین انتظامات پوری اہمیت کے ساتھ کیے جا رہے ہیں، ان کی اہمیت اور ضرورت کو سمجھا جائے۔

بے شک قرآن اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور اس کا سمجھنا اور اس کے احکامات پر عمل کرنا ہر مسلمان پر لازم ہے۔ قرآن ہی وہ کتاب ہے کہ جس نے اس دنیا میں بہترین انقلابات برپا کیے ہیں اور یہ قرآن ہی ہے کہ جو اس کرۂ ارض کے رہنے والوں کی صحیح رہنمائی کر سکتا ہے۔

Marfat.com

آزادی اور قرآن

اس کرۂ ارض پر مختلف اور متعدد اقوام و ملل آباد ہیں۔ کب سے آباد ہیں یہ کوئی صحیح نہیں جانتا، کب تک آباد و قائم رہیں گی کوئی نہیں کہہ سکتا کہ فیصلۂ غیب کیا ہے۔ ان اقوام و ملل کی بہر حال ایک تاریخ ہے۔ یہ انسانی تاریخ کیا ہے؟ اس سوال کا جواب اگر یہ دیا جائے تو بجا ہوگا اور درست کہ اقوام و ملل نے اپنے ہر دور میں اور پورے تسلسل کے ساتھ اپنی آزادی اور اپنی حریتِ فکر کے لیے جو جدّ و جہد کی ہے ہر انسانی تاریخ اُس کی ایک داستانِ مسلسل ہے۔ انسانی تاریخ کے آپ کسی بھی دور میں چلے جائیے، یہ دور غاروں کا دور ہو یا جھونپڑیوں یا محلات کا۔ کاغذ کا دور ہو یا دھاتوں کا دور ہو یا پتھروں کا دور ہو آپ دیکھیں گے کہ ہر دور میں انسانی تمدن کے انداز بدلے ہیں۔ ثقافت کے نقشے نئے نئے قائم ہوئے ہیں۔ افکار و حوادث کے لیے نئے رنگ قائم ہوئے ہیں۔ خیالات میں انقلابات آئے ہیں، اس کے باوجود تاریخِ انسانی کے ہر دور میں ایک قدرِ مشترک ہر قوم و ملت میں رہی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ تضادات و تباین کے باوجود اور اختلاف و تنوّع کے باوصف انسانی شعور نے جب سے آنکھ کھولی ہے اس نے ہمیشہ اور ہر حال میں اور ہمہ وقت آزادی کی حمد و ستائش کی ہے اور اپنی آزادی کو قائم اور باقی رکھنے کی جُہدِ مسلسل اور سعیِ کامل کی ہے۔ اِسی جُہدِ مسلسل اور سعیِ کامل کا نام تاریخِ انسانی ہے۔

ہندُستان میں جب تحریکِ آزادی نے جنم لیا اور برطانوی استعمار کے خلاف اہلِ وطن جب صف آرا ہوئے تو اُس وقت تحریکِ آزادی کا مفہوم و منتہا اور مقصود یہ تھا کہ برطانوی اِستعمار اور انگریز کی طاقت کو پاش پاش کر دیا جائے اور اُس کی جگہ اپنی حکومت قائم کی جائے۔ اس تحریک میں برِصغیر کی تمام قومیں (امتیاز کے بغیر) شریک تھیں۔ اس موقع پر شاعرِ مشرق، حکیم الامّت علامہ اقبالؒ نے مسلمانوں کی رہ نمائی قرآن کی روشنی میں کی۔ علامہ اقبالؒ نے مغرب کے جمہوری نظام کو اسلام کے خلاف سازش قرار دیا۔ انھوں نے فرمایا کہ مغرب کا جمہوری نظام استبدادِ ملوکیت کی ایک نقاب پوش شکل ہے، اس میں نوعِ انسانی کبھی آزادی سے ہم کنار نہیں ہو سکتی۔ دوسرے یہ کہ یہ مغربی اندازِ فکر اور مغربی نظامِ جمہوریت اسلام کی ضد ہے، اس

Marfat.com

لیے اس میں مسلمان کو وہ آزادی میسّر نہیں آسکتی کہ جو اُسے اسلام عطا کرتا ہے۔ اس مغربی نظامِ جمہوریت نے اور اشتراکیت نے یہ آوازہ بلند کیا کہ اقتدار کا سرچشمہ عوام ہیں، اُنھی کو حقِ حکومت پہنچتا ہے، مگر قرآنِ کریم اِس مفروضے کو باطل قرار دیتا ہے۔ قرآن کے نزدیک کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ دوسرے انسانوں کو اپنا محکوم بنائے۔ اس صورتِ حال میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حقِ حکومت اگر کسی انسان کو حاصل نہیں ہے تو پھر یہ حق کسے حاصل ہے؟

قرآن انسانوں کی تمدّنی زندگی کے لیے نظامِ حکومت ضروری قرار دیتا ہے۔ اُس کا کہنا یہ ہے کہ حکومت کا حق صرف اللہ کو حاصل ہے:

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ (الانعام: ۵۷)

وہ اپنے حقِ حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔

وَلَا يُشْرِكُ فِىْ حُكْمِهٖۤ اَحَدًا (الکہف: ۲۶)

اس اساس پر اور اس بنا پر

اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّاۤ اِيَّاهُ ؕ (یوسف: ۴۰)

اُس نے حکم دیا ہے کہ اُس کے سوا کسی کی محکومیت اختیار نہ کی جائے

ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ (یوسف: ۴۰)

یہی محکم نظامِ حیات ہے، لیکن اکثر لوگ اس بات کو نہیں سمجھتے اور وہ انسانی حکومتوں کی ہیئت بدل کر مطمئن ہو جاتے ہیں کہ ہم نے غلامی کی زنجیریں کاٹ دی ہیں اور آزادی کا سانس لے لیا ہے۔

قرآن واضح الفاظ میں اور ذرّہ برابر ابہام کے بغیر کہتا ہے کہ حکومت اللہ کی کتاب یعنی قرآنِ حکیم کے ذریعے سے قائم ہوگی جس میں کسی انسان کو دخل نہ ہوگا کیوں کہ اللہ اپنے اختیارات کسی کو تفویض نہیں کرتا۔ اس حقیقت کی توضیح و تشریح کے لیے خود زبانِ نبی کریمؐ سے کہلوایا:

اَفَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِىْ حَكَمًا وَّهُوَ الَّذِىْۤ اَنْزَلَ اِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا ؕ (الانعام: ۱۱۴)

یعنی: "کیا تم لوگ چاہتے ہو کہ اللہ کے سوا کسی اور حاکم کی طلب و جستجو کرو، حال آنکہ اُس نے اپنی کتاب نازل کر دی ہے کہ جو مفصّل ہے۔"

برصغیر کے مسلمان تحریکِ آزادی میں شریک ہوئے اور اس جدوجہدِ آزادی میں اس نظریہ اساس کے ساتھ مستعد و متحرک ہوئے کہ وہ پاکستان قائم کریں گے جہاں قرآن کی حکومت ہوگی اور اللہ کا قانون نافذ ہوگا۔ اُن کے پاس جذبہ صادق تھا۔ یہ اُن کا ایمانِ کامل تھا اور اُن کا یقینِ محکم

Marfat.com

کہ دنیا کی ہر بڑی طاقت مسلمانانِ برصغیر کے جوشِ ایمانی کے سامنے زیر ہو گئی اور غیر ملکی استعمار نے ہار مان لی۔

یہ عجیب اور حیرت انگیز حقیقت ہے اور کرشمۂ الٰہی کہ پاکستان ٹھیک اُس دن عالمِ وجود میں آیا اور منصۂ شہود پر جلوہ گر ہُوا کہ ۲۷ رمضان المبارک تھی، یومِ نزولِ قرآن تھا! بے شک یہ اللہ تعالیٰ کا حکم تھا، یہ نظامِ الٰہی تھا کہ پاکستان ایسے دن قائم ہوا کہ جو تمام عالمِ اسلام کے نزدیک مبارک و متبرّک ہے اور جس کی عظمت و تقدیس میں پُورا عالمِ اسلام متفق ہے۔ درحقیقت اللہ کا یہ بڑا اہم فیصلہ تھا، کیوں کہ منشائے الٰہی یہی تھا کہ پاکستان قائم ہو اور اُس میں حکومتِ قرآن قائم ہو۔

۲۷ رمضان یومِ نزولِ قرآن ہے۔ اس یومِ مبارک کے بارے میں قولِ فیصل ہے اور حرفِ آخر کہ اسلام اور عالمِ اسلام کے لیے یہ تاریخ ساز دن ہے، اس دن قرآنِ کریم نازل ہوا اور اس لیے نازل ہوا کہ اس کرۂ ارض کی ہر تاریکی کو روشنی سے منوّر کر دے، اور ہر باطل کو مٹا کر حق کو قائم کر دے، اور اس کرۂ ارض پر اللہ کے قانون کی حکمرانی ہو۔

اس باب میں قرآن کے احکامات واضح ہیں اور بیّن؛ سورۂ مائدہ میں ارشادِ ربانی ہے:

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ فَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ۝ (المائدہ: ۴۴)

یعنی "جو لوگ کتاب اللہ کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے وہی کافر ہیں"۔

اور اس کے ساتھ ہی رسول اللہ سے فرمایا گیا:

وَأَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ (المائدہ: ۴۹)

یعنی "ان میں کتاب اللہ کے مطابق فیصلے کرو"۔

قرآنِ کریم میں اللہ کے سوا ہر طاقت کو طاغوت کہا گیا ہے، اور کفر اور ایمان کے اس فرق کو ان الفاظ میں بیان کر دیا گیا ہے:

فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى لَا انْفِصَامَ لَهَا (البقرہ: ۲۵۶)

یعنی "جو اللہ پر ایمان لایا اور اُس نے طاغوت سے کُفر برتا تو اُس نے ایسا محکم سر رشتہ تھام لیا جو کبھی نہیں ٹوٹ سکتا"۔

اِس ارشادِ باری تعالیٰ کی روشنی میں ہمیں یہ غور کرنا چاہیے کہ وہ لوگ کہ جو دعوا کرتے ہیں کہ

Marfat.com

کتابُ اللہ پر ایمان لائے، لیکن عملاً اُن کا حال یہ ہے کہ وہ چاہتے ہیں کہ

اَنْ یَّتَحَاکَمُوْٓا اِلَی الطَّاغُوْتِ (النسا: ۶۰)

اپنے مسائل و مُعاملات کے فیصلے طاغوت سے کرائیں حال آنکہ انھیں حکم دیا گیا کہ وہ طاغوت سے کُفر برتیں۔

ایسے لوگ صحیح راہ پر نہیں ہیں۔ وہ ایک سانس میں اللہ کے قانون کی بات کرتے ہیں، مگر دوسرے میں اُس کی نفی کرتے ہیں۔ اُن کا قلب و ایمان متزلزل ہے، حال آنکہ واقعہ یہ ہے کہ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ۚ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ (الانعام: ۱۱۵) یعنی "اللہ کے کلمات (قوانینِ الٰہی) صدق و عدل کے ساتھ مکمل ہو گئے۔ یہ قوانین غیر متبدل ہیں"۔

آج ۲۷ رمضان المبارک کو پاکستان قائم ہوا تھا، عالمِ وجود میں آیا تھا۔ اِس کی حیثیت تاریکی میں نور کی ہے۔ ہم نے اللہ سُبحانہٗ و تعالیٰ سے یہ وعدہ کیا تھا کہ ہم پاکستان کو اسلامی مملکت بنائیں گے۔ ہمیں ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہیے کہ کیا ہم نے اپنا وعدہ پورا کیا ہے؟ اگر نہیں تو جاگیے اور بیدار ہو جائیے:

آج ۲۷ رمضان المبارک ہے، یومِ نزولِ قرآن ہے اور یومِ استقلالِ پاکستان ہے۔ ہم کو ایک تاریخ ساز فیصلہ کرنا ہے کہ

- پاکستان میں اقتدارِ اعلا قرآنِ مجید و فرقانِ حمید کو حاصل ہو گا۔
- مملکتِ پاکستان کا فریضہ قرآنی احکام و قوانین کو عملاً نافذ کرنا ہو گا۔
- پاکستان کا ہر فرد احکامِ قرآن کے مطابق زندگیوں کو ڈھالے گا اور پیروی اور اتباعِ سنّتِ رسولؐ کرے گا۔
- اور ایک ایسا قرآنی نظامِ شوریٰ قائم کیا جائے گا کہ جو بازی گریِ سیاست اور مذہبی فرقہ بندیوں سے ماورا ہو گا۔

Marfat.com

حیاتِ دُنیا کا تصوّر قرآن کی روشنی میں

دنیا کا ہر نظام انسان کی دنیوی زندگی کے متعلق اپنا ایک مخصوص تصوّر اور مخصوص معیار رکھتا ہے۔ در حقیقت اس تصور سے انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے مختلف پہلو متعین ہوتے ہیں۔ ہر نظام اپنا ایک مخصوص نظریہ حیات رکھتا ہے اور اس نظریہ کے مطابق وہ اپنے ماننے والوں کے افعال و کردار اور اقوال و افکار کو جانچتا پرکھتا ہے۔

اسلام بھی ہمیں ایک نظریہ حیات عطا کرتا ہے اور اسی کی بنیاد پر ہماری دنیوی اور دینی زندگی کو وہ معیارات بخشتا ہے جن پر ہماری کامیابی یا ناکامی کا انحصار ہے۔

آگے بڑھنے سے پہلے یہاں ایک نکتے کی وضاحت ضروری ہے۔ اسلام میں دوسرے مذاہب کے برعکس دین اور دنیا کی علاحدگی کا تصور نہیں ہے۔ نہ اسلام میں ترکِ دنیا اور رہبانیت کا تصور ہے۔ اسلام اس کا قائل نہیں ہے کہ چند رسمی عبادات کے بعد انسان کو کھلی چھٹی دے دی جائے کہ وہ اپنی دنیوی زندگی میں اپنے معاملات میں، اپنی تجارت میں، اپنی سیاست میں، اپنی تعلیم میں، اپنی صنعت میں جو چاہے کرے۔ جس طرح چاہے اپنے معاملات کو طے کرے۔ نہ اسلام اس کو مانتا ہے کہ انسان کو پوری آزادی ہے کہ وہ ان شعبوں میں بلا روک ٹوک جو رویہ چاہے اختیار کرلے۔ یہ ایک محدود اور ناقص تصور ہے اور قرآن و سنّت کی تعلیمات کے مطابق نہیں ہے۔ قرآن و سنت کے مطابق ایک انسان کی پوری زندگی عبادت ہے بلکہ انسان کی زندگی کا مقصد ہی قرآن حکیم نے عبادت بتایا ہے:

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ ○ (الذاریات: ۵۶)

یعنی: "اور نہیں پیدا کیا ہم نے جن اور انسان کو مگر اس لیے کہ وہ عبادت کریں۔"

اس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ قرآن حکیم نے انسانی زندگی کا ایک مقصد متعیّن کر دیا ہے اور صاف صاف بتا دیا ہے کہ خالقِ حقیقی کا مقصد انسان کو پیدا کرنے سے یہ ہے کہ وہ عبادت کرے۔ یہی وہ مقصد ہے جو قرآنی نقطۂ نظر سے حیاتِ دنیوی کا تصور واضح کرتا ہے۔

Marfat.com

قرآن و سنت کی روشنی میں ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ہر انسان کا ہر کام، ہر فعل عبادت ہو سکتا ہے اور اس کو عبادت ہونا چاہیے اگر وہ کچھ حدود کے اندر رہ کر انجام دیا جائے۔ یہ تصور ہمیں زندگی کے ایک وسیع تر مفہوم سے آشنا کرتا ہے۔ دیگر مذاہب میں عبادت کا تصور اسلام سے قبل یہ تھا کہ کچھ متعین اوقات میں کسی خاص جگہ کسی خاص انداز سے مقررہ رسوم کے ادا کر دینے سے انسان عبادت کے فرض سے سبکدوش ہو جاتا ہے۔ اسلام نے انسان کو پہلی بار یہ بتایا کہ عبادت مسجد ہی میں نہیں ہوتی عبادت پارلیمنٹ میں بھی ہو سکتی ہے، عبادت درس گاہ میں بھی ہو سکتی ہے عبادت دکان میں بھی ہو سکتی ہے۔ شرط یہ ہے کہ انسان اپنے کو عبد سمجھے اور اپنے معبود کی خوشنودی اور رضا کو ہمیشہ اور ہر وقت پیش نظر رکھے۔ معبود حقیقی نے جو حدود انسان کے لیے مقرر کر دی ہیں ان کی پابندی کرتے ہوئے وہ جو کام بھی کرے گا وہ عبادت ہوگا چاہے وہ حصولِ معاش کے لیے ہو یا کسی غریب الوطن کی ہمدردی کے لیے۔

اس تصور کو ذہن میں رکھ کر جو زندگی گزاری جائے گی وہ انتشار و افتراق سے پاک ہوگی، استحصال سے منزّہ ہوگی۔ اس زندگی میں امن و سکون، آرام و راحت ہوگی، خوشی و خوش حالی ہوگی۔

اسلام اس دنیا کو عارضی قیام گاہ بتاتا ہے اور اس کو ایک ابدی زندگی کی تیاری کی جگہ قرار دیتا ہے۔ اس لیے وہ انسان جو اسلام پر ایمان رکھتے ہیں دنیاوی زندگی میں شتر بے مہار نہیں ہو سکتے۔ ان کے ذہن میں ہمیشہ قرآن کا یہ حکم رہتا ہے:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ كُلُوا مِمَّا فِي الْأَرْضِ حَلَالًا طَيِّبًا وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ ۚ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُبِينٌ ۝ إِنَّمَا يَأْمُرُكُمْ بِالسُّوءِ وَالْفَحْشَاءِ وَأَنْ تَقُولُوا عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ۝

(البقرہ: ۱۶۸-۱۶۹)

یعنی: "اے لوگو! جو کچھ زمین میں حلال اور پاک ہے اس میں سے کھاؤ اور شیطان کی پیروی نہ کرو وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔ وہ تو تمہیں بدی اور بے حیائی کا اور خدا کے بارے میں ایسی باتیں کہنے کا حکم دیتا ہے جو تم نہیں جانتے"۔

قرآن حکیم اس طرح واضح طور پر ہماری رہنمائی کرتا ہے کہ ہم زمین سے وہ سب کچھ حاصل کریں اور اس سے فائدے حاصل کریں جس کی ہمیں خدا اور رسولؐ نے اجازت دی ہے۔ اور ان تمام باتوں سے بچیں جن کی ہمیں ممانعت کر دی گئی ہے۔

Marfat.com

کیوں کہ ایک مسلمان کی حیثیت سے ہم اگر حدود اللہ سے تجاوز کریں گے تو شیطانی راہ پر چلیں گے جو بدی کی راہ ہے اور اس کے بعد اہلِ ایمان اور غیر اہلِ ایمان کا امتیاز ختم ہو جائے گا اور ہم تشخص سے محروم ہو جائیں گے جو ایک ملت کی حیثیت سے ہمیں حاصل ہے اور ہمارے اور دوسروں کے درمیان حدِ فاصل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسلام ہمیں اس دنیا، یعنی اس آزمائش گاہ میں، اس طرح زندگی بسر کرنے کی تعلیم دیتا ہے کہ ہمیں ہر وقت یہ احساس رہے کہ ہمارے ہر عمل کا نتیجہ دوسری زندگی میں ظاہر ہوگا۔ اچھے اعمال کی جزا ملے گی اور برے اعمال کی سزا سے ہم نہیں بچ سکیں گے۔ اس لیے اس دنیا میں زندگی گزارتے وقت ہمیں اللہ تعالیٰ کے حقوق کو کسی لمحے فراموش نہیں کرنا چاہیے۔ اسی طرح اللہ کے بندوں کے حقوق بھی نہیں بھولنے چاہئیں۔ حقوق اللہ اور حقوق العباد کی بنیاد پر جس حیاتِ دنیوی کا تصور قائم ہو وہ ایک ایسے پاکیزہ معاشرے کو جنم دینے کا ذریعہ بنے جس میں کمال درجہ اعتدال ہو، امن و چین ہو، دیانت و امانت ہو، علم اور اہلِ علم کی قدردانی ہو، اخلاق و کردار کی اعلا مثالیں ہوں۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس معاشرے میں انسان کو انسان سمجھا جاتا ہو۔ انسان کو حیوان نہ سمجھا جاتا ہو نہ اس کو مشین سمجھا جاتا ہو، معاشرتی مساوات اور سماجی انصاف اس معاشرے کا نمایاں وصف ہو۔ اعتماد و اطمینان کا دور دورہ ہو۔

سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

اِنَّمَا الدُّنْيَا خُلِقَتْ لَكُمْ وَ اِنَّكُمْ خُلِقْتُمْ لِلْآخِرَةِ

یعنی: "دنیا تمھارے لیے پیدا کی گئی ہے اور تم آخرت کے لیے پیدا کیے گئے ہو۔"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کا منشا یہ ہے کہ دنیا میں جو کچھ ہے وہ تمھارے لیے ہے تم اس سے متمتع ہو اور فائدہ اٹھاؤ مگر دنیا کے ہو کر نہ رہ جاؤ۔ بلکہ یہ سمجھ کر دنیا میں رہو کہ اصلی زندگی آخرت کی زندگی ہے اور وہی دائمی زندگی ہے۔ دنیا میں اگر ہم صحیح اعمال اختیار کریں گے اور خدا اور رسولؐ کے احکام کے مطابق چلیں گے تو آخرت کی زندگی میں کامیابی حاصل ہوگی اور اگر اس زندگی میں احکامِ الٰہی کو نظر انداز کرنے کی کوشش کریں گے تو ناکامی سے دوچار ہوں گے۔

آخر میں سرکارؐ کا ایک اور ارشاد سن لیجیے کہ اُس ارشاد میں حضورؐ نے نہایت جامع اور بلیغ انداز میں حیاتِ دنیوی کا مکمل تصوّر پیش کر دیا ہے۔ حضورؐ فرماتے ہیں کہ "دنیا آخرت کی کھیتی ہے۔"

Marfat.com

قرآنِ حکیم سے مسلمانوں کا تعلق

قرآنِ کریم سے مسلمان کا تعلق بالکل ویسا ہی ہے جیسا جسم کا جان سے۔ قرآن نہیں تو اسلام نہیں۔ اگر قرآن کو مسلمان حرزِ جاں نہ بنائے تو وہ اسلام کی تعلیمات سے بے بہرہ اس آدمی کی طرح ہے جو اندھیری رات میں ادھر ادھر بھٹکتا پھرے اور اسے نشانِ راہ اور منزلِ مقصود نظر نہ آئے۔ قرآن نہیں تو مسلمان روحِ اسلام سے محروم ہے۔ قرآن نہیں تو رُشد و ہدایت نہیں قرآنِ حکیم دینی اور دنیاوی تعلیمات کا الٰہی مجموعہ ہے۔ یہ انسانوں کی ہدایت کے لیے نازل کیا گیا تاکہ وہ اسے پڑھیں، اس پر غور کریں اور کائنات کے حقائق کو سمجھیں اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ کی اس طرح اطاعت کریں کہ دنیا میں سربلندی حاصل ہو اور آخرت میں بھی نجات و ثواب کے مستحق ہوں۔ قرآن حکیم سے مسلمان کا تعلق ایسا ہے کہ اس کے بغیر گویا وہ گمراہی کے گڑھے میں پڑا ہوا ہے۔ قرآن مسلمان کی روح ہے، اس کی جان ہے، اس کا ایمان ہے، اس کی فلاح و بہبود کا وسیلہ ہے۔ سربلندی اور خوش حالی کا یقینی ضابطہ ہے۔ دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت اس امت کا مقابلہ نہیں کر سکتی کہ جو قرآن کو پڑھتی اور اس پر عمل کرتی ہے۔ قرآن راہِ راست دکھاتا ہے۔ فقیروں کو بادشاہ بنا دیتا ہے۔ جاہلوں کو عالم و فاضل بنا دیتا ہے۔ انسانوں کو ان کی حقیقت سے آشنا کرتا ہے اور کائنات کے رازہائے سربستہ ان پر منکشف کرتا ہے۔

قرآنِ کریم کی ابتدا ہی میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ذٰلک الکتاب لا ریب فیہ، "بے شک یہ وہی کتاب ہے جس کے من جانب اللہ ہونے میں رتی برابر بھی شک نہیں ہے۔" اور اس قرآنِ حکیم کی خاصیت یہ ہے کہ وہ متقیوں کی ہدایت کرتا ہے: ھدی للمتقین۔ اور پھر یہ بھی بتا دیا کہ قرآنِ حکیم کی نگاہ میں متقی کون لوگ ہیں۔ فرمایا کہ جو لوگ غیب پر ایمان لاتے ہیں نماز قائم کرتے ہیں اور جو نعمتیں اللہ تعالیٰ نے انھیں دی ہیں، ان میں دوسروں کو بھی شریک کرتے ہیں اور رسول اللہؐ پر جو کچھ اللہ کی جانب سے نازل ہوتا ہے، اسے وہ بے چون و چرا تسلیم کرتے ہیں اور سابقہ صحیفوں کے من جانب اللہ ہونے پر ایمان رکھتے ہیں۔ اور ان تمام اوصاف کے علاوہ اس بات پر بھی وہ کامل یقین رکھتے ہیں کہ دنیاوی زندگی ایک عارضی زندگی ہے، اس کے بعد یومِ آخرت آئے گا اور بُرے

Marfat.com

اعمال کے لیے سزا دی جائے گی اور اچھے اعمال کے لیے بھی جزا ہے۔ اس تفصیل کے بعد یہ بات خود بخود واضح ہو جاتی ہے کہ قرآنِ حکیم کے مطالعہ اور اسے حرزِ جاں بنائے بغیر کوئی انسان ہدایت نہیں پا سکتا۔ اور جو مسلمان ہے وہ تو ایسی بات سوچ بھی نہیں سکتا کہ اللہ تعالیٰ کے جو احکام رسول اللہؐ کی وساطت سے بھیجے گئے ہیں، ان سے غفلت برتتے اور پھر اس کا بھی متوقع رہے کہ اسے ہدایت نصیب ہو جائے گی۔ اس قسم کی توقع کی مثال ایسی ہے کہ جیسے کوئی شخص املی کا درخت لگائے اور اس میں آم کے پھلوں کی تمنا کرے۔ جو مسلمان قرآن حکیم کا مطالعہ نہیں کرتے وہ غفلت کا شکار ہیں اور جس قدر جلد وہ اس حقیقت کو سمجھ لیں اسی قدر جلد ان کا ادبار ختم ہو گا اور پھر وہ دنیا کی امامت کے منصب پر سرفراز ہو سکیں گے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کو ضمانت دی ہے اور فرمایا ہے کہ یہی لوگ ہیں کہ جو اللہ کی جانب سے ہدایت یافتہ ہیں، اور یہی لوگ ہیں جو فلاح پانے والے ہیں۔

سرکارِ دو عالمؐ قرآن کی تعلیم و تربیت کا بطور خاص اہتمام فرماتے تھے۔ اس لیے صدرِ اوّل میں مسلمانوں کی اکثریت قرآن کی حافظ تھی اور ہر معاملے میں اس سے رہبری حاصل کرتی تھی۔ چناں چہ یہ مشہور واقعہ ہے کہ رسول اللہؐ کی وفات کے بعد ایک مسلمان حضرت عائشہ صدیقہؓ کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپؐ کے اخلاق کے متعلق دریافت کیا۔ آپ نے فرمایا۔ قرآن پڑھو، رسول اللہؐ کے اخلاق معلوم ہو جائیں گے۔

آخری حج کے موقع پر آں حضرتؐ نے جو خطبہ دیا وہ انسانی تاریخ کا سب سے قدیم اور جامع چارٹر ہے۔ اس خطبہ میں آپؐ نے بطور خاص تاکید فرمائی ہے کہ "میں تم میں ایک چیز چھوڑتا ہوں۔ اگر تم نے اس کو مضبوط پکڑ لیا تو گم راہ نہ ہو گے۔" وہ چیز کیا ہے؟ کتاب اللہ یعنی قرآن حکیم۔

اس ہدایت کی روشنی میں قرآنِ پاک سے مسلمان کا جو تعلق ہونا چاہیے وہ اس قدر واضح ہے کہ اس کے سوا کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ مسلمان اور قرآن لازم و ملزوم ہیں۔

تاریخ گواہ ہے کہ جب تک مسلمان قرآن حکیم کا بطور خاص مطالعہ کرتے اور اس پر عمل کرتے رہے اس وقت تک دنیاوی سربلندی حاصل کرتے رہے۔ اس زمانے کی دو بڑی سلطنتوں سے اس طرح ٹکرا گئے کہ دشمن سامانِ جنگ کے علاوہ تعداد کی کثرت پر بھی نازاں تھے اور تہذیب و تمدّن کے بھی مدعی تھے، لیکن مسلمانوں کے مقابلے میں شکست پر شکست کھاتے رہے۔ مسلمانوں کے پاس اسلحہ کی بھی کمی ہوتی اور وسائل بھی محدود ہوتے، اور فوجیوں کی تعداد

Marfat.com

بھی کم ہوتی، اس کے باوجود جب وہ اپنے مقابلتاً محدود وسائل کے ساتھ دشمنوں کے مقابلے پر آتے تو ان کے پاس صرف قرآن کی تعلیمات تھیں وہ جانتے تھے کہ اللہ نے ہمیں جنگ کی تیاریوں کا حکم تو ضرور دیا ہے، لیکن اس کے باوجود کامیابی کا اصل راز ایمان اور اللہ کی نصرت پر بھروسا ہے۔ اور یہ بھروسا قرآن حکیم کے مطالعہ سے پیدا ہوتا ہے۔

كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةً بِإِذْنِ اللّٰهِ ط (البقرہ: ۲۴۹)

"اللہ نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ کتنی ہی چھوٹی چھوٹی جماعتیں ہیں جو بڑی بڑی جماعتوں پر اللہ کے حکم سے غالب آجاتی ہیں۔"

اسی لیے مسلمانوں کے لیے عظمت کا راز صرف قرآنِ حکیم کے ساتھ وابستگی میں ہے۔ اس کے علاوہ مسلمانوں نے اپنے دورِ عروج میں سائنس اور معقولات میں جو کچھ بھی ترقی کی وہ قرآن حکیم ہی کی ہدایت کا نتیجہ تھی۔ اس لیے کہ قرآن حکیم میں متعدد مقامات پر اللہ تعالیٰ بتاتا ہے کہ کائنات کو انسانوں کے لیے تسخیر کیا گیا ہے، اس لیے ان کا فرض ہے کہ اس کے رازہائے سربستہ کا انکشاف کریں اور ایک جانب کائنات کے ذرے ذرے کو انسان کی فلاح و بہبود کے کام میں لائیں اور دوسری جانب خالقِ کائنات کی تسبیح کریں اور اس کا شکر ادا کریں کہ اس نے کس قدر بے شمار نعمتیں انسان کے لیے پیدا کی ہیں۔

قرآنِ حکیم ایمان کا سرچشمہ اور عمل کا مرکز ہے۔ وہ اپنے ماننے والوں کو بتاتا ہے کہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے نہ رہیں اور صرف آخرت کا نعرہ لگا کر دنیاوی سربلندی کے حصول میں کوتاہی نہ کریں۔ یہ دنیا بھی ان کے لیے ہے اور آخرت بھی۔

پاکستان اسلام کے نام پر عالمِ وجود میں آیا ہے۔ ہم اہلِ اسلام نے قیامِ پاکستان کے لیے قرآن کی رہبری میں بے مثال جدوجہد کی ہے۔ ہم نے قرآن پر ایمانِ کامل کے ساتھ دنیا کی دو بڑی طاقتوں کو سرنگوں کر کے پاکستان بنایا ہے، اور اس وعدے کے ساتھ بنایا ہے کہ ہم پاکستان میں قرآن کی حکومت قائم کریں گے اور قرآن اور شارحِ قرآن ﷺ کے بتائے ہوئے راستے پر چل کر دنیا کے لیے اسلامی تعلیمات کا ایک نمونہ پیش کریں گے۔ مگر ہم نے اپنی پاکستانی زندگی کے ماہ و سال غفلتوں میں گزار دیے اور سراسر اور صریحاً عظیم و کثیر نقصانات اٹھائے ہیں۔ ضرورت ہے کہ ہم اس غفلت سے جلد باہر نکلیں اور پاکستان میں نفاذِ شریعتِ اسلامی کے لیے خود کو کمربستہ کریں۔ اپنا وعدہ پورا کریں اور راہِ اسلام پر چل کر اپنے حالات کو درست کریں۔

Marfat.com

ایک آیت کا پیغام

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَذَرُوا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبَا إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ○ فَإِنْ لَمْ تَفْعَلُوا فَأْذَنُوا بِحَرْبٍ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ ۖ وَإِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوسُ أَمْوَالِكُمْ لَا تَظْلِمُونَ وَلَا تُظْلَمُونَ ○ وَإِنْ كَانَ ذُو عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ إِلَىٰ مَيْسَرَةٍ ۚ وَأَنْ تَصَدَّقُوا خَيْرٌ لَكُمْ ۖ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ○ وَاتَّقُوا يَوْمًا تُرْجَعُونَ فِيهِ إِلَى اللَّهِ ○ قف ثُمَّ تُوَفَّىٰ كُلُّ نَفْسٍ مَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ○ (البقرہ: ۲۷۸ تا ۲۸۱)

یعنی "ایمان والو! اللہ سے ڈرو، اور اگر تم اپنے ایمان کے دعوے میں سچے ہو تو تمھارا جو سود لوگوں کے ذمے ہے، اس سے دست کش ہو جاؤ۔ اگر تم اپنے دعویٔ ایمان کا ثبوت دینے میں ناکام رہے تو اچھی طرح سمجھ لو کہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے تمھارے خلاف اعلانِ جنگ ہے ـــــ اللہ کی طرف سے مہلت ہے کہ تم اب بھی توبہ کر لو اور سود چھوڑ دو تو تمھاری اصل رقم تمھارے لیے جائز ہو گی، اسی طرح نہ تم پر کوئی زیادتی ہوگی نہ تم کسی پر زیادتی کرو گے ـــــ ایک بات اور یاد رکھو کہ اگر تمھارا قرض دار تنگ دست ہو تو اُسے کشادگی تک مہلت دو اور اگر تم اس قرض کو اللہ کی راہ میں صدقہ کر دو تو تمھارے لیے اور بھی اچھا ہے، بشرطے کہ تم سوچو اور غور کرو۔ جس روز تم اللہ کے دربار میں حاضر ہو گے اُس دن کی ذلت اور رُسوائی سے اپنے بچاؤ کا انتظام کر لو۔ وہاں ہر شخص اپنے کیے کا بدلا پائے گا اور کسی پر ظلم نہ ہو گا۔"

اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا سب سے نمایاں وصف یہ ہے کہ ان میں عُمومیت ہوتی ہے، اُس کی نعمتیں سارے جہانوں اور تمام انسانوں کے لیے ہیں۔ دُھوپ، ہوا، پانی اور اس طرح کی ایک نہیں بے شمار نعمتیں ایسی ہیں جن کے لیے کافر و مومن کی قید نہیں۔

قرآن شریف بھی اللہ تعالیٰ کی ایسی نعمتوں میں سے ہے کہ اس میں بندوں کے لیے جو بھی سامانِ رشد و ہدایت ہے، اور اُن کے دلوں کی بیماریوں کے لیے جو بھی سامانِ شفا ہے اُس میں نہ تو زمان و مکان کی تخصیص ہے، نہ نسل و قوم کی تحدید ہے، بلکہ سارے انسانوں اور ساری قوموں کے لیے ایک ابدی نعمت ہے۔

Marfat.com

یہ درست ہے کہ اس کتابِ ہدایت میں بعض مقامات ایسے ضرور ہیں جہاں خالقِ کائنات نے اپنا خطاب کسی فرد یا گروہ کے لیے مختص کر دیا ہے، لیکن خطاب میں تخصیص کا مقصد دراصل اُس بات کی اہمیت کی طرف متوجہ کرنا یا مُخاطب کو اپنی ذمے داری اور اپنے مقام و مرتبے کی تکمیل کی طرف بطورِ خاص مائل کرنا ہے۔ اس طرح کے خطاب میں ایک خاص نکتہ یہ بھی پوشیدہ ہوتا ہے کہ مخاطب اللہ تعالیٰ سے اپنی بندگی اور اُس کے قرب کے جذبے کو اور زیادہ مُستحکم بنائے، وہ اپنے آپ کو اُس کا بندہ سمجھے، اور اس کے احکام کی زیادہ سے زیادہ اطاعت اور مکمل فرماں برداری کے لیے اپنے آپ کو آمادہ کرے اور خطاب میں خصوصیت کی اس نوازش کو محسوس کرے۔

اس آیت میں جو مضمون بیان کیا گیا ہے اگر ان تمام باتوں کو ذہن میں رکھ کر غور کیا جائے تو جو صورتِ حال سامنے آتی ہے وہ ہمارے لیے بڑی سنجیدگی سے غور و فکر کی متقاضی ہے۔ سُود کی حُرمت کا حکم اور اس کے اسباب پر نہایت دل نشیں انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے۔

اِس آیت کے مخاطب بلاشبہ اہلِ ایمان ہی ہیں، مگر یہ تمدّنی، معاشی اور اخلاقی اصول و احکام پر مبنی ہے، اور معاملات کا یہ وہ پہلو ہے کہ جس کی وسعتیں قانون بین الملل کی حیثیت رکھتی ہیں، اور ان احکام کی پابندی سختی کے ساتھ اُس وقت بھی کی جائے گی کہ جب معاملات کسی غیرمُسلم سے ہوں گے۔ مختصر الفاظ میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ خطاب خاص ہے، مگر حکم عام! کیوں کہ اسی حکم میں کسی استثنا کے بعد وہ تمدّنی مصالح پورے ہو ہی نہیں ہوسکتے کہ جو اسلام کو مطلوب ہیں، اور جن کی بنا پر ایک قرآنی نظام یا اسلامی ریاست بلاتخصیص سب کے لیے سایۂ رحمت بن سکتی ہے۔

اسی بنا پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلامی حدودِ ریاست میں سود کو روکنے کے سخت احکام نافذ کیے۔ آپؐ نے نجران کے عیسائیوں سے جو معاہدہ کیا، اس میں صاف طور پر لکھ دیا کہ اگر تم سُودی کاروبار کرو گے تو مُعاہدہ کالعدم ہو جائے گا اور ہم کو تم سے جنگ کرنی پڑے گی۔ بنو مغیرہ کے سُود خور سارے عرب میں مشہور تھے۔ فتحِ مکہ کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کی تمام سودی رقمیں باطل کر دیں۔ خود اپنے چچا حضرتِ عبّاس کے بارے میں فرمایا کہ میں سب سے پہلے اُن کا سُود ساقط کرتا ہوں۔ آپ نے یہاں تک فرمایا ہے کہ سود لینے والے اور دینے والے اور اس دستاویز کے کاتب اور اس پر گواہی دینے والے سب پر اللہ کی لعنت ہے۔

اِس سخت ترین احکام کا مقصد صاف اور واضح ہے کہ سرمایہ دارانہ اخلاق، سرمایہ دارانہ ذہنیت اور سرمایہ دارانہ نظامِ تمدّن کو بیخ و بُن سے اکھیڑ پھینکا جائے، اور امدادِ باہمی کی بنیاد پر صالح

Marfat.com

تمدّن اور صحت بخش معاشی نظام قائم کیا جائے۔

ایک عام مسلمان بھی اچھی طرح جانتا ہے کہ سُود خوری نہ صرف گناہِ عظیم ہے بلکہ ایک گھناؤنا جُرم ہے۔ آج سے چند برس پہلے تک سُود خور کو کبھی عزّت کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔ اسلام اور سُود میں ایسی مُغائرت تھی کہ کوئی کافر بھی یہ یقین کرنے کے لیے آمادہ نہ ہوتا تھا کہ ایک مسلمان کبھی سُود خور ہو سکتا ہے۔ مسلمانوں نے ہمیشہ اجتماعی اور انفرادی دونوں سطحوں پر سُود سے مکمل اجتناب کیا ہے اور اسے بدترین گناہ سمجھا ہے، لیکن شامتِ اعمال ہے کہ اغیار کے تسلّط اور اُن کے ہاتھوں اسلام کے برباد شدہ معاشی نظام کی وجہ سے اوّل اوّل تو سُود کو گناہِ عظیم سمجھنے کے ذہنی رویّے میں تبدیلی ہوئی اور پھر جزوی طور پر یہ گھناؤنا جُرم خود مسلمانوں سے سرزد بھی ہونے لگا۔ پھر ہماری بدقسمتی سے وہ وقت بھی آیا کہ جب سُود کی حُرمت کا تصوّر محض خیالی اور اعتقادی رہ گیا اور عملاً ہم نے اُس معاشی نظام کو قبول کر لیا کہ جس کی بنیاد سُود پر تھی۔

ہمارے غیر ملکی آقاؤں نے ہمیں سُود کی "ناگزیری" اور اس کی "افادیت" ذہن نشین کرنے کے لیے جو استدلال سکھائے، اور جنھیں ہم نے بغیر سوچے رٹ لیا ہے، یاد رکھیے کہ ان کی تان زر اندوزی، مفاد پرستی، خوف اور عدمِ تحفّظ پر ٹوٹتی ہے۔ وہ ہمیں غربت اور ناداری کا خوف دلا کر اس لعنت سے آج بھی چمٹے رہنے کی تاکید کرتے ہیں۔ یاد رکھیے کہ قرآنِ کریم اس کو شیطانی منطق کہتا ہے:

اَلشَّیْطٰنُ یَعِدُکُمُ الْفَقْرَ.... (البقرہ - ۲۶۸)

یعنی "شیطان تمھیں ناداری سے ڈراتا ہے"۔

یہی خود غرضانہ استدلال صَدقات سے روکتا ہے، ایثار و ہمدردی کی راہ میں حائل ہوتا ہے، بلا غرض قرض دینے سے باز رکھتا ہے اور ہمیں عدمِ تحفّظ کا احساس دلا کر ارتکازِ دولت پر مائل کرتا ہے، آخرت اور اس کی عظیم ترین جزا سے غافل بنا کر عیش کوشی کی تلقین کرتا ہے۔ دولت کی حرص پیدا کر کے ہمیں سنگ دل اور اغراض کا بندہ بناتا ہے۔ آپ غور فرمائیں کہ جس گناہ کے ارتکاب پر اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف سے اعلانِ جنگ کر دیا جائے کیا ایسے مجرم کو کسی میدان میں نصرت اور کامرانی نصیب ہو سکتی ہے؟ کیا ممکن ہے کہ اللہ اور رسولؐ کی طرف سے ہمارے خلاف اعلانِ جنگ ہو اور ہمیں امن و سکون نصیب رہے؟ ——

اگر ہم آزادی چاہتے ہیں، اپنی صلاح اور معاشرے کی فلاح چاہتے ہیں، اپنی کامیابی کے آرزومند ہیں تو ہمیں اِس حالت سے چھٹکارا پانا ہوگا، اور اپنی زندگی کے ہر شعبے کو سُود سے قطعی اور مکمل طور پر پاک و صاف کرنا ہوگا۔

Marfat.com

اِس مضمون کو ایک اور جگہ اللہ تعالیٰ نے اِن الفاظ میں واضح فرمایا ہے:

اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا يَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِيْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ
مِنَ الْمَسِّ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْٓا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا ۘ وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَ
حَرَّمَ الرِّبٰوا ؕ فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَ ؕ وَاَمْرُهٗٓ
اِلَى اللّٰهِ ؕ وَمَنْ عَادَ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ (البقرہ-۲۷۵)

یعنی "جو لوگ سُود کھاتے ہیں: ان کا حال اُس شخص جیسا ہوگا جیسے شیطان نے چھوکر باؤلا کردیا ہو۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ یہ کہتے ہیں کہ تجارت بھی سُود جیسی ہے۔ حال آنکہ اللہ نے تجارت کو حلال اور سُود کو حرام قرار دیا ہے۔ اب جسے اللہ کی یہ ہدایت پہنچے اور وہ سود خوری سے باز آجائے تو پہلے جو کچھ ہو چکا اُسے اللہ مُعاف کردے گا اور اُس کا مُعاملہ اللہ کے ہاتھ ہوگا، مگر جو حکم معلوم ہونے کے بعد بھی اپنا یہ عمل جاری رکھے تو ایسے لوگ، جہنمی ہیں جو اس میں ہمیشہ رہیں گے.

Marfat.com

Marfat.com

إِنَّآ أَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ۝

(الفتح : ۸)

ہم نے تم کو شہادت دینے والا، بشارت دینے والا اور خبردار کر دینے والا بنا کر بھیجا ہے۔

رحمتِ عالم صلّی اللہ علیہ وسلّم

Marfat.com

رسالت

یہ دنیا جو ہمیں زندگی گزارنے کے لیے دی گئی ہے اور اس میں وہ تمام وسائل جو زندگی گزارنے کے لیے ضروری ہیں، افراط کے ساتھ مہیا کیے گئے ہیں، اس دنیا کا ذرّہ ذرّہ اور خود ہمارا اپنا وجود، شعور اور تعقل و وجدان ہم سے یہ مطالبہ کرتا ہے کہ ہم اس بات پر غور کریں کہ قدرت نے یہ کارخانہ ہست و بود کیوں پھیلایا ہے، ہمیں کس غرض سے یہاں بھیجا گیا ہے، ہماری ابتدا کیسے اور کس کے ارادے، اختیار اور قدرت سے ہوئی اور ہم جو یہاں ہیں اور یہاں کی سہولتوں سے فائدہ اٹھا رہے ہیں تو ہمیں وجود بخشنے والا اور عدم سے شہود میں لانے والا ہم سے کیا چاہتا ہے۔ یعنی یہ کہ ہمارا مقصدِ وجود کیا ہے۔ یہ عالم، یہ ہنگامۂ ہست و بود جس نے برپا کیا ہے ہمارا اس سے کیا تعلق ہے؟ اس کائنات میں ہم جیسے دوسرے انسان جو ہم سے پہلے تھے، جو ہمارے ساتھ زندگی گزار رہے ہیں اور جو ہمارے بعد آنے والے ہیں ان سے ہمارے تعلق کی نوعیت کیا ہے؟ پھر یہ کہ جیسا کہ ہمارا مشاہدہ ہے کہ یہاں ہر آنے والا ایک خاص مدت گزارنے کے بعد یہاں سے رخصت ہو جاتا ہے تو وہ کہاں جاتا ہے۔ اور خود ہمیں یہاں سے کہاں جانا ہے۔

یہ سب سوالات ہمارے ذہنوں میں ضرور پیدا ہوتے ہیں اور ہر دور اور ہر زمانے میں ہر انسان، خواہ وہ علم و تعلیم، فکر و نظر اور شعور و ادراک کے کسی بھی درجے پر کیوں نہ رہا ہو، ان کے بارے میں سوچتا رہا ہے۔ یوں ان سوالات کا جواب پانا ہماری اور ہم میں سے ہر ایک کی فطرت کا تقاضا ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ ہمیں زندگی بخشنے والے رحیم و کریم اللہ تعالیٰ نے ہماری فطرت کے ہر تقاضے کی تکمیل کا سامان مہیا کر رکھا ہے تو کیا یہ بات ممکن ہے کہ اس نے ہمارے وجود میں دخیل اور ہمارے شعور و وجدان میں پیوست اس تقاضے کی تکمیل کا سامان نہ کیا ہو۔

اس نے یقیناً اس امر کا انتظام کیا ہے اور یہ انتظام اس طرح کیا کہ اس نے ہم ہی میں سے بعض ہستیوں کا انتخاب کر کے انھیں ان سوالات کے جواب سکھائے اور انھیں اس بات کا پابند کیا کہ وہ اپنے اُس علم کے ذریعے سے کہ جو انھیں وحی سے حاصل ہوا، ان امور کے سلسلے میں

Marfat.com

انسانوں کی رہنمائی کریں۔

خالقِ کائنات نے اپنے ان منتخب بندوں کو رسول اور نبی کا نام دیا اور ان کے ذمے یہ خدمت کی کہ وہ اللہ کے دوسرے بندوں کو آگاہ کر دیں کہ ایمان رکھنے والے اس دنیا میں اور اس کے بعد ابدالآباد تک امن و سکون کے ساتھ باعزت زندگی گزار سکیں گے۔ نیز یہ کہ ان کا فرض ہے کہ وہ اپنی زندگی کے اعمال کو اس فکر کے مطابق بنانے کی کوشش کریں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبروں کو اس بات کا بھی پابند بنایا کہ وہ لوگوں کو پوری وضاحت کے ساتھ یہ سمجھا دیں کہ اس دنیا کو اور اس میں آباد انسان کو اس نے ایک خاص مقصد سے پیدا کیا ہے اور اس نے یہ بھی طے کر دیا ہے کہ اس مقصد کی تکمیل کے لیے انھیں یہاں کس طرح زندگی گزارنی ہے اور اس دنیا اور اس میں بسنے والی دوسری مخلوقات کے ساتھ انھیں کیا اور کس قسم کا تعلق رکھنا ہے، یعنی یہ کہ اس کارگہ حیات میں خیر و صلاح اور سعادت و فلاح کے رستے کون سے ہیں، نیز یہ کہ اس روشن شاہ راہ کو چھوڑ کر خود ساختہ طریقوں پر چلنے کا انجام کیا ہوگا۔

اسی بنا پر اللہ نے اپنے 'پیغام بروں' کو بشیر و نذیر کہا ہے، یعنی راہِ مستقیم پر چلنے والوں کو اچھے انجام کی خوش خبری دینے والے اور کج روی اختیار کرنے والوں کو ان کے انجامِ بد سے ڈرانے والے کا نام دیا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں رسالت کی ضرورت بتاتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے:

كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً قف فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ص وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ط وَمَا اخْتَلَفَ فِيْهِ اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ ج (البقرہ: ۲۱۳)

یعنی: "ابتدا میں سب لوگ ایک ہی طریقے پر تھے پھر آگے چل کر جب یہ حالت نہ رہی اور اختلافات رونما ہوئے تب اللہ نے نبی بھیجے جو راست روی پر بشارت دینے والے اور کج روی کے انجام سے ڈرانے والے تھے اور ان کے ساتھ کتاب برحق بھیجی تاکہ لوگوں میں جو اختلافات پیدا ہو گئے ہیں ان کا فیصلہ کریں۔" ان اختلافات کی وجہ (یہ نہ تھی کہ لوگوں کو حق معلوم نہیں تھا بلکہ) یہ تھی کہ لوگ حق سے واقفیت اور آگاہی کے باوجود آپس میں ایک دوسرے پر زیادتی کرنا چاہتے تھے۔"

اس آیتِ کریمہ کا مضمون کسی تشریح اور توضیح کا نہ متلاشی ہے نہ محتاج۔ میں جس بات کی طرف آپ کو متوجہ کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اگر ہم اس آیت مبارکہ کے مفہوم کو اپنے اوپر منطبق کریں تو یہ نتیجہ نکالنا مشکل نہیں ہے کہ ہمارا حال اس وقت بعینہٖ وہی ہے جو اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے مطابق ان افراد اور اقوام کا تھا جنھوں نے ہم سے پہلے ذاتی مقاصد اور مفادات کی تکمیل کے لیے

Marfat.com

ربانی ہدایات سے واقف ہونے اور ان پر ایمان رکھنے کے باوجود انھیں پس پشت ڈال دیا تھا اور آپس میں اختلافات پیدا کر لیے تھے۔

سابقہ امتوں کے لیے تو یہ موقع تھا کہ جب وہ اس طرح حق کو بھلا دیتی تھیں تو ان کی اصلاح کے لیے اور انھیں بھولا ہوا سبق یاد دلانے کے لیے دوسرے نبی آتے تھے۔ لیکن خاتم النبیینؐ کی امت کے لیے یہ راستہ تاقیامت بند ہے۔ اسی لیے امت کی ذمے داری زیادہ بڑھ جاتی ہے اور اپنے نبیؐ کی تعلیمات کو یاد رکھنا ہم پر فرض ہو جاتا ہے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے جس خرابی کی طرف ہمیں متوجہ کیا ہے وہ ہے ذاتی اور گروہی مقاصد کی بنا پر اختلاف۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان تمام خرابیوں اور بیماریوں کی جڑ، جن میں ہم مبتلا ہیں، یہی اختلاف باہمی ہے۔ غور کیجیے کہ جو امت تمام انسانوں کے اختلافات مٹانے پر مامور کی گئی تھی آج خود اختلاف و انتشار کا شکار ہے۔ اور اس بدنہاد اختلاف کا اثر ہے کہ آج ہم اپنے ذاتی اور گروہی مفادات کو امت کے مفادات پر ترجیح دینے لگے ہیں اور ساری دنیا میں حق سے اس بغاوت کے نتائج بھگت رہے ہیں۔

ہمارا عقیدۂ رسالت ہم سے مطالبہ کرتا ہے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات اور آپؐ کی ان ہدایات پر، جن پر ہم ایمان کے مدعی ہیں، دل و جان سے عمل کرنے پر کمربستہ ہو جائیں۔

آپؐ نے امت کو جو آخری نصیحت فرمائی تھی، اس میں ارشاد فرمایا تھا کہ:

میں تم میں دو چیزیں چھوڑے جاتا ہوں، اگر تم ان پر سختی سے پابند رہے تو تم کبھی گم راہ نہ ہو گے، اور یہ دو چیزیں ہیں اللہ کی کتاب اور میرا طریقہ، یعنی میری سنت۔"

ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کے دعوے دار ہیں اور آپ کا یہ فرمان ہمیں وہ راہ دکھاتا ہے جس کی پیروی کر کے آج ہم گم راہی سے بچ سکتے ہیں اور دین کے ان ہی دونوں ستونوں کو اپنا معیار قرار دے کے اپنے اختلافات ختم کر سکتے ہیں۔

Marfat.com

رسالت کے فرائض

خداوند تعالیٰ کا پیام بندوں تک پہنچانے کو رسالت کہتے ہیں، یہ رسالت کسبی نہیں وہبی چیز ہے، خدا ہی جسے چاہے عطا فرماتا ہے۔

اَللّٰہُ اَعْلَمُ حَیْثُ یَجْعَلُ رِسَالَتَہٗ (الانعام ۶:۱۲۴)

یعنی: اللہ تعالیٰ انسانوں میں اس خدمت کے لیے جس کو چنتا ہے، وہ برگزیدہ ہوتے ہیں۔

اس لیے کہ رسالت کوئی معمولی مرتبہ نہیں بلکہ نہایت مہتم بالشان مقام ہے اور یہ قانون فطرت ہے کہ جس کا مقام و مرتبہ جتنا بلند ہوگا اس کی ذمہ داریاں بھی اتنی ہی وسیع ہوں گی۔ دنیا جانتی ہے کہ سرورِ کائنات علیہ الصلوٰۃ والتحیات کو تمام انبیاے کرام پر فضیلت ہے۔ آپ کی رسالت ابدی اور عالمگیر ہے۔ آپ پر نازل ہونے والی کتاب وہ آخری کتاب ہے جس کے بعد کوئی کتاب نہیں نازل ہوگی۔ آپ کا لایا ہوا دین ایسا جامع، ایسا مکمل اور اس قدر ہمہ گیر ہے کہ اس کے بعد کسی دین و شریعت کی کوئی ضرورت نہیں۔ نبوت و رسالت، دین و شریعت، کتاب و وحی سب کی تکمیل فرما کر ہمیشہ کے لیے ان کا دروازہ بند کر دیا گیا۔ آپ سارے عالم کے لیے نبی ہیں، افضل المرسلین اور خاتم الانبیا ہیں۔ آپ کا یہ عظیم الشان منصب خود اس بات کی شہادت دے رہا ہے کہ آپ کے فرائض کا دائرہ بھی اتنا ہی وسیع ہوگا اور یقیناً یہ آپ ہی کا مرتبۂ کمال ہے کہ آپ نے اتنے اہم اور ایسے عالمگیر فرائض ایسی تکمیل اور اس حسنِ اسلوب کے ساتھ انجام دیئے کہ تاریخ عالم اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔ دنیا کے سارے مفکروں اور فلسفیوں پر سکتہ طاری ہے، زمین و آسمان محوِ تحیر ہیں، سچ ہے:

وَاللّٰہُ یَخْتَصُّ بِرَحْمَتِہٖ مَنْ یَّشَآءُ (البقرہ: ۱۰۵)

یعنی: ”اور اللہ جسے چاہتا ہے اپنی رحمت کے لیے خاص کر لیتا ہے۔“

اس خاصۂ خاصانِ رُسل کے فرائض پر خود قرآنِ کریم نے روشنی ڈالی ہے۔ یہاں مثالاً چند بنیادی فرائض کا ذکر کیا جاتا ہے جن سے آپ کو ان کی عظمت و اہمیت کا اندازہ ہوگا۔ کتاب اللہ میں چار مقامات پر صراحت کے ساتھ ان کا تذکرہ ہے۔ پہلے مقام کی مظہر تو خانہ کعبہ کی بنیادیں اٹھانے کے وقت کی وہ دعا ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کی تھی۔

Marfat.com

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ

(البقرہ: ۱۲۹)

یعنی: "پروردگار! ان لوگوں میں خود انھی کے اندر سے ایک رسول مبعوث فرما جو انھیں تیری آیات پڑھ کر سنائے اور ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دے اور ان کا تزکیہ کرے۔"

دوسری آیت ہے:

كَمَا أَرْسَلْنَا فِيكُمْ رَسُولًا مِّنكُمْ يَتْلُوا عَلَيْكُمْ آيَاتِنَا وَيُزَكِّيكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُم مَّا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ ○

(البقرہ: ۱۵۱)

یعنی: "جس طرح ہم نے تمھارے اندر خود تم میں سے ایک رسول بھیجا جو تم کو ہماری آیات پڑھ کر سناتا ہے اور تمھارا تزکیہ کرتا ہے اور تم کو کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور تمھیں وہ باتیں سکھاتا جو تم نہیں جانتے تھے۔"

تیسری آیت ہے:

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْ أَنفُسِهِمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ج

(آل عمران: ۱۶۴)

یعنی: "اللہ نے ایمان والوں پر احسان فرمایا جب کہ ان کے اندر خود انھی میں سے ایک رسول مبعوث فرمایا جو انھیں اس کی آیات پڑھ کر سناتا ہے اور ان کا تزکیہ کرتا ہے اور انھیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔"

چوتھی آیت سورۂ جمعہ کی ہے اور اس میں بھی انھی اوصاف کا ذکر فرمایا گیا ہے۔ ان آیات پر غور و فکر سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو صرف آیاتِ قرآنی سنا دینے کے لیے نہیں بھیجا تھا بلکہ آپؐ کی بعثت کے تین مقاصد اور بھی تھے۔ ایک یہ کہ آپ لوگوں کو تعلیم دیں، دوسرے یہ کہ اس کتاب کے منشا کے مطابق کام کرنے کی حکمت سکھائیں اور تیسرے یہ کہ آپ افراد اور ان کی ہیئتِ اجتماعی کا تزکیہ کریں۔ اجتماعی مفاسد کو مٹا کر صلاح و فلاح کی فضا پیدا کریں۔ اگر کتاب و حکمت کی تعلیم صرف آیات کے سنا دینے تک محدود ہوتی تو تزکیہ کا علاحدہ ذکر بے معنیٰ ہوتا۔

حقیقت یہ ہے کہ افراد اور معاشرے کی تربیت کے لیے آپؐ جو تدابیر فرماتے وہ الفاظِ قرآنی کو پڑھ کر سنا دینے سے زائد ایک چیز تھی۔ تعلیم کے ساتھ تربیت کے جو فرائض آپ ادا فرماتے تھے ان پر آپؐ مامور تھے۔ یہ فرائض آپؐ نے اپنے ذمے از خود واجب نہیں کر لیے تھے۔ قرآن اور رسالت پر ایمان رکھنے والا اچھی طرح جانتا ہے کہ یہ دونوں فرائض رسالت اور نبوت کے اجزا تھے، اسی لیے ان کی بار بار صراحت کی گئی ہے، ان کا باہم ذکر آیا ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم، خلوت میں ہوں یا جلوت میں، عام لوگوں کے درمیان ہوں یا اپنے کاشانۂ مبارک میں، ہر جگہ یہ فرائض انجام دیتے اور یہیں سے یہ حقیقت بھی واضح ہو جاتی

Marfat.com

ہے کہ قرآنِ کریم کے الفاظ سنانے سے زائد جو باتیں آپؐ نے فرمائیں ان کو سند تسلیم نہ کرنا درحقیقت رسالت اور وصفِ رسالت سے انکار ہے۔ آپ کے فرائض میں اس خاص پہلو کی وضاحت اس آیت میں کی گئی ہے کہ آپؐ کتاب اللہ کے شارح بھی ہیں۔

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ ۔۔۔ (النحل: ۴۴)

یعنی: "اے نبیؐ یہ ذکر ہم نے تمہاری طرف اس لیے نازل کیا کہ تم لوگوں کے لیے واضح کر دو اس تعلیم کو کہ جو ان کی طرف اتاری گئی ہے۔"

اس آیت سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائض میں یہ بھی تھا کہ قرآن میں اللہ تعالیٰ جو احکام و ہدایات دے ان کی آپؐ پوری پوری تشریح کر دیں۔ تشریح کا عمل صرف متن اور اس کے الفاظ تک محدود نہیں رہتا۔ الفاظ کی دلالت، ان کی معنویت کی وضاحت اور ان کے اطلاقات کے موقع محل کی صراحت بھی اس ذیل و ضمن میں آتی ہے ورنہ پھر تشریح کہاں ہوگی۔ قرآن نے آپؐ کو مترجم نہیں بلکہ شارح کہا ہے اور تبیین و توضیح کو آپؐ کے فرائض کا حصہ قرار دیا ہے۔ توضیح کا ایک مقصد تو یہ ہے کہ سننے والا اچھی طرح شئے مطلوب کو سمجھ لے اور دوسرا مقصد یہ ہے کہ اگر مسئلہ اپنے اندر عملی پہلو رکھتا ہو تو آپ عملی نمونہ و مثال بن کر توضیح فرمائیں۔ یہی عملی مظاہرہ انسانوں کے لیے آیاتِ ربانی کے منشا سے صحیح طور پر واقف ہونے کی عزت بخشے گا۔

اس آیت پر مزید غور و فکر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نزولِ کتاب کا مقصد ہی یہ ہے کہ رسولِ کریمؐ اپنے قول و عمل سے اس کی شرح و توضیح فرما دیں، کیوں کہ کتاب کا مطلب اور مدعا پوچھنے والوں کے لیے یہ انداز کبھی مفید نہیں ثابت ہو سکتا کہ صرف اس کے الفاظ دہرا دیئے جائیں۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے نبی اکرمؐ کو تشریح کتاب کا منصب بھی عطا فرمایا۔ یہ آپؐ کا فرض بھی تھا اور آپ کا منصب بھی، اور جو شخص اس منصب کو رسالت سے جدا ایک شخصی اور ذاتی چیز تصور کرتا ہے اس کا ذہن رسالت کے حقیقی تصور سے محروم ہے۔

ابھی ابھی یہ بات کہی گئی ہے کہ آیاتِ کتاب کی تشریح و توضیح آپؐ نے از خود اپنے ذمے نہیں لی تھی بلکہ قرآن نے آپؐ کا یہ فرض قرار دیا تھا۔ اس ثبوت کے لیے اس آیت کی طرف بھی توجہ مبذول کرانی ضروری ہے:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ ۔۔۔ (الاحزاب: ۲۱)

ترجمہ: "تم لوگوں کے لیے اللہ کے رسول میں ایک بہترین نمونہ ہے ہر اس شخص کے لیے جو اللہ اور یومِ آخرت کا امیدوار ہو۔"

یعنی قرآن کی اتباع کرو۔ کتاب اللہ کی تشریح کے ساتھ آپؐ پر فریضۂ تشریع بھی ہے اور اس کے دائرے کی وسعت کی طرف قرآنِ مجید کی یہ آیت اشارہ کر رہی ہے:

يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ

Marfat.com

عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلٰلَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ ط (الاعراف: ۱۵۷)

یعنی: "وہ ان کو معروف کا حکم دیتے ہیں اور منکر سے روکتے ہیں۔ ان کے لیے پاک چیزوں کو حلال کرتے ہیں۔ ناپاک چیزوں کو ان پر حرام کرتے ہیں۔ ان پر سے وہ بوجھ اور بندھن اتار دیتے ہیں جو ان پر چڑھے ہوئے تھے۔"

ایک نہیں متعدد قرآنی آیات سے اس بات کی شہادت ملتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو قاضی بھی مقرر فرمایا ہے اور مقدمات میں فیصلے کا حکم دیا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

إِنَّا أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا أَرٰىكَ اللّٰهُ ط (النسا: ۱۰۵)

یعنی: "(اے نبیؐ) ہم نے آپؐ کی طرف حق کے ساتھ کتاب نازل کی ہے تاکہ آپ لوگوں کے درمیان اللہ کی دکھائی ہوئی روشنی میں فیصلہ کریں۔"

گویا نزولِ کتاب کا مقصد احکامِ الٰہی کے مطابق قضا اور فیصلہ بھی ہے۔

رسالت کے فرائض کا ایک اہم جز تبلیغ بھی ہے جس کا ذکر قرآنِ کریم کی اس آیت میں کیا گیا ہے:

یا ایھا الرسول بلغ ما انزل الیك من ربك ط وان لم تفعل فما بلغت رسالته ط (المائدہ: ۶۷)

یعنی: "اے رسول جو کچھ آپ کے رب کی طرف سے نازل کیا گیا آپ اسے لوگوں تک پہنچا دیں اور اگر آپ نے نہیں پہنچایا تو آپ نے اس کی پیغمبری کا حق ادا نہیں کیا۔"

اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام اور اس کی بھیجی ہوئی ہدایتوں کو بے کم و کاست بندوں تک پہنچا دینا رسول کے فرائض میں تھا۔ اسی رسالت اور پیغمبری کا حق ادا کرنے کے لیے آپ کو گھر بار بھی چھوڑنا پڑا، لیکن یہ سب کچھ پیغمبرانہ شانِ تسلیم و رضا کے ساتھ آپ نے گوارا کیا۔ یہاں تک کہ نزولِ کتاب کا سلسلہ مکمل ہو گیا اور اقصائے عالم میں خدا کا آخری پیغام پہنچ گیا۔ آپ مظلومی سے نصرت و فتح کی منزل تک پہنچے اور آپ نے حجۃ الوداع کے موقعہ پر اتنے بڑے مجمع سے خطاب کرتے ہوئے تین بار دریافت فرمایا:

اَلَاھَلْ بَلَّغْتُ ؟ یعنی: "لوگو! کیا میں نے اللہ کا پیغام پہنچایا؟"

لوگوں نے کہا بے شک آپ نے پہنچا دیا۔

پھر آپ نے فرمایا:

اللھم اشھد خداوندا! تو گواہ رہ!

یہ تھے رسالت کے فرائض جو بے مثال حسن اور کمالِ عظمت کے ساتھ آپ نے انجام دیے۔ آپؐ کی روحِ پاک پر صلوٰۃ فراواں نازل ہو۔

Marfat.com

رسول اللہؐ قرآن کے آئینے میں

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت دو گروہ ایسے موجود تھے جو خود کو اہلِ کتاب کہتے تھے۔ ان کے اس بیان کی تصدیق قرآنِ حکیم نے بھی فرمائی ہے۔ قرآن ان دونوں اہلِ کتاب گروہوں کی بعض خرابیاں وضاحت سے بیان کرتا ہے، جن کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے جہاں بہت سی دوسری بُرائیوں کو اپنے عقائد میں داخل کر رکھا تھا، وہاں ان میں سب سے بڑی خرابی یہ تھی کہ انھوں نے نبوت اور رسالت کے تصور کو بھی مسخ کر دیا تھا۔ اس جگہ یہ بات لائقِ غور ہے کہ انبیا اور رسولوں کے بارے میں ان دونوں گروہوں کے تصورات ایک دوسرے کی ضد واقع ہوئے تھے۔

ان میں سے پہلا گروہ بنی اسرائیل کا ہے۔ قرآنِ حکیم ان کے بارے میں بتاتا ہے کہ ان کا رویہ اپنے انبیا کے ساتھ معاندانہ اور سخت گستاخانہ تھا۔ قرآنِ حکیم میں ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو جہاد کا حکم دیا تو انھوں نے آپ کو یہ جواب دیا کہ:

"موسیٰ، تم اور تمھارا رب ہی لڑے، ہم تو یہاں بیٹھے رہیں گے۔"

فَاذْهَبْ أَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا إِنَّا هٰهُنَا قَاعِدُونَ ۝ (المائدہ: ۲۴)

بنی اسرائیل نے اپنے انبیا کی کھلی نافرمانی کی، ان کے ساتھ گستاخی سے پیش آئے، یہاں تک کہ انبیا کو قتل بھی کیا۔ ان کے مقابلے میں اہلِ کتاب کے دوسرے گروہ کا حال یہ تھا کہ اس نے نبوت و رسالت کے تصوّر کو تصوّرِ الوہیت کے ساتھ خلط ملط کر دیا تھا۔ نبی کو معاذ اللہ، اللہ کا جز سمجھنے لگے تھے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور آپ کی والدۂ محترمہ حضرت مریم علیہا السلام کے بت بنا کر انھیں پوجنے لگے تھے۔

اسلام، جو انسانوں کے عقائد، افکار و اعمال اور تصورات کی اصلاح کا پیغام لے کر آیا تھا، اس نے وضاحت اور قطعیت کے ساتھ نبی کی حیثیت متعین کر دی۔ ایک طرف تو اس بات پر زور دیا کہ اللہ کا رسول انتہائی احترام، تعظیم اور محبت کا حق دار ہے۔ قرآنِ حکیم میں رسول کی اطاعت کی بھی اللہ کی اطاعت کے ساتھ تاکید کی گئی ہے:

Marfat.com

اَطِیۡعُوا اللّٰہَ وَالرَّسُوۡلَ (آل عمران: ۳۲)

یعنی: "تم اطاعت کرو اللہ کی اور اس کے رسول کی۔"

قرآن نے رسولؐ سے ادب و تعظیم کے ساتھ پیش آنے کی تاکید و ہدایت یہاں تک فرمائی ہے کہ:

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَرۡفَعُوۡۤا اَصۡوَاتَکُمۡ فَوۡقَ صَوۡتِ النَّبِیِّ وَلَا تَجۡهَرُوۡا لَهٗ بِالۡقَوۡلِ کَجَهۡرِ بَعۡضِکُمۡ لِبَعۡضٍ اَنۡ تَحۡبَطَ اَعۡمَالُکُمۡ وَاَنۡتُمۡ لَا تَشۡعُرُوۡنَ ۝ (الحجرات: ۲)

یعنی: "اے مومنو! اپنی آواز نبی کی آواز سے اونچی نہ کرو، اور جب ان سے بات کرنی ہو تو اس طرح زور سے نہ بولو جیسے تم آپس میں ایک دوسرے سے بولتے ہو۔ کہیں اکارت نہ ہو جائیں تمھارے کام اور تمھیں خبر بھی نہ ہو۔"

اس ہدایت سے بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ قرآن نے نبی کو کس مقام عظمت و رفعت پر فائز کیا ہے، اس کی تکریم اور عقیدت کو کتنی اہمیت دی ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ رسول کی اطاعت مثل اطاعتِ الٰہی کے ہے، رسول کی محبّت، حبِّ الٰہی کے برابر ہے اور مسلمانوں کے ایمان کا جز ہے۔ اسی کے ساتھ قرآن یہ بھی بتاتا ہے، اور پوری وضاحت اور قطعیت کے ساتھ بتاتا ہے کہ نبی بھی ایک انسان ہے اور اسی طرح کا انسان ہے جس طرح دوسرے انسان ہیں۔ اسلام سے پہلے یہ تصوّر راسخ تھا کہ انسان کبھی اللہ کا خلیفہ اور نائب نہیں ہو سکتا۔ مصلحین، ہادیین اور انبیا کو ایک مافوق الفطرت ہستی سمجھا جاتا تھا۔ عام اندازِ فکر یہ تھا کہ ایک آدمی جو عام آدمیوں کی طرح کا ہو، انھی کی طرح چلتا پھرتا، کھاتا پیتا، سوتا جاگتا ہو، نبی کیسے ہو سکتا ہے۔ اسی بنا پر حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ کی بات ماننے سے بھی فرعون نے انکار کر دیا تھا اور کہا تھا کہ کیا ہم اپنے ہی جیسے دو آدمیوں پر ایمان لے آئیں؛ سورۂ مومنون میں ہے:

اَنُؤۡمِنُ لِبَشَرَیۡنِ مِثۡلِنَا (مومنون: ۴۷)

لیکن قرآن نے ان تصورات کو غلط قرار دیا اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے خود ایک سے زیادہ بار یہ کہلوایا کہ میں بھی تمھاری ہی طرح انسان ہوں:

اِنَّمَاۤ اَنَا بَشَرٌ مِّثۡلُکُمۡ (الکہف: ۱۱۰)

حضورؐ کو اس اعلان کا حکم دے کر قرآن نے یہ بات صاف کر دی ہے کہ رسول اللہؐ بھی ایک انسان ہیں، ایک بشر ہیں، وہ بھی عام انسانوں کی طرح ہاتھ پاؤں رکھتے ہیں، شادی بیاہ کرتے ہیں، ملتے جلتے ہیں، جذبات و احساساتِ انسانی سے مملو ہیں۔ ایک انسان پر جس طرح رنج و غم اور مسرت و راحت وارد ہوتی ہے اسی طرح نبی اکرمؐ پر بھی ان کا اثر ہوتا ہے، اس

Marfat.com

لیے کہ اسلام دینِ فطرت ہے، انسانوں کے لیے ہے، انسانوں کی فلاح کے لیے، دنیا میں عمل کرنے کے لیے، دنیا سُدھارنے کے لیے ہے۔ یہ دین نبیؐ کے ذریعے نازل ہوا ہے اور اس لیے نبی کا انسان ہونا لازمی ہے۔

قرآن نے یہ بات بھی واضح کی ہے کہ نبی اکرمؐ بھی اللہ کے بندے اور اس کے حکم کے تابع ہیں۔ وہ جو کچھ کر سکتے ہیں وہ اللہ کی مرضی سے ہی کر سکتے ہیں۔ بطور خود ان کی کوئی طاقت نہیں۔ ان کو خدائی میں کوئی دخل نہیں، وہ بھی مشیتِ ایزدی کے اتنے ہی پابند ہیں جتنا دوسرا کوئی انسان ہو سکتا ہے۔ وہ کسی کو حکمِ الٰہی کے بغیر نہ نقصان پہنچا سکتے ہیں اور نہ نفع۔ قرآن حکیم میں ارشادِ باری ہے کہ "کہہ دیجیے کہ میں تو اپنی ذات کے لیے بھی نفع یا نقصان کی طاقت نہیں رکھتا، سوائے اس کے کہ جو اللہ چاہے۔"

قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِیْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ (الاعراف: ۱۸۸)

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے جب پوچھا گیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کیسے تھے، تو آپ نے فرمایا کہ کیا تم نے قرآن نہیں پڑھا ہے۔ اس بلیغ جملے میں حضرت ام المومنین رضؓ نے بہت بڑی بات فرما دی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ حضورؐ کی زندگی وہی تھی جو قرآن کے لائے ہوئے دین کے مطابق ہونی چاہیے۔ آپؐ کے اخلاق ایسے ہی تھے جیسے قرآن پر پوری طرح عمل کرنے والے کسی فرد کے ہو سکتے ہیں۔ آپؐ کا اسوۂ حسنہ اور قرآن کا معیارِ عمل ایک ہی چیز ہے۔

قرآنِ حکیم میں آپؐ کی بعض اخلاقی صفات بیان کی گئی ہیں اور بتایا گیا ہے کہ آپ اخلاق کے اعلا درجے پر تھے:

وَاِنَّكَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ (القلم: ۴)

حضورؐ اپنوں کے لیے ہی نہیں غیروں کے لیے بھی، اپنے ماننے والوں ہی کے لیے نہیں جھٹلانے والوں کے لیے بھی سراپا شفقت تھے۔ آپؐ نے اپنے بدترین مخالفوں کے لیے بھی بخشش کی دعا کی تو اللہ تعالیٰ کو یہ فرمانا پڑا کہ تم چاہے ان کے لیے معافی مانگو یا نہ مانگو، اگر تم ستر بار بھی ان کے لیے مغفرت طلب کرو گے تو بھی اللہ ان کو معاف نہیں کرے گا:

اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ؕ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِیْنَ مَرَّةً فَلَنْ یَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ؕ

(التوبہ: ۸۰)

سورۂ توبہ ہی میں ایک جگہ اور فرمایا گیا ہے:

"تمھارے پاس ایک ایسا رسول آیا ہے جو تم ہی میں سے ہے، تم پر جو تکلیف گزرتی ہے

Marfat.com

وہ اس پر بھی بھاری ہوتی ہے، اس کو تمھاری بھلائی کی حرص ہے، وہ مومنوں پر بہت شفیق اور مہربان ہے۔"

لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُم بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ ۝ (التوبہ: ۱۲۸)

اسی طرح سورۃ الکہف، سورۃ انبیا، سورۃ آلِ عمران، سورۃ مزمل، سورۃ احزاب، سورۃ النجم اور دوسری سورتوں میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعدد اوصاف اور خصوصیات کی طرف نہایت بلیغ اور واضح اشارات ملتے ہیں، جن کے مطالعے سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ اللہ پر بھروسا رکھنے والے، مستقل مزاج، عزمِ صمیم کے مالک، نرم خو، اصلاحِ حال کے سچے طالب، گم راہی سے خائف، رحمت کے خواہاں، سچائی کے پرستار، عبادت گزار، مغفرت کے لیے دعاگو، سیدھی راہ کے داعی، عذابِ الٰہی سے پناہ مانگنے والے اور تمام انسانوں کے لیے، تمام زمانوں کے لیے، تمام خطوں کے لیے نمونۂ کامل تھے۔ قرآن کا جتنا مطالعہ کرو گے شارحِ قرآن کا اسوۂ حسنہ روشن ہوتا جائے گا اور قرآن کے آئینے میں سیرتِ نبیؐ کی منور تصویر نمایاں ہوگی۔

خدا کی رحمت ہو نبی اعظم و آخر پر، جس نے ہمیں کتابِ مبین سے نوازا اور حق وصداقت، عظمت وسرفرازی اور فلاح وسعادت کا راستہ دکھایا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم۔

بلغ العلیٰ بکمالہٖ　　کشف الدجیٰ بجمالہٖ
حسنت جمیع خصالہٖ　　صلوا علیہ وآلہٖ

Marfat.com

رسولؐ کی اطاعت

قرآنِ مجید میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ

یعنی: "انبیاے کرام علیہم السلام کی بعثت کا مقصد ہی یہی ہے کہ ان کی اطاعت اور پیروی کی جائے۔"

اگر کوئی شخص رسول کی اطاعت کے بغیر براہِ راست اللہ تعالیٰ سے اپنا تعلق قائم کرنا چاہے تو اسلامی نقطۂ نظر سے وہ راہِ راست پر نہیں ہے۔ اسی طرح حضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ہدایت صرف آپؐ کی پیروی اور اطاعت کا نام ہے۔ اگر کوئی شخص آں حضرتؐ کے علاوہ کوئی دوسرا وسیلہ تلاش کرے یا دوسرے دین کی پیروی کرے تو وہ اللہ کی نگاہ میں مقبول نہیں ہے، اس لیے کہ اللہ نے قرآنِ حکیم میں بار بار اس بات کی تاکید فرمائی ہے کہ اللہ کی اطاعت کرو اور رسول اللہؐ کی اطاعت کرو۔ یعنی اللہ کی اطاعت قابلِ قبول ہو ہی نہیں سکتی اگر اس کے محبوب بندے اور نبی حضرت محمدؐ کی اطاعت نہ کی جائے۔

یہ بات ویسے بھی عقل کے مطابق ہے کہ اسلامی شریعت انسانوں تک رسول اللہؐ کے وسیلہ سے ہی پہنچی ہے۔ اور قرآنِ حکیم اللہ تعالیٰ کا کلام ہے یہ بات بھی آں حضرتؐ نے ہی ہمیں بتائی ہے۔ اگر آں حضرتؐ تشریف نہ لاتے تو ہمیں نہ اللہ کی وحدانیت کا علم ہوتا نہ اس کے احکام کی خبر ہوتی۔ اس کے علاوہ اللہ کے رسولؐ کی حیثیت محض پیغام رساں کی نہ تھی بلکہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم انسانوں کے ہادی اور رہبر تھے، اور آپؐ کے ہر قول اور ہر فعل کا اتّباع درحقیقت اللہ کے حکم کا اتّباع ہے۔ چناں چہ ایک مقام پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ:

وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۚ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ (الحشر: ۷)

یعنی: "رسولؐ جو ہدایات تمھیں دیں قبول کرو، ان پر عمل کرو اور جن باتوں سے منع کریں ان سے رک جاؤ۔"

سورۂ نجم میں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہؐ کے بارے میں فرمایا:

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۝ (النجم: ۳-۴)

یعنی: "وہ اپنی مرضی سے کوئی بات نہیں کہتے بلکہ صرف وہی کہتے ہیں جو اللہ تعالیٰ وحی کرتا ہے۔"

Marfat.com

اس کا مطلب یہ ہے کہ قول رسولؐ درحقیقت اللہ کا فرمان ہے اور رسولؐ کا حکم اللہ کا حکم ہے۔ اس لیے آپؐ کی اطاعت مسلمان پر فرض ہے۔

اسی بات کو ایک مقام پر اللہ تعالیٰ نے نہایت واضح الفاظ میں یوں فرمایا:

وَمَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ (النسا: ۸۰)

یعنی: "جس نے رسولؐ کی اطاعت کی تو اس نے اللہ کی اطاعت کی"

اس کا مطلب یہ ہے کہ رسولؐ کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہے اور رسولؐ کی نافرمانی اللہ کی نافرمانی ہے۔ چناں چہ فرمایا:

وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا ۝ (الاحزاب: ۳۶)

یعنی: "اور جس نے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کی تو وہ یقینی گم راہی کا مرتکب ہوا"

ایک مثال یہ ہے کہ جیسے کسی حکومت کے کارندے کی جو حکومت کی جانب سے متعین ہو نافرمانی یا عدول حکمی خود حکومت سے سرتابی خیال کی جاتی ہے۔ یہ مشابہت اگرچہ ناقص اور نامکمل ہے لیکن اس سے یہ بات سمجھ میں آجاتی ہے کہ اگر کوئی شخص اللہ کے رسولؐ کی نافرمانی کرتا ہے تو وہ اللہ کی نافرمانی کا مجرم ہے۔ اس لیے کہ رسول اللہؐ کی اطاعت اللہ ہی کے حکم سے کی جارہی ہے۔ اس سلسلے میں ہمارے آگے ابلیس کی مثال موجود ہے۔ اسے اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو سجدہ کرنے کا حکم دیا تھا تو اس نے یہ کہہ کر انکار کردیا کہ میں آگ سے پیدا کیا گیا ہوں اور آدم مٹی سے پیدا کیے گئے ہیں اس لیے مجھے آدم پر ترجیح حاصل ہے۔ حال آنکہ بات معمولی تھی۔ سوال یہ نہیں تھا کہ کس کو کس پر فضیلت ہے۔ سوال صرف اللہ کی اطاعت کا تھا۔ اس نے آدم کو سجدہ کرنے سے انکار کر کے اللہ کی نافرمانی کی اور راندۂ درگاہ ہوگیا۔ ٹھیک اسی طرح اللہ تعالیٰ نے خود حکم دیا کہ میرے رسولؐ کی اطاعت کرو اس لیے کہ آپؐ کی اطاعت ہی فی الاصل ہماری اطاعت ہے۔ تو اب وہ شخص یقینی طور پر سنگین گناہ کا مرتکب ہوگا کہ جو رسول اللہؐ کی اطاعت نہ کرے یا اطاعت میں خوش دلی نہ محسوس کرے۔

اللہ کی محبت بھی رسول اللہؐ کی اطاعت کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتی اس لیے کہ اللہ نے رسولؐ کی زبان سے یہ کہلوایا ہے کہ:

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِىْ ۔۔۔ (آل عمران: ۳۱)

یعنی: "اے رسول آپ لوگوں سے کہہ دیں کہ تم اللہ کی محبت کا دم بھرتے ہو تو میرا اتباع کرو"

آں حضرتؐ کا اسوۂ حسنہ ہی انسانوں کے لیے تقلید کا نمونہ ہے۔ جو شخص اپنے اعمال کو رسولؐ کے قول و فعل سے جتنا زیادہ ہم آہنگ کرے گا وہ اللہ کی نگاہ میں اتنا ہی زیادہ محبوب اور پسندیدہ

Marfat.com

ہو گا۔ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اس حقیقت کو پا گئے تھے اس لیے جب بھی رسول اللہ ﷺ انہیں کوئی بات سمجھانے کے لیے سوال کے انداز میں کچھ فرماتے تو وہ نہایت ادب کے ساتھ عرض کرتے کہ اللہ کے رسول ﷺ بہتر جانتے ہیں۔ اس طرح آپ حضور ﷺ کی نصیحت کو بغور سنتے اور ایک ایک حرف کو گرہ میں باندھ کر رکھتے اور اس پر عمل کرنے کی کوشش کرتے۔ اللہ تعالیٰ کو اپنے محبوب بندے کی خاطر اس حد تک منظور تھی کہ ایک مقام پر فرمایا کہ:

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا ۝ (النسا: ۶۵)

یعنی: "اللہ شاہد ہے کہ لوگ اہلِ ایمان کے زمرے میں شامل نہیں کیے جا سکتے جب تک وہ اپنے تمام اختلافی معاملات میں رسول ﷺ کو حَکَم نہ بنائیں اور پھر جب رسول ﷺ کا فیصلہ سامنے آ جائے تو اس پر عمل کرنے میں کوئی تنگی محسوس نہ کریں، اور بے چون و چرا سرِ تسلیم خم کریں۔" یعنی ہر حکم کی اطاعت کریں اور خوش دلی کے ساتھ اطاعت کریں۔

رسولِ اکرم ﷺ کا اسوۂ حسنہ بڑی چیز ہے۔ حدیث اور سیرت و تاریخ کی کتابوں کے ساتھ ساتھ قرآنِ حکیم سے بھی واضح ہوتا ہے کہ اس اسوۂ حسنہ کی زیادہ سے زیادہ پیروی ہی اطاعتِ رسول ﷺ ہے۔ آپ کو جو باتیں پسند تھیں وہ ہمیں بھی پسند ہونی چاہئیں۔ جو چیزیں آپ کو ناپسند تھیں وہ ہمیں بھی ناپسند ہونی چاہئیں۔ آپ ﷺ مسلمانوں کو اخوت کی سختی کے ساتھ تاکید کرتے تھے۔ اس لیے ہمارا فرض ہے کہ ہر مسلمان کو اپنا بھائی سمجھیں۔ آپ یتیموں کے والی، محتاجوں کے داتا، بیواؤں کے سرپرست، مسلمانوں کے رہبر، حتیٰ کہ کافروں اور مشرکوں کے لیے بھی رحمت تھے۔ اس لیے رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کا معیار ہماری نگاہ میں ان اوصاف کو اپنانا ہے۔ اس سرزمین پر مسلمانوں کے ہادیِ برحق صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہو سکتے ہیں دوسرا کوئی نہیں۔

پاکستان اسلام کا قلعہ ہے، مسلمانوں کا گہوارہ ہے۔ اس لیے ہر مسلمان کا فرض ہے کہ پاکستان کی حفاظت اور اس کی فلاح و بہبود کے لیے انتھک کوشش کرے تاکہ مسلمانوں کا یہ محبوب وطن جو اسلام ہی کے نام پر حاصل ہوا ہے، اغیار کی چیرہ دستیوں کا شکار نہ ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ اس کی حفاظت فرمائے اور ہم مسلمانوں کو سیسہ پلائی دیوار کے مانند متحد اور ناقابلِ تسخیر بنائے۔ آمین

میں دستِ دعا دراز کرتا ہوں:

اے اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ توفیق عطا فرما کہ سارا عالمِ اسلام اللہ کی رسّی کو مضبوطی کے ساتھ پکڑ لے اور ان میں کوئی افتراق و انتشار باقی نہ رہے۔ ہم اس ارشادِ ربانی پر لبیک کہیں کہ:

وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا وَّلَا تَفَرَّقُوا

Marfat.com

حضورؐ بہ حیثیت سربراہِ ملّت

سرکارِ دو عالم فخرِ موجودات سرورِ کونین ختم الرسل حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ اور حیاتِ پاک ہر مسلمان کے لیے اسوۂ حسنہ اور نمونۂ عمل ہے۔ ایک مسلمان کی حیثیت سے انفرادی اور اجتماعی زندگی بسر کرنے کے لیے ہمیں ہر قدم پر ہر شعبۂ زندگی میں سرکارؐ کی رہنمائی کی ضرورت ہے۔ حضورؐ دنیا میں آخری پیغمبر کی حیثیت سے تمام علمی و عملی کمالات کے جامع اور انسانِ کامل کا ایک نمونہ بنا کر بھیجے گئے تھے۔ آپؐ نے امت کو عقائد و عبادات ہی کی ہدایت نہیں فرمائی، بلکہ زندگی کے ہر میدان میں وہ حکمت آفرین ہدایات دی ہیں کہ ان پر عمل کر کے دین و دنیا کی نعمتیں حاصل کی جا سکتی ہیں اور اس کے بعد ہمیں رہنمائی کے لیے کسی جانب دیکھنے کی ضرورت نہیں رہتی، بلکہ اگر دنیا اس حکیمانہ نمونۂ فکر و عقل کو اپنا لے تو جس اضطراب اور انتشار میں وہ آج پھنسی ہوئی ہے اس میں مبتلا نہ ہو۔

ہمیں یہ بات بہت اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ آپؐ جس طرح ایک مشفق باپ اور ایک محبّت کرنے والے شوہر ہیں، اسی طرح امّت کے حاکم اور سربراہ ہیں۔ جس طرح آپؐ نے مخلوق کو خالق کا بندہ بنانے میں ایک منفرد مثال قائم فرمائی ہے، اسی طرح خدا کے بندوں کو باہم جوڑنے، ان کے آپس کے معاملات منصفانہ بنیاد پر استوار کرنے اور ایک پاکیزہ معاشرہ قائم کر کے مستحکم نظامِ دنیا کو بخشنے میں جو کردار ادا کیا ہے، تاریخ اس کی مثال پیش نہیں کر سکتی۔

ایک امیر یا ایک سربراہِ ملّت کی حیثیت سے بھی حضورؐ کا اسوۂ حسنہ ہمارے لیے روشنی کا ایک مینار ہے، بلکہ ساری انسانیت کے لیے ایک آئیڈیل ہے۔ حضورؐ نے واضح الفاظ میں بتا دیا ہے کہ حدود کے معاملے میں بڑے اور چھوٹے کا امتیاز نہیں ہونا چاہیے۔ آپؐ نے فرمایا کہ "تم سے پہلی امتیں اس لیے ہلاک ہوئیں کہ ان میں سے جب کوئی عزت والا چوری کرتا تھا تو اسے سزا نہیں دیتے تھے۔ قسم ہے اللہ کی اگر محمدؐ کی بیٹی فاطمہؓ

Marfat.com

بھی چوری کرے تو اس کا ہاتھ کاٹ ڈالوں"۔

غور فرمایا آپ نے کہ حضورؐ نے کس خوبی سے یہ نکتہ بیان فرما دیا کہ جرم اور غلطی ہر حال میں قابل سزا ہیں اور اس معاملے میں کسی امتیاز اور کسی رعایت کی گنجائش نہیں ہے۔ جرم کرنے والا کوئی ہو، کسی طبقے کا فرد ہو، کسی خاندان کا رکن ہو، کیسا ہی بااثر ہو، کیسا ہی دولت مند ہو اگر قانون کی خلاف ورزی کرے گا تو قانون اور انصاف کے مطابق سلوک کیا جائے گا۔ اس طرح حضورؐ نے معاشرے کو انصاف اور عدل اور مساوات کی وہ بنیاد عطا کر دی کہ جو ایک مستحکم اور پُرامن معاشرے کی ضامن ہے۔

تاریخ شاہد ہے اور حال بھی ایسی مثالوں سے خالی نہیں کہ بادشاہ اور مطلق العنان آمر اپنی حکومت و جبروت کا سکہ جمانے اور اپنی ہیبت دلوں میں بٹھانے کے لیے طرح طرح کے ہتھکنڈے استعمال کرتے ہیں کہ ان کے سامنے آ کر اچھے اچھے سرغنے کانپنے لگتے ہیں۔ اپنا رعب جمانے کے لیے یہ بادشاہ اور حکمران اپنے اردگرد وہ اسباب اور وہ ماحول پیدا کرتے ہیں کہ جن سے دیکھنے والا لرزہ براندام ہو جائے، لیکن ہمارے سرکارؐ ان تمام ظاہری لوازم اور اسباب سے بے نیاز تھے۔ سارے عرب کی حکومت آپؐ کے قدموں میں تھی، لیکن پھٹا بوریا آپؐ کا "اسباب راحت تھا"۔ عظیم المرتبت حکمران اور بادشاہ آپؐ کی ملّت کے زیر نگیں تھے، لیکن سرکارؐ کی بے سروسامانی ہی آپؐ کی ہیبت اور عظمت و جلال کا ذریعہ تھی۔ ایک آدمی آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوتا ہے اور آپؐ کے رعب سے لرزہ براندام ہو جاتا ہے۔ آپؐ اس کیفیت سے خوش ہونا تو کجا الٹا اسے دلاسا دیتے ہیں اور اس کے دل سے ہیبت دور کرنے کے لیے جو کچھ فرماتے ہیں وہ انسانی عظمت کا عدیم النظیر چارٹر ہے اور حریت پسندوں اور مساوات کے بڑے بڑے دعوے داروں کے لیے سبق آموز۔ آپؐ فرماتے ہیں، "ڈرو نہیں، میں قریش کی ایک غریب عورت کا بیٹا ہوں جو سوکھا ہوا گوشت کھایا کرتی تھی"۔ آپؐ نے ان چند لفظوں میں وہ معیارِ شرف و مجد بیان کر دیا جو تاریخ انسانی کا کوئی بڑے سے بڑا بادشاہ اور کسی قوم کا بڑے سے بڑا سربراہ نہ کر سکا۔ انسانی عظمت کردار میں پوشیدہ ہے، اخلاق میں مضمر ہے، علم پر منحصر ہے، خدمت میں خفیہ ہے، عہدہ اور دولت عزّ و شرف کا معیار نہیں ہے۔

Marfat.com

ایک سربراہ کے لیے دلنواز سخن ضروری ہے کہ وہ اپنے ساتھیوں سے محبت سے کام لے، ان کو کم تر نہ سمجھے اور ان کی عزت بڑھائے۔ حضورؐ اپنے معمولی سے معمولی ماتحتوں کے ساتھ برابر سے کام کرتے۔ ایک بار حضورؐ اپنے ساتھیوں کے ساتھ سفر پر تشریف لے گئے اور سفر کے دوران میں ساتھیوں کو بکری بھوننے کا حکم دیا۔ ایک صاحب نے کہا یا رسولؐ اللہ میں اس کو ذبح کروں گا۔ دوسرے نے کہا کہ میں اس کا گوشت تیار کروں گا۔ تیسرے صاحب نے اس کو پکانے کے لیے اپنی خدمات پیش کیں۔

سربراہِ امتؐ نے ارشاد فرمایا: "اور جنگل سے لکڑیاں میں لاؤں گا۔"

اصحابِ رسولؐ نے عرض کیا یا رسول اللہ ہم جو حاضر ہیں۔ آپؐ نے فرمایا: "ٹھیک ہے، مگر مجھے یہ پسند نہیں کہ میں امتیاز کے ساتھ الگ بیٹھا رہوں اللہ تعالیٰ اس بات کو پسند نہیں فرماتا ہے کہ کوئی شخص اپنے رفیقوں میں ممتاز بننے کی کوشش کرے۔"

سردارِ ملت کی ایک ضروری خصوصیت ان کی دل سوزی اور ہمدردی بھی ہے۔ حضورؐ اس خلوص میں بھی بے مثال تھے۔ لوگوں کے دکھ درد کا بے حد خیال رکھتے تھے۔ آپؐ نے اللہ کے عذاب سے بچنے کا ایک بہت بڑا ذریعہ لوگوں کی ضرورت کے وقت اُن کے کام آنے کو بتایا ہے۔

مشورہ ایک سربراہِ ملت کے لیے مفید ہی نہیں لازمی ہے۔ حضورؐ نے نہ صرف مشورے کا حکم دیا ہے، بلکہ اس پر عمل بھی فرماتے تھے، خصوصاً اجتماعی معاملات مشورے کے بغیر کبھی طے نہ فرماتے۔

خطیب بغدادی حضرت علی رضی اللہ عنہ سے یہ روایت نقل کرتے ہیں کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ آپ کے بعد کوئی معاملہ ایسا پیش آجائے جس کے متعلق نہ قرآن حکیم میں کچھ اترا ہو اور نہ آپؐ سے کوئی بات سنی گئی ہو تو ہم کیا کریں؟"

آپؐ نے فرمایا میری امت میں سے عبادت گزار اور اطاعت شعار لوگوں کو جمع کرو اور اس معاملے کو مشورے کے لیے سامنے رکھ دو اور کسی ایک شخص کی رائے پر فیصلہ نہ کرو۔"

خود حضورؐ کا عمل بھی یہی تھا کہ "شَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ" (آل عمران۔ ۱۵۹) کی پوری طرح تعمیل فرماتے اور صحابہ کرام کے مشورے سے امورِ ملت و حکومت فیصل فرماتے۔

حضورؐ اس امر کا بھی لحاظ فرماتے تھے کہ جن لوگوں کو مسلمانوں کے معاملات اور انتظام

Marfat.com

کی باگ ڈور سونپی جائے وہ اپنے اخلاق اور اہلیت کے علاوہ عوام النّاس کے اعتماد کے بھی اہل ہوں اور لوگ ان کو پسند کرتے ہوں، دوسرے الفاظ میں عوامی مقبولیت بھی پیش نظر رہتی تھی۔

حضورؐ کا ارشاد ہے: "تمہارے بہترین امام اور قائد وہ ہیں جن کو تم چاہتے ہو اور وہ تم کو چاہتے ہوں۔ تم ان کو دعائیں دیتے ہو اور وہ تم کو دعا دیتے ہوں اور تم میں بدترین رہنما وہ ہیں جن کو تم ناپسند کرتے ہو اور وہ تم کو ناپسند کرتے ہوں اور وہ تم پر لعنت بھیجتے ہوں اور تم ان پر لعنت بھیجتے ہو۔"

غرض مختصراً یہی کہا جا سکتا ہے کہ تدبر، مشاورت، عدل، دل نوازی، دل سوزی، سادگی، خدمت، ہمدردی اور ہر دلعزیزی کے وہ اصول اور پیمانے حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے اپنے اسوۂ حسنہ سے ہمیں عطا کیے ہیں جو سربراہانِ ملّت و حکومت کے لیے رہتی دنیا تک سرچشمۂ ہدایت رہیں گے۔

Marfat.com

خلقِ عظیم

قرآن حکیم میں سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ارشاد فرمایا گیا ہے:

وانك لعلى خلق عظيم ٥ (القلم: ۴)

یعنی: "اور اے نبی بے شک آپ اخلاق کے بلند مرتبے پر فائز ہیں۔"

عظمتِ اخلاق کا یہ تاجِ زریں خصائصِ نبوی میں شمار کیا جاتا ہے، اس لیے کہ از آدم تا ایں دم بارگاہِ رب العالمین سے کسی کو فضل و کمال کی وہ سند نہیں مرحمت فرمائی گئی جو خاتم الانبیاء کو دی گئی۔ تشریف آوری آپ سے پہلے بھی انبیائے کرام علیہم السلام کی ہوتی رہی اور قرآن کریم نے اکثر انبیا کے خاص خاص اوصاف بھی بیان کیے۔ مگر حق یہ ہے کہ ان نفوسِ قدسیہ کے اخلاقِ حسنہ پر کسی مومن کو معمولی سا شبہ بھی نہیں ہو سکتا۔ قرآن کریم نے ہمیں یہ کہنے کی ہدایت کی ہے:

لا نفرق بين احد من رسله (البقرہ: ۲۵۳)

پھر بھی بعض انبیاء کو دوسرے نبیوں پر فضیلت ضرور ہے اور اس کا اعلان اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ میں کیا ہے:

تلك الرسل فضلنا بعضهم على بعض ٥ (البقرہ: ۲۵۳)

ان انبیائے کرام میں افضل سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں جن پر نبوت اور رسالت کا سلسلہ ختم ہوا اور نوعِ بشر کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والا دین مکمل ہوا۔ آپ پر نازل ہونے والی کتاب آخری کتاب، اور آپ کی لائی ہوئی شریعت آخری شریعت اور آپ کی پیش کردہ ہدایت کو مکمل ضابطۂ حیات کہا گیا۔ فضائل و کمالات کی ایسی جامعیت بخشی گئی کہ جو کہیں اور نظر نہیں آتی۔

یہ سارے اوصاف اس بات کے متقاضی تھے کہ جس ذاتِ اقدس پر اللہ تعالیٰ کے ان سارے انعامات کی تکمیل ہوئی اس کی سیرت اور اس کے اخلاق بھی اس مرتبۂ کمال کے ہوں کہ رہتی دنیا تک وہ نمونہ و مثال بن جائے اور اس کا کوئی گوشہ ایسا نہ ہو جس میں کسی عہد اور کسی قرن، کسی نسل اور کسی آبادی، غرض پوری نوعِ انسانی کے لیے روشنی اور ہدایت موجود نہ ہو۔ اگر بندگی ہو تو اس عبدِ کامل کی سی جس کو اللہ تعالیٰ خود اپنا بندہ کہہ کر نوازے۔ اگر صبر ہو تو ایسا کہ اس سے بلند معیار کا تصور بھی ممکن نہ ہو۔ اگر ایثار ہو تو ایسا کہ اخلاقیات کی تاریخ میں اس سے بڑھ کر رفعت و کمال کا مظاہرہ نہ کبھی ہوا ہو

Marfat.com

اور نہ قیامت تک ممکن ہو۔ اگر رافت و رحمت، ہمدردی، دلسوزی، استقامت و استقلال، عزت نفس اور عجز و انکسار، شجاعت اور اولوالعزمی ہو تو ایسی کہ دوست ہی نہیں دشمن کو بھی اعتراف ہو۔ صدق اور راست بازی اس مرتبے کی ہو کہ اس سے اعلا و ارفع مقام پر چشم عالم نے آج تک کسی بشر کو نہ دیکھا ہو۔ اسی کمال کی طرف حدیث نبوی کے یہ الفاظ اشارہ کرتے ہیں کہ:

انما بعثت لِأُتَمِّمَ مکارم الاخلاق

ترجمہ: "میں تو اس لیے مبعوث ہوا ہوں کہ فضائل اخلاق کو مرتبۂ کمال تک پہنچا دوں۔"

دیگر انبیائے کرام علیہم السلام بھی بلاشبہ فضائلِ اخلاق سے آراستہ تھے مگر اخلاق کو درجۂ کمال تک پہنچانے کا شرف اللہ تعالیٰ نے آپ ہی کو بخشا۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر آپ کی تشریف آوری نہ ہوتی تو اخلاق اور اس کے محاسن کا شعور تو ضرور ہوتا مگر اس کے مرتبۂ کمال کا تصور نہ ہوتا۔

اب میں آپ کی توجہ اس چیز کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں کہ قرآن کریم نے کس موقع پر آپ کو رفعت و فضیلت کا یہ تاج عطا فرمایا تھا اور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاقِ حسنہ کو کس امتیاز کی بنا پر خلق عظیم کا مقام حاصل ہوا۔

دراصل تبلیغ اسلام کا وہ دور تھا جب کفر و شرک کی ساری طاقتیں اپنے پورے ساز و سامان کے ساتھ اس راہ میں مزاحم تھیں۔ کفار حشر و نشر کا انکار کر سکتے تھے اور انھوں نے کیا، اللہ کی وحدانیت کا بھی انکار کر سکتے تھے اور انھوں نے یہ بھی کیا، لیکن ایک چیز ایسی تھی جس کے انکار کی وہ کبھی جرأت نہیں کر سکتے تھے، اور وہ تھی آپؐ کی امانت اور صداقت۔ آپؐ کا عدل اور آپؐ کی راست بازی۔ انہیں جب آپؐ کے اخلاق پر انگشت نمائی کا موقع نہ ملا تو انھوں نے اس دعوت حق کے سلسلے میں آپؐ پر الزامِ جنوں عائد کیا۔ یہ الزام ان کافروں کے فکری تضاد کا مظہر تھا، اس الزام کی تردید کرتے ہوئے فرمایا جا رہا ہے کہ:

"بے شک آپ اخلاق کے بلند مرتبے پر فائز ہیں۔"

اس خلقِ عظیم کا اعلان قلم اور اس سے لکھی جانے والی چیز کی قسم کے ساتھ کیا گیا، جس سے یہ بات بخوبی سمجھی جا سکتی ہے کہ جو کچھ آپ پیش کر رہے ہیں، اس کا تعلق علم سے ہے، اور جب علم ہے تو اخلاق بھی ہے، اس لیے کہ حقیقی علم اور اخلاق میں تلازم ہے۔ جہاں علم نہیں وہاں اخلاق نہیں۔ پھر یہ کفار معاندت میں کیوں اتنے اندھے ہو گئے ہیں کہ جو ذاتؐ اخلاق کے بلند ترین مقام پر فائز ہو اور جس کی دعوت علم پر مبنی ہو اس کو مجنون کہتے ہیں، یہ کیونکر ہو سکتا ہے؟ ہاں ایسا کہنے والے دیوانے ہو سکتے ہیں اور اشارہ یہ ہے کہ جلد آپ بھی دیکھ لیں گے اور وہ بھی دیکھ لیں گے کہ دیوانہ کون ہے؟ آپؐ کی سیرت تو دنیا میں مثال بن کر رہے گی، آپؐ کا اخلاق سارے عالم کا فاتح بن کر رہے گا، اور اس سے دنیا کو اخلاق

Marfat.com

صدق، ایفائے عہد، امانت و دیانت، مساوات و عدل، نرمی و محبت اور رحمت کا قابلِ تقلید نمونہ ہمیشہ ملتا رہے گا۔ ہاں ان کا انجام چشمِ عبرت دیکھ لے گی کہ جو الزامِ جنوں عائد کر رہے ہیں۔ اس خلقِ عظیم کے اعلان کا ایک معنی خیز پہلو اور بھی ہے، وہ یہ کہ انسان کو جو چیز دیگر مخلوقات سے ممتاز کرتی ہے وہ اس کا جبلی کردار نہیں، بلکہ اخلاقی کردار ہے۔ اخلاقی کردار ہی اس کی رفعت اور فوقیت کا سبب بنتا ہے۔ جذبات و احساسات کے لحاظ سے حیوان و انسان میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ دراصل اخلاقی کردار ہی کی تشکیل و تعمیر کے لیے انبیائے کرامؑ کی بعثت ہوتی ہے۔ حکمت اور میزان کا نزول بھی اسی غرض سے ہوا ہے۔ اسی لیے صاحبِ خلقِ عظیم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنی بعثت کی غرض و غایت پر اس طرح بھی روشنی ڈالی ہے کہ:

انما بُعِثْتُ معلما یعنی: "میں تو معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں۔"

اس سے پہلے اسی غرض و غایت پر روشنی ڈالتے ہوئے وہ حدیث بھی بیان کی گئی ہے جس میں تکمیلِ اخلاق کا ذکر آیا ہے۔ اگر تعلیم اور تکمیلِ اخلاق کے درمیان ربط و رشتے کی تلاش و جستجو کی جائے تو یہ بات بآسانی معلوم ہو سکتی ہے کہ معلم کا کام محض علم کے مسائل بیان کر دینا نہیں ہے، بلکہ اخلاق کی تشکیل و تعمیر بھی ہے، اور یہ اخلاق تکمیل کے مدارج تک اس وقت پہنچ سکتے ہیں کہ جب معلم اخلاقی اعتبار سے خود بھی کامل و مکمل ہو۔ لہٰذا یہ اعلان ساری دنیا کے لیے ہے کہ جن کو تکمیلِ اخلاق کے لیے بھیجا گیا ہے وہ خود اللہ کے نزدیک بلند ترین مقامِ اخلاق پر فائز ہیں، اور یہ اخلاق علم و عمل اور قول و فعل کی ایسی ہم آہنگی کا نام ہے جہاں کہیں کوئی تضاد نہ ہو۔ فرمائیے کہ عبداللہ بن اُبی اور اس کے ساتھیوں کا پورا گروہ کیوں منافق ٹھہرایا گیا، وہ زبان سے اسلام کا اقرار کرتا تھا، ظاہری اعمال کی بجا آوری میں بھی مستعد تھا، لیکن اس کا کردار وحدتِ فکر و عمل کے بجائے عقائد و اعمال کے تضاد کا شکار تھا۔ لیکن اس کے برعکس آپ خلقِ نبوی کا مطالعہ کریں تو آپ کو معروف میں کامل اور منکر سے یکسر پاک ذاتِ اقدسؐ نظر آئے گی۔ وہاں تضاد کی ادنیٰ مثال بھی نہیں ملے گی۔ آپؐ نے اگر مساوات کا درس دیا تو غلام آقا بن گئے اور آقا ان کے خادم۔ اخوت کا درس دیا تو مدینے میں اجنبی سگے بھائیوں سے بڑھ گئے۔ آپؐ نے دنیا میں خزانے لٹائے مگر دنیا کو اس حال میں چھوڑا کہ آپؐ کے گھر چراغ جلانے کا تیل اور مٹھی بھر غلہ نہ تھا۔

خداوند تعالیٰ نے جس طرح دین کی تکمیل کا اعلان فرما کر ساری دنیا کو متنبہ کر دیا کہ اب کسی نبی کی بعثت اور کتاب کا نزول نہ ہوگا اسی طرح " انك لعلی خلق عظیم " کہہ کر یہ بھی بتا دیا کہ اب اس سے بڑھ کر کمالِ اخلاق کا کوئی اور مرتبہ نہیں ہے۔

اگر تاریخ عالم میں سارے انسانوں کے لیے کسی کے اخلاق کو قابلِ تقلید نمونہ کہہ سکتے ہیں تو وہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا اخلاقِ حسنہ ہے۔

Marfat.com

ختم نبوت

قرآن وحدیث کی رو سے نبوت کا مسئلہ ایمانیات اور اعتقادیات میں اساسی اہمیت رکھتا ہے، بلکہ صاف اور واضح الفاظ میں یہ کہنا چاہیے کہ یہ مسئلہ کفر و اسلام سے تعلق رکھتا ہے۔ اگر کوئی واقعی اللہ کا رسول یا نبی ہے، اور خاکم بدہن اگر ہم اس کا انکار کرتے ہیں تو ہمارے ایمان کی ساری عمارت منہدم ہو جاتی ہے، اور ہم کافر ہو جاتے ہیں، اس لیے کہ الوہیت، رسالت، وحی اور آخرت ہی پر یقین کا نام ایمان ہے۔ ان میں سے کسی ایک کے بارے میں بھی اگر ہمارے یقین اور ایمان میں کوئی معمولی سا فتور موجود ہے تو ہم مومن نہیں ہو سکتے۔ اسی کے برعکس یہ صورت بھی ہے کہ اگر کوئی نبی یا رسول نہیں ہے اور ہم اس کو رسول یا نبی تسلیم کرتے ہیں تو ہم صرف کافر ہی نہیں ہوتے بلکہ اللہ اور اس کی مقدس کتاب پر اس سے بڑھ کر کوئی ظلم نہیں ہو سکتا، کیوں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے انبیا مبعوث ہوتے ہیں اور رسولوں کو اللہ تعالیٰ ہی بھیجتا ہے، اگر کسی کو اس نے نہیں بھیجا ہے اور ہم یہ کہہ دیتے ہیں کہ اللہ نے بھیجا ہے تو یہ سراسر افترا اور بہتان ہے۔ یہ ایسا بدترین جھوٹ ہے جسے تاریخ کبھی معاف نہیں کر سکتی۔

نبوت کے مسئلے کو مذاق بنانے والی قومیں کبھی ہدایت نہیں پا سکتیں۔ کتاب و رسالت ہی تو اصل سرچشمہ ہدایت ہے اور اگر رسالت اور نبوت ہی کے سلسلے میں ہمارا ذہن صاف نہ ہو تو ہمیں کبھی منزلِ حق نصیب نہیں ہو سکتی۔

رسالت اور نبوت کی تاریخ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ انسانوں کی ہدایت و رہبری کے لیے انبیاؑ ہمیشہ آتے رہے اور ان پر کتابوں کا نزول بھی ہوتا رہا ہے مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے جتنے انبیا اور مرسلین تشریف لائے ان کی بعثت و رسالت خاص خاص اقوام کی طرف تھی، کسی نبی کے مخاطب سارے انسان اور سارے عالم کے لوگ نہیں تھے۔ کتبِ سماوی کی تعلیمات بھی مخصوص عہد کے لیے تھیں، اور وہ زمان و مکان پر محیط نہ تھیں، لیکن جب انسانی تمدن نے ارتقا کی منزلیں طے کر لیں اور وہ اس مقام پر پہنچ گیا کہ جہاں سے کسی نبی کا پیغام عام ہو سکے، اور

Marfat.com

دوسری طرف ہدایتِ حق کو قبول کرنے والوں کی ایک امّت بھی بن گئی جو کتابِ الٰہی اور نبی کی سیرت کو من وعن محفوظ رکھ سکے تو سلسلۂ نبوت و رسالت آں حضرت ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وسلم پر سارے اوصافِ کمال کے ساتھ ختم کر دیا گیا، اور قیامت تک باقی رہنے والی تعلیمات پر مشتمل نیز ہمہ گیر خصوصیت رکھنے والی، اور ساری نوعِ بشر کو مخاطب بنانے والی کتاب نازل فرما کر وحی کا سلسلہ بھی ختم فرما دیا گیا۔ اب کسی کو مزید اس کام پر مامور کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔

دنیا کے حالات خود خاتم الانبیا نیز عالم گیر دین اور مکمل کتاب کا تقاضا کرنے لگے تھے۔ اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے اپنا آخری پیغمبر بنا کر ساری انسانیت کی ہدایت و رہبری کے لیے مبعوث فرمایا۔ آپ کے بعد نہ تو کوئی نبی آئے گا، نہ کوئی اللہ کی کتاب نازل ہوگی، نہ کوئی دین آئے گا، نہ کوئی شریعت آئے گی، نہ کوئی وحی آئے گی اور نہ کوئی اللہ کا پیغام آئے گا۔ اس لیے قرآن جس صورت میں نازل ہوا تھا، آج بھی بغیر کسی ترمیم و اضافے کے اسی صورت میں موجود ہے اور قیامت تک محفوظ رہے گا، کیوں کہ اس کے مخاطب وہ سارے انسان ہیں جو خلعتِ وجود سے آراستہ ہو کر دنیا میں آتے رہیں گے۔

اسی کتاب کے ساتھ نبی کی ساری ہدایات اور ساری تعلیمات نیز سیرت اور اسوہ کی تفصیلات کا سارا ذخیرہ آج بھی موجود ہے، حالات و سوانح کا کوئی گوشہ مستور نہیں ہے، جب کہ یہ حال نہ دیگر آسمانی کتابوں کا ہے نہ انبیائے سابقین کے سوانح اور ان کی تعلیمات کا۔

پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ آپ کے بعد کسی اور نبی کو دنیا میں بھیجنے والا ہوتا تو قرآن میں صاف اور صحیح طور پر ارشاد فرما دیتا کہ میں ایک اور نبی بھیجنے والا ہوں، لیکن اس کے برعکس قرآن نے آپ کے خاتم الانبیا ہونے کا اعلان کیا، اور متعدد آیات میں ایسے اشارے موجود ہیں کہ جن کی روشنی میں ختمِ نبوت کے عقیدے کو صحابۂ کرام سے لے کر آج تک امّت کے تمام طبقات نے جزوِ ایمان قرار دیا۔ ختمِ نبوت کا ثبوت ہمیں قرآن میں ملے گا، احادیث میں ملے گا اور اس عقیدے پر ہمیشہ سے اجماعِ امّت رہا ہے۔ کسی چیز کے حق ہونے کی اس سے بڑھ کر اور کیا دلیل ہو سکتی ہے کہ قرآن بھی ناطق ہو اور حدیث میں بھی واضح طور پر ثبوت موجود ہو، اور اجماع بھی۔

آئیے! سب سے پہلے آیاتِ قرآنی پر غور کریں:

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ۝ (الاحزاب: ۴۰)

یعنی: "محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تمھارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں، لیکن وہ اللہ کے رسول اور انبیا کے خاتم ہیں۔"

Marfat.com

تمام مفسرین خاتم النبیین کے معنی آخری نبی بیان کرتے ہیں۔

ختم نبوت کے سلسلے میں تنہا یہی ایک آیت نہیں ہے، بلکہ دوسری آیات میں بھی اشارے موجود ہیں، آپ پر سلسلۂ نبوت کے اختتام کی دلیل یہ بھی ہے کہ آپ ساری نوعِ انسانی کے لیے ذریعۂ ہدایت بنائے گئے:

وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ٥ (سبا: ۲۸)

یعنی: "اے نبی! ہم نے آپ کو تمام انسانوں کے لیے بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے۔"

دوسری جگہ سورۂ انعام میں انیسویں آیت میں ارشاد ہوا ہے:

وَاُوْحِيَ اِلَيَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ ط

یعنی: "اور میری طرف یہ قرآن وحی کیا گیا ہے تاکہ اس کے ذریعہ سے تم کو اور ہر اس شخص کو متنبہ کر دوں جسے یہ پہنچے۔"

سورۂ اعراف کی آیت ۱۵۸ میں ارشاد ہوا:

قُلْ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا ۔۔۔۔۔

یعنی: "اے نبی کہہ دو، اے انسانو! میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں۔"

سورۂ انبیا میں ہے:

وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ٥

یعنی: اور اے نبی! ہم نے نہیں بھیجا تم کو مگر تمام جہان والوں کے لیے رحمت کے طور پر۔"

جب آپ کی ہمہ گیر اور آخری رسالت و نبوت کا اظہار قرآنِ پاک، دین کی تکمیل، نعمتوں کے اتمام، آپ کے رحمتِ جہاں ہونے کے اعلان، اور رہتی دنیا تک کے لیے نوعِ بشر کے لیے ذریعۂ ہدایت کہہ کر کر رہا ہے تو پھر کسی اور نبی کے تصوّر کا کیا جواز باقی رہ جاتا ہے؟

اللہ کے فیصلے اور اس کی رضا کے علم کا دوسرا بڑا ذریعہ ہمارے پاس حدیث ہے، جس میں صراحت کے ساتھ آپ نے سلسلۂ نبوت و رسالت کے ختم ہونے کا اعلان فرمایا ہے۔

ترمذی میں حضرت انس بن مالکؓ سے یہ حدیث مروی ہے کہ آں حضرتؐ نے فرمایا کہ رسالت اور نبوت کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ میرے بعد اب کوئی رسول ہے نہ کوئی نبی۔ یہ اور اس طرح کی بکثرت احادیث صحاح صاف اور صریح الفاظ میں آئی ہیں۔

قرآن و سنّت کے بعد تیسرا درجہ اجماعِ صحابہؓ کا ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ آں حضرتؐ کی وفات کے بعد جن لوگوں نے نبوت کا دعوا کیا اور جن لوگوں نے ان کی نبوت کو تسلیم کیا ان سب

Marfat.com

سکے خلاف صحابہ کرامؓ نے بالاتفاق جنگ کی۔

اجماعِ صحابہ کے ساتھ ساتھ اجماعِ علماء مجتہدین بھی اسی فیصلے پر ہے کہ آپؐ پر نبوت اور رسالت کا سلسلہ ختم ہو گیا اور آپؐ آخری نبی ہیں، ان میں فقہی مذاہب کے ائمہ اربعہ بھی ہیں اور طحاوی جیسے علمِ اعتقادیات کے ماہر بھی ہیں، ابنِ حزم اندلسی بھی ہیں۔ امام غزالی بھی ہیں، بغوی، زمخشری، قاضی عیاض، شہرستانی، رازی، ابن کثیر جیسے مفسرین اور محدثین بھی ہیں۔ شرحِ فقہِ اکبر میں ملا علی قاری نے لکھا ہے کہ "نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبوت کا دعوا بالاجماع کفر ہے۔"

Marfat.com

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ ۝

(الذاریات: ۵۶)

میں نے جن اور انسانوں کو اس کے سوا کسی کام کے لیے پیدا نہیں کیا کہ وہ میری بندگی کریں۔

عبد اور معبود

Marfat.com

بندگی ایک نعمت ہے

حکومت و اقتدار اور اختیار میں بظاہر اتنی کشش ہے کہ کوئی عام انسان بھی اس کے مقابلے میں محکومی و بندگی کو پسند نہیں کرتا۔ بلکہ محکومی و بندگی کو ایک مجبوری، ایک کمزوری اور ایک خامی سمجھا جاتا ہے۔ لیکن جن لوگوں نے سنجیدگی سے اس مسئلہ پر غور کیا ہے اور اس کی گہرائی میں گئے ہیں وہ اس کو ایک اور نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں اور جب وہ اس کے اثرات و نتائج پر تفصیل سے غور کرتے ہیں تو وہ عام نتیجے کے برعکس نتیجہ نکالتے ہیں۔ وہ اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ بندگی اور محکومی کسی انسان کی کمزوری نہیں ہے بلکہ اس کے لیے ایک نعمت ہے لیکن کس کی بندگی؟ انسان اگر انسان کی بندگی کرنے لگے یا ایک قوم دوسری قوم کی محکوم ہو جائے تو یہ تو غلامی کہلاتی ہے اور غلامی ایک ناپسندیدہ اور غیر مستحسن چیز ہے۔ جو کسی کو غلام بنالے وہ بھی قابلِ احترام نہیں ہوتا اور جو غلام بن جائے اس کی وقعت بھی جاتی رہتی ہے۔ غلام فرد ہو یا غلام قوم، اس کا اعتبار اور اس کا وقار آزاد افراد اور آزاد اقوام کے مقابلے میں کم ہوتا ہے۔ اسی سے یہ بات ظاہر و ثابت ہو جاتی ہے کہ انسان انسان کا غلام نہیں ہو سکتا۔ غلامی اور بندگی اگر باعثِ ننگ و عار نہیں ہے تو وہ صرف ایک ہی ہستی کی بندگی اور غلامی ہے۔

اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ ۝ (الفاتحہ:۴)

یعنی: "خدایا ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں۔"

لہٰذا عبدیت اور بندگی اگر جائز ہو سکتی ہے تو صرف اس قادرِ مطلق، اس ذاتِ یکتا اور بے ہمتا کی جس نے انسان کو پیدا کیا اور اپنی نعمتوں سے نوازا، جس نے انسان کو کائنات میں افضل ترین مقام عطا کیا، جس نے انسان کو اپنا نائب بنا کر خلافتِ ارضی سے سرفراز کیا۔ اس نے ہمیں پیدا کیا اور ہماری تخلیق کا مقصد بھی بتا دیا کہ جن اور انسان کو صرف اس لیے پیدا کیا گیا ہے کہ وہ اللہ کی عبادت کریں:

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ ۝ (الذاریات:۵۶)

عبادت کیا ہے؟ اسلام میں عبادت کا مفہوم پوجا پاٹ اور محض رسمی عبادات کا ادا کر لینا نہیں ہے۔ عبادت ایک جامع لفظ ہے اس میں وہ تمام ظاہری اور باطنی اعمال و اقوال داخل ہیں جو اللہ

Marfat.com

کو پسند ہیں اور جو اس کی خوشنودی کا باعث بنتے ہیں، مثلاً نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، سچائی، حق گوئی، امانت، دیانت، وعدہ وفائی، مخلوقِ خدا کے ساتھ ہمدردانہ سلوک، حقوق العباد، نیکی کی تلقین، بدی سے پرہیز، انصاف، اخلاص، صبر، تحمل وغیرہ۔ دوسرے الفاظ میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ انسان کی تمام زندگی عبادت ہو سکتی ہے اگر وہ تسلیم و رضا کے ساتھ بسر کر جائے۔

قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ (الانعام: ۱۶۲)

یعنی: "کہو کہ میری نماز اور میری قربانی اور میرا جینا اور مرنا اللہ ہی کے لیے ہے جو سارے جہاں کا پالنے والا ہے۔"

ہم اس بات کو اس انداز پر بھی سوچ سکتے ہیں کہ انسان کی زندگی کے تمام اعمال اگر ایک عبد اور ایک بندے کی حیثیت سے انجام دیے جائیں تو وہ عبادت میں شمار ہونے کے لائق ہیں۔ چاہے بظاہر وہ کتنے ہی دنیاوی کام معلوم ہوتے ہوں۔ مثلاً کسبِ معاش ایک ایسا فعل ہے جس کو خالص دنیادارانہ کہا جائے گا لیکن اگر فرض شناسی، دیانت داری اور خدا ترسی کے ساتھ روزی کمائی جائے اور اس کے ذریعہ اپنے متعلقین کی ضروریات زندگی پوری کی جائیں تو اس دنیادارانہ فعل میں بھی عبادت کی شان پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی طرح دوسرے کام بھی جو حدود اللہ کے اندر انجام دیے جائیں، عبادت کا درجہ رکھتے ہیں۔ گویا عبادت کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ انسان کو ایک مقصدِ زندگی حاصل ہو جاتا ہے۔ اس مقصد کو پیشِ نظر رکھ کر وہ اپنے لیے مشاغل کا انتخاب کرتا ہے اور اسے مقصد کی کسوٹی پر کس کر نیک و بد میں تمیز اور خوب و ناخوب میں امتیاز کرتا ہے۔ یہ مقصد ایک ایسے عیار کی طرح ہوتا ہے جس کے ذریعہ کھوٹا کھرا الگ ہو جاتا ہے۔ ہر ذی ہوش جانتا ہے کہ زندگی اس وقت تک بے معنی اور بے مزہ رہتی ہے جب تک اس میں کوئی اعلا مقصد پیشِ نظر نہ ہو۔ زندگی کا مزہ مقصد میں پوشیدہ ہے۔ لطفِ حیات نصب العین میں مضمر ہے۔ نشاطِ زیست کے لیے کسی لگن اور کسی تڑپ کی ضرورت ہے۔ مقصد کی لگن انسان کے اعمال و افعال میں ایک تنظیم پیدا کرتی ہے۔ یہ تنظیم انسان کو سکون و طمانیت کی دولت عطا کرتی ہے۔ تنظیم سہولت بھی پیدا کرتی ہے اور خوش اسلوبی بھی۔

مقصد کی لگن انسان میں سعی اور جدوجہد کا جذبہ بیدار کرتی ہے اور کوشش کرنے کی آرزو پیدا کرتی ہے۔ کوشش کی معراج حقیقی کامیابی ہے۔ اس سے قلب کو صحیح طمانیت حاصل ہوتی ہے۔ یہ طمانیت ہی زندگی کا سہارا ہے۔ اس طمانیت اور احساس و اعتماد کے بغیر زندگی بے معنی اور بے مقصد ہے۔

کامل کوشش کی راہ میں جو مشکلات حائل ہوتی ہیں ان میں بے صبری شاید سب سے بڑی رکاوٹ ہے جو انسان کو کوشش سے روکتی ہے اور جدوجہد میں خلل ڈالتی ہے۔ بندگی کا ایک فائدہ یہ

Marfat.com

بھی ہے کہ آدمی بے صبرا نہیں ہوتا۔ اس کو اطمینان ہوتا ہے کہ "السعی منی والاتمام من اللہ"۔ بندے کا کام صرف کوشش کرنا ہے۔ اتمام اور اختتام اللہ کے اختیار میں ہے۔ لہٰذا وہ صبر و ضبط کا دامن کبھی ہاتھ سے نہیں چھوڑتا۔ کبھی مایوس اور بددل نہیں ہوتا۔ وہ استقلال کے ساتھ کوشش کیے جاتا ہے۔ کام یابی اور نتائج کو اپنے معبود پر چھوڑ دیتا ہے۔ جب کوشش کی تکمیل سے پہلے ہی نتائج کا انتظار ہو تو کوشش کا جاری رہنا مشکل ہی نہیں، ناممکن ہو جاتا ہے۔ بے صبری قاتلِ سعی ہے۔ ایک اچھا بندہ صابر بھی ہوتا ہے اور راضی بہ رضا بھی۔

ایک عبد اور بندہ اپنے بہت سے معاملات میں فکر مند نہیں ہوتا ہے۔ وہ اپنے اللہ سے مانگتا ہے اور اسی سے امید رکھتا ہے۔ یہ طرزِ فکر اس میں بے نیازی پیدا کر دیتا ہے۔ بے نیازی انسان کو بہت سی پریشانیوں سے بچاتی ہے اور خود اعتمادی و خود شناسی پیدا کرتی ہے۔ ایک بندہ جب اپنے معبود سے آرزو کرتا ہے تو وہ معبود سے قریب ہو جاتا ہے۔ آرزومندی اپنی جگہ ایک جنسِ گراں بہا ہے جو ایک عبد اور ایک بندے کو ہی میسر ہو سکتی ہے۔ بقول علامہ اقبال:

متاعِ بے بہا ہے درد و سوزِ آرزومندی
مقامِ بندگی دے کر نہ لوں شانِ خداوندی

Marfat.com

اللہ سے محبّت کا معیار

تمام عبادات کی غایت اللہ کا قرب اور اس کی محبّت ہے۔ اس لیے کہ بندے کا مطلوب اللہ عزّوجل ہے۔ اس طرح اللہ کی محبّت انسانی زندگی کا مقصدِ اعلیٰ ہوا۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے قرآنِ حکیم میں مختلف مقامات پر ان تدابیر کو واضح کیا ہے جو بندے کے دل میں اللہ کی محبّت پیدا کر سکتی ہیں۔ ایک آدمی دوسرے آدمی سے محبت کرتا ہے۔ ماں باپ اپنے بچوں سے محبّت کرتے ہیں۔ قوم اپنے مخلص اور بے لوث رہبر سے محبت کرتی ہے۔ انسان بعض جانوروں سے بھی محبّت کرتا ہے۔ بعض پودے اور پھول بھی اس کے دل کو اپنی جانب کھینچتے ہیں۔ محبت کی یہ تمام صورتیں مخلوقات کے درمیان ہیں۔ لیکن اللہ کی ذات واحد اور احد ہے۔ لَیْسَ کَمِثْلِہٖ شَیْءٌ یعنی "کوئی اس کا مثل نہیں ہے"۔ انسان اللہ کی ذات کا کوئی تصوّر تک قائم نہیں کر سکتا، اس لیے اللہ سے محبّت کا معیار بالکل مختلف اور جدا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے اس سے زیادہ محبت کرتا ہے جتنی محبت والدین اپنے بچّوں سے کرتے ہیں، مگر ان دونوں قسموں کی محبّت کا معیار ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہے۔ اللہ تعالیٰ کی محبت کی بنیاد یہ ہے کہ اسے واحد اور احد مانا جائے۔ اور دل میں یہ ایمان جاگزیں کیا جائے کہ وہی سارے عالم کا خالق ہے اور وہی سب کا رب ہے۔ اس کی ربوبیت میں کوئی اس کا شریک نہیں ہے۔ وہی زندہ رکھتا ہے۔ وہی رزق دیتا ہے۔ وہی تن درست رکھتا اور وہی شفا دیتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان تمام صفتوں کی غیر اللہ سے نسبت کی نفی کی جائے کیوں کہ صرف وہی ان کا مستحق ہے۔ انسان کا یہ مقام ہے کہ وہ اللہ کے سوا تمام دوسری طاقتوں کی پرستش سے دامن کو آلودہ نہ کرے۔ اور اللہ کے علاوہ کسی دوسری ہستی سے کوئی امید نہ رکھے۔ کوئی مدد نہ چاہے۔

اس طرح تمام غیر اللہ سے منھ موڑ کر صرف اللہ کا ہو رہے۔ ایک حدیث ہے کہ "اللہ نے فرمایا جب میرا بندہ نوافل کے ذریعہ سے میرا قرب چاہتا ہے تو میں اس سے محبت کرتا ہوں، حتیٰ کہ میں اس کے کان بن جاتا ہوں اور وہ مجھ سے سنتا ہے، اس کی آنکھیں بن جاتا ہوں اور وہ مجھ سے دیکھتا ہے، اس کے ہاتھ بن جاتا ہوں اور وہ مجھ سے پکڑتا ہے۔ وہ مانگتا ہے تو میں اس کو عطا کرتا ہوں اور

Marfat.com

جب میرے پاس پناہ چاہتا ہے تو میں اس کو پناہ دیتا ہوں۔"

یہ ساری صفات بندے میں نوافل کے ذریعہ سے پیدا ہوتی ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ کی محبت کا معیار یہ ہے کہ اس کے احکام کی بے چون وچرا اور برضا و محبت تعمیل کی جائے۔ یہی اس کی محبت کا معیار ہے اور اسی ذریعہ سے اس کی محبت حاصل کی جاسکتی ہے چنانچہ قرآنِ حکیم میں اس نکتہ کو اللہ تعالیٰ نے نہایت واضح الفاظ میں یوں فرمایا کہ اگر بندہ چاہتا ہے کہ اللہ اس سے محبت کرے تو وہ اللہ کے رسول ؐ کی کامل اور مکمل اطاعت کرے۔ جن باتوں کا رسول اللہؐ نے حکم دیا ہے ان پر عمل کرے اور جن کاموں سے آپؐ نے منع فرمایا ہے ان سے باز رہے۔ اس کھلے ہوئے حکم کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے محبت کا معیار یہ ہے اس کے محبوب ترین بندے اور رسول ؐ کی پیروی کی جائے۔ اگر کوئی بندہ نبی اکرم ؐ کی اطاعت کے بغیر اللہ کی محبت کا متمنّی ہے تو وہ سخت گم راہی میں مبتلا ہے، اس لیے کہ اللہ کے نزدیک "دین صرف اسلام ہے"۔ جب واحد پسندیدہ راہِ عمل اسلام کی مقرر کردہ ہے تو پھر کوئی دوسری راہ اللہ کی محبت کی جانب انسان کی رہبری نہیں کرسکتی۔

غرض اللہ کی محبت کا معیار قرآن کے احکام پر عمل کرنا اور اس کے رسول ؐ کی اطاعت کرنا ہے۔ یہی وسیلہ ہے جو انسان کے دل میں اللہ کی محبت پیدا کرسکتا ہے اور اس کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ بھی اپنے ایسے بندے سے محبت کرتا ہے۔ صحابۂ کرام ؓ اس بلند مقام پر فائز تھے کہ اللہ تعالیٰ نے خوش ہو کر ان کی توصیف فرمائی کہ اللہ ان سے راضی ہوگیا اور وہ اللہ سے راضی ہوگئے۔ محبت کا یہی واحد معیار ہے جو اسلامی شریعت میں مطلوب ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم تمھاری شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جو لوگ اللہ کی تلاش میں جنگل جنگل مارے مارے پھرتے اور صحرا کی خاک چھانتے پھرتے ہیں وہ اسلام کی مقرر کردہ راہ سے انحراف کرتے ہیں اور اپنے لیے ایسی راہ متعین کرتے کہ جو اسلام نے مقرر نہیں کی ہے۔ اسی طرح ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں بندے سے اس قدر قریب ہوں کہ وہ جو چاہے مجھ سے مانگے۔ جب وہ مانگتا ہے تو ہم اس کی دعائیں سنتے اور اس کی تمنائیں پوری کرتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ سے محبت کرتے ہیں وہ ہمیشہ اسے اپنے قریب پاتے ہیں، یہاں تک کہ ان کا ایمان اس بات پر ہوتا ہے کہ اگر وہ اللہ کا ذکر کرتے رہیں گے تو اللہ بھی انھیں ہر وقت یاد رکھے گا اور اپنی رحمتوں کی بارش کرتا رہے گا۔

ایک جگہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ (البقرہ: ۴۵)

Marfat.com

یعنی: "ہم سے مدد چاہتے ہو تو صبر سے کام لو اور نماز کو ہماری یاد اور محبت کے اظہار کا ذریعہ بناؤ۔"

نماز اسلام کا انتہائی اہم ستون ہے اور لازمہ شریعتِ اسلامی ہے۔ یادِ الٰہی اور قربِ باری تعالیٰ کے لیے نماز ایک اہم ترین راستہ ہے۔ اس راہ پر جو مسلمان پوری پابندیوں کے ساتھ چلتے ہیں ان کا منزلِ مقصود تک پہنچنا یقینی ہے۔

اللہ تعالیٰ کے احکام کی پابندی اور اس کے رسولِ مقبولؐ کی اطاعت ہمیں بلاشبہ یادِ الٰہی اور اللہ سے محبت کے مرتبے پر فائز کرتی ہے۔ اس کا ایک راستہ یہ بھی ہے کہ ایک انسان دوسرے انسان سے محبت کرے۔ انسان کے شرف کا احترام کرے۔ مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ یہ بھائی چارہ محبت اور خلوص و انس کا درس دیتا ہے۔ ہمیں اللہ کی طرف سے ہدایت ہے کہ ہم اپنے اخلاق کو بلند کریں اور زندگی کے ہر معاملے میں حُسنِ اخلاق کا مظاہرہ کریں۔ ہم مسلمان کسی مرحلے پر بھی یہ فراموش نہ کریں کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بعثت کا مقصد مکارمِ اخلاق کی تکمیل قرار دیا ہے:

بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَکَارِمَ الْاَخْلَاقِ

اخلاق کے بارے میں اس سے زیادہ پُرعظمت و جلال بات نہیں ہو سکتی اور یہ واضح طور پر ہمیں صحیح راستہ دکھاتی ہے۔

مختصر یہ کہ اللہ سے محبت کا واحد طریقہ یہ ہے کہ رسولِ اکرمؐ نے اللہ کی بندگی اور اطاعت کا جو قاعدہ سکھایا ہے اس پر بے چون و چرا عمل کیا جائے۔ یہی اللہ کا حکم ہے۔ اس نے فرمایا کہ اگر تم چاہتے ہو کہ اللہ تم سے محبت کرے تو اللہ کے رسولؐ کی اطاعت کرو۔ اللہ بھی تم سے محبت کرنے لگے گا۔ اللہ کی محبت رسولؐ کی اطاعت میں پوشیدہ ہے۔

اللہ تعالیٰ ہم مسلمانوں کو توفیق عطا فرمائے کہ ہم رسول اللہؐ کی پوری پوری اطاعت کریں تاکہ اللہ کی محبت حاصل ہو۔ اور ہم دنیا اور آخرت میں کامیاب و کامران رہیں۔

Marfat.com

حُبِ الٰہی کے تقاضے

اپنے محسن سے محبت، اس سے لگاؤ اور اس کی چاہت انسان کی گھٹی میں ہے۔ جس طرح انسان کا سب سے بڑا محسن اللہ تعالیٰ ہے اسی طرح احسان مندی میں مومن کا کوئی مقابل نہیں۔ احسان مندی اور منّت پذیری کا جذبہ جو اظہار و اقرارِ محبت کی صورت میں جلوہ گر ہوتا ہے، بندۂ مومن سے زیادہ کسی میں نہیں ہو سکتا۔ یہ بات اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ان الفاظ میں بیان فرمائی ہے:

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ (البقرہ: ۱۶۵)

یعنی: "وہ جو ایمان والے ہیں تو وہ خدا کی محبت میں بڑے ہی پکے ہوتے ہیں۔"

انسان کی زندگی میں خدا سے محبت کے مظاہر ہمیشہ سے نمایاں رہے ہیں۔ وہ لوگ جنھوں نے اپنی زندگی کی راہیں خود متعین کرنے کی جسارت کی ان کو بھی اس جذبۂ محبت کے اظہار کے لیے اپنی طرف سے طریقے گھڑنے پڑے، چوں کہ یہ طریقے خدا کی طرف سے نہیں تھے اس لیے انسانی فطرت کے مطابق بھی ثابت نہیں ہوئے۔

مثلاً انسان نے یہ سوچا کہ خدا سے محبت کے اظہار کا سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ آدمی مردم بے زار ہو جائے۔ اور یہ سوچ کر وہ جنگلوں میں جا بسا۔ اس نے سوچا کہ خدا سے محبت کا اظہار خود کو فنا کر دینے کے علاوہ اور کسی ذریعہ سے نہیں ہو سکتا تو اس نے کھانا پینا چھوڑ دیا۔ اس طرح کی اور بہت سی مثالیں تاریخ میں ملتی ہیں اور ان لوگوں میں آج بھی دیکھی جا سکتی ہیں جنھیں ربانی ہدایت سے استفادے کی توفیق نہیں ہوئی۔

قرآن مجید نے خدا سے محبت کے ان خود ساختہ انسانی مظاہر کو رہبانیت کا نام دیا۔ ارشادِ ربانی ہے:

وَرَهْبَانِيَّةَ ۨ ابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ اِلَّا ابْتِغَاۗءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا ۚ (الحدید: ۲۷)

یعنی "یہ رہبانیت انھوں نے خود گھڑلی ہے۔ اللہ نے انھیں اس کا حکم نہیں دیا تھا۔"

Marfat.com

اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: لَا رُھْبَانِیَّۃَ فِی الْاِسْلَامِ یعنی: "اسلام میں رہبانیت کی کوئی گنجائش نہیں۔" اس کے برخلاف قرآن نے اللہ سے محبت کا جو طریقہ بتایا ہے وہ یہ ہے کہ اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے یہ کہلوایا کہ:

اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ۔۔۔ (آل عمران: ۳۱)

یعنی: "اگر تم خدا سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو، پھر اللہ بھی تم سے محبت کرنے لگے گا۔"

اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر اللہ سے محبت کے اظہار کا صحیح طریقہ اختیار کیا جائے تو اس کے نتیجے میں خود اللہ بھی بندوں سے محبت کا وعدہ فرماتا ہے۔ آئیے اب یہ دیکھیں کہ اللہ کن لوگوں سے محبت فرماتے ہیں۔ قرآن مجید میں ہے:

اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ ۝ (البقرہ: ۱۹۵)

یعنی: "اللہ دوسروں کے ساتھ بھلائی سے پیش آنے والوں سے محبت کرتا ہے۔"

ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے کہ:

وَاللّٰہُ لَا یُحِبُّ الظّٰلِمِیْنَ ۝ (آل عمران: ۵۷)

یعنی: "دوسروں پر زیادتی کرنے والے اللہ کے محبوب نہیں ہو سکتے۔"

ایک دوسری آیت میں فرمایا گیا ہے:

اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُقْسِطِیْنَ ۝ (المائدہ: ۴۲)

یعنی: "انصاف کرنے والے اللہ تعالیٰ کے محبوب ہیں۔"

ایک آیت میں اہلِ ایمان کی یہ صفات بیان فرمائی ہیں:

وَالْکٰظِمِیْنَ الْغَیْظَ وَالْعَافِیْنَ عَنِ النَّاسِ وَاللّٰہُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ ۝ (آل عمران: ۱۳۴)

یعنی: "مومن غصہ پی جانے والے ہوتے ہیں، لوگوں کی خطاؤں اور غلطیوں سے درگزر کرنے والے ہوتے ہیں اور اللہ کو ایسے نیکوکار محبوب ہیں۔"

اسی طرح ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا:

وَیُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰی حُبِّہٖ مِسْکِیْنًا وَّیَتِیْمًا وَّاَسِیْرًا ۝ (الدھر: ۸)

یعنی: "یہ ایمان والے خدا کی محبت میں حاجت مندوں، بے سہارا یتیموں اور قیدیوں کو کھانا کھلاتے ہیں۔"

ان تمام آیات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کن لوگوں سے محبت کرتا ہے اور پھر کون سے اعمال ہیں جن کے نتیجے میں یا جن کی جزا یہ بتائی گئی ہے کہ اللہ ایسے بندوں سے محبت کرتا ہے جو ایسے اعمال کرتے ہیں۔ ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے سب سے زیادہ نمایاں اعمال وہ

Marfat.com

ہیں جن کا تعلق بندوں کے ساتھ احسان اور نیک سلوک سے ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآن نے انسان کے لیے عقائد و اعمال کا جو تصور قائم کیا ہے اس کی بنیاد تمام تر رحمت و محبت پر رکھی ہے۔ وہ انسان کی روحانی زندگی کو فطرت کے عالمگیر کارخانے سے کوئی الگ اور غیر متعلق چیز قرار نہیں دیتا، بلکہ اسی کا ایک مربوط گوشہ قرار دیتا ہے اور اسی لیے کہتا ہے کہ جس کارساز فطرت نے اس کارخانۂ ہستی کی بنیاد رحمت پر رکھی ہے، ضروری تھا کہ اس گوشہ میں بھی اس کے تمام احکام سرتاسر رحمت کی تصویر ہوں۔ چناں چہ قرآن نے جا بجا یہ حقیقت واضح کی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا بندوں سے رشتۂ محبت کا رشتہ ہے اور سچی عبودیت اسی کی عبودیت ہے جس کے لیے معبود صرف معبود ہی نہ ہو بلکہ محبوب بھی ہو۔

لیکن بندے کے لیے اللہ کی محبت کی عملی راہ کیا ہے؟ وہ کہتا ہے کہ اللہ کی محبت کی راہ اس کے بندوں کی محبت میں سے ہو کر گزرتی ہے۔ جو انسان چاہتا ہے کہ اللہ سے محبت کرے اسے چاہیے کہ اللہ کے بندوں سے محبت کرنا سیکھے۔ مسلم میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے حوالے سے ایک حدیث کا ابتدائی حصہ اس طرح ہے کہ قیامت کے دن اللہ ایک بندے سے کہے گا۔" اے ابن آدم! میں بیمار ہو گیا تھا مگر تو نے میری بیمار پرسی نہ کی۔" بندہ متعجب ہو کر کہے گا، "بھلا ایسا کیسے ہو سکتا ہے اور تو تو رب العالمین ہے۔" خدا تعالیٰ فرمائے گا تجھے معلوم نہیں کہ میرا فلاں بندہ تیرے قریب بیمار ہو گیا تھا اور تو نے اس کی خبر نہ لی۔ اگر تو اس کی بیمار پرسی کے لیے جاتا تو مجھے اس کے پاس پاتا۔

یہ تو اللہ سے محبت کا طریقہ تھا، لیکن اس محبت کے کچھ تقاضے بھی ہیں۔ اور ان میں سے ہم پاکستانیوں کے لیے اہم ترین تقاضا یہ ہے کہ ۲۷ رمضان المبارک کو پاکستان قائم ہوا تھا۔ ۲۷ رمضان یوم نزولِ قرآن اور یوم استقلال پاکستان ہے۔ اس پاکستان کے لیے ہم مسلمانوں نے پورے عزم کے ساتھ ہی اپنے اللہ تعالیٰ سے یہ وعدہ کیا تھا کہ ہم پاکستان میں قرآن کی حکومت قائم کریں گے، دستور الٰہی نافذ کریں گے اور اپنی زندگیوں کو اسلام کے سانچے میں ڈھال کر تمام دنیا کے لیے اسلامی زندگی اور اسلامی اخلاق و اقدار کا نمونہ پیش کریں گے۔

اگر ہم نے اپنا یہ وعدہ پورا نہیں کیا ہے اور اپنا یہ عہد پورا نہیں کیا ہے تو یہ اللہ تعالیٰ سے محبت کا راستہ نہیں ہو سکتا۔ تقاضائے محبت یہ ہے کہ ہم اپنے اس دعوے کو بہر حال اور بہر صورت پورا کریں۔ ہم پاکستان سے محبت کریں اور اس زمین پاک کے ذرہ ذرہ سے ہمارا رشتۂ انس و خلوص قائم ہو۔

Marfat.com

پاکستان کا ہر فرد بشر ہماری محبت کا مستحق ہے۔ ہم کو ایک دوسرے سے محبت کرنی چاہیے اور ایک دوسرے کا احترام کرنا چاہیے۔ ایک دوسرے کی مدد کرنی چاہیے اور پاکستانی معاشرے کو ایک پُرامن، ایک پیارا اور ایک اسلامی معاشرہ بنانا چاہیے۔

درحقیقت یہی ثبوت ہوگا اور مظہر کہ ہم کو اللہ سے محبت ہے۔ اور پھر ہم اس کی رحمت و نعمت کے مستحق ہوں گے اور اللہ کا فضل و کرم ہماری زندگیوں میں انقلاب برپا کردے گا۔

آئیے ہم سب مل کر دستِ دعا دراز کریں۔ اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ ہمیں صراط مستقیم پر چلائیں۔ اللہ عزوجل ہمارے پیارے وطن پاکستان کی حفاظت فرمائیں اور امت مسلمہ پاکستانیہ کے قلوب کو اپنی محبت سے بھر دیں اور خدمتِ اسلام و مسلمین کے لیے ہمیں مستعد بنا دیں۔

Marfat.com

اللہ سے عہد

اللہ تعالیٰ نے تمام بنی آدم کی روحوں سے ازل میں یہ عہد لیا تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کو ہی اپنا رب مانیں گے، اور تمام روحوں نے اس پر شہادت دی تھی کہ وہی ان کا رب ہے۔ یہی وہ عہد ہے جسے اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو مخاطب کرکے قرآنِ حکیم میں یاد دلایا اور سورۂ اعراف میں اِس امرِ واقعہ کا اس طرح ذکر کیا کہ یاد کرو جب نکالا تمھارے رب نے بنی آدم سے ـــــ اُن کی پیٹھوں سے ـــــ اُن کی ذات کو اور اُن کو گواہ ٹھیرایا خود اُن کے اوپر۔ پوچھا کیا میں تمھارا رب نہیں ہوں؟ تو انھوں نے اقرار کیا اور کہا ہاں تُو ہمارا رب ہے۔ ہم اس کے گواہ ہیں۔

یہ ایک ایسی دل چسپ حقیقت ہے جس کے متعلق ذرا ٹھنڈے دل سے یک سو ہو کر غور کیا جائے تو یہ بات واضح ہو کر سامنے آجائے گی کہ انسان میں فطری طور پر جو جذبۂ عبودیت پایا جاتا ہے وہ اس بات کی شہادت ہے کہ غیر محسوس طور پر ہی سہی یہ وہی جذبۂ عہد ہے جو اُس کی فطرت میں جاگزیں ہے۔ اس موقع پر یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ اسلام کے اوّلین مخاطب اہلِ عرب تھے۔ انھیں اللہ تعالیٰ کے اللہ ہونے سے انکار نہیں تھا، لیکن رب انھوں نے اللہ کے سوا اور بھی بنالیے تھے۔ حال آنکہ عہدِ فطرت میں اقرار صرف اللہ ہی کی ربوبیت کا ہے۔ ربوبیت صرف اللہ کو سزاوار ہے۔ اس کے سوا کوئی اور رب نہیں ہے۔ جو لوگ اس کے برخلاف عقیدہ رکھتے ہیں وہ صریحاً گمراہی میں مبتلا ہیں۔

دینِ اسلام دینِ فطرت ہے اور ہر زمانے کے لیے اور ہر خطۂ کائنات کے لیے ہے۔ اِس کی بے حد و شمار خصوصیات میں ایک یہ بھی ہے کہ اس میں استدلال منطقی ہے اور بار بار یہ تاکید کی گئی ہے کہ ربوبیت کے عرفان کے لیے کائنات کا بغور مشاہدہ کیا جائے۔ عقلِ سلیم کو کام میں لایا جائے، فکرِ صحیح کے ذریعہ سے فہمِ دین کی کوشش کی جائے تو یہ حقیقت کہ جو بظاہر مستور نظر آتی ہے کھُل کر سامنے آجائے گی۔

اسی لیے قرآنِ حکیم میں بحث کی بنیاد تاریخ پر قائم کی گئی اور ایسے تاریخی واقعات تمثیلی طور پر پیش کیے گئے جن سے عرب باشندے واقف تھے۔ تاریخ کے ساتھ فطرت اور عقل کی بدیہیات

Marfat.com

پر بھی گفت گو کی گئی۔ فطرت ہی کی طرف گویا اس عہد میں اشارہ ہے۔ اللہ تعالیٰ یاد دلاتا ہے کہ جب تم اقرار کر چکے ہو تو غفلت میں کیوں مبتلا ہو۔ تم اپنے عہد کو یاد کرو اور اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا اقرار کرو۔

عالمِ ارواح میں عہدِ الست کے متعلق ایک حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ پہلے آدم کی پُشت پر ہاتھ پھیرا تو اُن کی اولاد نکلی۔ پھر اولاد پر ہاتھ پھیرا تو ان کی اولاد نکلی۔ پھر ان سے سوال کیا کہ کیا میں تمھارا رب نہیں ہوں؟ تو سب نے کہا کیوں نہیں، آپ ہمارے رب ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ عہد اس لیے لیا گیا کہ قیامت کو تم یہ نہ کہہ سکو کہ ہم بے خبری میں مارے گئے، ہم کو تو اس کی اطلاع ہی نہ تھی۔ اس کی تشریح کرتے ہوئے یہ مثال پیش کی گئی ہے کہ جب ہم پیدا ہوئے تھے تو ہمیں کسی لفظ کا پتا نہ تھا۔ آج ہم بے تکلف بولتے ہیں۔ آخر یہ الفاظ کسی نے تو ہم کو سکھلائے تھے۔ لیکن ہمیں یاد نہیں آتا کہ یہ لفظ کس نے بتاتے تھے، کہاں بتائے تھے، لیکن یہ یقینی ہے کہ ہم کو کسی نے بتائے ضرور تھے۔

اسی طرح گو ہم کو عہد کا وقت اور جگہ تو یاد نہیں لیکن انسان کی جبینِ نیاز میں یہ جو سجدہ کرنے کی تڑپ ہے یہ کس نے پیدا کی۔ دنیا کا ہر آدمی خواہ یہودی ہو یا عیسائی، مشرک ہو یا مجوسی، ہندو ہو یا بُدھ کا ماننے والا سب ہی سجدہ کرتے ہیں اور اپنے خیال میں ہر ایک اللہ تعالیٰ ہی کو سجدہ کرتا ہے ـــــ گو وہ مسلمانوں کی طرح سجدہ نہ کرے یعنی غلط طریقے سے سجدہ کرے ـــــ بہر حال یہ بندگی اور عبودیت کا جذبہ بتا دیتا ہے کہ کسی نے ہم سے عبودیت کا عہد ضرور لیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ حکیم میں اسی عہد کو یاد کروایا ہے جسے "اللہ سے عہد" کہا جاتا ہے۔

اسی مضمون کو ایک دوسری حدیث میں اس طرح واضح کیا گیا ہے کہ جتنے بچے پیدا ہوتے ہیں وہ دینِ فطرت یعنی اسلام پر پیدا ہوتے ہیں۔ مگر خارجی اثرات یعنی ماحول اور ماں باپ اور سماج کی تربیت سے یہودی، عیسائی یا مجوسی بن جاتے ہیں۔ اس کی مثال بھی دی گئی ہے کہ جب جانور کا تن درست بچہ پیدا ہوتا ہے تو اس کے تمام اعضا صحیح و سالم ہوتے ہیں مگر بعد میں لوگ ان کے کان، دُم وغیرہ کاٹ کر اپنی پسند کا بنا لیتے ہیں۔ اِسی طرح روزِ اول میں اللہ سے عہد کا یہ اثر ہے کہ بچے دینِ فطرت پر پیدا ہوتے ہیں لیکن خارجی اثرات انھیں کفر و شرک میں ملوث کر دیتے ہیں۔

اس لیے تمام عہدوں میں سے سب سے پہلے انسان پر اس عہد کو پورا کرنا واجب ہے جو اللہ اور اُس کے بندوں کے درمیان ہوا ہے۔ یہ عہد ایک تو وہ فطری معاہدہ ہے جو روزِ الست بندوں نے اپنے اللہ سے باندھا اور جس کا پورا کرنا اُن کی زندگی کا پہلا اور بنیادی فرض ہے، لیکن اس بنیادی معاہدے کے علاوہ چند قول و قرار اور بھی ہیں جو مُعاہدے کی تعریف میں آتے ہیں اور جن کا پورا کرنا

Marfat.com

بھی انسانوں کے فرائض میں شامل ہے۔ اِن تمام مُعاہدوں کی بھی فرضیت واہمیت اپنی جگہ مُسلّم ہے۔

اِن میں سے عہد کی ایک شکل یہ بھی ہے کہ اللہ کا نام لے کر کسی سے بیعت یا اقرار کیا جائے۔ اُس کا پورا کرنا بھی اسلامی شریعت کے مطابق ضروری ہے۔ تیسرا وہ عہد ہے جو عام طور پر قول و قرار کی شکل میں بندوں میں آپس میں ہُوا کرتا ہے اور چوتھا عہد وہ ہے جو اہلِ حقوق کے درمیان فطرتاً قائم ہے اور جن کے ادا کرنے کا اللہ نے حکم دیا ہے۔ معاہدے کی یہ شکلیں بظاہر بندوں کے درمیان معلوم ہوتی ہیں لیکن ان کا شمار بھی اللہ کے عہد میں ہے۔ اس لیے کہ اللہ نے ایسا ہی حکم دیا ہے۔ چناں چہ سُورۂ رعد میں فرمایا: ترجمہ: "جو اللہ کے ساتھ اپنے عہد کو پورا کرتے ہیں اور اپنے اقرار کو نہیں توڑتے اور اللہ نے جن تعلّقات کو جوڑنے کا حکم دیا ہے اُن کو جوڑے رکھتے ہیں"۔ اس آیت میں پہلے اُس فطری عہد کے ایفا کا ذکر ہے جو اللہ اور بندوں کے درمیان بلا واسطہ موجود ہے۔ پھر اُس قول و قرار کا ذکر ہے جو باہم اِنسانوں میں ہوا کرتا ہے، اس کے بعد فطری عہد کا ذکر ہے جس کی بنا پر معاہدے، خاص کر اہلِ قرابت کے درمیان، قائم ہیں۔

غرض یہ ہے کہ اللہ سے عہد کا مطلب روزِ الست یا روزِ اوّل کا وہ عہد ہے جو بندوں نے اللہ سے اس کی ربوبیت کے متعلق کیا ہے، لیکن عہد کے ضمن میں بعض ایسے معاملات بھی آجاتے ہیں جو بظاہر بندوں کے درمیان ہیں، لیکن اُن کی خوش حالی اور امن وامان اور آپس کی محبت و شفقت برقرار رکھنے کے لیے اُن کی بھلائی کی خاطر اللہ تعالیٰ نے اُن کو بھی گویا اللہ کے ساتھ عہد کے مترادف قرار دے کر اُن کی اہمیت میں اضافہ کیا ہے۔

عہد، خواہ اس کی کوئی بھی قسم ہو، بہرحال عہد ہے اور عہد کو پورا کرنا فرض ہے، اخلاق ہے، انصاف ہے اور شرافت ہے۔ ہمارے دینِ اسلام کی بنیاد یہ ایمان ہے کہ اللہ ہے، اور اللہ خالقِ دو جہان ہے، اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے، اللہ مالکِ کُل ہے، حاکمیت بس اللہ ہی کی ہے اور ہم اللہ کے بندے ہیں۔ ہم دل و جان سے اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں۔ اس عہد و تسلیم کا تقاضا بس یہ ہے کہ ہم انھی راہوں پر چلیں کہ جو اللہ تعالےٰ نے ہمیں دکھا دی ہیں اور حق کی طرف اللہ کے رسولِ برحق ؐ نے ہماری رہ نمائی کی ہے۔

قیامِ پاکستان بھی ایک عہد ہے۔ ہم نے تحریکِ آزادی کے وقت یہ عہد کیا تھا کہ ہم پاکستان بنائیں گے اور اس پاکستان میں قانون فقط اللہ تعالیٰ کا نافذ ہوگا۔ پاکستان مملکتِ اسلامیہ ہوگا اور یہاں ہماری زندگیاں اسلام کی روشنی سے منور ہوں گی اور ہمارے اعمال تابعِ فرمانِ الٰہی

Marfat.com

ہوں گے اور ہمارے افعال تابع فرمانِ رسولؐ ہوں گے۔

پاکستان عالمِ وجود میں آچکا ہے۔ اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ نے ایک مملکت ہم کو عطا فرمادی ہے۔ اب یہ پاکستان ہم سے مطالبہ کرتا ہے کہ ہم اپنا عہد پورا کریں۔ پاکستان کو اسلام کی روشنی سے منوّر کریں۔ یہاں اللہ کا قانون نافذ کریں اور یہاں قرآن رُول قائم کریں۔

اللہ تبارک و تعالیٰ ہم پر اپنا فضل و کرم فرمائیں اور ہم کو استقامت عطا فرمائیں کہ ہم پاکستان میں اللہ کا قانون جاری و ساری کریں۔

Marfat.com

ذکرِ الٰہی اور ثابت قدمی

اگر آپ کو کسی شخصیت سے عقیدت ہو، آپ اس کے فضل و کمال کے معترف ہوں اور مداح، اور اس کی صفات کے قائل ہوں تو یہ فطری بات ہے کہ آپ اس کی تحسین کریں گے، اس کی عظمت کے گن گائیں گے اور اس کا ذکر کر کے خوش ہوں گے۔ آپ جتنا زیادہ اس شخصیت کا ذکر کریں گے اتنا ہی آپ کا جذبہ عقیدت بڑھے گا، آپ کی محبت میں اضافہ ہو گا اور آپ کا انس ترقی کرے گا، کیوں کہ یہ فطری بات ہے کہ ذکر کی کثرت سے عشق بڑھتا ہے۔ یاد کرنے سے دل میں محبت کے چراغ روشن ہوتے ہیں اور محبت ہی سے طلب پیدا ہوتی ہے۔

اسلام اپنے ہر ماننے والے سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اپنے ہر کام، ہر فعل میں اللہ تعالیٰ کے احکام کی پابندی کرے اور اللہ کے رسولؐ کی تعلیمات کی پیروی کو اپنا مستقل شعار بنائے۔ ایک مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہر معاملے میں اور ہر وقت کرے۔ وہ چاہے مسجد میں ہو یا مدرسے میں، بازار میں ہو یا گھر میں، دفتر میں ہو یا اسمبلی میں، حاکم ہو یا محکوم، آقا ہو یا غلام، جوان ہو یا بوڑھا، احکام الٰہی کی پابندی اس کے لیے ضروری ہے، اور یہ اسی وقت ممکن ہے کہ جب وہ ہر وقت اللہ کو یاد رکھے، اپنے ایمان کو تازہ رکھے، اور اپنے اس احساس کو زندہ رکھے کہ وہ آزاد نہیں ہے بلکہ اللہ کا بندہ ہے۔ وہ اپنے عمل کے لیے جواب دہ ہے۔ اس کو اپنی زندگی کے لمحے لمحے کا حساب دینا ہے۔ یہ ایمان اور یہ احساس اس کو اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام یاد دلائے گا اور ان کی پابندی پر مجبور کرے گا۔ قرآنِ حکیم میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ اللہ کا کثرت سے ذکر کرو تاکہ تم فلاح پاؤ۔

وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ۝ (جمعہ: ۱۰)

آپ نے غور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے ذکر کی ہدایت کے ساتھ یہ بھی بتا دیا گیا ہے کہ فلاح کا یہی راستہ ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ صرف ذکرِ الٰہی میں ہی انسان کی فلاح و نجات پوشیدہ ہے۔ بعض لوگ ذکر کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ فقط زبان سے اللہ اللہ پکارنے کا نام ذکر ہے۔ یہ بہت محدود تصور ہے۔ ذکرِ الٰہی بہت وسیع صفت ہے۔ جب آپ کسی ہستی سے محبت و عقیدت رکھتے ہیں تو صرف

Marfat.com

زبان سے اس کا ذکر ہی نہیں کرتے بلکہ اس کی صفات کو بھی اپنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ لہٰذا اللہ کے ذکر کا مطلب بھی یہی ہونا چاہیے کہ آپ زبان سے بھی صفاتِ الٰہی کا ذکر کریں اور اپنے عمل میں اس کے قریب ہونے کی زیادہ سے زیادہ کوشش کریں اور عمل کے لیے جیسا کہ میں نے ابھی بیان کیا کوئی خاص میدان مخصوص نہیں ہے۔ ہر شعبۂ حیات میں اطاعتِ الٰہی ضروری ہے۔

ذکرِ الٰہی سے انسان کو سکون ملتا ہے اور اس کا ایمان ترقی کرتا ہے۔ ذکر سے غافل رہنے والے نقصان اٹھاتے اور ناکام رہتے ہیں۔ ان کو سکون و اطمینان میسّر نہیں آتا۔ وہ ہر معاملے میں پریشان رہتے ہیں اور ہر کسی سے ڈرتے ہیں۔ ان میں وہ اعتماد، وہ جراٴت، وہ ہمت اور وہ ثابت قدمی پیدا نہیں ہوتی کہ جو کامیاب اور پُرسکون زندگی کے لیے ضروری ہے۔

سرورِ کائنات سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلّم سے دریافت کیا گیا کہ اللہ کے بندوں میں قیامت کے دن کن لوگوں کا درجہ بلند ہوگا، حضور صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا:

"اللہ کا ذکر کرنے والے (لوگوں کا)، چاہے وہ مرد ہوں یا عورتیں۔"

ایک اور حدیث پاک میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے ارشاد فرمایا کہ:

"اللہ کو یاد کرنے والے کی مثال اور یاد نہ کرنے والے کی مثال زندہ اور مردہ کی سی ہے۔"

یعنی یاد کرنے والا زندہ ہے اور یاد نہ کرنے والا مردہ ہے۔

سورۂ احزاب میں فرمانِ الٰہی ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اذْكُرُوا اللَّهَ ذِكْرًا كَثِيرًا ۝ وَسَبِّحُوهُ بُكْرَةً وَأَصِيلًا ۝ (الاحزاب: ۴۱-۴۲)

یعنی: "اے ایمان والو! اللہ کا ذکر کرو اور بہت ذکر کرو۔ اور صبح و شام اس کی پاکی بیان کرو۔"

غور فرمائیے کہ ذکرِ الٰہی کی تاکید کس جامعیت کے ساتھ فرمائی گئی ہے۔ بات یہ ہے کہ جس طرح جسم کی زندگی کھانے پینے پر منحصر ہے اور اگر جسم کو غذا میسّر نہ آئے تو اس کا زندہ رہنا محال ہے اسی طرح روح کی زندگی کے لیے اللہ تعالیٰ کا ذکر اور اس کی یاد ضروری ہے۔ ذکرِ الٰہی کے بغیر روح زندہ نہیں رہ سکتی۔ ذکر کے بغیر روح مردہ و مضمحل ہو جاتی ہے۔ اور جب انسان کی روح ہی مردہ ہو جائے تو پھر زندگی کس کام کی۔ ایک بے روح جسم کس کام کا۔ لہٰذا ذکر کے بغیر زندگی بے معنی اور بے مقصد ہے۔ بے مقصد زندگی حیوانوں کو تو زیب دیتی ہے، انسانوں کو زیب نہیں دیتی۔ مقصد ہی سے زندگی میں خوبی اور توانائی آتی ہے۔ مقصد ہی انسان کو توانا اور ثابت قدم بناتا ہے۔ مقصد ہی مصیبتوں اور مشکلات میں عزم اور ہمّت بخشتا ہے۔

ابھی میں نے کہا ہے کہ ذکرِ الٰہی کا مطلب زبان سے صرف اللہ اللہ پکارنا ہی نہیں ہے۔

Marfat.com

اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ زبان سے ذکرِ الٰہی ضروری نہیں ہے یا اس کی اہمیت اور افادیت نہیں ہے۔ نہیں۔ زبان سے ذکرِ الٰہی بھی ضروری ہے کیوں کہ اس طرح بھی عمل کی توفیق ملتی ہے اور احکامِ الٰہی کی پابندی کی ترغیب ہوتی ہے۔ انسان اللہ تعالیٰ سے قریب تر ہوتا جاتا ہے اور غیر اللہ سے دور ہوتا جاتا ہے۔ اسی لیے اللہ کے نیک بندوں کی زبانیں ذکرِ الٰہی سے تر رہتی ہیں۔ اور ان کے دل و دماغ پر ہر وقت تصورِ الٰہی غالب رہتا ہے۔ ان کا قلبی تعلق بڑھتا رہتا ہے اور دل آئینے کی طرح صاف ہو جاتا ہے۔ لہٰذا زبانی ذکر کو بھی غیر ضروری نہیں سمجھنا چاہیے۔ یہ بے فائدہ عمل نہیں ہے۔ البتہ یہ خیال رکھنا چاہیے کہ زبان اور عمل میں تضاد نہ ہو۔ زبان پر ذکرِ الٰہی اور عمل میں غیر اللہ کی اطاعت، یہ متضاد چیزیں ہیں۔ اس سے خسارے کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

"حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے حدیث قدسی مروی ہے کہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ بندہ جب مجھے یاد کرتا ہے اور میرے ذکر سے اس کے ہونٹوں کو حرکت ہوتی ہے تو میں اس کے ساتھ ہوتا ہوں۔"

یہ احساس کہ اللہ تعالیٰ میرے ساتھ ہے کتنی بڑی قوت ہے۔ اس کا اندازہ کرنا بہت مشکل ہے، لیکن ناممکن نہیں ہے۔ جب انسان اس راہ پر چلنا شروع کر دے تو اللہ تعالیٰ بھی اس سے قریب آنا شروع کر دیتا ہے اور پھر بندے کو وہ استقامت اور ثابت قدمی نصیب ہوتی ہے کہ دنیا کی کوئی طاقت اس کو راہ سے نہیں بھٹکا سکتی۔

اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ ۝ (الرعد: ۲۸)

یعنی: "یاد رکھو۔ دلوں کو اللہ کے ذکر ہی سے چین ملتا ہے۔"

Marfat.com

خشیتِ الٰہی

انسان کے تمام افعال و اعمال کے محرکات میں دو ہی جذبے اہم ہوتے ہیں: خوف اور محبت۔ ان دونوں کے لوازم اور نتائج الگ الگ ہیں۔ محبت کے دعوے کا نتیجہ کبھی کبھی انسان کی عملی زندگی میں نافرمانی اور گستاخی کی صورت میں بھی ظاہر ہوتا ہے۔ محبوب کے کرم پر غایت اعتماد کی وجہ سے محبت کرنے والا اس کے احکام سے غافل بھی ہو جاتا ہے، اس لیے جس کردار کی تعمیر محض محبت کی بنیاد پر ہو گی اس میں توازن نہیں ہو گا اور اسلام کی تو خصوصیت ہی یہ ہے کہ وہ ہر معاملے میں توازن پیدا کرنا چاہتا ہے۔ ہمارے پورے نظامِ زندگی کی روح بھی عدل و توازن ہے۔ بلاشبہ قرآنِ کریم مومنوں کے دلوں کو اللہ تعالیٰ کی محبت سے بھی معمور دیکھنا چاہتا ہے، اس کی رحمت، اس کی رافت، اس کی ربوبیت، اس کی صفتِ تخلیق، اس کی رزق رسانی، اس کی قدرتِ بے پایاں اور اپنی بندگی اس سے محبت ہی کا تقاضا کرتی ہے۔ لیکن اس عطا و بخشش کے ساتھ ساتھ اس نے ہمارے کچھ فرائض بھی مقرر کیے ہیں، کچھ ہمیں احکام بھی دیے ہیں، اور بعض باتوں سے دور رہنے کی بھی سخت تاکید کی ہے۔ ان کو مختصر الفاظ میں ہم حدود اللہ کہہ سکتے ہیں۔

قرآن یہ چاہتا ہے کہ سارے انسان اور خاص طور پر وہ لوگ جو ایمان کا دعوا رکھتے ہیں، وہ اللہ تعالیٰ کے قائم کردہ حدود کے اندر اپنی زندگی گزاریں۔ ان میں صداقت ہو، پاک بازی ہو اور ان کے اخلاق و اعمال منکرات اور ناپسندیدہ باتوں سے محفوظ ہوں۔ یہ صورت صرف اللہ تعالیٰ کی محبت کے جذبے سے نہیں پیدا ہو گی بلکہ خوف و خشیت سے پیدا ہو گی، اس لیے قرآنِ پاک جہاں مومنوں کے اوصاف میں اللہ سے ان کی والہانہ محبت کا ذکر کرتا ہے وہاں ان کے خوف و خشیت کا ذکر بھی کرتا ہے۔

وَهُم مِّنْ خَشْيَتِهِ مُشْفِقُونَ ○ (الانبیا: ۲۸)

ترجمہ: اور وہ اس کے خوف سے ڈرے رہتے ہیں۔

یعنی صرف ڈرتے ہی نہیں، بلکہ لرزہ براندام رہتے ہیں، ایسا خوف اللہ کی عظمت اور کبریائی کے صحیح علم و تصور سے پیدا ہوتا ہے۔ جو شخص اللہ کے سامنے اپنی جواب دہی کا احساس رکھتا ہو گا، جزا اور سزا پر پختہ یقین رکھتا ہو گا اور جو یہ جانتا ہو کہ اللہ تعالیٰ غفور اور رحیم بھی ہے اور شدید العقاب بھی

Marfat.com

ہے، وہ اپنے بندوں کو سزا بھی دیتا ہے، ان پر کرم بھی فرماتا ہے، وہ نوازتا بھی ہے، اور محروم بھی کرتا ہے، وہ یقیناً اس سے محبت بھی کرتا ہوگا اور اس سے ڈرتا بھی ہوگا۔

خوف و خشیّت کو قرآن نے مومنوں کا صرف وصف ہی نہیں بتایا ہے بلکہ اس کی تاکید بھی کی ہے:

وَخَافُونِ اِنۡ کُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ ۝ (آل عمران: ۱۷۵)

ترجمہ: "مجھ سے ڈرو اگر تم حقیقت میں صاحبِ ایمان ہو"

اس سے معلوم ہوا کہ خوفِ الٰہی کے بغیر ایمان مکمل نہیں ہوسکتا۔ جس کے دل میں اللہ تعالیٰ کا خوف نہیں ہے وہ بڑے سے بڑے گناہ کا مرتکب ہوسکتا ہے۔ انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین ہیئتِ اجتماعی کی تنظیم میں معاون ضرور ثابت ہوتے ہیں، اور تعزیرات کی وجہ سے بڑی حد تک معاشرہ فتنہ و شر سے محفوظ بھی رہتا ہے، لیکن قوانین کی موجودگی کے باوصف جرائم نہ صرف سرزد ہوتے ہیں بلکہ آج کی دنیا میں تو ہر طرح کی بے راہ روی اور لاقانونیت میں اضافہ ہی ہوتا جارہا ہے۔ غیر مسلم معاشرے میں کردار کی کمزوری پر تو حیرت نہیں ہے، لیکن ایمان و اسلام کا دعوا کرنے والی جماعتوں میں اگر احکامِ الٰہی کی علانیہ خلاف ورزی ہو تو پھر ہمیں یہ کہنا پڑے گا کہ ہمارا ایمان ناپختہ ہے اور اللہ تعالیٰ کی عظمت کا تصور اور قیامت میں اس کے حضور اپنی جواب دہی کا احساس نہیں ہے۔ اسی لیے قرآنِ پاک میں خوفِ خدا کو علم کا نتیجہ کہا گیا ہے:

اِنَّمَا یَخۡشَی اللّٰہَ مِنۡ عِبَادِہِ الۡعُلَمٰٓؤُا ؕ (الفاطر: ۲۸)

یعنی: اللہ کے بندوں میں صرف علم رکھنے والے لوگ ہی اس سے ڈرتے ہیں۔

یہ ہمیں ذہن نشین کرلینا چاہیے کہ علم سے یہاں محکم ایمان اور پختہ یقین مراد ہے، اور اللہ تعالیٰ کی ساری صفات پر ایسا ایمان مراد ہے جو مومن کی رفتار و گفتار، قول و عمل، فکر و خیال، اخلاق و عبادات سب میں خشیتِ الٰہی کا جذبہ پیدا کرے۔ ظاہر ہے کہ انسان جس کو اچھی طرح نہ جانتا ہو، جس کے بارے میں مجملاً صرف یہ علم ہو کہ وہ بڑی قدرت اور اختیار والا ہے، لیکن اس کے اقتدار و اختیار کے مکمل تصور سے ناآشنا ہو، اس کے دل میں کس طرح خوف پیدا ہوسکتا ہے؟ اس لیے ہمیں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ خوفِ خدا کے تقاضے اہلِ علم اور اہلِ ایمان ہی پورے کرسکتے ہیں۔

خوف ہی کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے ایک مقام پر یہ بھی ارشاد فرمایا ہے:

وَاِیَّایَ فَارۡهَبُوۡنِ (البقرہ: ۴۱)

یعنی: اور مجھ ہی سے تم ڈرو۔

یہ آیت ہمیں صاف صاف بتارہی ہے کہ دنیا میں ڈرنے کے لائق صرف خدائے واحد ہی ہے۔

Marfat.com

مومن کے دل میں کبھی غیر اللہ کا خوف جاگزیں نہیں ہو سکتا، اس لیے کہ وہ جانتا ہے کہ سارے انسان اس کی طرح اللہ کے محتاج ہیں، اللہ کے سوا کسی میں نفع و نقصان پہنچانے کی طاقت نہیں اور اللہ کے سوا کوئی حیات و موت کا مالک نہیں، نہ کوئی دے سکتا ہے، نہ کوئی محروم کر سکتا ہے، اور یہی اختیارات ہیں جن کی بنا پر انسان کے دل میں خوف پیدا ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ساری صفات اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں، پھر خوف و خشیت کی مستحق بھی اسی کی ذاتِ پاک ہے، اسی لیے قرآن کریم میں زور دے کر فرمایا گیا کہ "مجھ ہی سے ڈرو۔"

اللہ کے خوف کی جب اتنی شدید تاکید قرآن میں کی گئی ہے اور اس کو ایمان کا تقاضا قرار دیا گیا ہے تو ہمیں یہ بھی غور کرنا چاہیے کہ اس خوف و خشیت کے کیا نتائج ایک مومن کی زندگی پر مترتب ہوتے ہیں۔

وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ۙ فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى ؕ (النّٰزعٰت: ۴۰-۴۱)

یعنی: اور جو کوئی ڈرا ہو اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے سے، اور روکا ہو اس نے جی کو خواہش سے، سو بہشت ہی ہے اس کا ٹھکانا۔

خوفِ الٰہی کا ایک بڑا تقاضا قلب کو ان خواہشوں سے محفوظ رکھنا ہے جو خلافِ حق ہیں۔ معاملات و عبادات کے تمام شعبوں میں احکامِ خداوندی اور سنّتِ نبوی کا اتباع خشیت کے نتائج اور ثمرات ہیں۔ ایمان کا تقاضا تو یہی ہے کہ مومن اپنے ہر قول و عمل کے سلسلے میں ہر وقت یہ خوف محسوس کرتا رہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حضور کیا جواب دے گا۔ اس طرح وہ اپنا احتساب خود کرتا ہے۔ خوف کا ایک مقام اور بھی ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کے خاص اور مقرب بندوں کے لیے ہے، یعنی وہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہیں کہ کسی خطا و لغزش کی بنا پر کہیں وہ اس کی نظروں سے گر نہ جائیں اور جو نعمتیں ملی ہیں وہ سلب نہ ہو جائیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بخشی ہوئی ہر چیز اپنی جگہ پر نعمت کبریٰ ہے۔ کیا یہ نعمت نہیں ہے کہ اس نے ہمیں ایمان کی دولت بخشی؟ کیا یہ نعمت نہیں ہے کہ ہمیں خیر الامم قرار دیا؟ کیا یہ نعمت نہیں کہ ہماری ہدایت و رہبری کے لیے خاتم الانبیا صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیجا؟ کیا یہ نعمت نہیں ہے کہ قرآنِ پاک کو ایک مکمل نظامِ زندگی بنا کر نازل فرمایا؟۔

اب ہمارا فرض یہ ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کے ان احسانات کا شکر بھی ادا کرتے رہیں اور اس بات سے خوف بھی محسوس کرتے رہیں کہ کہیں کسی گناہ کی وجہ سے یہ نعمتیں سلب نہ کر لی جائیں۔

اللہ تعالیٰ نے ہمیں تاکید فرمائی ہے کہ:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ○ (آلِ عمران: ۱۰۲)

یعنی: اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو جیسا کہ ڈرنے کا حق ہے۔ تم کو موت نہ آنے مگر اس حالت میں کہ مسلم ہو۔

Marfat.com

ہمیں ہمیشہ دولتِ ایمان و اسلام کی حفاظت کرنی چاہیے۔ ہماری یہ کوشش انفرادی اور اجتماعی سطح پر ہونی چاہیے۔ ایسا نہ ہو کہ مسلسل نافرمانیوں اور پے در پے معصیتوں کی وجہ سے سوءِ انجام سے دوچار ہونا پڑے، کیوں کہ ایمان کی حفاظت صرف تصدیق بالقلب اور اظہار باللسان ہی سے نہیں ہو سکتی، بلکہ اعمالِ صالحہ اور تزکیۂ اخلاق سے ہوگی اور ہمیں زندگی کے سفر میں یہ خوف محسوس کرنا ہوگا کہ کہیں ہماری غفلت اور کوتاہی ہمیں اللہ کے پاس ذلت و رسوائی سے دوچار نہ کر دے کہ نتیجتاً ہم اس حال میں اُس کی بارگاہ میں حاضر ہوں کہ دل ایمان کی دولت سے خالی ہو۔

یہ بات ہمیں اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ انفرادی سطح پر ایک صاحبِ ایمان کو مکمل احکامِ الٰہیہ کے مطابق زندگی گزارنے کے سلسلے میں ابتلا و آزمائش کے کئی مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے جہاں قدم ڈگمگانے لگتے ہیں۔ اس لیے استقامت کے ساتھ ساتھ اس بات کی تاکید فرمائی گئی کہ ایمانی زندگی بسر کرنے کے لیے ماحول پیدا کیا جائے اور امت کے سارے افراد ہر سطح پر قرآنی نظام کے سانچے میں اپنی زندگی کو ڈھالنے کی پوری پوری جد و جہد کریں تاکہ خشیتِ الٰہی امتِ مسلمہ کے تمام اعمال و اخلاق کی بنیاد بن جائے اور دنیا میں ایک معتدل اور متوازن معاشرہ قائم ہو سکے۔

یہاں یہ واضح کر دینا بہت ضروری ہے کہ خوف کا زیادہ بڑھ جانا بھی قرآنی ہدایات کے خلاف ہے۔ اسلامی طرزِ زندگی وہ ہے جس میں امید و خوف دونوں جذبات و محرکات کی جھلکیاں موجود ہوں۔ اس کی بہترین مثالیں سیرتِ طیبہ اور اسوۂ صحابہ رضی اللہ عنہم میں ملتی ہیں۔ مومنِ کامل وہ ہے جو شدید خوف کی بنا پر نہ تو مایوس ہو جائے اور نہ خشیت ترک کر کے امید کی بنا پر احکام سے غافل ہو جائے۔ بغیر خشیت کے امید بھی بے معنی ہے۔ جو ڈرتا ہے وہی امیدِ کرم بھی رکھ سکتا ہے۔ اس لیے خشیتِ الٰہی کو ایمان کا بنیادی تقاضا کہنا چاہیے اور امید کو اس کے تابع سمجھنا چاہیے۔

Marfat.com

اُسوۂ ابراہیمی

حضرت نوح علیہ السّلام کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السّلام پہلے نبی ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے دینِ حق کی عالم گیر دعوت کے لیے مبعوث فرمایا تھا۔ قرآنِ حکیم نے آپ کی داعیانہ زندگی، آپ کی پاک اور بلند سیرت، عقیدۂ توحید کی اشاعت و تبلیغ کی راہ میں آپؑ کی عظیم الشان قربانی کو اُمّتِ مُسلمہ کے لیے نمونۂ عمل اور اُسوہ قرار دیا ہے۔

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ دنیا میں سارے انبیائے کرام علیہم السّلام کی بعثت توحید ہی کی تعلیم کے لیے ہوئی ہے، اور قرآن شاہد ہے کہ حضرت آدمؑ سے لے کر خاتم الانبیاءؐ تک سارے نبیوں کی تعلیم کی بنا اور اساس توحید ہی رہی ہے، لیکن حضرت ابراہیم علیہ السّلام بھی نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح اُن ممتاز انبیائے کرام میں ہیں کہ جن کی سیرت کو قرآنِ حکیم میں قابلِ تقلید نمونہ کہا گیا ہے۔ انبیائے کرام کی بعثت تو اطاعت کے لیے ہوتی ہی ہے، کیوں کہ وہ اللہ کے بندوں کو اللہ کے احکام اور ہدایات پہنچاتے ہیں، لیکن جب کسی نبی کی زندگی کو خاص طور پر قرآن نمونہ و مثال کہتا ہے تو وہ یقیناً اُن واقعات کی طرف اشارہ کرتا ہے جن میں پوری نوعِ انسانی کے لیے کوئی پیغام ہوتا ہے یا پھر اس کی تعلیم کا کوئی پہلو ہمہ گیر ہوتا ہے اور حُسن و صداقت کی ایسی بے پناہ کشش رکھتا ہے کہ اللہ کی نظروں میں ساری دُنیا کے لیے اور انسانی تاریخ کے ہر دور کے لیے سامانِ فلاح ہوتا ہے۔

بلاشبہ سیرتِ طیّبہ کی ہمہ گیری، پیام کی عالم گیری، اَبدیّت، نیز اُسوۂ حَسَنہ کا ساری دُنیا کے لیے قابلِ تقلید ہونا، خصائصِ مُصطفوی میں ہے۔ لیکن تعلیماتِ انبیا میں جو چیز مشترک رہی ہے وہ توحید ہے اور اس راہ میں حضرت ابراہیم علیہ السّلام کی زندگی بھی ایسے روشن چراغ کی حیثیت رکھتی ہے جس کی روشنی قیامت تک باقی رہے گی۔

آپ کی شانِ تسلیم و رَضا، آپ کی بے لاگ اطاعت اور آگ کے شعلوں میں گھِر کر بھی اللہ کی وحدانیت کا اعلان اپنے اندر عبرت و موعظت کا ہمہ گیر پہلو رکھتا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السّلام کے زمانے میں قوم صرف شرک اور بُت پرستی میں مبتلا نہیں

Marfat.com

تھی بلکہ اُس کی معاشی، تمدّنی، سیاسی اور معاشرتی زندگی کا سارا نظام ہی اِس بےعقیدگی پر مبنی تھا۔ اب آپ حضرت ابراہیمؑ کی ہمّت وعزیمت کا اندازہ کیجیے کہ ایک ایسے ماحول میں کہ جہاں ہر کھاتے پیتے خاندان کے افراد معبودِ باطل بنے بیٹھے تھے، جہاں شہنشاہِ وقت کی بھی پرستش ہوتی تھی، جہاں بُت خانے کے پجاریوں کو بھی خدا سمجھا جاتا تھا، اس ماحول میں خدائے واحد کی پرستش کا اعلان اپنے خلاف چاروں طرف زبردست محاذ قائم کرنے کے مترادف تھا یا نہیں۔ یعنی آپ کو صرف مذہب اور عقیدے کے محاذ پر باطل پرستوں سے جنگ نہیں کرنی تھی بلکہ مُعاشرت اور سیاست کے محاذ پر بھی معرکے سر کرنے تھے۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی، بلکہ اپنے اثرات اور عمل کے لحاظ سے ایک انتہائی دُور رس اور ہنگامہ خیز ذمّے داری تھی جو آپ پر ڈالی گئی۔ آپ کی دعوت دراصل مذہبی بادشاہت کے خلاف اعلانِ جنگ تھی۔ توحید کی اس آواز نے سارے ملک میں طوفان اٹھادیا۔ اور یہ مخالفتوں کا طوفان تھا۔ ایک طرف شہنشاہیت اپنے لاؤلشکر سمیت مستعد تو دوسری طرف مذہبی ٹھیکے دار تیر و تبر کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس طرح حق کی آواز کو دبانے کے لیے پورا معاشرہ اپنی مشرکانہ روایات کی بنا پر اس نعرے کو اجنبی سمجھ کر حضرت ابراہیمؑ کے درپئے آزار ہوگیا۔

جس نظامِ شرک سے توحید کی معرکہ آرائی ہو رہی تھی اس کی حقیقت اچھی طرح سمجھ لیجیے! اس نظام سے متسلک کوئی فرد ایسا نہیں تھا جو اللہ کے وجود کا منکر ہو مگر اس کے ساتھ ساتھ دوسروں کو بھی اپنا حاجت رَوا تصوّر کرتا تھا اور اللہ کو رَبُّ الْاَرْبَاب مانتا تھا۔ ان ہی باطل خداؤں میں مقبروں کے پُجاری اور تخت و اورنگ پر بیٹھنے والے بادشاہ بھی تھے، اور سوسائٹی انھیں فوق البشر سمجھتی تھی۔ اس مُعاشرے کی توہّم پرستی، اس کے جہل اور بےبصری کا یہ عالم تھا کہ وہ فرشتوں، جنوں اور چاند تاروں تک کو خدائی میں شریک سمجھتا تھا۔ زندگی کے لیے قانون سازی کا سارا حق اس مُعاشرے میں صرف بادشاہوں اور اُونچے خاندان کے لوگوں کو تھا۔ بادشاہِ وقت کا یہ دعوا تھا کہ ملک اور اس کے باشندوں کا حاکمِ مطلق وہ ہے۔ اُس کی زبان قانون ہے اور اُس سے بالاتر اقتدار کسی کا نہیں اور جو شخص اُس کی اِس حیثیت کو تسلیم نہیں کرتا، وہ صرف قانونی اور سیاسی طور پر ہی باغی اور مجرم نہیں ہے بلکہ وہ دینِ اجداد کا بھی دشمن ہے، اور اس انحراف کی بنا پر گردن زدنی ہے۔ چناں چہ دربارِ شاہی نے حضرت ابراہیمؑ کو قید میں ڈال دینے کا حکم صادر کردیا۔ دس روز تک وہ جیل میں رہے۔ پھر شاہی کونسل نے ان کو زندہ جلادینے کا فیصلہ کیا۔

Marfat.com

پورے معاشرے کی بیزاری مول لے کر، حاکمِ وقت سے ٹکرا کر، جیل میں بند ہو کر اور آگ کے لپکتے ہوئے شعلوں میں زندہ جلا ڈالنے کا حکم سُن کر بھی وہ اللہ کو ایک اور صرف ایک کہتے رہے اور ان کے پائے ثبات میں کوئی لغزش نہ آئی۔ قرآنِ پاک شاہد ہے کہ زندہ جلا دینے کی بات صرف دھونس اور دھمکی نہیں تھی، بلکہ واقعی آگ کا الاؤ تیار کیا گیا، اور حضرت ابراہیمؑ کو اس میں پھینکا گیا، مگر اللہ کے حکم سے آگ اُن کے لیے بے ضرر اور بے سوز ہو گئی۔ قومِ ابراہیمؑ تو تباہ ہو گئی، نمرود کا نام و نشان مٹ گیا، مگر خدائے واحد کی بندگی کی دعوت دینے والے حضرتِ ابراہیمؑ اور اُن کے مبارک فرزندوں حضرت اسمٰعیل و حضرت اسحاقؑ کو بقا کی دولت نصیب ہوئی۔ چالیس صدیوں تک دینِ برحق کی روشنی جہاں کہیں نظر آئی، وہ انھی پاک باطن انبیا کے سوزِ دروں کی رہینِ منّت تھی۔

حضرتِ ابراہیمؑ کے اُسوۂ حسنہ کا ایک اور بھی پہلو ہے جو توکل علی اللہ سے عبارت ہے۔ اہلیہ محترمہ اور کم سِن بچّے کو صرف اللہ کے حکم اور اس کی حفاظت کے بھروسے پر بے آب و گیاہ میدان میں چھوڑنا اور اپنے جگر گوشے کو اپنے ہاتھوں سے قربان کرنے کے لیے آخری قدم تک اٹھا لینا اور اس طرح ساری دنیا کو اسلام کا حقیقی مفہوم سمجھانا آپ کی پیغمبرانہ زندگی کا وہ روشن باب ہے جس کے ہر ہر جزو پر عمل اور اس کی یاد کو اللہ تعالیٰ نے شعائرِ اسلام میں شامل فرما دیا ہے۔

ان تمام فرائض کی ادائی اور ان تمام تر آزمائشوں سے گزرنے کے بعد آپ کی زندگی میں جو سب سے نمایاں وصف پیدا ہوا وہ آپ کا عجز و انکسار ہے جس کے اظہار کے لیے آپ فرمایا کرتے تھے کہ "میں نے اپنا رُخ اُس ذاتِ اقدس کی طرف کیا جس نے آسمان و زمین کو پیدا کیا، اُس کی بارگاہِ عظمت میں میرا سر خم ہے اور دل ہر حکم کی تعمیل کے لیے آمادہ ہے اور مَیں مشرکوں میں سے نہیں ہوں بلکہ سر جھکانے والوں میں سے ہوں"۔ یہی ادائے جاں سپاری کی یہی طاعت اور سر فروشی، یہی حکیمانہ استدلالِ توحید کی خاطر سارے عالم سے اُن کی ٹکّر اور جبر و اِستبداد کے سارے مراحل سے گزر کر بالآخر دینِ الٰہی کا قائم کر دینا اور پوری نوعِ انسانی کے لیے خانۂ کعبہ کی صورت میں ایک عالمی مرکزِ توحید قائم کرنا خداوند تعالیٰ کو ایسا پسند آیا کہ صرف اُنھی کی زندگی نہیں بلکہ راہِ حق اور جادۂ توحید پر چلنے میں جن لوگوں نے بھی اُن کی پیروی کی سورۂ مُمتحِنہ میں اُن کی زندگیوں کو بھی ایک نمونہ قرار دیا گیا۔

اِسی اُسوۂ حسنہ کا مظہر صفا و مروہ کی سعی بھی ہے، مزدلفہ و عرفات کا قیام بھی ہے اور

Marfat.com

مُنیٰ کی قربانی بھی، نیز آبِ زم زم کا پینا اور طوافِ کعبہ اور تلبیہ بھی!! یہ سارے اسلامی شعائر وہ ہیں جن کے بارے میں بجا طور پر انھوں نے خود کہا تھا:

"وَ اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ"

اسی قربانی و اطاعت کا یہ صلہ ہے کہ اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ نے آپ کی زندگی کو قابلِ تقلید نمونہ قرار دیا ہے اور یہ بھی فرمایا ہے کہ ہم حُسنِ عمل والوں کو ایسی ہی جزا دیتے ہیں۔

Marfat.com

اللہ کے محبوب بندے

اللہ تعالیٰ کے محبوب بندے بلاشبہ وہ لوگ ہیں کہ جو اس کے احکام کی بالکل اسی طرح اطاعت کرتے ہیں جس طرح رسول اللہ ؐ نے بتایا اور عمل کر کے دکھایا ہے۔ رسول اللہ ؐ کی اطاعت ہی اللہ کی اطاعت ہے اور جن لوگوں نے اس حقیقت کو سمجھا اور اپنی بساط کے مطابق آپؐ کی پیروی کی، وہی اللہ تعالیٰ کے محبوب بندے ہیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جن کے اوصافِ حمیدہ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ حکیم میں بیان فرمائے ہیں، اللہ کو اس لیے محبوب تھے کہ وہ صرف نمازیں ہی نہیں پڑھتے تھے، بلکہ نماز کی روح سے بھی آشنا تھے۔ اس لیے تن، من دھن سب کچھ اللہ کی راہ میں قربان کرنے کے لیے ہمیشہ تیار رہتے تھے، اور ان کی عقیدت اور محبت کا یہ عالم تھا کہ ہر قسم کی قربانی بغیر کسی پس و پیش اور جبر و اکراہ کے پیش کرتے تھے۔ ان کی ارادت و اطاعت کا یہ عالم تھا کہ جب بھی آں حضرتؐ ان سے کوئی بات دریافت فرماتے تو جانتے ہوئے بھی پاسِ ادب سے یہی فرماتے تھے کہ اللہ کے رسولؐ بہتر جانتے ہیں۔ ان میں اولیت حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ کو حاصل تھی۔ قبولِ اسلام کے بعد وہ اسلام کی تبلیغ میں آں حضرتؐ کے دستِ راست بن گئے اور جو کچھ ان کے پاس تھا راہِ خدا میں سب نثار کر دیا اور میدانِ جاں نثاری میں کوئی دوسرا صحابی آپ سے بازی نہ لے جاسکا۔ بعض بعض مواقع پر گھر کا سارا اثاثہ اللہ کی راہ میں دے دیا۔ اور جب آں حضرتؐ نے ان سے پوچھا کہ اہل و عیال کے لیے بھی کچھ چھوڑا ہے تو عرض کیا کہ ان کے لیے اللہ اور اس کا رسولؐ کافی ہے۔ یہ ہیں اللہ کے محبوب بندے کی نشانیاں، جس کی تعریف خود رسول اللہ ؐ نے یہ کہہ کر فرمائی کہ سب کے احسان کا بدلہ ہم نے ادا کر دیا، لیکن حضرت ابوبکرؓ کے احسان کا بدلہ خود اللہ تعالیٰ ادا کرے گا۔

حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ اور تمام دوسرے صحابہؓ و صحابیاتؓ، اہلِ بیتؓ اور ازواجِ مطہراتؓ بھی اللہ کے محبوب بندوں میں شامل ہیں۔ ان محبوب ترین بندوں کی عجیب و غریب شان ہے کہ اللہ تعالیٰ خود "رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ وَرَضُوْا عَنْہُ" یعنی: "اللہ ان سے راضی ہے" جیسے الفاظ سے ان کی عزت افزائی فرماتا ہے۔ مالک ان سے خوش

Marfat.com

تھا اور خالق ان سے راضی تھا۔ اور اللہ تعالیٰ نے ان کے جذبۂ جاں نثاری کو اس طرح قبول فرمایا کہ وہ نہ صرف اپنی رضامندی کا اظہار کرتا ہے بلکہ یہ بھی کہتا ہے کہ اس کے یہ بندے ایسے محبوب ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی ذرہ نوازی سے خود بھی راضی اور خوش ہیں۔ بندے کی رضا کا اس طرح ذکر ان کے عجیب و غریب مقام کی نشان دہی کرتا ہے۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اللہ تعالیٰ کو اپنے بندوں میں صحابہ کرام ہی سب سے زیادہ محبوب رہے ہیں۔ چناں چہ آں حضرتؐ نے ان کی شان میں فرمایا کہ میرے اصحابؓ ستاروں کے مانند ہیں۔ تم ان میں سے جس کسی کی بھی پیروی کرو، راہِ حق پر رہو گے۔

اس سلسلے میں یہ دل چسپ اور اہم نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ بندوں میں سے صرف حضورؐ کو اللہ تعالیٰ نے اس عزت سے نوازا کہ جو کوئی رسول اللہؐ کی پیروی کرے گا، اللہ اس سے محبت کرے گا اور رسول اللہؐ نے یہ مرتبہ اپنے اصحاب کو دیا کہ ان کی پیروی رسول اللہؐ کی خوش نودی کا باعث ہے، جس کا مطلب اللہ کی خوش نودی اور رضا ہے۔

یوں تو صحابہ کرامؓ سب کے سب اللہ کے محبوب ترین بندے ہیں، لیکن ان میں بعضوں کا یہ مرتبہ بھی ہے کہ ان کے ایثار سے اللہ تعالیٰ ایسا خوش ہوتا تھا کہ ان کا ذکر قرآنِ حکیم میں بھی فرما دیتا تھا۔ چناں چہ جب مدینہ کے انصارؓ نے مہاجرین کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور ان کے لیے بے مثال قربانیاں پیش کیں تو اللہ تعالیٰ ان سے بہت خوش ہوا۔ چناں چہ جب بنی النضیر کی زمین دو انصاریوں کے سوا مہاجرین میں تقسیم کر دی گئی تو انصار نے ہنسی خوشی اس فیصلے کو تسلیم کیا۔ اللہ تعالیٰ کو ان کا یہ ایثار بے حد پسند آیا۔ اور سورۂ حشر میں خاص طور پر مدح و ستائش کی گئی۔ تعلیماتِ اسلامیہ میں ایثار اور قربانی کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ عدل و احسان کو بلند مقام حاصل ہے۔ انسان سے محبت اور اس کا احترام بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ انصار اور مہاجرین کے مابین یہ تمام رشتے استوار تھے اور ان میں باہمی یگانگت اور محبت انسانیت کے لیے ایسا سبق اور درس ہے کہ جسے دوام اور ہمیشگی حاصل ہے۔

ایک دفعہ ایک بھوکا آدمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا۔ آپ نے فرمایا جو جو شخص آج کی رات اس کو اپنا مہمان بنائے گا، اللہ تعالیٰ اس پر رحم فرمائے گا۔ میزبانی کی سعادت ایک انصاری صحابیؓ کے حصے میں آئی۔ وہ اس کو اپنے گھر لے گئے۔ بیوی سے پوچھا کہ گھر میں کچھ ہے؟ بولیں صرف بچوں کا کھانا ہے۔ بولے بچوں کو سُلا دو اور چراغ کو بجھا دو۔ ہم دونوں رات بھر بھوکے رہیں گے اور مہمان پر ظاہر کریں گے کہ کھا رہے ہیں۔ چناں چہ انھوں نے ایسا ہی کیا۔ صبح کو

Marfat.com

رسول اللہؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپؐ نے فرمایا: "اللہ تبارک وتعالیٰ تمھارے اس حسنِ سلوک سے بہت خوش ہوا۔" بے شک ایسے انسان کہ جو دوسرے انسانوں کے لیے ایثار کریں اور ان سے محبت کریں، بے شک وہ اللہ کے محبوب بندے ہیں۔ وہ نہ صرف اللہ کے محبوب بندے ہیں، بلکہ معاشرہ بھی ایسے عظیم اور صاحبِ ایثار انسانوں کی قدر و منزلت کرتا ہے۔ قرآنِ حکیم کی آیت۔

وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۚ (الحشر: ۹)

یعنی: "یہ حضرات خود فاقے کرتے ہوں تب بھی ایثار پر آمادہ رہتے ہیں"۔ اسی سلسلے میں نازل ہوئی۔

غرض اللہ کے محبوب بندے وہی ہیں کہ جو اللہ کے ہر حکم کی بغیر کسی پس وپیش کے اطاعت کرتے ہیں اور رسول اللہؐ کے ہر فیصلے کو اس طرح تسلیم کرتے ہیں کہ دل میں ذرا بھی انقباض نہیں ہوتا۔ ان کے لیے محض یہ بات کافی ہے کہ رسول اللہؐ نے ایسا فرمایا یا فلاں معاملے میں رسول اللہؐ نے اس طرح عمل کیا۔ یہ اتباعِ سنت ہے اور اہلِ اسلام کے لیے اس کا بلند و اہم مقام ہے۔ اس کے بغیر ایمان کامل نہیں ہو سکتا۔

چناں چہ خلفائے راشدین کے دور میں عام طریقہ یہ تھا کہ ہر معاملے میں قرآن حکیم سے رجوع کیا جاتا، اور اگر وضاحت نہ ملتی تو رسول اللہؐ کا اسوہ دیکھا جاتا۔ اپنی رائے صرف اس وقت کام میں لائی جاتی جب قرآن اور سنت میں کوئی فیصلہ نظر نہیں آتا۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں فرمایا:

قُلْ إِن كُنتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ ۗ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ○

(آل عمران: ۳۱)

یعنی: "آپ کہہ دیجیے کہ اگر تم اللہ کی محبت چاہتے ہو میری اطاعت کرو، اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرے گا اور تمھارے گناہوں کو معاف کر دے گا۔ اور اللہ بڑا معاف کرنے والا اور رحم والا ہے۔"

اس واضح حکم سے یہ بات صاف ہو گئی کہ اللہ کے نیک اور محبوب بندے صرف وہی ہیں جو اللہ کے رسولؐ کی اطاعت اور پیروی کرتے ہیں۔ اس لیے جو لوگ اللہ کے محبوب بندوں کے زمرے میں شامل ہونا چاہتے ہیں، انھیں چاہیے کہ رسول اللہؐ کی حیاتِ طیبہ کا گہری نگاہ سے مطالعہ کریں اور اس پر زیادہ سے زیادہ عمل کرنے کی کوشش کریں۔ اپنی عبادت، اپنے اخلاق، اپنے مزاج، اپنے طور طریقے، ابنائے جنس کے ساتھ ہمدردی اور محبت سب کچھ کو رسول اللہؐ کے نمونے پر پورا اتارنے کی کوشش کریں۔ جو شخص رسول اللہؐ کے اسوۂ حسنہ پر جتنا زیادہ عمل کرے گا وہ اتنا ہی زیادہ اللہ کا محبوب بندہ ہوگا۔

اس کرۂ ارض پر مختلف اور متعدد اقوام و ملل آباد ہیں۔ ان کے اپنے اپنے معتقدات ہیں اور

Marfat.com

مذاہب ہیں۔ ان کی پہچان اور شناخت ان کے فکر و عمل سے ہوتی ہے اور ان کا طرزِ زندگی اور اندازِ بود و باش ان کے اعتقاد و مذہب کا عکاس ہوتا ہے اور وہی ان کا تشخص ہوتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ ایک مسلمان کا اپنا ملی تشخص کیا ہے؟ ایک مسلمان کی پہچان کیا ہے؟ اس سوال پر جس قدر بھی غور کریں، اس کا جواب بس ایک ہی ہے، اور وہ یہ ہے کہ مسلمان کا تشخص اور اس کی پہچان یہ ہے کہ وہ اللہ کو خالقِ کائنات تسلیم کرتا ہے اور اس کا یہ ایمان ہے کہ اس کرۂ ارض کی ہر شے کا مالک فقط اللہ تعالیٰ ہے، اور انسان بس اس کا امین ہے۔ مسلمان کا ایمان یہ ہے کہ وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کا رسول تسلیم کرتا ہے اور ہر کام میں زندگی بھر اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرتا ہے۔ اطیعواللہ و اطیعوالرّسول اس کا وظیرہ اور حاصلِ زندگی ہوتا ہے۔

ایسا انسان کہ جو قرآن کی تعلیمات کو تسلیم کرتا ہے اور اللہ کے رسولؐ کی حیاتِ طیبہ اور سنتِ رسولؐ کے مطابق زندگی بسر کرتا ہے، وہ بلاشک وشبہ اللہ تعالیٰ کا محبوب بندہ ہے۔ اور ایسا انسان فکر و عمل کے لحاظ سے، طرزِ زندگی کے اعتبار سے، اپنے مسلک و سلوک کی وجہ سے ہمیشہ سربلند رہتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ اس کے نیک اعمال کی وجہ سے اسے سرفرازی عطا فرماتا ہے۔ سچا اور صادق مسلمان ہمیشہ سرخ رو رہتا ہے۔ دینِ فطرت ہونے کی وجہ سے اسلام نے اپنی برتری کو ساری دنیا سے تسلیم کرالیا ہے۔ قرآنِ حکیم نے واشگاف الفاظ میں کہہ دیا ہے کہ:

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَام (آل عمران: ۱۹)

یعنی: "اللہ کے یہاں جو طریقِ زندگی مقبول ہے۔ وہ تو فقط اسلام ہے۔"

آئیے! ہم اہلِ پاکستان غور کریں کہ ہم خود اپنی سربلندی کے لیے کیا راستہ اختیار کریں اور اپنی سرفرازی کا کیا سامان کریں۔ راہ صاف ہے، روشنی موجود ہے، ہماری وقعت و عظمت کا راز اسی میں پوشیدہ ہے کہ ہم سچے مسلمان بنیں اور اپنی زندگیوں کو اسلام کے قالب میں ڈھالیں، پاکستان کی عظمت کا راز بھی اسی میں ہے۔ اللہ تعالیٰ ہماری مدد فرمائیں اور ہم اللہ تعالیٰ کے نیک و محبوب بندوں میں داخل ہوں۔

Marfat.com

خودی اور عبدیت

آج کی گفت گو کا موضوع ہے خودی اور عبدیت۔ اگر آپ احتیاط اور گہرائی کے ساتھ غور فرمائیں تو یہ محض دو الفاظ نہیں ہیں بلکہ یہ بنیادی اصطلاحات ہیں کہ جو ایک خاص طرزِ زندگی اور رمزِ حیات کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ خودی کی اصطلاح کتنی ہی غامض، وسیع اور فلسفیانہ کیوں نہ ہو اس کا مرکز اور محور بہر حال عرفانِ نفس ہے۔ اسی مقام پر پہنچ کر ہمارا ذہن اُس ہستی کی طرف منتقل ہوتا ہے کہ جس سے ہماری تخلیق کا رشتہ وابستہ اور قائم ہے اور اسی رشتے کے احساسِ کامل اور ادراکِ عمیق و بلیغ کا اصطلاحی نام عبدیت ہے۔ لہٰذا میں یہ عرض کرنے کی اجازت چاہوں گا کہ جہاں خودی ہے وہیں عبدیت بھی ہے، اور ان دونوں میں ایسا تلازم ہے کہ ہم ایک کو دوسرے سے جُدا نہیں کر سکتے۔

حقیقی عبدیت احکامِ خداوندی کی پوری پوری اطاعت اور غیر اللہ کی حاکمیت تسلیم کرنے سے انکار کا نام ہے۔ جو شخص خدائے واحد کو اپنا خالق، رزاق اور معبودِ حقیقی تصور کرتا ہے وہ درحقیقت سارے خداوندانِ باطل کی خدائی سے انکار کرتا ہے۔ یہ انکار کرنے والا ایک طرف تو اپنے عجز و نیاز اور اپنے رکوع و سجود کا مرکز صرف ایک ذات کو قرار دیتا ہے، دوسری طرف ہر جھوٹی عظمت کے سر پر تیشہ لگا کر اُسے پاش پاش کر کے اپنے وجود کی کرامت اور شرف و برتری کا بھرپور اظہار کرتا ہے۔ خودی درحقیقت خدائے واحد کی ایسی بندگی کا نام ہے جس میں آستانۂ غیر پر سر خم کرنے کا کوئی تصور ہی نہیں ہے۔ ہم اس کو بالفاظِ دیگر عرفانِ نفس بھی کہہ سکتے ہیں اور عرفانِ حق بھی۔

یوں فلسفیانہ طور پر خودی سے مُراد وہ استقلالِ ذاتی ہے کہ جو مخلوق کے علم و عمل کو ایک مخصوص دائرے میں نمایاں کرتا ہے، اُس کی ذات و صفات کے بود و نبود کے مظاہر کا تعین کرتا کرتا ہے، اور اس کی بالیدگی کا سامان فراہم کرتا ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خودی کی بالیدگی کا کیا مفہوم ہے؟ اور اس کے نشوونما کی منزل کیا ہے؟ نیز یہ کہ بود و نبود کے مظاہر سے کیا مراد ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ باطن میں اپنے وجود کا

Marfat.com

احساس جتنا گہرا ہوتا جائے گا وجود بخشنے والی ذاتِ اقدس سے رشتہ اتنا ہی مستحکم ہوتا جائے گا۔ اس رشتے کا استحکام خودی کی منزلِ کمال ہے اور یہ رشتہ ہے عبدیت کا جیسا کہ ارشاد فرمایا گیا ہے:

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ ﴿الذاریات: ۵۶﴾

بود و نبود کے مظاہر اعمال و کردار ہیں، اخلاق و اوصاف ہیں اور تسخیرِ انفس و آفاق ہے۔ اعمال و کردار میں جس انداز سے پاکیزگی آتی جاتی ہے اسی نسبت سے تسخیری قوت میں اضافہ ہوتا جاتا ہے اور فرد کی زندگی کائنات پر محیط ہوتی چلی جاتی ہے۔ اس کی سعی و عمل اور اس کی کاوش و جہد نتائج کی روشنی میں اس کو اپنے وجود کا یقین دلاتی جاتی ہے اور بالآخر اس میں خودی کا شعور پیدا کر دیتی ہے۔

اس منزل پر پہنچ کر ایک فطری خواہش سوال بن کر جنم لیتی ہے کہ خودی اور عبدیت کی شان کیا ہے اور اس کا نمونہ کیا ہے۔ یہ تلاش اور جستجو مظاہرۂ جبلت ہے اور اس کا جواب ایک انسان کا منتہائے فکر و مقصود ہوتا ہے۔ میں جواباً یہ کہوں گا کہ خودی اور عبدیت کا کامل ترین نمونہ ہمیں حیاتِ نبوی میں ملتا ہے۔ یہ آپؐ کی خودی اور عبدیت ہی کا مرتبۂ کمال تھا کہ آپؐ کے اسوۂ حسنہ کی پیروی کی دعوت سارے عالم کو دی گئی۔ یہ آپؐ کی شانِ عبدیت ہی تھی کہ آپؐ اور آپؐ کے اصحاب کو تمام ظاہری بے سر و سامانی کے باوجود دنیا کی کوئی طاقت خوف زدہ نہ نہ کر سکی۔ یہ آپؐ کی خودی ہی تھی کہ آپؐ نے عبدیت کاملہ کے ساتھ ساری دنیا اور اس کی خدائی کے جھوٹے دعوے داروں سے بے نیازی اختیار فرمائی تو اللہ تعالیٰ نے صرف انھی کو نہیں بلکہ شش جہات کو آپ کے لیے مسخر کر دیا۔

عزیزانِ من!

میں آپ کی توجہ اس حقیقت کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں کہ تسخیر کا یہ وعدہ ہر اُس شخص کے لیے ہے جو خودی اور عبدیت کی راہوں پر گام زن ہو۔ مگر بدقسمتی یہ ہے کہ ہم آج ایسے دور سے گزر رہے ہیں کہ اس میں نہ احساسِ خودی ہے اور نہ شعورِ عبدیت۔ قرآنِ حکیم نے ہمارے لیے جس روشنی کا انتظام کیا تھا اور سنتِ رسولؐ نے ہمیں جو ہدایات بخشی تھیں ان سے ہمارے فکر و نظر اور سعی و عمل کا دامن خالی ہو چکا ہے۔ نتیجے کے طور پر ہم سے قوموں کی امامت و قیادت کا منصب چھن چکا ہے اور ہم خوار و رسوا ہو کر مارے مارے پھر رہے ہیں۔ اپنی انفرادی خودی سے محروم ہو کر ہمارا مقدر یہ بنا ہے کہ ہم نے اپنے نظریۂ حیاتِ ملّی کو گم کر دیا ہے۔

Marfat.com

ہم اپنے مرکز سے منحرف ہو کر نظریاتِ غیر کی گرفت میں آگئے ہیں اور پھر اپنی ملی اور اجتماعی خودی کو ہم نے اس طرح پامال کیا ہے کہ صفِ اقوام و امم عالم میں ہمارا کوئی مقام مختص ہے اور نہ تشخص ہماری آرام طلبیوں نے اور ہماری عیش کوشیوں نے کاسۂ گدائی ہمارے ہاتھ میں دے دیا ہے اور ہم ہیں کہ ملک ملک بھیک مانگ رہے ہیں۔ ہمارا حال یہ ہو گیا ہے کہ:

لہم قلوب لایفقھون بھا — دل ہیں مگر ان سے سمجھتے نہیں
ولہم اعین لایبصرون بھا — آنکھیں ہیں مگر ان سے دیکھتے نہیں
ولہم آذان لایسمعون بھا — کان ہیں مگر ان سے سنتے نہیں

محنت و کاوش کے بغیر لقمہ حلق سے اُتارنا روحِ اسلامی کے سراسر منافی ہے۔ قرض کی اسلام نے کبھی تعریف نہیں کی۔ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جانا اور دوسروں کی امدادوں پر جینا شعائرِ اسلامی کے قطعاً خلاف ہے۔ اس سے انفرادی اور اجتماعی خودی پامال ہو کر رہ جاتی ہے۔ عرفانِ نفس اور عرفانِ حق کے بدیہی تقاضے یہ ہیں کہ ہم مسلمانانِ پاکستان اور مسلمانانِ پاکستان ہی کیوں مسلمانانِ عالم عبدیت کے معانی و مفاہیم کا لفظاً و معناً احساس اور ادراک کریں اور اپنی زندگی اور زندگی کے ہر شعبے میں عملاً اس کا مظاہرہ کریں۔

خودی کا مفہوم صرف اسی حالت میں ہماری سمجھ میں آسکتا ہے کیوں کہ ایک مسلمان کے لیے خودی اور عبدیت لازم و ملزوم ہیں۔ عبدیت ہی اس کی خودی ہے اور یہی وہ خودی ہے کہ جس نے مسلمان کو شرف اور امتیاز بخشا ہے اور یہی وہ خودی ہے کہ جس سے اہلِ اسلام اقوام و مللِ عالم میں امتیاز و تشخص حاصل کر سکتے ہیں۔ ضرورت ہے کہ ہم اپنی فکر و نظر کو وسعت دیں اور اپنے اخلاق و کردار کا حقیقت پسندانہ جائزہ لے کر ان کی بلندیوں کی طرف متوجہ ہوں۔ اپنے دل و دماغ کو ٹٹولیں اور اگر حواسِ ظاہر و باطن یہ گواہی دیں کہ ہم خودی لُٹا چکے ہیں تو پھر اب بھی وقت ہے کہ ہم سلامت روی اختیار کریں۔ اللہ تعالیٰ ہماری مدد فرمائیں۔

Marfat.com

اللہ سے سرکشی کا انجام

قرآنِ حکیم میں اللہ تعالیٰ نے بندوں سے اپنے جس تعلق کا سب سے زیادہ ذکر فرمایا ہے وہ رحم و رحمت کا تعلق ہے۔ اس تعلق کی بار بار اور مسلسل یاددہانی کی غرض سے مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ ہر چھوٹے بڑے، اہم اور کم اہم کام کی ابتدا اِس چھوٹے سے فقرے سے کریں جس میں اللہ کی رحمت کا سمندر موجیں مارتا نظر آتا ہے۔ وہ فقرہ ہے:

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ یعنی: "اللہ کے نام سے جو رحمٰن ہے اور رحیم"

اس مبارک فقرے میں اللہ تعالیٰ نے اپنی دو صفات بتائی ہیں یعنی رحمان اور رحیم ــــــ یہ دونوں اپنے مفہوم میں رحمت کا تصوّر رکھتی ہیں۔ یہ تاکید اور یہ تکرار ظاہر کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو جس طرف متوجہ فرمایا ہے وہ اس کی بے حد و حساب رحمت ہے، ایسی اور اتنی کہ انسان تصوّر بھی نہیں کر سکتا۔ قرآنِ حکیم، جو ہمارے لیے کتابِ ہدایت، ہماری ایمانی زندگی کا سرچشمہ، دنیاوی زندگی میں ہمارا قائد اور رہ نما، آخرت کے لیے ہمارا سہارا اور ہماری ابدی نجات اور فلاح کا ضامن، یہیں دنیا اور آخرت میں، دونوں جگہ کامیابی کی راہ دکھانے والا اور کامیابی سے ہم کنار کرنے والا ہے۔ خود اس کے بارے میں بھی اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

ھٰذَا بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّکُمْ وَھُدًی وَّرَحْمَۃٌ (الاعراف: ۲۰۳)

یعنی: "یہ کتاب سامانِ بصیرت ہے تمھارے رب کی طرف سے اور سراپا ہدایت و رحمت۔"

اس کتابِ ہدایت اور اس سرچشمۂ رحمت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو سیدھی راہ چلنے کی طرف رہ نمائی کی ہے، اور غلط راہوں پر جانے سے روکا ہے۔ یہی اس کے اوامر اور نواہی ہیں۔ لیکن انسان اپنی جلد باز طبیعت اور نزدیک بیں فطرت کی بنا پر بہت سی اچھی باتوں کو اپنے لیے بوجھ سمجھتا ہے اور اسے ان میں اپنا نقصان دکھائی دیتا ہے۔ بہت سی بُری باتوں میں اپنے لیے سامانِ راحت دیکھتا ہے اور انھیں اپنے لیے نفع بخش خیال کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ جو انسان کی اس کمزوری سے خوب واقف ہے، فرماتا ہے:

وَعَسٰۤی اَنْ تَکْرَھُوْا شَیْئًا وَّھُوَ خَیْرٌ لَّکُمْ وَعَسٰۤی اَنْ تُحِبُّوْا شَیْئًا وَّھُوَ شَرٌّ لَّکُمْ وَاللّٰہُ یَعْلَمُ وَاَنْتُمْ

Marfat.com

لَا تَعْلَمُوْنَ ○ (البقرہ: ۲۱۶)

یعنی: "ہو سکتا ہے کہ ایک چیز تمھیں ناگوار ہو حالانکہ اس میں تمھاری بھلائی ہے اور ہو سکتا ہے کہ کوئی بات تمھیں پسند ہو اور اس میں تمھارے لیے برائی ہو۔ اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔"

اللہ جو قادرِ مطلق ہے اَحکم الحاکمین ہے، انسان کو محض حکم ہی نہیں دیتا، بلکہ اس کو اس بات کا یقین بھی دلاتا ہے کہ اللہ کا حکم ماننے میں تمھاری بھلائی ہے۔ قرآنِ مجید میں جہاں بھی کسی بات کا حکم دیا گیا ہے یا کسی بات سے روکا گیا ہے اللہ تعالیٰ نے محض قانون کی زبان میں یہ بات نہیں کہی، بلکہ ایک رحیم و کریم آقا کی طرح، ایک واقفِ حال مُربّی کے انداز میں، اور اپنے بندوں اور اپنی مخلوق پر رحم کرنے والے اور شفقت کا برتاؤ کرنے والے رب کی حیثیت سے کہی ہے۔ اللہ تعالیٰ بار بار اور بہ تکرار یہ فرماتا ہے کہ اللہ تمھیں جن باتوں کا حکم دیتا ہے اُن پر عمل کرنے میں تمھاری ہی بھلائی ہے۔ انتہائی محبّت اور پیار کے الفاظ میں بندوں کو سمجھاتا ہے کہ اپنی بھلائی کی خاطر اللہ کا حکم مان لو۔ پھر اپنی اطاعت پر اجرِ عظیم کا وعدہ فرماتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیثِ قدسی میں فرمایا ہے:

"اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ جو بندہ میرا قرب حاصل کرنے کے لیے اور میری اطاعت و فرمانبرداری کی راہ میں میری طرف بالشت بھر آگے بڑھتا ہے میں اس کی طرف ہاتھ بھر بڑھتا ہوں اور جو میری طرف ہاتھ بھر آگے بڑھتا ہے میں گز بھر اس کی جانب بڑھتا ہوں۔ اگر میرا بندہ چلتا ہوا میری طرف آئے تو میں دوڑتا ہوا اس کی جانب بڑھتا ہوں۔"

اب آپ سوچیے کہ ایسے مہربان آقا کا حکم ماننے اور خوش دلی سے تسلیم کرنے کے بجائے جو بدنصیب اور جو بدقسمت اس کی نافرمانی کرتے ہیں وہ کس انجام کے مستحق ہیں۔

قرآنِ حکیم میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنی نافرمانی کرنے والوں کو ان کے بُرے انجام سے بار بار ڈرایا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖٓ اَنْ تُصِيْبَهُمْ فِتْنَةٌ اَوْ يُصِيْبَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ○

(النور: ۶۳)

یعنی: "وہ لوگ ہوشیار رہیں جو اللہ کے حکموں کے مطابق نہیں چلتے کہ کہیں انھیں کوئی فتنہ اپنی لپیٹ میں نہ لے لے یا پھر انھیں اللہ کے سخت عذاب کا سامنا نہ کرنا پڑ جائے۔"

ایک اور جگہ ارشاد فرمایا ہے:

اَفَاَمِنُوْٓا اَنْ تَاْتِيَهُمْ غَاشِيَةٌ مِّنْ عَذَابِ اللّٰهِ اَوْ تَاْتِيَهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ○

(یوسف: ۱۰۷)

Marfat.com

یعنی: "کیا یہ لوگ اس بات سے مطمئن ہیں کہ ان پر اللہ کے عذاب کا کوئی جھکڑ اچانک مسلّط ہو جائے گا۔ کیا انھیں اس بات کا خوف نہیں کہ اچانک قیامت آ کھڑی ہو اور انھیں سوچنے تک کی مہلت نہ ملے؟"

اسی طرح نافرمانوں اور سرکشی کی راہ پر چلنے والوں کو ایک جگہ ان الفاظ میں متنبہ فرمایا ہے:

اَفَاَمِنۡتُمۡ اَنۡ یَّخۡسِفَ بِکُمۡ جَانِبَ الۡبَرِّ اَوۡ یُرۡسِلَ عَلَیۡکُمۡ حَاصِبًا ثُمَّ لَا تَجِدُوۡا لَکُمۡ وَکِیۡلًا ۝

(الاسراء: ۶۸)

یعنی: "کیا تمھیں اس بات سے ڈر نہیں لگتا کہ اللہ تمھیں زمین میں دھنسا چھوڑے، یا تم پر عذاب سنگریزوں کی آندھی کی صورت میں آجائے اور پھر تمھیں کوئی کارساز ڈھونڈے نہ ملے؟"

یہ اور اسی مضمون کی دیگر بے شمار آیات بظاہر اللہ تعالیٰ کے جلال اور اس کی غضبناکی کی تصویر معلوم ہوتی ہیں، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ بھی اس کی شانِ رحیمی پر دلالت کرتی ہیں۔ وہ یہ نہیں چاہتا کہ اس کے بندے جنھیں اس نے اپنے ہاتھوں سے بنایا ہے اُس کی نافرمانی کریں، اس کی بات نہ مانیں، سرکشی کی چال چلیں اور اس کے غیظ و غضب کا نشانہ بنیں، اس کے عذاب کے مستحق ٹھہریں۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انھیں خوب سمجھا سمجھا کر بُرے انجام سے اور اچانک آجانے والے عذاب سے ڈرا کر اور ہر طرح انھیں غلط کاریوں، بدعملیوں اور گناہ کے کاموں سے روکتا ہے۔ اس ساری تنبیہ اور تہدید کو نظر انداز کر کے، اُس بُرے انجام سے بے خوف ہو کر جو لوگ الرحمٰن الرحیم کے دامنِ رحمت کے سائے سے گریزاں ہوں ان کی بدقسمتی اور حرمان نصیبی ناقابلِ بیان ہے۔

آج ہم مشرق سے مغرب تک انسانوں کو جن مصائب و مشکلات میں مبتلا دیکھ رہے ہیں یہ صرف اور صرف اس سراپا رحم و کرم آقا سے سرکشی کا نتیجہ نہیں تو اور کیا ہے؟ یہ ہماری نافرمانیوں، بغاوتوں اور سرکشیوں کا نتیجہ ہے کہ آج ہمارا کوئی دن ایسا نہیں گزرتا جس میں، ہم پر کوئی دل دہلا دینے والی مصیبت نہ ٹوٹتی ہو۔ کاش ہم اس تنبیہ پر کان دھریں اور اس کو اپنی اصلاح کا ذریعہ بنا لیں۔

یہ آفات اور یہ مصیبتیں جو اللہ کی بتائی ہوئی راہ اور اس کی مقرر کی ہوئی روش زندگی سے سرکشی اور بغاوت کا نتیجہ ہیں، ربِّ کریم کی جانب سے انسانوں کے لیے اس امر کی یاد دہانی ہیں کہ نادانو! کیوں ہلاکت کی راہ پر چل پڑے ہو۔ اس راہ کو چھوڑ دو اور اللہ کے دامنِ رحمت میں پناہ لو۔

سورۂ توبہ میں ارشاد ہوتا ہے:

اَوَلَا یَرَوۡنَ اَنَّهُمۡ یُفۡتَنُوۡنَ فِیۡ کُلِّ عَامٍ مَّرَّةً اَوۡ مَرَّتَیۡنِ ثُمَّ لَا یَتُوۡبُوۡنَ وَلَا هُمۡ یَذَّکَّرُوۡنَ ۝

(التوبہ: ۱۲۶)

یعنی: "کیا یہ لوگ نہیں دیکھتے کہ ہم انھیں سال میں ایک دو مرتبہ کسی نہ کسی فتنے میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ یہ یاد دہانی

Marfat.com

بھی انھیں اس بات پر آمادہ نہیں کرتی کہ اپنے گناہوں سے توبہ کریں اور نصیحت پکڑیں“

آپ نے دیکھا کہ قرآن مجید میں جہاں بھی کوئی تنبیہ ہے تفہیم کے انداز میں ہے سمجھانے کے پیرائے میں ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ کو سرکشی، ناشکری اور بغاوت کی راہ اختیار کرنے والے بندوں کی تباہی بھی مقصود نہیں۔ وہ انھیں بھی اپنے دامن رحمت میں جگہ دینے کو تیار ہے، مگر ہم ہیں کہ اپنے انجام سے بے خبر، اللہ کی پکڑ سے بے نیاز اس کی رحمت سے روز بروز دور ہوتے جا رہے ہیں۔ یاد رکھیے کہ اللہ کی رحمت کا دامن جس قدر وسیع ہے اس کے عفو و درگزر کا بھی کوئی ٹھکانہ نہیں یہاں تک کہ وہ اس کی رحمت سے مایوس ہو جانے والوں سے بھی ناراضی کا اظہار فرماتا ہے:

وَمَنْ يَقْنَطُ مِنْ رَّحْمَةِ رَبِّهٖۤ اِلَّا الضَّآلُّوْنَ ٥ (الحجر: ۵۶)

یعنی: ”اللہ کی رحمت سے صرف گمراہ ہی مایوس ہو سکتے ہیں۔“

اللہ سے سرکشی ایک اور طرح بھی ہمارے لئے نقصان دہ ہے اور وہ ایسے کہ اللہ نے ہمارے لیے زندگی گزارنے کا جو طریقہ مقرر کیا ہے وہ ہماری اپنی فطرت کے مطابق ہے۔ اگر ہم اس کی بتائی ہوئی راہ پر نہ چلیں گے اور اس کی ہدایت کی پیروی کرنے کے بجائے سرکشی کی تباہ کن راہ پر چلیں گے تو ہم اپنی فطرت کے خلاف عمل کریں گے۔ اور فطرت کے خلاف عمل کا تباہ کن انجام کیسا ہولناک ہوتا ہے، ہم نے اس کے مظاہرے اپنی ان آنکھوں سے بارہا دیکھے ہیں۔ اگر آپ انھیں یاد کرنا چاہیں تو ہیروشیما کا المیہ یاد کریں۔ مگر یہ بات سمجھ لیں کہ اللہ کی راہ سے سرکشی کا انجام ہیروشیما کے واقعے سے لاکھوں اور کروڑوں گنا زیادہ برا ہے۔

Marfat.com

اللہ کو بھول جانا

اللہ تعالیٰ کو بھلا دینا کرۂ ارض یعنی اس دُنیا کا سب سے بڑا حادثہ اور سب سے الم ناک سانحہ ہے۔ تاریخ کے صفحات، عظیم تغیرات اور کثیر واقعات انسان کی اس بدقسمتی پر گواہ ہیں اور شاہد کہ انسان نے خود فراموشی کی راہ اختیار کی اور اپنی حقیقت سے صرفِ نظر کیا۔ خود فراموشی اور اپنی حقیقت کی فہم سے فرار انسان کا سب سے بڑا گناہ ہے کیوں کہ اس کے ارتکاب ہی سے اللہ تعالیٰ کو بُھلا دینے کی راہ کھلتی ہے۔ انسان جب اپنی حقیقت کو فراموش کر کے اللہ تعالیٰ کو بُھلاتا اور فراموش کرتا ہے تو درحقیقت وہ ایک عذاب کا شکار اور ایک مصیبت میں مبتلا ہوتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مُعاشرے میں فساد اور سوسائٹی میں انتشار اور دل و دماغ میں افکارِ بد کی یلغار اور فکر و عمل میں تضاد صرف اسی حالت میں پیدا ہوتا ہے کہ انسان اپنے آپ کو بھول گیا ہو۔ آپ یہ خوب سمجھ لیجیے اور اچھی طرح ذہن نشین کر لیجیے کہ اپنے آپ کو بھول جانا قرآنِ حکیم کے مطابق اللہ کو بھلا دینے کی سزا ہے۔

نسوا اللہ فانسٰھم انفسھم ط (الحشر، آیت ۱۹)

یعنی "لوگ اللہ کو بھول گئے تو اُس نے انھیں خود فراموشی کی شکل میں سزا دی۔"

بلاشبہ سزاؤں میں یہ بڑی سزا ہے کہ انسان اپنی حقیقت سے محروم ہو جائے۔ انسان کی حقیقت ہے کیا؟ طبیعاتی نقطۂ نظر سے انسان خاک و آب کا ایک متحرک ڈھیر ہے جو اگر اپنے مقام کو پہچانے تو اِس عالمِ آب و گِل میں خلاقِ عالم اور مالکِ کُل کا نائب اور خلیفۃ اللہ فی الارض ہے، لیکن اگر وہ اپنے اس مقام اور اپنی اس عظمت و رفعت کو، کہ جو اسے اللہ کے نائب کی حیثیت سے حاصل ہے، حُسنِ اطاعت اور حُسنِ سلوک و عمل کے ذریعہ سے باقی نہ رکھ سکے تو قرآنِ حکیم کے الفاظ میں وہ جانور بلکہ اس سے بھی بدتر ہے۔

اولئک کالانعام بل ھم اضل ط (الاعراف، آیت ۱۷۹)

انسان کی عظمت اور اس کی بلندی و رفعت اور انسان کی بے حیثیتی اور بے وقعتی کے درمیان وجۂ فرق اور باعثِ امتیاز بننے والی خصوصیت اللہ کی پہچان اور اللہ کی یاد ہے

Marfat.com

اور ایمان ہے جس کے ساتھ عمل صالح ہو۔ سورۃ والتین میں اسی حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم ۝ ثم رددنٰہ اسفل سافلین ۝ الا الذین اٰمنوا وعملوا الصّٰلحٰت۔۔۔ (والتین آیت ۴-۶)

سرورِ کائنات، فخرِ موجودات حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایمان کی اصل چھ چیزیں قرار دی ہیں: اللہ پر ایمان لانا، اللہ کے فرشتوں پر ایمان لانا، اللہ کی کتابوں پر ایمان لانا، اللہ کے رسولوں پر ایمان لانا، قیامت کے دن پر ایمان لانا، تقدیر پر ایمان لانا۔ اور عملِ صالح کی تعریف یہ ہے کہ انسان کا ہر عمل وحی الٰہی یعنی شریعتِ اسلامی کے تحت ہو۔ حسنِ عمل کا ایک لازمی عنصر خود ایمان ہے۔ بغیر تصحیح ایمان اور بغیر حق تعالیٰ جل شانہٗ کی رضاجوئی کے انسان کا کوئی عمل، عملِ صالح کی تعریف میں نہیں آسکتا۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حق تعالیٰ کا ذکر ہر لمحہ اور ہر وقت کرتے تھے، اور ہمیشہ یادِ الٰہی میں مصروف و مشغول رہا کرتے تھے اور کوئی چیز آپ کو ذکرِ الٰہی سے باز نہ رکھتی تھی، اور آپ کی ہر بات یادِ حق، حمد و ثنا، توحید و تمجید، تسبیح و تقدیس اور تکبیر و تہلیل میں ہوتی تھی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر سانس، آپ کے قلب و زبان، اور آپ کا اٹھنا بیٹھنا، کھڑا ہونا، لیٹنا، کھانا پینا، آنا جانا، سفر و اقامت، غرض کہ کسی حال میں بھی ذکرِ حق سے جدا نہ تھا۔ اللہ تعالیٰ کو یاد رکھنے کی یہ معراج ہے۔ اور درحقیقت یہ نمونۂ عمل ہے کہ جو امتِ مسلمہ کے لیے مشعلِ راہ ہے اور یہ ہدایت ہے کہ جو ہادی برحقؐ نے مسلمانوں کو اپنے عمل سے دی ہے۔

ہم پاکستان کے مسلمانوں کو اس روشنی میں اپنے حال پر غور کرنا چاہیے اور اپنے دل کو ٹٹولنا چاہیے اور ہمیں ضمیر کی آواز کو سننا چاہیے۔ ہم اپنی حیاتِ مستعار کے روز و شب اگر روشنی قرآن میں اور اتباعِ رسولؐ میں نہیں گزار رہے ہیں تو بلا شبہ ہم خدا فراموشی کی ضلالت میں مبتلا ہیں اور خود فراموشی کے عذاب میں گرفتار ہیں۔ اور یہ خدا فراموشی یعنی اللہ کو بھول جانا اور اپنے آپ کو بھول جانا، انسان کو دائرۂ انسانیت سے خارج کر دیتا ہے۔ اور انسان انسان نہ رہا تو وہ یقیناً مسلمان بھی نہ رہا۔

اگر ہمارے اعمال صالح اور نیک نہیں، اگر ہم نے دیانت و امانت کو ترک کر دیا ہے، اگر ہم انسان کے مقامِ شرف کا احترام نہیں کرتے ہیں اور ایذا رسانی کرتے ہیں، انسانوں کو

Marfat.com

تکلیف پہنچاتے ہیں۔ اور اگر ہم ارکانِ اسلام سے صَرفِ نظر کرتے ہیں یعنی نمازیں چھوڑتے ہیں، روزے سے غفلت برتتے ہیں، زکواۃ سے فرار کی راہ اختیار کرتے ہیں وغیرہ، تو یہ یقیناً اللہ کو بھول جانا ہے اور یہ یقیناً صراطِ مستقیم اور سیدھی راہ نہیں ہے۔

انسانی تاریخ کے مختلف ادوار کو ان کی بعض خصوصیات کی بنا پر مختلف نام دیے گئے ہیں جب آدمی صنعت سے ناواقف تھا اور اس کی تمام ضروریات کی تکمیل قدرتی طور پر پائی جانے والی اشیا کرتی تھیں، جن میں پتھر اپنی مضبوطی اور افادیت کے لحاظ سے سب سے زیادہ اہم تھا، تو تاریخ کے اس دور کو "پتھر کا زمانہ" کہا گیا۔ پھر دھاتوں کا زمانہ آیا، پھر مشینی دور آیا اور کہا جاتا ہے کہ آج یہ دور ایٹمی دور ہے، لیکن تاریخ دانوں اور علم تاریخ کی اصطلاحیں وضع کرنے والے علما اور خود اس انسان سے جس کی یہ تاریخ ہے، میں معذرت کرتے ہوئے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اگر ہمارے اس دور کا کوئی صحیح اور مبنی بر حقیقت نام ہو سکتا ہے تو اسے انسانی مصائب و مشکلات کا دور کہنا چاہیے۔ آج کے انسان کی زندگی اس قدر پیچیدہ اور اس کی زندگی کے پہلو اس قدر وسیع ہیں کہ ان کا احاطہ و شمار ممکن نہیں ہے، عالم انسانیت بحیثیتِ مجموعی انسانی مُعاشرے کی مختلف اکائیاں، افراد کا ہر گروہ اور اس گروہ کا ہر فرد مسائل و مصائب میں جکڑا ہوا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان تمام خرابیوں کی جڑ یہ ہے کہ آج انسان اپنے آپ کو بھول گیا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ خدا کو بھول گیا ہے۔ ہم خدا کو یاد رکھیں تو خود ہماری اپنی حقیقت اپنی نظروں میں رہے گی۔ یہ عرفانِ ذات ہمیں وہ راہ دکھائے گا جس پر چل کر ہم خوش حالی اور اطمینان کی زندگی گزار سکیں گے۔ لیکن اس جگہ یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ اللہ کی یاد کے تقاضے محض اس کے نام کی تسبیح پڑھنے سے پورے نہیں ہو جاتے بلکہ اللہ کو یاد رکھنے سے مراد اس کی اطاعت و بندگی میں لگے رہنا اور مسلسل لگے رہنا ہے۔ اللہ کی اطاعت ہی اس کو یاد رکھنا ہے اور اس کی اطاعت سے باز رہنا درحقیقت اسے بھلا دینا ہے۔

حضرت ابن مبارک کا قول ہے کہ شیطان جب آدمی کو مستقل مزاجی کے ساتھ اللہ کی بندگی اور اس کے احکام کی پابجائی کرتے پاتا ہے تو اس سے مایوس ہو جاتا ہے، لیکن جب وہ دیکھتا ہے کہ آدمی اللہ کی اطاعت اور اس کی بندگی سے بے پروا ہے تو پوری شدت سے اس پر حملہ کرتا ہے اور اُسے جکڑ لیتا ہے اور جب کوئی انسان اس طرح شیطان کے قبضے میں آجائے تو پھر شیطان کی پوری کوشش ہوتی ہے کہ اس آدمی کو کبھی اللہ کی یاد نہ آجائے۔

قرآن حکیم میں ہے:

Marfat.com

استحوذ علیھم الشیطٰن فانسٰھم ذکر اللہ ط اولٰئک حزب الشیطٰن ط الا ان حزب الشیطٰن ھم الخاسرون (سورہ مجادلہ آیت ۱۹)

یعنی "شیطان ان پر چھا کر رہ گیا ہے اور اس نے ان کے دلوں سے خدا کی یاد بالکل محو کر کے رکھ دی ہے۔ ایسے لوگ شیطان کی ٹولی کے افراد ہیں اور خوب سمجھ لو کہ اس ٹولی کے نصیب میں سوائے خسران کے اور کچھ نہیں"

حاصلِ کلام یہ ہے کہ اللہ کو بھلا دینے سے مراد ہے خود اپنی حقیقت نظروں میں نہ ہونا، اللہ کی اطاعت سے رُوگردانی کرنا اور شیطان کے جال میں پھنس کر رہ جانا۔ اور یہ تین خرابیاں ایسی ہیں کہ کسی میں پائی جائیں تو اُسے انسانیت کے اس عظیم مقام سے نیچے گرا دیتی ہیں جو اللہ نے اُسے بخشا ہے۔ یہ اللہ کی نعمت کی ناقدری ہے اور اس ناقدری کی سزا ناقدر انسان کو دنیا میں ملتی ہے اور آخرت میں بھی۔ ارشاد باری سنیے:

وَمَنۡ اَعۡرَضَ عَنۡ ذِكۡرِىۡ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيۡشَةً ضَنۡكًا وَّنَحۡشُرُهٗ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ اَعۡمٰى ۝ قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرۡتَنِىۡۤ اَعۡمٰى وَقَدۡ كُنۡتُ بَصِيۡرًا ۝ قَالَ كَذٰلِكَ اَتَتۡكَ اٰيٰتُنَا فَنَسِيۡتَهَا‌ ۚ وَكَذٰلِكَ الۡيَوۡمَ تُنۡسٰى ۝ (سورہ طٰہٰ ۱۲۴-۱۲۶)

یعنی "جو میری یاد سے غفلت برتے تو میں اس کی زندگی تنگ کر دیتا ہوں اور اسے قیامت کے دن اس حال میں اٹھاؤں گا کہ اس کی اِبصارت زائل ہوگی۔ وہ خود کو اس حال میں پائے گا تو فریاد کرے گا کہ میرے رب تو نے مجھے اندھا کیوں کر دیا، میں تو آنکھوں والا تھا۔ جواب ملے گا۔ تو اِس برتاؤ کا مستحق ہے۔ تیرے پاس میری آیتیں آئیں اور احکام آئے مگر تو نے مجھے یاد نہ رکھا۔ آج میں نے تجھے بُھلا دیا!"

اے برادران! ہم نے یہ پاکستان اس لیے بنایا تھا کہ ہم یہاں اللہ کی حکومت قائم کریں گے اور اپنی زندگیوں کو تابعِ فرمانِ رسولؐ بنائیں گے۔ ہم نے یہ عہد کیا تھا کہ ہم اس سرزمینِ پاک سے دنیا کو اللہ کا پیغام دوبارہ پہنچائیں گے۔ ہم نے ماضی میں ایسا ہی کیا تھا۔ اسلام نے ریگستان حجاز میں ظہور کیا تھا مگر صحرائے افریقہ میں اس کی آواز بلند ہوئی۔ اس کی دعوت کی صدا جبل بوقبیس کی گھاٹیوں سے اٹھی مگر دیوارِ چین سے صدائے اشھدان لاالٰہ الااللہ کی بازگشت گونجی۔ تاریخ کی نظریں جس وقت دجلہ و فرات کے کنارے پیروانِ اسلام کے نقشِ قدم گن رہی تھیں عین اس وقت گنگا اور جمنا کے کنارے سینکڑوں ہزاروں ہاتھ تھے کہ جو اللہ وحدہٗ لاشریک کے آگے سربسجود ہونے کے لیے وضو کر رہے تھے۔

یہ ہمارا ماضی ہے۔ ذرا پاکستان میں آج اپنے حال کو دیکھیے۔ اگر یہ سامانِ عبرت ہے تو اب بھی وقت ہے کہ ہم صراطِ مستقیم اختیار کریں۔

Marfat.com

حقوق اللہ

اسلام نے حقوق کی دو قسمیں بتائی ہیں: حقوق اللہ اور حقوق العباد۔ چوں کہ حقوق تعلق کی بنا پر عائد ہوتے ہیں اس لیے سب سے پہلے یہ وضاحت ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کا تعلق اپنے بندوں سے کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے بندوں پر اپنے حقوق کا تذکرہ کرتے ہوئے جس اساسی اور بنیادی تعلق کا اظہار فرمایا ہے وہ ہے ایجاد و خلق کا رشتہ، یعنی وہ ہمارا ہی نہیں بلکہ ساری کائنات کا خالق ہے، اور ہم ہی نہیں بلکہ دنیا اور دنیا کی ہر چیز اس کی مخلوق ہے۔ وہ کائنات کا ایسا خالق اور موجودات کا ایسا صانع ہے کہ ان کو پردۂ عدم سے وجود میں لانا پھر فنا کر دینا اور انھیں پھر وجود عطا کرنا، سب کچھ اس کی قدرت میں ہے۔ وہ ایسی حکمت والا خالق و صانع ہے کہ اپنی مصنوعات کے ذرّے ذرّے سے پوری طرح باخبر ہے، عالمِ ایجاد کی ہر چیز اسی کی تخلیق کی رہینِ منت ہے۔

هو اللّٰه الخالق البارئ المُصَوِّرُ لهُ الاسماءُ الحسنٰى ط (الحشر:۲۴)

یعنی: "وہ اللہ ہی ہے جو تخلیق کا منصوبہ بنانے والا اور اس کو نافذ کرنے والا اور اس کے مطابق صورت گری کرنے والا ہے۔ اس کے اور بھی اچھے نام ہیں۔"

قرآنِ حکیم میں ایک دوسرے مقام پر تمام بندوں سے اللہ تعالیٰ نے اس طرح خطاب فرمایا ہے:

یاایها الناس انا خلقنٰکُم من ذکر و انثٰی ۔۔۔ (الحجرات: ۱۳)

یعنی: "ہم نے تمھیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا۔"

نہایت زور دے کر قطعیت کے ساتھ یہ بات فرمائی جا رہی ہے کہ ہم نے تم لوگوں کو پیدا کیا ہے۔ الحاد و شک کے صحراؤں میں بھٹکنے والوں سے پوچھا جا رہا ہے:

هل مِن خالقٍ غیرُ اللّٰہِ ۔۔۔۔ (الفاطر: ۳)

یعنی: کیا اللہ کے سوا کوئی خالق ہے؟

اللہ تعالیٰ نے قرآنِ حکیم میں ایک دو مقام پر نہیں اکثر و بیشتر مقامات پر اپنی صفتِ خلق کا تذکرہ کیا ہے۔ اس کا خالق ہونا جہاں اور بہت سی صفات کی طرف اشارہ کرتا ہے وہاں عقلِ سلیم کی رہ نمائی اس طرف بھی کرتا ہے کہ جو خالق ہے وہی مالک بھی ہے اور مخلوق اپنے خالق کی مملوک ہے، اس لیے

Marfat.com

کہ ممکن نہیں کہ خالق کوئی اور ہو اور مالک کوئی اور ہو۔ یہاں یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ ہمارے اور اس کے درمیان رشتہ خالق اور مخلوق کا ہے، مالک و مملوک کا ہے۔ خالق کا اپنی مخلوق پر اولین حق یہ ہے کہ وہ اس کو اپنا خالق سمجھے اس لیے کہ اس سے بڑھ کر احسان ناشناسی نہیں ہو سکتی کہ ہم العیاذ باللہ، اپنے خالق ہی کو تسلیم نہ کرتے ہوں۔ خالق کو تسلیم نہ کرنا درحقیقت اپنے وجود کا انکار ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کا سب سے پہلا حق یہ ہے کہ اس پر ایمان لایا جائے اور ایمان ایسا مکمل ہو جس میں اس کی قدرت اور اس کی ملکیت کی قولاً یا فعلاً کسی طرح نفی نہ ہوتی ہو۔ اگر کوئی شخص اس پر اس کی تمام قدرتوں اور صفتوں کے ساتھ پورا یقین نہیں رکھتا تو اس کا ایمان مکمل نہیں ہے، اور جب اس پر ایمان ہی مکمل نہیں ہے تو ہمیں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ ہم اس کا پہلا حق بھی ادا نہ کر سکے۔ قرآنِ حکیم میں اس کامل یقین و ایمان کے بارے میں کہ یہ اللہ کا حق ہے، فرمایا گیا ہے:

یاایھاالذین آمنوا آمِنوا باللہ ورسولہ ۔۔۔۔ (النسا: ۱۳۶)

یعنی: "اے لوگو جو ایمان لائے ہو! ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر"

اس یقین و ایمان کے بعد کہ وہ خالق و مالک ہے ہمارے غور و فکر کا دوسرا مرحلہ شروع ہوتا ہے اور وہ ہے مقصدِ تخلیق۔ کیوں کہ اس کو سمجھے بغیر ہم اس کے دوسرے حقوق ادا نہیں کر سکتے۔

آئیے اس مقصدِ تخلیق کو بھی سمجھیں جو خود اللہ تعالیٰ نے اپنی کتابِ مبین میں فرمایا ہے:

وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون ٥ (الذاریات: ۵۶)

یعنی: "میں نے جن اور انسانوں کو اس کے سوا کسی کام کے لیے پیدا نہیں کیا کہ وہ میری بندگی کریں"

عبادت اور بندگی اللہ تعالیٰ کا دوسرا حق ہے۔ یہ عبادت اور بندگی اپنا ایک مخصوص تقاضا رکھتی ہے۔ اس کا تعلق صرف رکوع و سجود سے نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق اس بات سے ہے کہ انسان زندگی کے ہر شعبے میں اس کا اور صرف اس کا بندہ ہو کر رہے اور کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہرائے۔ اس بندگی کا تصور پوری زندگی پر محیط ہو۔ معاملات و عبادات، فرد اور جماعت کا کوئی گوشہ ایسا نہ ہو جو اس کی خالص بندگی کے تصور سے محروم ہو۔ یہی وہ حق ہے جس کا تذکرہ قرآن شریف میں ان الفاظ میں کیا گیا ہے:

الا تعبدوآ الا اللہ (ہود: ۲)

یعنی: "تم بندگی نہ کرو مگر صرف اللہ کی"

دراصل ایمان کے بعد اللہ تعالیٰ کا دوسرا حق اس کی وہ بندگی ہے جو شرک سے بالکل پاک اور منزہ ہو اور اس کے مالک و خالق ہونے کا یقین اس بات کا بھی متقاضی ہے کہ حاکم بھی اسی کو سمجھا جائے اور غیر اللہ کی حاکمیت سے پاک معاشرہ قائم کیا جائے۔ حکومت و سلطنت اسی خالقِ حقیقی کا حق ہے کیوں

Marfat.com

کہ جب وہ خالق ہے تو مالک بھی ہے، اور حکم کا اختیار مالک کے سوا کسی کو نہیں۔

اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ ط (الاعراف: ۵۴)

یعنی: "اسی کی خلق ہے اور اسی کا امر ہے۔"

جب تک ہماری زندگی اور ہمارے گرد و پیش کی دنیا پر ہمارے جیسے انسانوں کی خدائی ہے ہم اللہ تعالیٰ کا حق ادا کرنے سے قاصر ہیں، اور ہمارا یہ دعوا غلط ہے کہ ہم اس کے سچے بندے ہیں۔ بندگی میں سچائی یہ ہے کہ اللہ واحد کی حاکمیت سے زندگی کے کسی شعبے کو مستثنیٰ نہ سمجھا جائے۔ یہی وہ چیز ہے جس کے بغیر بندگی مکمل نہیں ہو سکتی۔

خدائے واحد کو خالق و مالک ماننے کے بعد اور اس کو حاکم حقیقی سمجھ لینے کے بعد بندوں پر جو اس کا حق ہے وہ ہے اطاعت جس کا حکم قرآنِ مجید میں دیا گیا ہے:

یا ایھا الذین آمنوا اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم ج (النسا: ۵۹)

یعنی: "اے ایمان والو! اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور ان لوگوں کی جو تم میں صاحبِ امر ہوں۔"

حقیقت یہ ہے کہ اس کے حقوق ہم پر اس کی نعمتوں کی وجہ سے بھی ہیں۔ خود اپنی زندگی پر غور فرمائیے تو معلوم ہو گا کہ ہر سانس اس کی ایک نعمت بے کراں ہے۔ اس نے جسم بخشا، روح بخشی، بصارت دی، بصیرت عطا فرمائی، عقل و فہم کی دولت سے نوازا اور ایسی لاتعداد نعمتیں عطا فرمائیں جن سے اس کی دوسری مخلوقات محروم ہیں۔ وہ چاہتا تو ہمیں انسان نہ بناتا پتھر بناتا، پانی بناتا۔ اور انھی نعمتوں کی بنا پر اس کا حق یہ بھی ہے کہ اس سے محبت کی جائے۔ محبت صرف تقاضائے ایمان ہی نہیں بلکہ تقاضائے کرم و احسان بھی ہے۔ اس کی رافت، اس کی شفقت، اس کی ربوبیت، سب کچھ ہم سے محبت کا تقاضا کرتی ہے:

وَالَّذِيْنَ آمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ط (البقرہ: ۱۶۵)

یعنی: "ایمان والے اللہ تعالیٰ کو سب سے بڑھ کر محبوب رکھنے والے ہیں۔"

یہ محبت کیا ہے؟ اس کے احکام کی اطاعت، اس کے دین کی اشاعت، اس کے بخشے ہوئے نظامِ عدل کا نفاذ، اس کی راہ میں خلل انداز ہونے والی قوتوں سے جہاد۔

اللہ تعالیٰ ہمیں اس کی توفیق بخشے۔

Marfat.com

شَهۡرُ رَمَضَانَ الَّذِیۡۤ اُنۡزِلَ فِیۡهِ الۡقُرۡاٰنُ

(البقرہ : ۱۸۵)

رمضان وہ مہینا ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا۔

برکاتِ رمضان

Marfat.com

استقبالِ رمضان

رمضان کا یہ مہینہ رحمتوں، برکتوں، سعادتوں اور نعمتوں کا مہینہ ہے۔ اس کی آمد پر ہر فرزندِ اسلام، ہر صاحبِ ایمان فرحت و مسرت محسوس کرتا ہے اور روحانی امیدوں کے ساتھ اس کا استقبال کرتا ہے۔ اس میں چھوٹے بڑے، امیر غریب، عورت مرد، مشرقی مغربی، شمالی جنوبی، کالے گورے کی تمیز نہیں، تمیز ہے تو بس ایمان و عقیدے کی۔ جس نے ایمان سے بہرہ پایا ہے وہ رمضان کو خوش آمدید کہتا ہے، رمضان سے برکتیں حاصل کرتا ہے، دینی فوائد حاصل کرتا ہے اور روحانی بلندیوں کی جانب گام زن ہونے کی کوشش کرتا ہے۔

قرآن حکیم ارشاد فرماتا ہے: شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَیِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ ۚ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْیَصُمْهُ ؕ وَمَنْ كَانَ مَرِیْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَیَّامٍ اُخَرَ ؕ یُرِیْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْیُسْرَ وَلَا یُرِیْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ ؗ وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝ (البقرہ-۱۸۵)

یعنی: "رمضان کے مہینے میں قرآن اتارا گیا۔ اس میں لوگوں کے لیے ہدایت ہے اور روشن دلیلیں ہیں راہ پانے کی اور حق کو باطل سے جدا کرنے کی۔ پس تم میں سے جو کوئی پائے اس مہینے کو تو روزے ضرور رکھے اور جو کوئی بیمار ہو یا سفر میں ہو تو اس کو گنتی پوری کرنی چاہیے دوسرے دنوں سے۔ اللہ تمھارے لیے سہولت چاہتا ہے، دشواری نہیں چاہتا۔ اور یہ کہ تم گنتی پوری کرو اور اللہ کی بڑائی کرو اس بات پر کہ تم کو ہدایت عطا کی کہ تم احسان مانو۔"

غور فرمائیے کہ اس ماہ کی عظمت یہ بیان فرمائی جا رہی ہے کہ اس میں قرآن نازل فرمایا گیا ہے، جو ہدایت ہے، رہ نمائی ہے سیدھے سچے راستے کی طرف۔ قرآن میں روشن دلیلیں ہیں۔ دوسری عظمت رمضان کی یہ ہے اس میں روزے فرض کیے گئے: یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَیْكُمُ الصِّیَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (البقرہ: ۱۸۳)

یعنی: "اے اصحابِ ایمان! تم پر روزے فرض کیے گئے، اسی طرح جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیے گئے تھے تاکہ تم تقویٰ اختیار کرو۔"

Marfat.com

روزے کا مقصد نیکی و پرہیزگاری بیان فرمایا گیا ہے اور اسی ماہ میں قرآن کا نزول ہوا تاکہ نیکی اور پرہیزگاری، پاکیزگی اور نیکوکاری کے لیے پوری پوری رہنمائی میسر آئے۔ قرآن مکمل ضابطۂ اخلاق ہے اور دستورِ حیات۔ اور رمضان کا سب سے بڑا عطیہ یہ ہے کہ اس ماہِ مقدس میں شارعِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم پر کتابِ ہدایت اُتاری گئی جس کی روشنی قیامت تک نوعِ انسانی کی رہنمائی کرتی رہے گی۔ قرآن ہمیں بہترین زندگی بسر کرنے کا ڈھنگ سکھاتا ہے، اچھائی اور برائی میں تمیز کرنے کا واضح معیار عطا فرماتا ہے، سیدھا صاف راستہ دکھاتا ہے۔ عبد اور معبود کے تعلق کو واضح کرتا ہے اور دین و دنیا کی نعمتوں کی نشان دہی کرتا ہے۔ اخلاق و اعمال کا مثالی نمونہ دیتا ہے۔ تقوے اور طہارت کے درمیان محبّت اور مودّت کی بنیادیں عطا کرتا ہے۔ انفرادی اور اجتماعی زندگی کے رہنما اصول کی تعلیم دیتا ہے۔ انسان کی عظمت اور مجد و شرف کو نمایاں کرتا ہے۔

رمضان کی دوسری فضیلت اس کے روزے ہیں۔ روزے تربیتِ نفس کا بہترین ذریعہ ہیں، پاکیزہ زندگی کے لیے نفس کی تربیت لازمی ہے۔ محض اچھے اصولوں کی تعلیم اُس وقت تک غیر موثر ہے جب تک افراد کی تربیت اُس کے مطابق نہ ہو۔ قول کچھ ہو اور عمل کچھ، تو قول کا حسن بے معنی ہو جاتا ہے۔ اصل اہمیت عمل کی ہے۔ عمل ہی انسان کا زیور ہے اور اسی سے انسان کی پستی اور بلندی ظاہر ہوتی ہے۔ قرآن عمل کی تعلیم دیتا ہے اور عمل ہی کی بنیاد پر انسان کو جانچتا ہے۔ جس معاشرے کے افراد عمل سے عاری ہوں وہ معاشرہ قرآن کے معیار سے ناقص اور ناکام ہے۔ اُس کے افراد نکبت سے دوچار ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ رمضان عمل کی تربیت کا بہترین موقع فراہم کرتا ہے۔ اِس مہینے میں انسان خود اپنا تجزیہ کر سکتا ہے، اپنا تزکیہ کر سکتا ہے اور خود اپنی تربیت کر سکتا ہے۔ اِس مہینے میں وہ بہت سی جائز چیزوں کو بھی ایک مقررہ مدت میں حرام کر لیتا ہے۔ وہ کھا سکتا ہے مگر نہیں کھاتا۔ وہ پی سکتا ہے مگر نہیں پیتا۔ وہ اپنے نفس کی دوسری خواہشات بھی پوری کر سکتا ہے، مگر وہ ان جائز خواہشات کی تکمیل بھی نہیں کرتا، کیوں کہ وہ اللہ کی رضا حاصل کرنا چاہتا ہے۔ وہ اپنے ساتھیوں کی ہمدردی اور خدمت بھی کرتا ہے اور اُن کے دُکھ درد کو زیادہ بہتر طریقے سے سمجھنے لگتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا احسان ہے کہ اُس نے ہمیں قرآن جیسی روشن کتاب سے نوازا۔ ہم اس کی روشنی سے اپنے دلوں کو منوّر کر سکتے ہیں، اپنے اخلاق کو جگمگا سکتے ہیں، اپنی عادات کو سنوار سکتے ہیں، خاص طور

Marfat.com

پر سعادتوں اور برکتوں کے اس مہینے میں ہمیں قرآن سے زیادہ قریب ہونا چاہیے۔ قرآن سے اپنے تعلق کو تازہ اور مضبوط کرنا چاہیے۔ قرآن کے راستے پر پوری ہمت اور طاقت کے ساتھ چلنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ قرآن ہمارا رہ نما ہے۔ اس کی رہ نمائی سے ہمیں پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہیے۔ اس مہینے میں اللہ کی رحمتوں کی بارش ہوتی ہے۔ اس کے بعد بھی ہم اگر پیاسے رہیں تو یہ ہمارا قصور ہے۔ ہم اللہ کی بندگی کے لیے پیدا کیے گئے ہیں اور بندے بن کر ہی زندگی کو خوبی سے گزار سکتے ہیں۔ اس کی بندگی سے رُوگردانی کریں گے تو دُنیا کی ہر معمولی طاقت کے آگے ہمیں جھکنا پڑے گا۔ ہماری فلاح و نجات صرف پیروی قرآن میں ہے اور اتباعِ قرآن کا بہترین نمونہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس و اعلیٰ ہے۔ اس نمونے کی موجودگی میں ہمیں کسی دُوسری طرف دیکھنے کی ضرورت نہیں۔ صرف اور صرف اُسوۂ حسنہ کی پیروی کر کے ہی ہم سرفراز اور سُرخ رُو ہو سکتے ہیں۔ سربلندی اور سرفرازی ہماری مُنتظر ہے۔ قرآن کی بتائی ہوئی راہ پر ایک بار چل پڑیے، بلندیاں آپ کے پیچھے پیچھے آئیں گی۔ اور اس کے آغاز کے لیے رمضان بہترین وقت ہے۔

ہم اِن جذبات کے ساتھ ماہِ رمضان کا استقبال کرتے ہیں اور دُعا کرتے ہیں کہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ ہمیں راہِ راست اور صراطِ مستقیم پر چلائیں اور رمضان کی برکات و فیوض سے بہرہ مند فرمائیں۔

Marfat.com

رمضان المُبارک

علامات کے بارے میں ایک عام غلط فہمی یہ پائی جاتی ہے کہ علامات اپنے دائرے سے باہر نکل کر حقائق اور تاریخ کی جبریت سے غیر متعلق ہو جاتی ہیں، یا تاریخ میں شامل ہو جاتی ہیں۔ اس کے برعکس صحیح بات یہ ہے کہ علامات میکانکی طور پر تشبیہات میں بدلتی رہتی ہیں اور حقائق کے گہرے ادراک کے لیے علامات کی یہی بامعنی افادیت ہے۔ کوئی علامت دراصل وہ واسطہ ہے جو اصلیت کو تجرّد سے ملاتا ہے۔ علامات معنویت کو ٹھوس شکل دیتی ہیں اور علامات کا یہی پہلو قانونِ تطبیق کا جزو ہے۔

قانونِ تطبیق کے ذریعے عملِ تفہیم کو واضح تر بنانے کے لیے قرآنِ حکیم میں بار بار یہ اشارہ ملتا ہے کہ خالقِ کون و مکان نے اپنے بندوں کے لیے بے شمار نشانیاں مقرر فرمائی ہیں تاکہ وہ ان نشانیوں کی مدد سے حقائق کا ادراک کر سکیں، برائیوں، تباہیوں اور پراگندگی سے بچ سکیں اور اس طرح اپنے مقصدِ حیات کو سمجھ سکیں اور خالقِ حقیقی کی بتائی ہوئی صراطِ مستقیم پر چل کر بلا خوف و خطر اپنی دنیاوی زندگی اور آخرت دونوں کو سنوار سکیں۔

اس گفت گو کا نفسِ مضمون یہی ہے کہ نشانیوں کی معنویت اور مربوط صفات کو مدِّنظر رکھتے ہوئے رمضان المبارک کی اہمیت کو سمجھا جائے۔

لفظ رمضان کے بنیادی حروف "ر" "م" اور "ض" ہیں۔ اس سہ حرفی کلمہ کے معنیٰ عربی زبان میں گرم ریت، تپتی ہوئی ریت یا پھر معنوی مراد "حرارت" ہے۔ اس ضمن میں بعض اہلِ قلم نے خیال آرائی کی ہے کہ نفاذِ اسلام کے بعد پہلا رمضان گرمی کے موسم میں آیا تھا اس لیے رمضان کی معنوی وجہ یہی ہو سکتی ہے، لیکن یہ محض خیال آرائی ہے۔ کیوں کہ "ر" "م" "ض" کی معنویت پہلے ہی سے موجود تھی۔ پھر قابلِ غور بات یہ ہے کہ آخر یہ کس بات کی علامت ہے کہ شریعتِ اسلام کا آغاز ہی اس انداز سے ہوا کہ دورِ اسلام کے پہلے روزے تپتی ہوئی گرمی میں آئیں اور گرمی بھی ریگستانی علاقوں کی!

اس حقیقت کے گہرے ادراک کے لیے ہمیں ایک مرتبہ پھر نشانیوں کے قانونِ تطبیق کی

Marfat.com

طرف لوٹنا ہوگا تاکہ یہ بات اچھی طرح اور بلا شک و شبہ ذہن نشین ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ نے، جو رحمٰن اور رحیم ہے اور جو اپنے بندوں پر رحم و کرم فرماتا ہے، اس نے اسلام کے ایک اہم ستون کی نشانی گرمی اور حرارت سے کیوں منطبق فرمائی۔ اگر غور کیجیے تو اس علامت میں بھی رحمت ہے، برکت ہے، مغفرت اور نجات ہے۔ روزوں کی روایت تو تقریباً ہر مذہب میں موجود ہے کلیسائی عقیدے میں روزے بہت زیادہ سخت تھے اور طویل عرصے تک دن اور رات پر مشتمل تھے، مگر اسلام میں روزوں کی شدت و مدت کو کم کر کے صرف مہینہ بھر کے لیے محدود اور وقت صرف طلوعِ صبح صادق سے لے کر غروبِ آفتاب تک گھٹا دیا گیا اور غروبِ آفتاب سے لے کر صبح صادق تک آرام کرنے اور کھانے پینے کی کھلی اجازت دے دی گئی۔

یہاں ہمیں گرمی، آگ اور حرارت کی علامتی اور معنوی حقیقت پر غور کرنا ہے۔ لفظِ رمضان کا مادّہ حروف "ر" "م" اور "ض" پر مشتمل ہے۔ جس کے معنی گرم ریت کے ہیں۔ گرمی اجسام کو حرارت پہنچاتی ہے، اسی طرح رمضان المبارک کا مہینہ انسانی جسم میں ایک معنوی حرارت اور تپش پیدا کرتا ہے۔ آگ گرمی، حرارت اور روشنی، زندگی کے لازمی عناصر ہیں۔ آگ کی اس اہمیت ہی نے آتش پرستی کو جنم دیا، لیکن اسلام نے توحید کا سبق دے کر آگ کو صرف ایک عامل قرار دیا۔ اور اس خیال کو کہ جو آگ کے تعلق سے بعض ذہنوں میں جاگزیں ہو گیا تھا کہ آگ کے بغیر کچھ بھی نہیں اور یہ کہ سورج ایک کرۂ آتش ہے جو قابلِ پرستش ہے، باطل قرار دیا۔

ایسے تصورات ختم کرنے کے لیے باری تعالیٰ نے بوقتِ طلوع، بوقت نصف النہار اور بوقت غروب سجدے کی ممانعت فرمائی اور یہ ثابت کر دیا کہ سورج صرف ایک تودۂ ملتہب یعنی ایک جلتا ہوا کرہ ہے اور اس سے تیز تر شعلے جہنم میں موجود ہیں۔ اس طرح دوزخ کو آگ سے تشبیہ دی۔

آگ کا یہ کام ہے کہ وہ مادے کو تپائے اور کثافتوں کو دور کرے تاکہ مادّہ پاک ہو جائے۔ یہی حالت ماہ رمضان المبارک میں انسانی جسم کی ہوتی ہے کہ بھوک، پیاس اور دوسری جسمانی خواہشات پر پابندی لگ جاتی ہے۔ لازماً اس کا نتیجہ بخارات اور گرمی کی صورت میں اٹھ کر جسم میں حرارت پیدا کرتا ہے اور یہ حرارت اس نفسِ امارہ کو جلاتی ہے جو کثیف ہوتا ہے اور انسان کو کندن بنا دیتی ہے، بالکل اسی طرح جیسے سونے کو ملائم، چمک دار اور کثافتوں سے پاک کرنے کے لیے آگ میں تپایا جاتا ہے۔

روزے کی حرارت نفسِ امارہ کو جلا کر انسانیت کو جلا بخشتی ہے اور حرارتِ ایمان پیدا کرتی ہے۔ رمضان کی اہمیت و غایت تزکیۂ نفس ہے اور تزکیہ نفس، نفس کو جلانے ہی سے ممکن

Marfat.com

ہے تاکہ ایمانی اور روحانی قوتیں بیدار ہو جائیں۔

سرور کونین حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس مبارک مہینے میں ہمارے اگلے اور پچھلے گناہ بخش دیتا ہے اور اپنے فیض سے ہمیں جان بخشتا ہے۔ حضورؐ کا ارشاد ہے کہ اس مہینے کے پہلے عشرے میں رحمت، دوسرے عشرے میں گناہوں سے توبہ اور تیسرے عشرے میں جہنم کی آگ سے نجات نصیب ہوتی ہے۔ آخری عشرے، یعنی دس دن، میں کچھ راتیں ایسی ہیں جن میں لیلۃ القدر مخفی رکھی گئی ہے اور لیلۃ القدر وہ رات ہے کہ جب قرآنِ حکیم لوحِ محفوظ سے بساطِ کائنات پر نازل ہوا، اس رات کی عبادات ہزار مہینوں کی عبادات سے افضل ہیں۔

اس حدیث شریف کے پیشِ نظر آپ نے ضرور محسوس کیا ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کی رحمتیں ماہِ رمضان کے پہلے دس دنوں میں نازل ہوتی ہیں گویا سب سے پہلے دھیمی دھیمی آنچ جسم میں سرایت کرتی ہے اور عبودیت و عبادت کی روشنی ہمارے جسم، ذہن اور روح کو منوّر کرنے لگتی ہے۔ اس انداز سے روحانیت کی جلا رحمت بن کر نازل ہوتی ہے۔ پھر اس کیفیت سے جذبۂ انفعال پیدا ہوتا ہے اور آدمی اپنے گناہوں سے شرمندہ ہو کر توبہ کرتا ہے۔ تیسرا عشرہ وہ ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے لیلۃ القدر مخفی رکھی ہے، جہاں عذابِ جہنم اور آگ سے نجات کی نوید ہے اور جب نفس کی کثافتیں اس حد تک دور ہو جاتی ہیں کہ بندے اور خالق کے درمیان شیطانی وسوسے دخیل نہیں ہو سکتے۔

رمضان المبارک کی اہمیت اگر ان نشانیوں اور مشیتِ ایزدی کے پیرائے میں دیکھی جائے تو قرآنِ حکیم کی اہمیت بحیثیت آخری الہامی صحیفۂ الٰہی اور بھی واضح ہو جاتی ہے۔

علمائے دین کا اتفاق ہے کہ نزولِ قرآن اسی مبارک شب سے شروع ہوا چنانچہ یہ وہ ہدایت ہے کہ جو اس کتابِ الٰہی پر ایمان رکھنے والے اور اس پر عمل کرنے والے کو دوزخ کی آگ سے پناہ دے کر جنت الفردوس کا مژدہ دیتی ہے۔ یہ وہ ہدایت ربّانی ہے جو دنیا میں برائیوں اور گناہوں کو جلانے کے لیے عطا ہوئی ہے تاکہ اس پر یقین کامل رکھنے والے لوگ ایک ایسا معاشرہ تشکیل دے سکیں جو گناہ، عصبیت، بے انصافی، جہالت، گمراہی اور انسان دشمنی سے پاک ہو۔

کیا اسے محض اتفاق کہا جائے گا کہ آغازِ اسلام کے چند اہم ترین واقعات اسی مبارک مہینے میں رونما ہوئے۔ جنگِ بدر اور فتح مکہ ان ہی اہم واقعات میں سے دو ہیں۔

پاکستان ۲۷ رمضان المبارک کو وجود میں آیا۔ تاریخ اسلام کا یہ واقعہ کچھ کم اہم نہیں ہے، مگر دیکھیے کہ ہم یعنی برصغیر کے مسلمانوں کی جدوجہد کا مقصد صرف یہ تھا کہ وہ اپنے لیے ایک ایسا خطہ

Marfat.com

ارض حاصل کرلیں جہاں ان کی محبوب اسلامی روایات اور امنگیں پروان چڑھ سکیں۔ چناں چہ اس وطنِ عزیز کو قلعۂ اسلام کہنا غلط نہیں۔

اہلِ فکر و نظر، صاحبانِ بصارت و بصیرت، علمائے حق اور عالمانِ طب و سائنس سب کے سب اس پر متفق ہیں کہ ماہِ صیام اور ماہِ رمضان اپنے فیوض و برکات کی وجہ سے فکر و نظر کے لیے، دماغ و قلب کے لیے پیغامِ انقلاب ہے اور صحت ذہن و جسم کے لیے پیامِ شفا۔ خوش قسمت ہیں وہ تمام افرادِ ملّت کہ جن کو یہ ماہِ صیام نصیب ہوا اور انھوں نے اس کے فیوض و برکات سے کاملاً فائدہ اٹھایا اور فلاحِ دین و دنیا کا سامان کیا۔

دعا ہے کہ اہلِ پاکستان کے لیے اور عالمِ اسلام کے لیے یہ ماہِ رمضان ان کے علوئے مرتبہ کا سبب بنے اور ان کو سربلندی اور سرفرازی حاصل ہو۔ اے اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ ہماری دعاؤں کو شرفِ قبول عطا فرما۔

Marfat.com

روزہ، رمضان اور صحت

قرآن مجید و فرقانِ حمید میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے کھانے پینے کی کھلی آزادی عطا فرمائی ہے۔ اور یہ آزادی اس لیے ہے کہ اکل و شرب، کھانا پینا انسان کی فطرت ہے اور اس فطرت پر کوئی قدغن نہیں ہے۔ جب تک فطری تقاضے حدود میں ہیں اور قناعت کا ان میں حُسن ہے وہ ہمہ پہلو آزاد ہیں اور اس لیے ان کو یہ کھلی چھٹی ملی ہے کہ اس زمین کا یہ نظام ہے کہ یہ انسان کی ضرورت کی کفیل ہے۔

انسان اگر اس عقل سے کام لیتا ہے کہ جو اُس کو عطا ہوئی ہے اور جس نے اس کو اشرف المخلوقات کے درجے پر فائز کیا ہے تو اس کرۂ زمین پر اس کے اکل و شرب اور اس کی حیات کے سارے سامان موجود ہیں۔ اگر وہ عقل کا صحیح استعمال کر سکتا ہے اور فکری جدّ و جہد کو بروئے کار لا سکتا ہے تو قدرت اس درجہ فیاض ہے کہ وہ انسان کو تکلیف میں نہیں ڈال سکتی۔

لیکن انسان کی زندگی میں ایسے لمحات بھی آتے ہیں کہ وہ اپنے فرائض سے غافل اور اپنے نفسانی تقاضوں سے عاجز ہو جاتا ہے۔ فرائض سے غفلت کی ہزار صورتیں ہیں مگر ایک مسلمان کی حیثیت سے جو بنیادی فرائض عبادت و ریاضت کے لیے، جدّ و جہد، تنازع للبقا اور مظاہرۂ اخلاق و شرافت کے لیے انسان پر عائد ہوتے ہیں، اُن سے انسان اور مسلمان غافل ہو جائے تو زندگی کا سکون اور حیات کی طمانیت اور نفس کی اہمیت اس سے چھن جاتی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ زندگی کی محنتیں اور کاوشیں سامانِ تسکینِ حیات ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ انسان کی معیشت قیام و بقا کی جدّ و جہد اور کشاکش کا نام ہے اس لیے قدرتی طور پر اس کا ہر گوشہ طرح طرح کی محنتوں اور کاوشوں سے گھرا ہوا ہے اور بہ حیثیتِ مجموعی زندگی اضطراری ذمہ داریوں کا بوجھ اور مسلسل مشقتوں کی آزمائش ہے۔

قرآنِ کریم میں ہے:

ترجمہ "بلاشبہ ہم نے انسان کو اس طرح بنایا ہے کہ اس کی زندگی مشقتوں سے گھری ہوئی ہے"۔

جو لوگ حرکت میں رہتے ہیں وہ برکت پاتے ہیں۔ جو انسان جدّ و جہد اور سعی مسلسل اور کاوشِ پیہم کو مشعلِ راہ بنا لیتے ہیں، اس دنیا کی فراوانیاں ان کا مقدر ہو جاتی ہیں اور جب اس کا مقصود اللہ اور

Marfat.com

اس کی محبت ہوتا ہے تو انسانی عظمت انتہاؤں کو چھو لیتی ہے۔

روزہ ایک عبادت ہے اور فرض ہے۔ اس کے جسمانی اور رُوحانی فائدے مسلّم ہیں۔ میرے نزدیک من جملہ دیگر فوائد و برکات کے روزے کا مفہوم یہ بھی ہے کہ انسان جو ہر قسم کی نعمتوں سے بہرہ ور ہے اور ان کے کھانے پینے پر قدرت رکھتا ہے وہ حسبِ حکمِ خداوندی جب کھانے پینے سے ہاتھ کھینچتا ہے اور خود کو اکل و شرب سے محروم کرتا ہے اور اس میں جب محرومی کا احساس کرتا ہے تو اس کو ضرور ان کا خیال آنا چاہیے جو بے بضاعتی کی بنا پر اشیائے خورو نوش سے مجبوراً محروم رہتے ہیں۔ ان کو اس بھوک کا احساس ہونا چاہیے کہ جو ایک نادار کی قسمت ہو جاتی ہے اور اس پیاس کا ادراک ہونا چاہیے کہ جو کش مکشِ حیات اور اصول و فرائض کی بنا پر اختیار کی جاتی ہے۔

اگر ایک روزے دار کی رُوح روزے کی اس ایک رُوح و غایت سے آگاہ اور واقف نہیں ہوتی ہے تو میری رائے میں اس کے احساس و ادراک کی قوتوں کو بیدار ہونا چاہیے۔

جب آپ روزہ رکھتے ہیں تو خالقِ کائنات کے حکم کی تعمیل کرتے ہیں۔ طلوعِ سحر تا غروبِ آفتاب آپ خود پر جو پابندی عائد کرتے ہیں وہ آپ کا اپنا فعل ہے اور آپ کا ضمیر ہے کہ جو آپ کو پابند بناتا ہے۔ جب آپ پابندی کرتے ہیں اور اس پابندی کو توڑتے نہیں ہیں تو آپ خوب جانتے ہیں کہ اس کا جاننے والا صرف اللہ ہے اور اس یقین کے ساتھ آپ تعمیلِ ارشاد کرتے ہیں۔

اطاعت کی یہ تربیت بھی روزے کا عنوان ہے، وہی قادرِ مطلق جس کے حکم کی آپ تعمیل کرتے ہیں اور روزہ رکھتے ہیں آپ کو کھانے پینے کی پوری آزادی دیتا ہے مگر ایک حد کے ساتھ کہ اسراف نہ کرو۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ ہم اتنا نہ کھائیں کہ وہ ایک طرف اسراف کی تعریف میں آجائے اور دوسری طرف ہمارے جسم اور ہماری رُوح کے لیے سببِ علالت بن جائے۔ ہم جب بھی ضرورت سے زیادہ کھائیں گے ہمارا جسم اور اس کا نظام اسے قبول نہیں کرے گا اور وہ ضائع ہوگا۔

رمضان میں قدرت کی نعمتوں سے متمتع ہونے کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہو سکتا کہ ہم نہ صرف اپنے اقتصادی نظام کو متاثر کرلیں بلکہ اپنے لیے اکل و شرب کا زائد از ضرورت و حیثیت سامان کرکے اپنے لیے نئے مسائل پیدا کرلیں۔ وہ لوگ کہ جو بے حساب نعمتوں سے بے حساب متمتع ہونے کے اہل ہیں ان کو اپنے پڑوس اور اپنے مُعاشرے کو ضرور دیکھنا چاہیے کہ کوئی فاقہ تو نہیں کر رہا ہے۔

میری رائے میں رمضان شریف میں افطار و سحر کے جو اہتمام و انتظامات عام طور سے آج کل لوگ کرتے ہیں وہ اس ماہِ مبارک کی رُوح اور اسپرٹ کے خلاف ہیں۔ کھانے پینے میں تنوّعاتِ کثیرہ نقصان دہ ہیں۔ افطار میں عموماً ہم جتنا کھا لیتے ہیں اور رات کے کھانے سے جو شکم پُری کر لیتے ہیں

Marfat.com

اور پھر صبح سحری میں جو لوازمات ہم کرتے ہیں وہ اگرچہ کھانے کی تعریف میں آتے ہیں لیکن قطعی طور پر ہماری جسمانی ضرورت و حاجت سے زیادہ ہیں ہمیں اس کا حساب کرنا چاہیے۔

یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ دُنیا میں ہر چیز جتنی زیادہ حقیقت سے قریب ہوتی ہے اتنی ہی زیادہ سہل اور دل نشین اور قابلِ لحاظ و عمل ہوتی ہے اور خود فطرت کا یہ حال ہے کہ وہ کسی گوشے میں بھی الجھی ہوئی نہیں ہے۔ الجھاؤ جس قدر پیدا ہوتا ہے بناوٹ اور تکلف سے پیدا ہوتا ہے۔

میں ذاتی طور پر رمضان المبارک میں گزشتہ ۳۵ سال سے افطار کے وقت مروجہ افطاری یعنی دہی بڑے، دال سموسے، پھلکیاں، چٹنیاں، قلمی بڑے، آلو کچالو وغیرہ کچھ نہیں کھاتا ہوں میرا معمول یہ ہے کہ میں کھجور سے روزہ افطار کرتا ہوں اور اگر ممکن ہوتا ہے تو لیموں یا کسی پھل کا ذرا سا رس پی لیتا ہوں یا کوئی اچھا شربت پی لیتا ہوں۔ نمازِ مغرب سے فارغ ہو کر ناشتہ کر لیتا ہوں یعنی ایک گلاس دودھ، ذرا سی ڈبل روٹی بغیر مکھن کے، کا ہے انڈا اور بس سحری میں معمولی سادہ کھانا کھاتا ہوں۔ گھی کی روٹی اور چاول رمضان المبارک میں ترک کر دیتا ہوں۔ میں اس معمول پر ۳۵-۳۶ سال سے کاربند ہوں اور مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔

شاید میں غلطی نہیں کروں گا اگر سب کو ایسا ہی کرنے کا مشورہ دُوں۔ یقین کرنا چاہیے کہ ایسا کرنے سے صحت کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ اس کے برعکس، اس میں جسم اور رُوح دونوں کا فائدہ ہے۔ پھر دیکھیے کہ تراویح اور تہجد میں کیا مزہ آتا ہے۔ یہ کیا نماز ہوئی کہ رکوع کر رہے ہیں تو حلق میں پانی اچھل کر آ رہا ہے اور سجود میں غذا جیسے باہر نکلی جا رہی ہو۔

آج جدید سائنس نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ روزہ کولیسٹرول کو ضائع کرتا ہے۔ یہ وہی خون کا کولیسٹرول ہے کہ جو دل کی بیماریوں کا سب سے بڑا سبب ہے۔ آج کی دنیا میں اس سائنسی انکشاف کے لحاظ سے روزہ ایک برکت ہے۔ جو بات آج سائنس کو معلوم ہوئی ہے اس کا ادراک ذات ختم الرسلؐ کو تھا اور ضرور تھا۔ اسی لیے آں حضورؐ نے روزے کو جسم و رُوح کے لیے باعثِ خیر و برکت قرار دیا ہے اور مسلمانوں کو اعتدال اور میانہ روی کی تلقین فرمائی ہے۔

Marfat.com

۲۷ رمضان المبارک

۲۷ رمضان انسان کی آزادی کا یادگار دن ہے۔ اللہ سبحانہٗ تعالیٰ نے رمضان کی اِس بابرکت ۲۷ تاریخ کو رحمتِ نُزولِ قرآنی کا عنوان قرار دیا ہے۔ اس دن انسان کو انسانوں کی بندگی سے نجات مل گئی۔ بدبختی کے طوق و سلاسل انسان نے خود اپنے ہی ہاتھوں اپنی گردن میں ڈالے تھے، لیکن انھیں گلے سے اُتار پھینکنا اُس کے بس کی بات نہیں تھی۔ انسان تھا کہ ذلتوں اور شقاوتوں کے اس بوجھ تلے دَب کر جان دے دیتا تھا اور غلامیاں اُس کا مقدر بنی ہوئی تھیں۔ لاریب! انسان کے خالق کو کہ جو رحمٰن ہے اور رحیمؔ اور جو دانا ہے اور حکیم، انسان کی اِس حالتِ زار پر رحم آیا اور اللہ تبارک وتعالیٰ نے فیصلہ کیا کہ ظَلُوم و جَہُول انسان کو اُس کی خود اختیار کردہ قید سے رہائی دی جائے اور استقلال و حریّت اور آزادی کا پروانہ اُسے عطا کیا جائے۔ مشیئتِ ایزدی نے اپنے اِس ارادے کی تکمیل کے لیے شبِ قدر کا انتخاب کیا۔ علمائے حق اور محققین، اہلِ بصیرت اور صاحبانِ دِل اس امر پہ متفق ہیں کہ شبِ قدر ۲۷ ویں رمضان کی مُبارک رات ہے۔ قرآن کو نازل کرنے والی ہستی نے، جو شب و روز کی بھی خالق ہے، اس شب کو ہزار ماہ سے برتر اور افضل قرار دیا۔

اب ذرا انسان پر غور کیجیے! انسان اشرف ترین مخلوق ہے اور اسی طرح حریّت اور آزادی بہترین نعمت ہے، تو جس شب کو خالقِ ارض و سما جَلَّ شانُہٗ نے اپنی اشرف ترین مخلوق یعنی انسان کو اپنی اشرف ترین نعمت عطا فرمائی ہو اُس رات کو اِسی قدر رفیع اور مقدّس ہونا ہی چاہیے تھا۔ اس حقیقت کو قرآن نے اِن الفاظ میں ظاہر کیا ہے:

وَمَآ اَدْرٰكَ مَا لَيْلَةُ الْقَدْرِ ۝ لَيْلَةُ الْقَدْرِ ۙ خَيْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَهْرٍ ۝ (القدر۔ ۳)

یعنی "تمھیں لیلۃ القدر کی اہمیت کا کیا پتا؟ لیلۃ القدر کی ایک رات ہزار مہینوں سے زیادہ بڑی اور قدر و قیمت والی ہے۔"

انسان نے اپنے ہر دَور میں اپنی حریّتِ سیاسی اور اپنی حریّتِ فکر کے لیے جو جدّوجہد کی ہے انسانی تاریخ اُس کی ایک داستانِ مسلسل ہے۔ انسانی تاریخ کے آپ کسی بھی دَور میں چلے جائیے آپ دیکھیں گے کہ ہر دَور میں انسانی تمدّن کے انداز بدلے ہیں، ثقافت کے نئے نئے

Marfat.com

نقشے قائم ہوئے ہیں۔ فکر و نظر کے نئے نئے زاویے قائم ہوئے ہیں، خیالات میں انقلابات آئے ہیں۔ اس کے باوجود تاریخِ انسانی کے دور میں ایک قدرِ مشترک ہر قوم و ملت میں رہی ہے، اور وہ یہ ہے کہ تضادات و تبائن کے باوجود اور اختلافات و تنوّع کے باوصف انسانی شعور نے جب سے آنکھ کھولی ہے اُس نے ہمیشہ اور ہر حال میں اور ہمہ وقت آزادی کی حمد و ستائش کی ہے۔ جنوبی ایشیا میں جب تحریکِ آزادی نے جنم لیا اور برطانوی استعمار کے خلاف اہلِ ہند جب صف آرا ہوئے تو اُس وقت تحریکِ آزادی کا منتہا و مقصود یہ تھا کہ برطانوی طاقت پاش پاش کر دی جائے۔ حرّیت کی اس جدّوجہد میں مسلمانانِ ہند پوری طرح شامل و شریک تھے۔ اس موقع پر شاعرِ مشرق حکیم الامّت علامہ اقبال نے مسلمانوں کی رہنمائی قرآن کی روشنی میں کی۔ علامہ اقبال نے مغرب کے جمہوری نظام کو اسلام کے خلاف سازش قرار دیا۔ انھوں نے فرمایا کہ مغرب کا جمہوری نظام استبدادِ ملوکیت کی ایک نقاب پوش شکل ہے اور اسلام کی ضد ہے۔ اس میں انسان کو وہ آزادی میسّر نہیں آسکتی کہ جو اُسے اسلام عطا کرتا ہے۔ یہی وہ مغربی نظامِ حکومت ہے جس نے اشتراکیت کے ساتھ مل کر یہ آوازہ بلند کیا کہ اقتدار کا سرچشمہ عوام ہیں، اُنھی کو حقِ حکومت پہنچتا ہے۔ مگر قرآنِ کریم اس مفروضے کو باطل قرار دیتا ہے۔ قرآن کے نزدیک کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ دُوسرے انسانوں کو اپنا محکوم بنائے۔

قرآن انسانوں کی تمدّنی زندگی کے لیے نظامِ حکومت کو ضروری قرار دیتا ہے لیکن اُس کا کہنا یہ ہے کہ حکومت کا حق صرف اللہ کو حاصل ہے:

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ط (الانعام۔ ۵۷)

وہ اپنے حقِ حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرتا:

لَا يُشْرِكُ فِىْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا o (الکہف۔ ۲۶)

اس اساس پر اور اس بنا پر:

اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ط (یوسف۔ ۴۰)

اُس نے حکم دیا ہے کہ اُس کے سوا کسی کی محکومیت اختیار نہ کی جائے:

ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (یوسف۔ ۴۰)

یعنی "یہی محکم نظامِ حیات ہے، لیکن اکثر لوگ اس بات کو نہیں سمجھتے"

اور وہ انسانی حکومتوں کی ہیئت بدل کر مطمئن ہو جاتے ہیں کہ ہم نے غلامی کی زنجیریں

Marfat.com

کاٹ دی ہیں اور آزادی کا سانس لیا ہے۔

قرآن ذرہ برابر ابہام کے بغیر کہتا ہے کہ "حکومت اللہ کی کتاب یعنی قرآن حکیم کے ذریعہ سے قائم ہوگی جس میں کسی انسان کو دخل نہ ہوگا، کیوں کہ اللہ اپنے اختیارات کسی کو تفویض نہیں کرتا۔ اس حقیقت کی توضیح کے لیے خود زبانِ نبی اکرمؐ سے کہلوایا گیا:

اَفَغَیْرَ اللّٰہِ اَبْتَغِیْ حَکَمًا وَّھُوَ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ اِلَیْکُمُ الْکِتٰبَ مُفَصَّلًا ؕ (الانعام۔۱۱۴)

یعنی "کیا تم لوگ چاہتے ہو کہ اللہ کے سوا کسی اور حاکم کی طلب و جستجو کروں، حال آنکہ اُس نے ایسی کتاب نازل کر دی ہے کہ جو مفصل ہے۔"

مسلمانانِ ہند تحریکِ آزادی میں شریک ہوئے اور آزادی کی اس جدوجہد میں اس نظریۂ اساسی کے ساتھ متحد و متحرک ہوئے کہ وہ پاکستان قائم کریں گے جہاں قرآن کی حکومت قائم ہوگی اور اللہ کا قانون نافذ ہوگا۔ اُن کے پاس جذبۂ صادق تھا، ان کا ایمان کامل تھا اور ان کا یقین محکم۔ دنیا کی ہر بڑی طاقت مسلمانانِ برصغیر کے جوشِ ایمانی کے سامنے زیر ہوگئی اور غیر ملکی استعمار نے شکست کو تسلیم کر کے ہتھیار ڈال دیے۔

برادرانِ وطن! یہ عجیب اور حیرت انگیز حقیقت ہے اور کرشمۂ الٰہی ہے کہ پاکستان ٹھیک اُس دن عالمِ وُجود میں آیا اور منصّۂ شہود پر جلوہ گر ہوا کہ ۲۷ رمضان المبارک تھی، یومِ نزولِ قرآن تھا اور شبِ قدر تھی۔ بے شک یہ اللہ تعالیٰ کا انعامِ عظیم تھا اور یہ نظامِ الٰہی تھا اور منشائے قدرت تھا کہ پاکستان ایسے دن قائم ہوا کہ جو تمام عالمِ اسلام کے نزدیک مبارک و متبرک ہے، اور جس کی عظمت و تقدس پر سارا عالمِ اسلام متفق ہے اور متحد۔ یہ مشیتِ ایزدی تھی اور منشائے الٰہی تھا کہ پاکستان قائم ہوا اور اس میں حکومتِ قرآن قائم ہو۔

رمضان المبارک کی شب ۲۷ کو تاریخ انسانی سے جو سب سے بڑی نسبت ہے وہ نزولِ قرآن کی ہے۔ لاریب! یہی وہ کتاب ہے کہ جس نے انسانوں کو سربلندی عطا کی، اس کتاب نے پوری کائنات کو ممنون کیا، کرۂ ارض کی ہر تاریکی کو روشنی سے بدلا، زندگی کے رازہائے سربستہ انسانوں پر منکشف کیے۔

اُمّتِ مُسلمہ کو ۲۷ رمضان سے دو اہم نسبتیں ہیں: پہلی نسبت نزولِ قرآن کی ہے، دوسری نسبت شبِ قدر کی ہے، (جسے ہزار مہینوں سے بہتر کہا گیا ہے۔) اس روز و شب میں قرآن حکیم نازل ہوا کہ ہر باطل کو مٹا کر حق کو قائم کر دے اور اس کرۂ ارض پر اللہ کے قانون کی حکمرانی ہو۔

Marfat.com

اِس باب میں قرآن کے احکامات واضح ہیں اور بیّن۔ سورۂ مائدہ میں ارشادِ ربانی ہے:

وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ ۝ (المائدہ۔ ۴۴)

یعنی "جو لوگ کتاب اللہ کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے وہی کافر ہیں۔"

اور اس کے ساتھ ہی رسول اللہ سے فرمایا گیا:

وَأَنِ احْكُم بَيْنَهُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ .... (المائدہ۔ ۴۹)

یعنی "اِن میں کتاب اللہ کے مطابق فیصلے کرو۔"

قرآن کریم میں اللہ کے سوا ہر طاقت کو طاغوت کہا گیا ہے اور کفر و ایمان کے اس فرق کو اِن الفاظ میں بیان کر دیا گیا ہے:

فَمَن يَكْفُرْ بِالطَّاغُوتِ وَيُؤْمِن بِاللَّهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقَىٰ لَا انفِصَامَ لَهَا (البقرہ۔ ۲۵۶)

یعنی "جو اللہ پر ایمان لایا اور اس نے طاغوت سے کفر برتا تو اس نے ایسا محکم سررشتہ تھام لیا جو کبھی نہیں ٹوٹ سکتا۔"

اس ارشادِ باری تعالیٰ کی روشنی میں ہمیں یہ غور کرنا چاہیے کہ وہ لوگ جو دعوا کرتے ہیں کہ کتاب اللہ پر ایمان لائے لیکن عملاً ان کا حال یہ ہے کہ وہ چاہتے ہیں کہ:

أَن يَتَحَاكَمُوا إِلَى الطَّاغُوتِ .... (النساء۔ ۶۰)

یعنی "اپنے مسائل اور معاملات کے فیصلے طاغوت سے کرائیں۔" حال آنکہ انھیں حکم دیا گیا کہ وہ طاغوت سے کفر برتیں۔

لاریب! ایسے لوگ صحیح راہ پر نہیں ہیں، وہ ایک سانس میں اللہ کے قانون کی بات کرتے ہیں مگر دوسرے سانس میں اُس کی نفی کرتے ہیں۔ ان کا قلب و ایمان متزلزل ہے۔ حال آنکہ واقعہ یہ ہے کہ:

وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَعَدْلًا ۚ لَّا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِهِ ۝ (الانعام۔ ۱۱۵)

یعنی "اللہ کے کلمات (قانونِ الٰہی) صدق و عدل کے ساتھ مکمل ہو گئے، قوانین غیر متبدل ہیں۔"

پاکستان نعمتِ خداداد ہے۔ اگر ہم نے اس کی زندگی اور اس کے معاشرے کا رشتہ قرآن حکیم سے مستحکم نہ کیا تو ہم اس نعمت کے تشکر کا حق ادا کرنے سے قاصر رہیں گے۔ ہمیں سلبِ نعمت کے عذاب سے ڈرنا چاہیے۔ اِس لیے کہ یہ سنّتِ الٰہیہ ہے کہ عدمِ تشکر کی صورت میں نعمتیں سلب ہو جاتی ہیں۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم برابر دعا فرماتے تھے:

Marfat.com

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِكَ مِنْ زَوَالِ نِعْمَتِكَ۔

یعنی "اللہ! میں تیری پناہ مانگتا ہوں اس بات سے کہ تیری بخشی ہوئی نعمت زائل ہوجائے۔"

اللہ تعالیٰ ہمارا حامی و ناصر ہو کہ ہم پاکستان کی عظمت و رفعت کا سامان کریں۔ اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کریں۔

Marfat.com

روزہ اور صحّت

روزہ ہر مسلمان پر فرض ہے۔ اور یہ ان عبادتوں میں سے ہے جو مسلمانوں سے پہلے اُمتوں پر بھی فرض تھیں۔ روزہ تمام پیغمبروں کی شریعت میں کسی نہ کسی شکل میں موجود رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بھی روزے کو مسلمانوں پر فرض قرار دیتے ہوئے فرمایا:

یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ کَمَا کُتِبَ عَلَی الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ ○ (البقرہ: ۱۸۳)

یعنی: "اے ایمان والو! روزہ تم پر اسی طرح فرض کیا گیا ہے جس طرح تم سے پہلے کے لوگوں پر فرض کیا گیا تھا، تاکہ تم میں تقویٰ پیدا ہو۔"

اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے جہاں یہ معلوم ہوتا ہے کہ روزہ پچھلی امتوں پر بھی فرض تھا، وہاں یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ روزے کا مقصد انسان میں تقویٰ پیدا کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا کوئی ارشاد، اور کوئی حکم، حکمت، مصلحت اور مقصد سے خالی نہیں ہے۔ یہ اور بات ہے کہ انسان اپنی کم علمی اور کم نظری کی بنا پر حکمت و دانائی کی اُس تہہ تک نہ پہنچ سکے جو احکامِ الٰہی میں پوشیدہ ہے۔ بظاہر کھانے پینے اور نفسانی خواہشات سے کچھ وقت کے لیے پرہیز کرنے کو روزہ سمجھا جاتا ہے، اور شرعی نقطۂ نظر سے بھی سحر سے افطار تک ان چیزوں سے رُکے رہنے کو روزہ کہا جاتا ہے، لیکن یہ چیزیں اصل مقصد نہیں ہیں، بلکہ ایک اعلیٰ مقصد کے حصول کا ذریعہ ہیں۔ اسلامی عبادات کی خوبی یہ ہے کہ وہ مقصود بالذّات نہیں ہیں، بلکہ حصولِ مقصد کا وسیلہ ہیں۔ قرآنِ حکیم نے ہمیں روزے کا مقصد بھی تقویٰ بتایا ہے۔ تقویٰ کے لغوی معنی "کسی چیز سے بچنے" کے ہیں۔ لیکن تقویٰ کا دینی مفہوم یہ ہے کہ انسان تمام نفسانی خواہشات، جسمانی تقاضوں اور جذباتی عدمِ توازن سے اپنی حفاظت کرے اور ہر اس چیز سے بچے جو منکر یا برائی کی تعریف میں آتی ہو۔ جب آپ کسی ایسے راستے سے گزرتے ہیں کہ جس

Marfat.com

کے دونوں طرف جھاڑیاں ہوتی ہیں تو اپنے کپڑوں کو دونوں ہاتھوں سے اور جسم کو سمیٹ لیتے ہیں تاکہ کپڑے خاروں سے الجھ کر تار تار نہ ہوں اور جسم مجروح نہ ہو جائے۔ اسی طرح گناہوں اور برائیوں کی جھاڑیوں سے اپنی روح، اپنے نفس اور اپنے جسم کے دامن کو بچانا ضروری ہے۔ اسی حفاظت اور احتیاط کو ہم تقویٰ کہہ سکتے ہیں۔ تقویٰ اور پرہیزگاری کے بغیر انسان میں وہ انسانیت پیدا نہیں ہوسکتی جو اسلام کو مطلوب ہے۔ روزے کی غرض و غایت بھی تقویٰ ہے۔ روزہ ان چیزوں اور ان اعمال پر پابندی عائد کرتا ہے جو خواہشات کو بڑھانے اور جذبات کو بے لگام کرنے والی ہوں۔ روزانہ جو چیزیں جائز ہوتی ہیں اور جن اعمال کی اجازت ہوتی ہے روزے میں ان پر پابندی عائد کر کے نفس اور جسم دونوں کو تربیت دی جاتی ہے۔ روزے میں کھانا پینا بھی بند کر دیا جاتا ہے اور حصولِ لذّت کے دوسرے ذرائع پر بھی پابندی ہوتی ہے۔ اس طرح نفسانی خواہشات میں کمی ہو جاتی ہے اور روحانی طاقتوں میں اضافہ ہوتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں نفس اور جسم دونوں کے تزکیے اور تربیت میں روزہ مؤثر کردار ادا کرتا ہے۔ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلّم کا ارشاد ہے کہ "ہر چیز کی زکوٰۃ ہوتی ہے، روزہ جسم کی زکوٰۃ ہے۔"

روزہ ضبطِ نفس کا بہترین ذریعہ ہے۔ دوسری عبادات میں انسان کا عمل ظاہر ہوتا ہے، مثلاً جب آپ نماز پڑھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ آپ نماز ادا کر رہے ہیں، لیکن روزہ ایک ایسی عبادت ہے جس کی حقیقت صرف آپ کو معلوم ہوتی ہے۔ دن بھر کوئی شخص آپ کے ساتھ ساتھ نہیں رہتا۔ آپ چھپ کر کھا بھی سکتے ہیں پی بھی سکتے ہیں، لیکن آپ ایسا نہیں کرتے۔ بھوک پیاس آپ کو ستاتی ہے، لیکن آپ روزے میں کھانے پینے کو گناہ سمجھتے ہیں۔ اس طرح آپ کو ضبطِ نفس کی بے مثال تربیت ملتی ہے۔ آپ سمجھتے ہیں کہ چاہے کوئی انسان نہ دیکھ رہا ہو، لیکن میرا خدا مجھے دیکھ رہا ہے جس کے لیے میں نے روزہ رکھا ہے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ انسان کے ہر عمل کا بدل ہے، لیکن روزہ خاص میرے لیے ہے اور میں ہی اس کا بدلہ دیتا ہوں۔ اس طرح آپ کے یقین و ایمان میں اضافہ ہوتا ہے، وہ یقین کہ جو اعلا کردار کا جوہر اور بہترین اعمال کا ضامن ہے، اور وہ پختہ ایمان کہ جو روحانی بلندی، اخلاقی اصلاح، ذہنی صحت اور جسمانی تن درستی کا ذریعہ ہے۔ یہ یقین اور ایمان ہی ہے کہ جو انسان کو بہت سی

Marfat.com

ذہنی اور جسمانی تکلیفوں، بیماریوں اور پریشانیوں سے نجات دلاتا ہے۔

روزہ اگرچہ فاقہ نہیں ہے، لیکن کھانے پینے میں ایک وقفہ ضرور ہے۔ فاقہ بھی انسان کی ایک طبعی اور جبلی ضرورت ہے۔ اکثر انسانوں، بلکہ حیوانوں کو بھی بعض امراض میں غذا کی طرف رغبت نہیں رہتی اور بعض مرضی کیفیتوں میں تو غذا کا تصور بھی انسان کو ناگوار ہوتا ہے۔ روزے میں کھانے پینے کا جو وقفہ ہوتا ہے وہ جسم کو فضلات سے پاک اور خون کو صاف کرتا ہے۔ روزہ روزے دار میں حرص اور مرض سے مقابلے کی قوت پیدا کرتا ہے۔ اسی لیے نفس کے تزکیے اور جسم کی تربیت کے لیے روزے فرض کیے گئے ہیں۔ مسلمان ہر سال پورے ایک مہینے تک نفس اور جسم کی یہ تربیت حاصل کرتے ہیں اور ضبط و نظم کی عادت ڈالتے ہیں۔ روزوں کے مبارک مہینے میں پابندیِ اوقات کی بے مثال تربیت حاصل ہوتی ہے۔ تمام حکیم اور ڈاکٹر اور سائنس داں اس بات پر متفق ہیں کہ اوقاتِ مقررہ پر کھانا کھانا صحت کی ضمانت ہے۔ وقتِ مقررہ پر کھانا کھانے سے انسان کا جسمانی نظام جو تغذیہ حاصل کرتا ہے وہ بے وقت کھانے سے ممکن نہیں۔

انسانی صحت کے لیے اس کے ماحول کی ہم آہنگی ضروری ہے۔ انسان کی داخلی کیفیات اور خارجی حالات میں عدم مطابقت صحت کے لیے مضر ہوتی ہے۔ اور اس کش مکش کے نتیجے میں وہ بیمار ہو سکتا ہے۔ فرد اور ماحول کے اس تصادم سے عصابی امراض پیدا ہوتے ہیں۔ رمضان المبارک میں ماحول کی یکسانیت اور فضا کی ہم آہنگی روزے داروں کو ایک دوسرے سے قریب کرتی ہے اور وہ اعتماد بخشتی ہے کہ جو ذہن اور جسم دونوں کی صحت کے لیے مفید ہے۔ اس پورے مہینے میں نیکی، ہمدردی، تعاون اور بھائی چارے کا ماحول انسان کو احساسِ تحفظ عطا کرتا ہے۔ غریب اور امیر کو ایک دوسرے کے احساسات اور جذبات کو سمجھنے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ انسانی صحت کو برقرار رکھنے میں جو عوامل کارفرما ہوتے ہیں ان میں ذاتی حفظِ صحت کے ساتھ ساتھ ماحول کا بھی بڑا دخل ہوتا ہے۔ انسان کو سماجی حیوان کہا گیا ہے۔ اس کی فلاح و بہبود کے لیے سماجی رشتوں کی استواری ضروری ہے۔

اگر فرد ماحول سے مفاہمت نہ پیدا کر سکے تو بہت جلد اس کا دماغی نظام متاثر ہونے لگتا ہے۔ دور روزے دار اپنے آپ کو ایک دوسرے سے اتنا قریب محسوس کرتے

Marfat.com

ہیں کہ وہ بہت آسانی سے باہمی احساسات اور دکھ درد کو سمجھ سکتے ہیں۔

رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ روزہ ایک سپر ہے، ایک ڈھال ہے اور دوزخ سے حفاظت کے لیے ایک مضبوط قلعہ ہے۔ اگر ہم غور کریں تو حضورؐ کے اس ارشاد کی حکمت کو سمجھ سکتے ہیں۔ ایک روزے دار اپنے ہر عمل سے پہلے سوچنے پر مجبور ہوتا ہے کہ اس کا یہ عمل صحیح ہوگا یا غلط؟ یہ طرزِ فکر اس میں بڑھی ہوئی خواہشات پر قابو پانے کی صلاحیت پیدا کر دیتا ہے، اور اس کو بے شمار غلط کاموں اور برائیوں سے محفوظ رکھتا ہے۔ اس طرح انسان کے ہاتھ میں غلط اعمال کے خلاف ایک سپر آجاتی ہے اور وہ گناہوں سے مامون ہو کر ایک قلعے میں محفوظ ہو جاتا ہے۔ اگر روزے دار ذرا سی دیر کے لیے بھول بھی جائے تو لوگ اس کو فوراً یاد دلا دیتے ہیں کہ تم روزے سے ہو اور وہ فوراً نیکی کی طرف رجوع کر لیتا ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جب کسی کا روزہ ہو تو اس کو چاہیے کہ نہ خواہشِ نفس کی کوئی بات کرے اور نہ شور و شغب کرے۔ اگر کوئی شخص اس سے بدکلامی کرے یا لڑے جھگڑے تو وہ اس سے کہہ دے کہ بھائی، میں روزے سے ہوں۔"

نبی اکرمؐ نے فرمایا ہے:

"اُس خدا کی قسم جس کی مٹھی میں محمدؐ کی جان ہے روزے دار کے منھ کی بُو اللہ تعالیٰ کے نزدیک مشک کی خوش بو سے زیادہ پسندیدہ ہے۔ روزے دار کے لیے دو خوشیاں ہیں: ایک خوشی اس وقت حاصل ہوتی ہے کہ جب وہ روزہ کھولتا ہے، دوسری خوشی اس وقت حاصل ہوگی کہ جب وہ اپنے رب سے ملے گا۔"

یہ روحانی مسرت اور جسمانی فرحت اس فضا کی تشکیل میں معاون ہوتی ہے جو صحت مند فرد اور صحت مند معاشرے کے لیے ضروری ہے، اور جس میں انسان روحانی، اخلاقی، ذہنی اور جسمانی اعتبار سے صحت کے اعلا معیار تک پہنچ سکتا ہے۔

Marfat.com

قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ ط

(الزمر : ۹)

ان سے پوچھو کیا جاننے والے اور نہ جاننے والے دونوں کبھی یکساں ہو سکتے ہیں۔

علم و حکمت

Marfat.com

علم کی فضیلت

علم کی فضیلت و اہمیت کا اندازہ ایک مسلمان کی حیثیت سے کرنے کے لیے یہ حقیقت نہایت کافی ہے کہ سرکارِ دو عالم، سرورِ کائنات نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر سب سے پہلے جو وحی نازل فرمائی گئی اس میں علم حاصل کرنے کی ہدایت فرمائی گئی ہے:

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ ۚ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۚ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۙ الَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۙ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ۗ

(العلق: ۱-۳)

یعنی: "پڑھیے اپنے رب کا نام لے کر جس نے پیدا کیا انسان کو خون کے لوتھڑے سے۔ آپ پڑھیے۔ اور آپ کا رب بڑا کریم ہے، جس نے علم سکھایا قلم سے۔ انسان کو ان اشیا کا علم دیا جن سے وہ ناواقف تھا۔"

یہ پہلا سبق ہے جو اللہ تعالیٰ نے علم کی افادیت و اہمیت کے متعلق دیا۔ اسلام سے پہلے علم ایک مخصوص طبقے کی میراث سمجھا جاتا تھا اور عام انسان کے لیے نہ اس کی ضرورت سمجھی جاتی تھی اور نہ علم تک اس کی پہنچ تھی۔ اسلام ہی وہ پہلا دین ہے جس نے علم کی ضرورت پر زور دے کر عام انسانوں تک علم پہنچایا اور ایک مخصوص طبقے سے نکال کر اس دولت کو عام کیا اور اس روشنی کو پھیلایا۔ اسلام میں علم کی فضیلت کا اندازہ اس بات سے بھی بآسانی لگایا جا سکتا ہے کہ خالقِ کائنات نے اپنے صاحبِ علم ہونے کا بطورِ خاص اور متعدد مقامات پر ذکر فرمایا ہے جس کے ذریعے سے اس نے خود کو بندوں سے متعارف کرایا۔ اللہ تعالیٰ کی صفت کے طور پر علیم کا ذکر قرآنِ حکیم میں تقریباً ایک سو پچاس مقامات پر آیا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ محض علیم ہی نہیں معلّم بھی ہے۔ سورۂ بقرہ میں ارشاد ہے کہ:

وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ (البقرہ: ۲۸۲)

یعنی: "اور اللہ تمھیں تعلیم دیتا ہے۔"

ایک اور جگہ رسولِ کریمؐ پر اپنے احسانات اور انعامات کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ ۭ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا ۝

(النساء: ۱۱۳)

Marfat.com

یعنی: "اللہ تعالیٰ نے تجھ پر کتاب نازل فرمائی، تجھے حکمت عطا کی، تجھے تعلیم دی ان باتوں کی جنھیں تو نہ جانتا تھا۔ تجھ پر تو اللہ کا بڑا ہی فضل ہے۔"

قرآنِ حکیم میں حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے علم میں اضافے کی دعا کرنے کی ہدایت کی گئی ہے:

قُلْ رَّبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا ۝ (طٰہٰ: ۱۱۴)

یعنی: "اور آپ دعا کیجیے کہ اے میرے رب! میرا علم بڑھا دیجیے۔"

ہمیں بتایا گیا ہے کہ اہلِ علم کا درجہ بے علموں سے بڑا ہے اور عالم و جاہل برابر نہیں ہو سکتے۔ ارشادِ باری ہے:

قُلْ هَلْ يَسْتَوِى الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ (الزمر: ۹)

یعنی: "آپ کہیے کہ کیا علم والے اور بے علم کہیں برابر ہو سکتے ہیں۔!"

ان ہی قرآنی تعلیمات کا ثمر تھا کہ مسلمانوں نے تعلیم کو، علم کے حصول کو، علم کی اشاعت کو اہمیت دی اور عالم کی عظمت کو، صاحبِ علم کی عزت کو، علم دوست کی وقعت کو بڑھایا۔ اس میں اضافہ کیا، اتنا اضافہ کہ مسلمان اس معاملے میں تمام دنیا سے بڑھ گئے اور علم دوستی میں ان کا کوئی مقابل نہ رہا۔ اخلاق و کردار کے بعد علم کو اپنے لیے باعثِ شرف، ذریعۂ مجد اور وجہِ فضیلت جانا۔ علم حاصل کرنے، علم کو پھیلانے، عالم کی قدر و توقیر کرنے کے واقعات مسلمانوں کی تاریخ کا بڑا حصہ ہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ:

"علم حاصل کرو، اس لیے کہ جو شخص علم حاصل کرتا ہے وہ اللہ کے راستے میں نیکی کرتا ہے۔ جو شخص علم کا تذکرہ کرتا ہے وہ خدا کی تسبیح کرتا ہے، جو شخص علم کی جستجو کرتا ہے وہ اللہ کی محبت کا دم بھرتا ہے، جو شخص علم کو پھیلاتا ہے وہ صدقہ دیتا ہے۔" (مسلم و ترمذی)

ایک اور ارشاد ہے:

"طالب علم کی راہ میں فرشتے اپنے پر بچھاتے ہیں۔" (بخاری) حضورؐ نے علم کو عبادت سے افضل قرار دیا ہے۔ فرمایا:

"عالموں کی باتیں سننا اور حکمت کے اسباق کو دوستوں کے ذہن نشین کرانا عبادت سے بڑھ کر ہے۔" (مسلم)

اور یہ بھی سرکارِ دو عالمؐ ہی کا ارشاد ہے کہ:

Marfat.com

"طالب علم کی روشنائی شہیدوں کے خون سے بھی زیادہ پاک ہوتی ہے۔" (مسلم)

میں نے قرآن و حدیث کے بحرِ زخار میں سے صرف چند ارشادات پیش کیے ہیں جن سے یہ بتانا مقصود ہے کہ اسلام میں علم کی فضیلت پر کس قدر زور دیا گیا ہے اور عالم اور طالب علم کی عظمت و رفعت ہمارے دین میں کتنی زیادہ ہے۔

علم کی اہمیت آج دنیا کی تمام قوموں پر واضح ہو چکی ہے اور انھوں نے اس میدان میں ترقی بھی کی ہے، سائنس کو انسان نے بامِ عروج پر پہنچا دیا ہے اور سائنس نے دنیا بدل کر رکھ دی ہے۔ زندگی کے ہر میدان میں تبدیلی کی ہے۔ زندگی کو آسائشیں اور سہولتیں عطا کی ہیں۔ سفر کو آسان بنا لیا ہے۔ راہ و منزل کی دشواریوں کو دور کیا ہے، فاصلے کم کر دیے ہیں، تیز رفتاری بخشی ہے اور دنیا سکڑ کر گویا چھوٹی ہو گئی ہے۔ صنعت بہت آگے بڑھ گئی ہے، نئی نئی ایجادات نے انسان کی محنت و مشقت کو کم کر دیا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ انسان کو وہ لطف، وہ راحت اور وہ سکون میسّر نہیں ہے جو علم و سائنس کی اس ترقی سے پہلے اس کو حاصل تھا۔ اس کی یکسوئی اور اطمینان ختم ہو گیا ہے، وہ امن کو تلاش کرتا ہے، وہ اضطراب میں مبتلا ہے، اس کے اعصاب پر سخت تناؤ ہے۔ کیا اس کی وجہ علم کی ترقی اور سائنس کا عروج ہے؟ نہیں! اس میں علم کا کوئی قصور نہیں۔ سائنس کا کوئی جرم نہیں۔ ہم علم و حکمت کو اس خرابی کے لیے ملزم نہیں گردان سکتے۔ اس کی وجہ علم کے ساتھ یقین کا فقدان ہے، عرفان کی کمی ہے۔ علم یقین کے بغیر مکمل نہیں، عرفان کے بغیر سائنس ادھوری ہے۔ اشیا کے علم کی افادیت مسلّم، لیکن دانشِ ایمانی نہ ہو تو انسان علم کے فوائد سے محروم رہتا ہے۔ آج ہمیں سب سے زیادہ علم کی ضرورت ہے، علم کی کمی نے ہمیں مصائب میں مبتلا کر رکھا ہے۔ بظاہر انسانی علم میں بہت اضافہ ہوا ہے اور علم و سائنس ہی کے ہاتھ میں دنیا کی قیادت ہے، لیکن چوں کہ یہ علم ناقص ہے اس لیے اس کی رہنمائی بھی انسان کے دکھوں کا مداوا نہیں کر رہی ہے۔ علم جو انسان کو اللہ کا بندہ بنائے رکھے، معرفتِ الٰہی عطا کرے اور انسان کو انسان بنائے، وہی علم انسان کو حقیقی خوشی اور کامیابی عطا کر سکتا ہے اور اس پر فلاح و سعادت کے دروازے کھول سکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو ایسے علم کی دولت عطا فرمائے۔

Marfat.com

عِلم و فضیلت

اسلام علم کو جو مقام دیتا ہے اس کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ اوّلین وحی میں اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنا تعارف ان الفاظ میں کرایا ہے:

رَبُّكَ الْأَكْرَمُ ۙ الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۙ عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ۝ (العلق: ۵)

یعنی: "تیرا رب بزرگی والا ہے، جس نے تعلیم دی قلم کے ذریعہ سے اور سکھایا انسان کو جو وہ نہ جانتا تھا۔"

یہی وجہ ہے کہ اسلام کی اشاعت سے جاہلیت اور جہالت دونوں کا خاتمہ ہو گیا۔ اسلام جہاں بھی گیا اس نے نہ صرف دلوں سے کفر و شرک، بدعملی اور بدکاری کے آثار مٹائے بلکہ انھیں علم کی روشنی سے بھی منوّر کیا۔ قرآنِ کریم میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

يَرْفَعِ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ ۙ وَالَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ دَرَجَاتٍ ۝ (المجادلہ: ۱۱)

یعنی: "اللہ تم میں سے اہلِ ایمان اور اہلِ علم کے درجات بڑھاتا ہے۔"

اس آیت سے اس حقیقت کا اظہار ہوتا ہے کہ اللہ کے نزدیک ایمان و علم کو یکساں درجہ حاصل ہے۔

علم کی اہمیت اور عظمت اس سے بھی ظاہر ہوتی ہے کہ یہ وہ صفت ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے انبیا علیہم السلام کے سلسلے میں بطورِ خاص ذکر کیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ نبوّت اور علم لازم و ملزوم ہیں۔

نبوّت کے منصب سے تین امور بطورِ خاص متعلق ہیں:

لوگوں کو غیر اللہ کی بندگی اور شرک کی ذلّت سے نجات دلانا، فکری اور عملی حیثیت سے نفوس کا تزکیہ کرنا، اور ان میں اعلیٰ اخلاقی صفات پیدا کرنا۔ اور یہی مقاصد علم کے بھی ہیں۔ رسول اللہؐ نے ایک حدیث میں علم کو انبیا کا ورثہ قرار دیا ہے۔ اس لیے ہم مسلمانوں کے لیے علم کی جو اہمیت ہے اس کے پیشِ نظر ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم اپنے نظامِ تعلیم کو ایسے خطوط پر استوار کریں کہ اس سے استفادہ کرنے والی نسل انبیاء کرامؑ کے اس ورثے کی حفاظت کی ذمے داری سے عہدہ برآ ہونے کے قابل ہو سکے۔ بنیادی طور پر ہمارے نظامِ تعلیم کا مقصد اور منشا یہی ہونا چاہیے۔

Marfat.com

جب تک امت مسلمہ نے انبیاءؑ کے اس ورثے کی حفاظت کی اور اس امانت کا حق ادا کیا تو اللہ تعالیٰ کے اس فیصلے کے مطابق کہ:

وَاَنۡتُمُ الۡاَعۡلَوۡنَ اِنۡ کُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ ۝ (آل عمران: ۱۳۹)

یعنی "تم ہی غالب رہو گے اگر تم (سچے) مومن ہو"

مسلمان دنیا کی ایک ایسی طاقت کی حیثیت سے دیکھے جاتے تھے جنھیں کوئی نظر انداز نہیں کر سکتا تھا، لیکن جس روز سے امت نے اس لائق قدر ورثہ علم کی حفاظت چھوڑ دی اس کی زندگی دین اور دنیا کے دو متضاد خانوں میں بٹ کر رہ گئی، اور اس تضاد نے ساری امت کو انتشار میں مبتلا کر دیا جس کی وجہ سے آج یہ امت، جسے اقوام و ملل کی امامت اور قیادت کا بار اٹھانا تھا، اپنے داخلی اور ذاتی معاملات میں بھی دوسروں کی دست نگر ہو کر رہ گئی ہے۔ یہ نکبت اور خواری جو آج ہم پر مسلط ہے اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ عالم اسلام کا نظام تعلیم ان مقاصد کی تکمیل سے عاری ہے جن کی طرف اللہ تعالیٰ نے قرآنِ حکیم میں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی احادیث اور تعلیمات کے ذریعہ سے ہمیں متوجہ کیا ہے۔

ہمارا آج کا نظام تعلیم ہمارے ملی اور دینی مقاصد سے ہم آہنگ نہیں ہے، یہی وجہ ہے کہ دنیا کی مسلمان حکومتیں تعلیم کی مد میں کثیر رقم خرچ کرنے کے باوجود ایسے نوجوان پیش کرنے سے قاصر ہیں جن کے سینے آتشِ ایمان سے دہکتے ہوں اور وہ آج اس مادیت پرست دور کی قوتوں سے آنکھیں بھی چار کر سکتے ہوں۔ افسوس ہے کہ آج عالم اسلام میں مکتب اور مدرسے، کالج اور یونی ورسٹیاں، تحقیقی ادارے اور کتب خانے سب کچھ موجود ہیں، لیکن ان سے باہر آنے والے قدم دریاؤں کے دل دہلانے والی طوفانی قوت سے خالی ہیں۔

امت کا تعلیم یافتہ طبقہ مغرب کی مادیت پرست تہذیب کے مقابلے میں احساسِ کم تری کا شکار ہے، جبکہ بظاہر یہی طبقہ ساری امت کی نمائندگی کرتا ہے۔ اگر ہم اپنے ذہنوں سے مغرب کی مرعوبیت دور کرنا اور خود کو اس قابل بنانا چاہتے ہیں کہ ہمارے وجود کو اہمیت اور ہماری رائے کو وزن دیا جائے تو ہمیں نظام تعلیم میں ایسی انقلابی تبدیلیاں کرنی پڑیں گی جن سے ہمارا تعلیم یافتہ طبقہ جدید ترین معلومات کا حامل ہونے کے ساتھ ساتھ انبیائے کرامؑ کے علوم کا وارث بھی ہو۔

نظام تعلیم کے نقائص نے عالم اسلام پر اور ہم پر جو سب سے بُرا اثر ڈالا ہے وہ یہ ہے کہ آج ہم نے اپنی انفرادیت کھو دی ہے اور اپنا تشخص ضائع کر دیا ہے۔ وہ امت اور وہ قوم جو اپنا تشخص کھو چکی ہو، وہ اسے دوبارہ حاصل کیے بغیر آج کی اس دنیا میں کوئی مقام پانے میں کام یاب نہیں

Marfat.com

ہو سکتی۔ ہم نے اپنا تشخص کھو کر اپنا تاریخی مقام بھی کھو دیا ہے، جو ہمارے لیے اقوامِ عالم میں ہمارے اسلاف نے بڑی قربانی دے کر حاصل کیا تھا۔ جب ہمیں یہ مقام حاصل تھا تو اس کی وجہ یہی تھی کہ ہم بحیثیت فرد اور بحیثیت معاشرہ اپنے فرائضِ منصبی کی تکمیل کر رہے تھے۔ خود کو اپنے افکار و اعمال، اپنے اخلاق و کردار اور اپنے طرزِ زندگی اور اپنی تہذیب و ثقافت کے ذریعے علومِ انبیا کا وارث بنا کر دنیا کے آگے پیش کر رہے تھے۔ اور آج جب ہم نے اس سے غفلت برتی تو ہم کہ جو تمام عالم کی رہ نمائی اور قیادت کا فریضہ انجام دینے پر مامور تھے، دوسروں کے دست نگر ہو کر رہ گئے ہیں۔ اس ذلّت اور اس نکبت کی واحد اور اساسی وجہ یہی ہے کہ اللہ نے ہمارے سپرد جو امانت اس غرض سے کی تھی کہ ہم نہ صرف اس کا حق ادا کریں بلکہ اسے اپنے بعد آنے والوں کو منتقل کر جائیں، ہم نے اس کی حفاظت میں کوتاہی کی۔ ہم نے اپنے اسلاف کا ورثہ تو گم کر دیا اور اپنے نوجوانوں اور اپنی نوخیز نسلوں کو مادّہ پرست اور دنیا پرست تہذیب کے نام لیواؤں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا، ہم نے اپنے بدخواہوں کی تقلید میں تعلیم برائے معاش اور تعلیم برائے تعلیم جیسے نظریات کو اپنے اوپر مسلّط کر لیا ہے۔ اور اس طرح خود اپنے ہی کرتوتوں کے سبب مسندِ امامت سے اُتر کر مقلّدوں کی صف میں جا کر کھڑے ہو گئے۔ اگر ہم اپنے گزشتہ باعزت مقام پر واپس آنا چاہتے ہیں تو ہمیں مادّہ پرست تہذیب کی تقلید کا جُوا اپنے کاندھوں سے اتارنا ہوگا اور کتاب و سنّت کی رہنمائی اور روشنی میں اپنی زندگی کی راہوں اور اپنے نظامِ زندگی کا نقشہ خود مرتب کرنا ہوگا۔ پھر وہ رفعت اور وہ عظمت جو اللہ نے اپنے اہلِ ایمان بندوں کے لیے مقدر کی ہے ہم اس کے حق دار بن سکیں گے۔

اللہ ہماری رہ نمائی فرمائے اور ہماری مدد کرے۔

قرآنِ حکیم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت دیتا ہے:

وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا ۝ (طٰہٰ : ۱۱۴)

یعنی: "اور آپ کہیے کہ اے میرے پروردگار بڑھا دے میرے علم کو۔"

اور پھر واشگاف الفاظ میں اہلِ علم کے لیے مقامِ رفیع مختص کرنے کا اعلان کرتا ہے۔ علم کا مقام ارفع و بلند اور عالم کی عظمت و رفعت اسلام کا مزاج ہے اور اہلِ اسلام کا وطیرہ۔ سربلندی اور سرفرازی کے لیے ہر مسلمان کو یہ اصول و حقیقت تسلیم کر کے میدانِ علم میں پیش رفت کرنی ہوگی، کیوں کہ اس کے علاوہ کوئی اور صراطِ مستقیم نہیں۔

اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ ہمیں صراطِ مستقیم پر چلائیں اور دولتِ علم سے مالا مال فرمائیں!

Marfat.com

دین میں علم کی اہمیت

دینِ اسلام میں علم کی اہمیت ایسی ہے جیسی اندھیرے میں روشنی کی۔ حقیقت یہ ہے کہ کرۂ ارض کا یہ آخری اور مکمل دین، واحد دین ہے جس نے مذہب کی بنیاد علم پر رکھی اور بار بار لوگوں کو تحصیلِ علم اور کائنات پر غور و فکر کی دعوت دی حضور رسولِ مقبولؐ کی یہ حدیث شریف خاص طور سے قابلِ ذکر ہے: "علم حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے"۔ ایک اور حدیث شریف کا مطلب ہے کہ "علم حاصل کرنے کے لیے دور دراز مقام کا سفر کرنا پڑے تب بھی اس سے دریغ نہ کیا جائے۔"

سورۂ حج میں سچے مسلمانوں کے متعلق فرمایا کہ "یہ وہ لوگ ہیں کہ اُن کو جب ہم اقتدار بخشیں تو وہ نماز قائم کریں گے اور زکوٰۃ دیں گے۔ اچھی باتوں کا حکم دیں گے اور بُری باتوں سے روکیں گے۔" اس سے معلوم ہوا کہ نہ صرف تبلیغِ دین مسلمانوں کے فرائض میں شامل ہے بلکہ دین کے احکام کو نافذ کرنا بھی خیرالامم کی حیثیت میں اُن کی ذمّہ داری ہے۔ یہ فرض اور یہ ذمّہ داری وہی لوگ پوری کر سکتے ہیں کہ جو علم کے زیور سے آراستہ ہوں، اللہ کے احکام کو سمجھتے ہوں، رسول اللہؐ کی اطاعت کرتے ہوں اور "تَفَقُّہ فی الدّین" یعنی علم میں ایسے مرتبے پر فائز ہوں کہ نیک و بد میں امتیاز کر سکیں۔

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اشاعتِ علم کا اتنا زیادہ اہتمام فرماتے تھے کہ جب بدر کے بعض قیدی نقد فدیہ ادا نہ کر سکے تو آپؐ نے فرمایا دس مسلمان بچّوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دو۔ یہی تمہارا فدیہ ہے۔

مدینے میں مسلمانوں کو زیادہ تر یہود سے تعلق رہتا تھا جن کی مذہبی زبان عبرانی تھی، یہ بعض اوقات مسلمانوں کی عبرانی زبان سے ناواقفیت سے غلط فائدہ اٹھاتے۔ رسول اللہؐ نے اس بات کو محسوس فرمایا تو حضرت زید بن ثابتؓ کو حکم دیا کہ وہ عبرانی زبان سیکھ لیں اور حضرت زیدؓ نے رسول اللہؐ کی دُعا سے ایسا کارنامہ انجام دیا کہ پندرہ دن میں عبرانی زبان میں مہارت حاصل

Marfat.com

کرلی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن اور حدیث کے علاوہ مسلمانوں پر ایسے تمام علوم و فنون کا سیکھنا بھی واجب ہے جو اُن کے لیے مفید اور کار آمد ہوں۔

رسول اللہ صلعم کے عہدِ مبارک میں عرب کے جو علاقے اسلام کے زیرِ اثر آئے ان میں یمن سب سے زیادہ وسیع اور متمدّن علاقہ تھا۔ اس بنا پر آں حضرت صلعم نے اس کو پانچ حصّوں میں منقسم فرمایا اور ہر ایک کے لیے علاحدہ علاحدہ گورنر مقرر کیے۔ ان کے ذمّے ملکی انتظام، فصلِ مُقدّمات اور تحصیلِ خراج وغیرہ کے علاوہ سب سے مقدّم فرض اشاعتِ اسلام اور سنّت و فرائض کی تعلیم تھا۔ چناں چہ جب حضرت معاذ بن جبل رضؓ کو یمن کے ایک حصّے کا قاضی بنا کر روانہ کرنے لگے تو فرمایا کہ "تم اہلِ کتاب کے پاس جاتے ہو۔ پہلے اُن کو کلمۂ توحید کی دعوت دو"۔ اس کے بعد دُوسری تعلیمات کا ذکر فرمایا۔

ان فرائض کے ادا کرنے کے لیے سب سے زیادہ ضرورت علم کے علاوہ وسعتِ نظر اور اجتہاد کی تھی۔ اسی بنا پر آپ ان لوگوں کے علم اور سمجھ بوجھ کا امتحان بھی لیتے تھے۔ چناں چہ حضرت معاذ رضؓ کے ساتھ یہ واقعہ ہوا کہ جب ان کو یمن کی جانب بھیجا تو دریافت کیا مقدمات کا فیصلہ کیسے کرو گے؟ انھوں نے جواب دیا کہ قرآنِ مجید سے۔ آپ صلعم نے پھر دریافت فرمایا کہ اگر اس میں وہ فیصلہ تم کو نہ ملے تو کیا کرو گے؟ انھوں نے کہا کہ میں سنّتِ رسول کو رہنما بناؤں گا۔ آپ صلعم نے دریافت فرمایا کہ اگر یہ بات وہاں بھی نہ ملے تو کیا کرو گے؟ فرمایا اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا۔ اس پر آپ صلعم نے فرمایا: "اللہ کا شکر ہے جس نے رسول اللہ صلعم کے رفیق کو اس چیز کی توفیق دی جس کو خود اُس کا رسول محبوب رکھتا ہے"۔

چناں چہ سورۂ توبہ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ "سب کے سب مسلمان تو سفر کر کے (مدینہ) نہیں آسکتے اس لیے ہر قبیلے سے ایک گروہ کو آنا چاہیے تاکہ وہ دین کی سُوجھ بوجھ اپنے اندر پیدا کر سکیں، واپس جا کر اپنی قوم کو بے علمی کے وبال سے ڈرائیں کہ یہ لوگ اس طرح بُری باتوں سے بچیں"۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے علم کو بطورِ خاص بنیادی اہمیت عطا فرمائی مگر عملی طور پر ہر ایک کے لیے دین کے معاملات میں مہارت حاصل کرنا ممکن نہ تھا اس لیے ہدایت فرمائی کہ ایک ایسی جماعت تیار کی جائے جو دین کے اوامر و نواہی سے واقف ہو اور تفقّہ فی الدّین کی صلاحیت رکھتی ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ دینِ اسلام کی بنیاد علم پر ہے، ایسا علم جو قرآن و حدیث کے ساتھ تمام دوسرے علوم پر بھی حاوی ہو۔ قرآن حکیم کا مطالعہ کیا جائے تو بار بار ایسی آیتیں سامنے آئیں گی جن میں اللہ تعالیٰ نے کائنات پر غور و فکر

Marfat.com

کی تاکید کی ہے، کہیں فرمایا تم عقل سے کیوں نہیں کام لیتے۔ کہیں ناسمجھی اور بے علمی کے نقصانات پر آگاہ کیا اور فرمایا کائنات پر غور و فکر وہی لوگ کر سکتے ہیں جو زیورِ علم سے آراستہ ہوں۔ ایک جگہ ارشاد ہے، جاہل اور ان پڑھ کیا سوچے گا اور کیا سمجھے گا؟ ترمذی کی ایک حدیث میں ہے کہ ایک موقع پر آنحضرتؐ نے فرمایا کہ "باپ کا اپنے بچے کو ادب سکھانا بہترین نیکی ہے۔" اسی طرح ایک اور موقع پر ارشاد فرمایا کہ کوئی اپنے بچے کو اس سے بہتر عطیہ نہیں دے سکتا کہ وہ اس کو اچھی تعلیم دے۔ ظاہر ہے کہ ایسی تعلیم سے مراد وہ دینی تعلیم ہے جو انسان کو راسخ العقیدہ مسلمان بننے میں مدد کرے، اس کے اخلاق سنوارے اور اس کے ساتھ ہی اس میں کائنات کے رازہائے سربستہ کے انکشاف کی صلاحیت بھی پیدا کرے۔

دنیا کے بیش تر مذاہب میں فرائض کی ادائی کے لیے خاندان اور طبقات مخصوص ہیں لیکن اسلام میں ہر مسلمان داعی الی الخیر، مبلّغ، معلّم، واعظ اور محتسب ہے۔ ظاہر ہے یہ فریضہ کوئی شخص اس وقت تک ادا نہیں کر سکتا جب تک شریعت کے اوامر و نواہی سے پوری طرح واقف نہ ہو۔ اس کے لیے باقاعدہ تعلیم و تربیت کی ضرورت ہے۔ چناں چہ آں حضرتؐ نے تعلیم و تربیت کے دو طریقے رکھے تھے: ایک طریقہ یہ تھا کہ مختلف قبائل کے آدمی مدینہ آ کر چند دن قیام کر کے ضروری مسائل سیکھ کر واپس چلے جاتے تھے اور اپنے قبیلے کو تعلیم دیتے تھے۔ اس قسم کے متعلمین کے حالات حدیث و طبقات کی کتابوں میں بہ کثرت ملتے ہیں۔ انھیں چند دن تعلیم دینے کے بعد آں حضرتؐ قبیلوں میں واپس بھیج دیتے تھے۔ چناں چہ مالک بن الحویرثؓ کی سفارت کو بیس دن کی تعلیم کے بعد حکم دیا کہ اپنے خاندان میں واپس جاؤ اور ان میں رہ کر ان کو اوامرِ شریعت کی تعلیم دو۔ دوسرا طریقہ مستقل درس و تعلیم کا تھا اور اس کے لیے صُفّہ کی درس گاہ مخصوص تھی۔ اس میں وہ لوگ تعلیم حاصل کرتے تھے جو خود کو حصولِ علم کے لیے وقف کر دیتے تھے۔ اس درس گاہ میں ایک حلقہ خالصتاً درس و تعلیم کا تھا، دُوسرا عبادت و ریاضت کا۔ ابن ماجہ میں ہے کہ ایک دن رسول اللہؐ کاشانۂ اقدس سے برآمد ہوئے تو دیکھا کہ مسجد میں دو حلقے ہیں۔ ایک حلقے میں تعلیم و تعلّم کا سلسلہ جاری تھا۔ آپؐ نے دونوں کی تحسین فرمائی اور ارشاد فرمایا کہ مَیں تو معلّم بنا کر بھیجا گیا ہوں۔ درس و تعلّم کے حلقے میں بیٹھ گئے۔ اس واقعے سے دین میں علم کی جو اہمیت ہے وہ بالکل واضح ہو جاتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اسلامی شریعت کی رُو سے عالم اور جاہل برابر نہیں ہے۔ ایک روشنی ہے دوسرا تاریکی۔

سوچنے کی بات یہ ہے کہ جس ملّت کو سب سے پہلا سبق علم کا دیا گیا ہو اور ہادیِ برحقؐ پر سب سے پہلی وحی بھی اقرأ (پڑھو) سے شروع ہوئی ہو وہ ملّت علم کے میدان میں سب سے آگے کیوں نہیں ہے؟ ہمیں تو علم کی اُس منزل پر ہونا چاہیے تھا کہ جہاں دوسروں کا تصوّر بھی نہ جا سکے۔

Marfat.com

اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان اور اس کی تمام موجودات کو اہلِ ایمان و اسلام کے لیے مسخر کر دیا ہے، لیکن ہم اللہ کی یہ عنایت بھول گئے اور دوسری قومیں تسخیرِ کائنات میں مصروف ہیں۔ ہمیں اپنی حیاتِ مستعار کے کسی لمحے بھی یہ فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولِ برحق ؐ نے ہمیں علم حاصل کرنے اور علم کو پھیلانے کی ہدایت فرمائی ہے، اس لیے تمام نوجوانانِ اسلام کے لیے میرا مشورہ اور پیغام یہ ہے کہ وہ علم کے اسلحہ سے لیس ہو کر ایک ایسی خدا پرست اور انسان دوست قیادت فراہم کر دیں جو آج تمام عالم کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ دنیا اس وقت افتراق و انتشار، بدامنی اور بے یقینی سے تنگ آکر ایک منصفانہ اور متوازن نظامِ حیات کی متلاشی اور منتظر ہے۔ ایمان کے ساتھ ساتھ علم کی روشنی سے بہرہ ور نوجوان ہی انسانیت کے اس انتظار کو ختم کر سکتے ہیں۔

Marfat.com

اسلام کی نظر میں علم و عالم کا مقام

اسلام نے علم کو جو اہمیت دی ہے وہ محتاج بیان نہیں ہے۔ دنیا کے تمام مذاہب میں اسلام کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ اس نے علم اور جہل کے درمیان خطِ فاصل کھینچ کر صاف لفظوں میں بتایا کہ:

قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ ۝ (الزمر: ۹)

یعنی: "آپ کہہ دیجیے اے نبی، کہ کیا عالم اور جاہل برابر ہو سکتے ہیں۔"

حقیقت یہ ہے کہ اوہام و خرافات کے شکنجوں میں اسیر ہو کر کراہنے والی دنیا کو، نفس و روح کے کرب اور زندگی کی ظلمتوں سے نکال کر روشنی میں لانے والی کتاب، قرآن مجید ہی ہے جس کے بارے میں پروردگارِ عالم نے ارشاد فرمایا ہے کہ اس کے ذریعے سے وہ انسانوں کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لاتا ہے:

يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ

اسلام دنیا میں سراپا علم و آگہی بن کر آیا۔ اس لیے وہ ہمہ گیر انقلاب کا پیام بر ثابت ہوا۔ اس نے اپنے سفر کا آغاز ہی علم اور روشنی سے کیا۔ حضرت آدمؑ کو سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے زیورِ علم ہی سے آراستہ فرمایا اور فرشتوں پر ان کے شرف و برتری کا واضح سبب اسی کو قرار دیا:

وَعَلَّمَ آدَمَ الْاَسْمَاءَ كُلَّهَا

یعنی: "اور آدم کو تمام چیزوں کے نام سکھائے۔"

دوسرے مذاہب نے علم کو زندگی کی دوسری ضرورتوں کی طرح محض ایک ضرورت قرار دیا، مگر اسلام نے علم کو لازمۂ حیات بتایا اور علم و عبادت اور ایمان و اعتقاد کو ہم معنی قرار دیا۔ اس کے نزدیک علم محض شعور و ادراک کا نام نہیں ہے، بلکہ زندگی کے ان تمام تجربات مشاہدات، انکشافات اور مدرکات کا نام ہے جو اللہ کی معرفت اور دونوں جہانوں کی سعادت کے حصول کا ذریعہ بنتے ہیں اور انسان میں خود شناسی پیدا کرتے ہیں۔ اس کی صلاحیت، اس کی اہلیت اور اس کے مقاصد زندگی کا تعین، دائمی کام یابی اور ناکامی کی بنیاد پر کرتے ہیں۔

Marfat.com

اسلام بے مقصد علم کا قائل نہیں ہے، وہ بامقصد علم کا علم بردار ہے، جس کی روشنی میں انسان اپنے خالق کی عظمت و کبریائی کا یقین حاصل کر سکے۔ ایسا ہی علم انسان کو مطلوب ہے، خواہ وہ سمعی ہو یا بصری، تجربی ہو یا نظری، بہ ہر نوع نفسِ انسانی کی ایسی تربیت کر سکے جس میں فضائلِ اخلاق پوری طرح کارفرما ہوں، نیز ان کی حاکمیت کا شعور و احساس ہو اور کائنات کے ذرّے ذرّے کو توحید کی شہادت و دلیل سمجھنے والی بصیرت کا وہ حامل ہو۔

اسلام ہی وہ مذہب ہے جس نے عقائد سے لے کر عبادات اور اخلاقیات سے لے کر سیاسیات و اقتصادیات اور تمدن و معاشرت تک کی بنیاد علم پر رکھی۔ اسلام دنیا کا پہلا دین ہے جس کو اللہ کی طرف لے کر آنے والے نبیؐ نے ارشاد فرمایا کہ:

اَلْعِلْمُ سِلَاحِیْ

یعنی: "علم میرا اسلحہ ہے۔"

اس ارشادِ بلیغ کا صاف مطلب یہ ہے کہ ہم اقوام و ملل کو بزورِ شمشیر اپنے حلقے میں نہیں لاتے، بلکہ اس نور اور روشنی کی بنا پر لاتے ہیں کہ جو خیر و شر، حسن و قبح، توحید و شرک عظمت و ذلت، کامیابی اور ناکامی میں قوتِ تمیز عطا کرتی ہے اور اسی کا جامع ترین صفاتی نام علم ہے۔ وہی ہمارا اصل ہتھیار ہے، جو ہم وہم پرستوں اور حقائق سے نظریں چرانے والوں کے خلاف استعمال کرتے ہیں۔ ابن ماجہ کی روایت کے مطابق آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے علم کا حاصل کرنا مسلم معاشرے کے ہر فرد کے لیے ضروری قرار دیا:

طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِیْضَۃٌ عَلٰی کُلِّ مُسْلِمٍ وَّ مُسْلِمَۃٍ

قرآنِ حکیم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے جو مقاصد بیان کرتا ہے، ان میں تعلیم کتاب و حکمت بھی ہے:

یَتْلُوْا عَلَیْہِمْ اٰیَاتِہٖ وَیُزَکِّیْہِمْ وَیُعَلِّمُہُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ (الجمعہ: ۲)

یعنی: "وہی ہے جس نے امّیوں کے اندر ان ہی میں سے ایک رسول بھیجا جو ان پر اس کی آیتیں پڑھتا ہے اور انھیں پاک کرتا ہے اور انھیں کتاب اور حکمت سکھاتا ہے۔"

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی صفاتِ عالیہ اور ممتاز خصوصیات کے ساتھ اپنے مقصدِ بعثت پر اس طرح روشنی ڈالی ہے کہ:

اِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا

یعنی: "میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں۔"

Marfat.com

اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ نبوت کا ایک مقصد اشاعت علم بھی ہے، اور حضورؐ چوں کہ ایسی کتاب لائے جو علوم کا سرچشمہ ہے اور آپؐ کا اسوۂ حسنہ کمال علم و آگہی کا نمونہ تھا، اس لیے آپ کی بڑی خصوصیت علم ہی کے انتساب سے ظاہر کی گئی۔ بہ الفاظ دیگر یہ کہا جاسکتا ہے کہ سیرتِ نبوی کا اہم پہلو تعلیم ہی ہے۔ اس لیے جو لوگ اس دولت سے بہرہ ور ہیں ان کا مقام و مرتبہ نیابت نبوی ہے۔ "اَلْعُلَمَاءُ وَرَثَةُ الْاَنْبِیَاءِ" والی حدیث اسی مقام کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

اسلام نے جس علم کی دعوت دی ہے اس کی تین خصوصیات قابلِ ذکر ہیں۔ اولاً: تمام علوم کا سرچشمہ ذاتِ الٰہی ہے۔ ثانیاً: علم کا حقیقی اور یقینی ذریعہ وحیِ الٰہی ہے۔ ثالثاً: برتر علم، یقینِ آخرت اور معاد کا علم ہے۔

محض کسی شے کا جاننا کوئی اہمیت نہیں رکھتا، بلکہ تعمیری مقاصد ہی علم کو مثبت اور اعلا قدر و قیمت عطا کرتے ہیں۔ اس طرح جہاں اس بات کی وضاحت ہو جاتی ہے کہ دینِ اسلام علم کا یقینی ذریعہ وحیِ الٰہی کو قرار دیتا ہے وہاں اس امر کی بھی بہ تمام و کمال صراحت ہو جاتی ہے کہ علم کی بنیاد پر حاصل ہونے والی ثقافتی بلندیاں اسی وقت مثبت پہلوؤں کی حامل ہو سکتی ہیں کہ جب وہ بامقصد بھی ہوں، اور یہ مقصدیت یا حقیقی افادیت اس وقت تک پیدا نہیں ہو سکتی جب تک علم دین کے تابع نہ ہو۔

اسلام سائنسی ترقیوں کا مخالف نہیں، وہ خود تسخیرِ کائنات پر ہمیں ابھارتا ہے، وہ خود آفاق و انفس کے مشاہدے کی دعوت دیتا ہے اور ارض و سما سے تعلق رکھنے والے سارے کے سارے علوم کو وہ استحسان کی نظروں سے دیکھتا ہے، مگر یہ شرط ہے کہ ان میں مقصدیت ہو۔ اسلام تو علم، تہذیب، سیاست اور ثقافت کو الگ الگ خانوں میں تقسیم ہی نہیں کرتا۔ اس کے نزدیک زندگی کے صرف دو ہی عنوانات ہو سکتے ہیں؛ مُوحدانہ زندگی اور مشرکانہ زندگی۔ اللہ کے وجود اور اس کی صفات کے جاننے اور دل سے ماننے کا نام علم ہے اور زندگی میں اس کے نتائج کے ظہور کا نام عمل ہے۔

اسلام علم کی اشاعت میں مصروف رہنے والوں کو آخرت میں بلند ترین مقامات کی بشارت دیتا ہے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مرنے کے بعد انسان کے اعمال کا سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے، مگر تین چیزیں باقی رہتی ہیں اور ان میں سے اوّلین وہ علم ہے جس سے دوسروں کو فائدہ پہنچتا ہو۔ ان ہی خصوصیات کی بنا پر علما کے مقام و مرتبے پر روشنی ڈالتے

Marfat.com

ہوئے آپ نے ارشاد فرمایا کہ: "قیامت کے دن عالم کے قلم کی روشنائی شہیدوں کے خون سے تولی جائے گی۔"

فقط زہد و عبادت پر علم کی فضیلت ظاہر کرتے ہوئے حضورؐ نے ارشاد فرمایا کہ: "عالم کی فضیلت عابد پر ایسی ہے جیسی فضیلت مجھ کو میرے اصحاب میں سب سے کم مرتبہ آدمی پر ہے۔"

ایک دوسری حدیث میں یہ بھی ارشاد فرمایا گیا ہے کہ "جس طرح چودھویں کے چاند کو تمام کواکب پر فضیلت حاصل ہے اسی طرح عالم کو غیر عالم پر فضیلت حاصل ہے۔"

دراصل زندگی اور احکامِ الٰہی کے حقیقی شعور کے بعد انسان کے نفس پر شیطان کے لیے غلبہ حاصل کرنا دشوار ہو جاتا ہے۔ نتیجہ یہ کہ بندگی میں اخلاص پیدا ہو جاتا ہے۔ اسی لیے علم کو شہادت اور عبادت سے افضل قرار دیا گیا ہے۔ اسلام کے نزدیک زندگی کی صلاح و فلاح کا سارا دار و مدار خوفِ خدا پر ہے۔ اسلام میں اخلاق کی بنیاد بھی یہی ہے اور معاملات و عبادات نیز دیگر شعبوں کی اساس بھی اسی پر ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اللہ کا خوف اور خشیتِ الٰہی کب پیدا ہوتی ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ مکمل علم و آگہی اللہ تعالیٰ کے وجود پر مکمل ایمان کے بغیر نہیں پیدا ہو سکتی۔ اسی لیے قرآنِ پاک میں فرمایا گیا:

إِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا (فاطر: ۲۸)

یعنی: "اللہ تعالیٰ سے صرف اس کے علم والے بندے ڈرتے ہیں۔"

اللہ سے تو اہلِ علم ہی ڈرتے ہیں۔ یہ خشیت، علم اور توفیق کی رہینِ منّت ہوتی ہے اس لیے صاحبانِ علم کی فکر کو کارزارِ حیات میں مشعلِ راہ اور ان کے قدم کو سامانِ تعمیر اور ان کے وجود کو معاشرے کے لیے سرمایۂ زندگی کہا گیا۔ حدیث شریف میں ہے کہ: "اللہ تعالیٰ علم کو دنیا سے یوں ہی نہیں اٹھا لیتا مگر جب علما اٹھ جاتے ہیں تو ان کے ساتھ ساتھ وہ علم کو بھی اٹھا لیتا ہے۔" اس کا مطلب یہ ہے کہ علم کو محدود نہیں ہونا چاہیے بلکہ اس کی اشاعت زیادہ سے زیادہ ہونی چاہیے۔

اسلامی ثقافت کی جاذبِ نظر خصوصیت علم ہی ہے جس کی بنا پر مسلمانوں نے دنیا کے چپے چپے میں روشنی پھیلائی۔ حضرتِ عائشہؓ فرماتی ہیں کہ علمِ حدیث کی روایات کی کثرت کا نام نہیں بلکہ اللہ کے خوف کا نام ہے۔ جو بندے اللہ سے ڈرتے ہیں اور اپنے اخلاق اور معاملات کو برائیوں سے محفوظ رکھتے ہیں وہی ان علما میں سے ہیں جن کے بارے میں کتاب اللہ میں یہ ارشاد فرمایا گیا کہ: اللہ سے تو اہلِ علم ہی ڈرتے ہیں۔

Marfat.com

احترامِ علم و حکمت

قرآن مجید و فرقان حمید کی جو آیت سب سے پہلے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی اس میں علم حاصل کرنے کی ہدایت فرمائی گئی ہے:

اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ ۝ خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝ اِقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ ۝ الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝ عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ۝ (العلق: ۱-۵)

یعنی "اے محمدؐ! پڑھو تم، نام سے اپنے رب کے جس نے خلق کیا (پیدا کیا) انسان کو جمے لہو کی پھٹکی سے۔ ہاں پڑھو تم، اور تمہارا رب بڑا کریم ہے۔ جس نے سکھایا علم قلم کے ذریعے سے۔ سکھایا وہ انسان کو، جس کا اسے علم نہیں تھا۔"

اس طرح مسلمانوں کا، اہلِ اسلام کا پہلا سبق علم کی اہمیت ہے۔ اور اسلام ہی وہ پہلا دین ہے جس نے علم کو ایک مخصوص طبقے سے نکال کر عام انسانوں تک پہنچایا، اور بار بار علم حاصل کرنے کی ترغیب دی اور تاکید کی۔ قرآن حکیم میں حضورؐ کو اضافۂ علم کی دعا کرنے کی ہدایت دی گئی ہے:

وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِي عِلْمًا (طٰہٰ: ۱۱۴)

یعنی "اور آپ دعا کیجیے کہ اے میرے رب، میرا علم بڑھا دیجیے۔"

ہمیں بتایا گیا ہے کہ اہلِ علم کا درجہ بے علموں سے بڑا ہے اور عالم و جاہل برابر نہیں ہو سکتے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ (الزمر: ۹)

یعنی "آپ کہیے کہ کیا علم والے اور جہل والے کہیں برابر ہوتے ہیں۔"

قرآن حکیم کی اسی تعلیم کا نتیجہ تھا کہ مسلمانوں نے علم حاصل کرنے کو اولین اہمیت دی اور اخلاق کے بعد علم کو اپنے لیے ذریعۂ عزت اور وجۂ فضیلت جانا۔ علم کو حاصل کرنے اور علم کو پھیلانے اور اہلِ علم کی قدر و منزلت کرنے کے واقعات سے مسلمانوں کی تاریخ بھری پڑی ہے۔

Marfat.com

احکامِ الٰہی کے علاوہ شارعِ اسلامؐ کی تعلیمات میں علم کی اہمیت اور علما کے احترام کی واضح ہدایات موجود ہیں۔ حضورؐ کا ارشاد ہے کہ "جو کوئی خدا کے واسطے علم حاصل کرتا ہے وہ بڑا نیکی کا کام کرتا ہے۔ جو علم کا چرچا کرتا ہے وہ خدا کی تعریف کرتا ہے۔ جو علم کی تلاش کرتا ہے وہ اللہ کا عاشق ہوتا ہے۔ جو علم سکھاتا ہے وہ خیرات کرتا ہے۔ جو علم کو صحیح طریقے سے دوسروں تک منتقل کرتا ہے وہ خدا کے ساتھ وفاداری کا ثبوت دیتا ہے۔ علم سے انسان حرام و حلال میں تمیز کرتا ہے۔ علم جنّت کا راستہ روشن کر دیتا ہے۔ علم ریگستان میں ہمارا دوست ہے، علم تنہائی میں ہمارا ساتھی اور غربت میں غمگسار اور مددگار ہوتا ہے۔ دوستوں کی محفل میں علم ہمارا زیور ہوتا ہے اور دشمنوں کے مقابلے میں زرہ بکتر۔ علم کے ذریعہ سے بندہ بارگاہِ الٰہی میں اونچے مدارج پر پہنچتا ہے۔ دنیا میں عزت و مرتبہ حاصل کرتا ہے، آخرت میں مکمل خوشی۔

ایک اور ارشادِ رسولؐ ہے: "طالب علم کی راہ میں فرشتے اپنے پَر بچھاتے ہیں۔"

حضورؐ نے علم کو عبادت سے افضل قرار دیا ہے۔ فرمایا: "عالموں کی باتیں سننا اور حکمت کے اسباق کو دوستوں کے ذہن نشین کرانا عبادت سے بڑھ کر ہے۔"

اور یہ بھی سرکارِ دو عالمؐ ہی کا ارشاد ہے کہ "طالب علم کی روشنائی شہیدوں کے خون سے بھی زیادہ پاک ہوتی ہے۔"

اِن ارشاداتِ باری تعالیٰ اور تعلیماتِ رسولِ کریمؐ سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ احترامِ علم و حکمت نے ملتِ مُسلِمہ کا قوام بنا ہے۔ اسلام سے پہلے علم و حکمت کو صرف مذہبی پیشواؤں کی میراث سمجھا جاتا تھا۔ روشن خیال یورپ کی تاریخ علمی تحقیق کے صلے میں تعزیر کی مثالوں سے خالی نہیں ہے۔ زمین کا گول ہونا یا متحرک ہونا بھی اہلِ مذہب کو گوارا نہ تھا اور سائنس دان ایسی باتوں پر قید اور قتل کی سزاؤں کے مستوجب قرار پاتے تھے۔ نوعِ انسانی پر مسلمانوں کا یہ احسان ہے کہ انھوں نے علم کو پجاریوں اور پادریوں کے چنگل سے آزاد کرایا اور وہ ذہنی آزادی عطا کی کہ جو علم و حکمت کی جان ہے۔ اس طرح ہم پوری ذمے داری کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ جدید سائنس کی بِنا مسلمانوں کے ہاتھوں پڑی اور قافلۂ انسانیت جو آج علم و حکمت کی شاہ راہ پر گام زن ہے اس سفر کا آغاز مسلمانوں ہی نے کیا۔ قرآن حکیم نے حکمت کو خیرِ کثیر سے تعبیر کیا ہے:

وَمَنْ یُّؤْتَ الْحِکْمَۃَ فَقَدْ اُوْتِیَ خَیْرًا کَثِیْرًا (البقرہ: ۲۶۹)

Marfat.com

یعنی "اور جس کو حکمت عطا کی جاتی ہے وہ یقیناً خیر کثیر سے سرفراز ہوتا ہے۔"

مسلمان حکمت کو اپنی گم شدہ میراث سمجھتے ہیں اور اس سے مستفید ہونے میں ان کے لیے یہ بات مانع نہیں ہے کہ یہ کہاں سے ملی ہے، کس سے ملی ہے؟

ان حقائق کے مطالعے کے ساتھ ساتھ اگر ہم اپنی موجودہ حالت کا جائزہ نہ لیں تو یہ بات حقیقت پسندی اور خود شناسی کے خلاف ہوگی۔ موجودہ حالت کا جائزہ نہ لے کر گویا ہم اپنی غفلت اور نکبت کو جائز ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ آج ہماری کیفیت اس کے بالکل برعکس ہے جو ہمارے اسلاف کا طرۂ امتیاز تھی۔ آج ہم علم و حکمت کے میدان میں نہ صرف پیچھے ہیں بلکہ بہت پیچھے ہیں۔ علم و حکمت ہمارے لیے محترم نہیں رہے۔ آج تخلیق، تحقیق، ایجاد و اختراع سے ہمارا تعلق بہ مشکل نظر آتا ہے، بلکہ ہمیں یہ پوری طرح علم بھی نہیں ہے کہ علم و حکمت کے میدان میں یاران تیز گام نے کس منزل کو جا لیا ہے اور وہ کن امکانات کو چھو رہے ہیں۔ منزل یہ آگئی ہے کہ اگر کوئی شخص دوسروں کی تخلیقات و تحقیقات سے واقف ہو تو وہ شخص بھی ہمارے لیے سرمایہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ نقل و ترجمہ ہمارا کل اثاثہ ہے۔ اب تو ہمیں یہ بھی دوسرے بتاتے ہیں کہ تمھارے بزرگوں نے کیا کیا کام کیے تھے۔ ضرورت ہے کہ ہمارے اہلِ علم اور اصحاب فکر اس اندوہناک صورتِ حال پر غور کریں اور ان اسباب و عوامل کا کھوج لگائیں جو اس تفاوت کے ذمے دار ہیں اور ملت کے سامنے حقائق بلاکم و کاست بیان کریں۔

قرآن مجید و فرقان حمید نے علم کو نہایت اہم مقام دیا ہے اور اللہ تعالیٰ کے رسولؐ نے علم کو پھیلانے کی جو ہدایت اور جد و جہد فرمائی وہ بے مثل ہے۔ کتاب و سنّت کی روشنی میں علم کا مقام قطعی طور پر متعین ہو گیا کہ وہ اللہ اور اس کے رسولؐ کو پہچاننے کے لیے ہے اور ارض و خلا میں تحقیق و تلاش اور جستجو کے لیے ہے اور علم اس لیے ہے کہ اس سے انسانی فلاح و بہبود کے دروازے کھل جائیں اور علم کی غایت و منشا یہ ہے کہ اس سے دنیا و آخرت کی درستی کا سامان کیا جائے۔

قرآن حکیم نے اور حدیث شریف نے شمع روشن کر دی ہے اور اسی روشنی اور نور سے ہمارے لیے متعین راہوں کو بھی صاف اور روشن کر دیا ہے۔ ہمارا منتہائے مقصود تعمیر پاکستان ہے اور ہم پاکستان کو اسلام کا ایک ناقابلِ تسخیر قلعہ بنانے کا عزم بالجزم رکھتے ہیں۔ اس کے لیے ہمیں صحیح علم کو پھیلانا ہو گا۔ علم کو ہم پاکستان کے ہر ہر بچے کے

Marfat.com

لیے عام کر دیں گے کیوں کہ قرآن ہم سے یہی چاہتا ہے اور رسولِ مقبول ؐ کا یہی فرمان ہے اپنی امت کے لیے۔ آئیے کیا حکومت اور کیا عوام و خواص سب مل کر اللہ تعالیٰ کے حکم اور رسول اللہ ؐ کی تعلیمات کی تعمیل میں منہمک ہو جائیں اور پاکستان کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مستحکم کر دیں۔

Marfat.com

عِلم و حکمت

دنیا کی ہر چیز کہ جو انسان کو حاصل ہے، اور میسر ہے، اس کا بنانے والا اور اس کا عطا کرنے والا اللہ ہے۔ انسان کے آرام کے لیے، اور انسان کے شرف و امتیاز کے لیے، اور انسان کو اشرف المخلوقات، یعنی تمام کائنات میں انسان کو اشرف اور برتر رکھنے کے لیے اللہ تبارک و تعالیٰ نے اسے اپنی نعمتوں سے نوازا ہے۔ اور بڑی بڑی نعمتوں سے اس لیے نوازا ہے کہ وہ کائنات میں خیر و برکت کے کام کرے، اور نیک کام کرے اور آدمیت اور انسانیت کے مقام کو بلند کرے اور اونچا رکھے۔

ان لاتعداد اور بے حساب نعمتوں میں، جو حق تعالیٰ جلّ شانہٗ نے انسان کو عطا فرمائی ہیں، سب سے بڑی اور سب سے اچھی نعمت علم ہے۔ تخلیقِ آدم کے بعد سب پہلے جو چیز انسان کو عطا کی گئی، آپ جانتے ہیں وہ کیا ہے؟ ــــــ وہ علم ہے ــــــ قرآنِ کریم کی سورۂ بقرہ میں ارشادِ ربانی ہے:

وَعَلَّمَ آدَمَ الْاَسْمَاءَ

یعنی: "اور خدا نے آدم کو اسما کا علم سکھایا"

پہلی وحی جو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کی گئی، اس میں علم حاصل کرنے کا حکم دیا گیا ہے:

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ

یعنی: "پڑھ اپنے رب کے نام سے"

اس پہلی وحی کے سلسلے میں خداوندِ قدوس نے خود اپنا تعارف کرایا ہے:

وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۙ الَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۙ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ۗ

"اور تیرا رب بڑی بزرگی والا جس نے قلم کے ذریعہ علم سکھایا۔ انسان کو وہ علم دیا جس سے وہ واقف نہ تھا"

ذرا غور فرمائیے۔ اس کائنات کی ہر چیز پر گہری نگاہ ڈالیے۔ اس دنیا کی ہر شے پر توجہ فرمائیے اور ہر جاندار مخلوق کو دیکھیے جس کی انواع و اقسام کا احاطہ

Marfat.com

انسان ہرگز نہیں کر سکتا۔ انسان تصور نہیں کر سکتا، سوچ نہیں سکتا کہ اس کے ساتھ اسی دنیائے فانی میں کیسی کیسی اور کتنی مخلوق آباد ہے، مگر ایک انسان اتنا ضرور سوچ سکتا ہے کہ بہت سی مخلوق علم سے محروم ہے۔ اور جو مخلوق علم و حکمت سے مالامال ہے اور عقل و دانش سے آراستہ و پیراستہ ہے وہ صرف انسان ہے۔ اگر خدا تعالیٰ انسان کو علم و حکمت عطا نہ فرماتا تو غور فرمائیے انسان اور جانور میں کیا فرق رہتا! خود انسانوں میں بھی جو انسان پیدائشی گونگے ہوتے ہیں یا عقل و خرد سے محروم ہوتے ہیں، ان میں اور صحت مند انسانوں میں کتنا فرق ہوتا ہے!

فکر کا دراصل یہی مقام ہے، جہاں انسان کو سجدۂ شکر کرنا چاہیے اور ہمیشہ یہی دعا کرنی چاہیے کہ:

رَبِّ زِدْنِی عِلْمًا ——— رَبِّ زِدْنِی عِلْمًا

"اے میرے رب! میرا علم زیادہ کر۔ اے اللہ! میرا علم زیادہ کر۔"

علم انسان کی سب سے بڑی طاقت ہے اور قلم اس کا سب سے بڑا ہتھیار ہے۔ جب ہم زبان قرآن میں رَبِّ زِدْنِی عِلْمًا کہتے ہیں تو ہم اسے جانتے ہیں اور اسے تسلیم کرتے ہیں کہ علم کی تقسیم کم و بیش ہے۔ کچھ کو زیادہ علم نصیب ہے اور کچھ کو کم اور کچھ کو بالکل نہیں۔ جن کو زیادہ علم مقدر ہوا ہے وہ یقیناً بڑے خوش نصیب ہیں اور خوش قسمت اور لائق صد احترام۔

اہل علم و فضل پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ علم و قلم کو خیر کے لیے استعمال کریں۔ علم کو محدود نہیں ہونا چاہیے، بلکہ اسے عام ہو کر ہر انسان تک پہنچنا چاہیے۔ درس گاہیں عام ہونی چاہییں اور ان درس گاہوں کے دروازے ہر انسان پر کھل جانے چاہییں۔

اُطْلُبُوا الْعِلْمَ مِنَ الْمَهْدِ اِلَى اللَّحْدِ

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ گہوارے سے قبر تک علم حاصل کرو۔ اس ارشادِ رسول ﷺ کا صریحاً مطلب یہی ہے کہ ہر انسان تحصیلِ علم کرے۔ اور اسی ہدایت کا یہ تقاضا ہے کہ جو حاکم ہیں اور حکمت جنھیں عطا ہوئی ہے وہ تحصیلِ علم کے لیے ماحول کو سازگار بنائیں اور جو صاحبانِ علم ہیں اور اہلِ قلم ہیں وہ علم کو پھیلائیں اور چراغ سے چراغ جلائیں اور گہوارے سے قبر تک، یعنی ابتدائے حیات سے انتہائے حیات تک، یہ کارِ خیر تواتر و تسلسل کے ساتھ جاری رہے۔

Marfat.com

علم و حکمت جب دونوں ساتھ ہوتے ہیں تو قسمتیں بدل جاتی ہیں اور دین و دنیا کی ساری راہیں روشن اور منور ہو جاتی ہیں۔ علم و حکمت میسّر ہو تو یہ ایک انعامِ خدا ہے۔

علم کی اہمیت اس سے بھی ظاہر ہوتی ہے کہ قرآنِ مجید و فرقانِ حمید میں منصبِ رسالت کے فرائض میں تعلیم کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ فرائضِ رسالت کے سلسلے میں ارشادِ خداوندی ہے:

يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ ط (البقرہ: ۱۲۹) یعنی: "رسول ؐ لوگوں کو کتاب کی تعلیم دیتے ہیں، انھیں حکمت اور تزکیے کا سبق سکھاتے ہیں۔"

اس آیتِ کریمہ میں تعلیمِ کتاب کے ساتھ حکمت کا بھی ذکر ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ جب آدمی علم حاصل کرتا ہے تو اس کے ذہن کی تربیت بھی ہوتی ہے اور اس طرح صاحبِ علم کو خیر و شر میں تمیز کرنی آ جاتی ہے اور یہی صلاحیت قرآن حکیم کے الفاظ میں حکمت ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے:

وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا ط (البقرہ: ۲۶۹)

یعنی: "جسے حکمت عطا ہوئی اسے خیرِ کثیر کا مالک بنا دیا گیا۔"

اس طرح جب علم و حکمت اکٹھے ہوتے ہیں تو انسان کا ضمیر آلودگیوں سے پاک ہونے لگتا ہے اور یہ تزکیہ ہے۔

تزکیے کی یہ کیفیت علم کے واسطے سے پیدا ہوتی ہے۔ تزکیہ انسان کی فلاح اور کام یابی کی ضمانت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ۝ (الشمس: ۹)

"وہ آدمی کام یاب ہے جو اپنے نفس کا تزکیہ کرلے۔"

گویا علم کلیدِ کام یابی ہے۔ قرآن اہلِ علم کو بصیر و بینا اور جاہلوں کو اعمیٰ اور نابینا قرار دیتا ہے۔ اسی طرح علم کو نور سے اور جہل کو ظلمات، یعنی تاریکیوں سے تعبیر کرتا ہے۔ قرآن نے اپنے سے استفادے کی متعدد شرائط میں سے دو شرطوں کا بہ کثرت اعادہ کیا ہے:

اَلَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ اور اَلَّذِيْنَ يَعْقِلُوْنَ

یعنی "قرآنی ہدایات ان لوگوں کے لیے نفع بخش ہوتی ہیں: جو علم رکھتے ہیں۔ جو حکمت و دانائی رکھتے ہیں۔"

ہر کام اور ہر فعل کے لیے ایک دستور ہوتا ہے۔ زندہ رہنے اور زندگی گزارنے اور زندگی

Marfat.com

بسر کرنے کے لیے بھی ایک دستور کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ دستور قرآن ہے جو درسِ علم و حکمت دیتا ہے اور اس درسِ علم و حکمت کو بھی علم و حکمت ہی سے سمجھا جا سکتا ہے۔

اس تمام بیان سے بالآخر ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ علم حاصل کرنا چاہیے اور حکمت کو اپنی ملکیت بنانا چاہیے اور اس دنیا میں دانا و بینا ہو کر رہنا چاہیے، کیوں کہ ایسا کیے بغیر نہ ہم اپنے دین کو درست رکھ سکتے ہیں اور نہ دنیا کو اچھا اور پُر مقصد بنا سکتے ہیں ـــــ خلاصۂ پیغام اسلام یہ ہوا کہ:

"جاگو جگاؤ۔ شمعِ علم و حکمت کو ہاتھ میں لو اور تمام تاریکیوں کو روشنی میں بدل دو۔ ایک مومن کا یہ بڑا اہم فرض ہے۔"

Marfat.com

تعلیم

ہر وہ نظامِ زندگی جو اس دُنیا کا نظام اپنے مخصوص طرز پر چلانا چاہتا ہو اور اپنے طریقے پر زندگی کے مسائل حل کرنا چاہتا ہو وہ اِس مقصد کے لیے افراد کو ایک خاص سانچے میں ڈھالتا ہے اور اپنے اصولوں کے مُطابق انسان سازی کا کام انجام دیتا ہے۔ انسان سازی کا سب سے اہم ذریعہ اور طریقہ تعلیم و تربیت ہے۔ نظامِ تعلیم نظامِ زندگی کا جزوِ لاینفک ہوتا ہے اور کسی نظامِ حیات کی کام یابی کا تمام تر انحصار زندگی کے مجموعی فلسفے سے متاثر ہوتا ہے اور اس کو تقویت بھی پہنچاتا ہے۔ اگر نظامِ تعلیم آزاد ہو یا فلسفۂ حیات سے متصادم ہو تو وہ کام یاب بھی نہیں ہوگا اور زندگی کی خدمت سے بھی معذور رہے گا۔ تعلیم کی حیثیت نظامِ حیات کے ایک خدمت گار کی سی ہے۔ تعلیم جو اقدار نمایاں کرتی ہے وہ زندگی کو صحیح خطوط پر استوار کرتی ہیں۔ اسی طرح زندگی کا فلسفہ نظامِ تعلیم کو تقویت پہنچاتا ہے۔

ماضی یا حال کے کسی نظام کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ وہ سب سے پہلے اپنی توجّہ نظامِ تعلیم کی صحیح تشکیل پر مرکوز کرتا ہے اور اس کو اپنے مجموعی مقاصد اور مزاج سے ہم آہنگ اور مربُوط کرتا ہے۔ اسلام، جس کو ہم مسلمان ایک مکمل اور جامع نظامِ حیات مانتے ہیں اور زندگی کے تمام شعبوں کو اس کے مطابق ڈھالنے کی ضرورت تسلیم کرتے ہیں، اس کی کام یابی کے لیے بھی نظامِ تعلیم و تربیت کی صحیح تشکیل ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے علم کی اہمیّت پر بے حد زور دیا ہے۔ قرآنِ حکیم اور حدیثِ رسولؐ میں اس باب میں واضح اشارات ملتے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنے بارے میں فرمایا ہے کہ مجھے معلّم بنا کر بھیجا گیا ہے: حضورؐ کے الفاظ ہیں "بُعِثْتُ مُعَلِّماً"۔

قرآنِ حکیم نے عالم اور جاہل کو برابر قرار نہ دے کر علم کے بلند مرتبے کو واضح فرمایا ہے۔ قرآنِ حکیم کی تعلیمات کی روشنی میں جو مُعاشرہ تشکیل پاتا ہے اس میں علم، عالم، معلّم، اور متعلّم کو اعلاترین مقام حاصل ہوتا ہے۔ اس معاشرے میں تعلیم کی نعمت عام ہوتی ہے۔ تعلیم پر کسی خاص گروہ، جماعت یا طبقے کا اجارہ نہیں ہوتا۔ اسلامی مُعاشرے میں ہر مرد

Marfat.com

اور عورت کا حق ہی نہیں، فرض ہوتا ہے کہ وہ علم حاصل کرے۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ جو مسلمان علم رکھتا ہو اس کا فرض ہے کہ وہ علم کو دوسروں تک بھی پہنچائے۔ علم کو صرف اپنی جاگیر نہ بنالے۔ علم کو چھپانا حق کو چھپانے کی طرح بری بات ہے۔

مقاصد تعلیم پر بڑی بڑی خامہ فرسائیاں ہوئی ہیں۔ ماہرین نے تعلیم کے مقاصد متعین کرنے میں بہت کاوشیں کی ہیں۔ صفحات کے صفحات سیاہ کیے ہیں، لیکن اگر ہم صاف ذہن سے غور کریں اور غیر ضروری بحثوں میں نہ اُلجھیں تو تعلیم کا مقصد صرف ایک ہے اور وہ ہے انسان کو انسان بنانا۔ انسان کو اگر تعلیم انسان، یعنی سچّا اور اچھا انسان، نہ بنا سکے تو وہ اپنے مقصد میں ناکام ہے۔ انسان سازی میں جو نظامِ تعلیم ناکام ہو اور متعلم میں انسانیت نہ پیدا کر سکے وہ تعلیم ناقص اور لاحاصل ہے، بلکہ ضرر رساں ہے۔ قرآنِ حکیم کے نقطۂ نظر سے وہ انسان بہترین انسان ہے جو اللہ کا اچھا بندہ ہو، گویا قرآنی نقطۂ نظر سے تعلیم کا مقصد عبادِ صالح اور نیک بندے تیار کرنا ہے۔

قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ مسلمان بہترین امت ہیں اور ان کو اس لیے بھیجا گیا ہے کہ وہ نیکیوں اور بھلائیوں کو پھیلائیں اور برائیوں کو روکیں۔

كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ
وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ (آلِ عمران: ۱۱۰)

ترجمہ: "تم ہو بہتر سب امتوں سے جو بھیجی گئی عالم میں، حکم کرتے ہو اچھے کاموں کا اور منع کرتے ہو بُرے کاموں سے۔"

اس ارشادِ باری کی روشنی میں تعلیم کا سب سے اہم وظیفہ یہ ہونا چاہیے کہ وہ ایسے انسان پیدا کرے جو خود بھی اچھے انسان ہوں اور اچھائی سے محبت کرتے ہوں اور اچھائیوں کو پھیلائیں اور اپنے فکر و عمل سے وہ فضا پیدا کریں جس میں سچائی، نیکی، شرافت اور انسانیت کی قدر ہو، اعلا اقدار کا بول بالا ہو اور یہ سب اس حد تک ہو کہ افراد کو عزت کے ساتھ زندہ رہنے کے لیے نیک بننا پڑے اور وہ پھر ایسا ماحول اور معاشرہ تشکیل دیں جس میں برائیوں کو پنپنے کا موقع ہی نہ ملے اور کوئی بداخلاقی سر نہ اٹھا سکے۔

ایک اچھے نظامِ تعلیم کی یہ خصوصیت بھی ہوتی ہے کہ اس کے ذریعہ سے علم اور عمل، قول اور فعل کی دوئی ختم ہو جاتی ہے۔ اس نظام کے تعلیم یافتہ افراد جیسا سوچتے ہیں اور زبان سے جو کچھ کہتے ہیں وہی کرتے ہیں۔ ان کے فکر اور فعل میں تضاد نہیں ہوتا۔ زبان سے

Marfat.com

صداقت کی تعلیم اور عمل سے کذب کا استحکام کبھی مفید نہیں ہوتا اس لیے کوئی نظامِ تعلیم جو انسان کو ذہنی طور پر تو افکار و معلومات سے مُسلّح کرتا ہو لیکن عملی طور پر اُن میں ایسی کوئی تحریک و ترغیب نہ پیدا کرتا ہو جو عقائد و نظریات سے ہم آہنگ ہو جائے تو ایسا نظامِ تعلیم بے مقصد، لاحاصل، ناکام اور غیر مفید ہوتا ہے۔

تعلیم کا کام یہ ہے کہ وہ انسان میں ایسی روشنی پیدا کر دے جو اس کے ذہن کو بھی منور کر دے اور اس کے اعمال کو بھی سنوار دے۔ جو تعلیم یہ کام نہیں کر سکتی وہ روشنی نہیں ہے تاریکی ہے۔ تعلیم کی روشنی کو پھیلانا ہر مسلمان پر فرض ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ہے کہ "علم سیکھو اور لوگوں کو سکھاؤ"۔ حضورؐ کے الفاظ ہیں: "تعلموا العلم وعلموہ النّاس"۔

علم کا حاصل کرنا بھی ثواب ہے اور علم کی اشاعت بھی باعثِ اجر ہے۔ حدیث میں ہے کہ "عالم اور متعلّم دونوں اجر میں شریک ہیں"۔ یہ بھی حدیث ہے کہ "جو علم حاصل کرنے کے لیے گھر سے نکلے وہ اللہ کی راہ میں ہے جب تک واپس نہ آ جائے"۔

ان احکام و ارشادات کی روشنی میں ہمیں اپنے تعلیمی نظام پر پوری توجہ کرنی چاہیے تاکہ ہم بہت اچھے انسان، بہت مخلص مسلمان اور بہت سچے پاکستانی پیدا کر سکیں جو ایک طرف اپنی تہذیب اور روایات کے امین ہوں تو دوسری طرف عہدِ جدید کے تقاضوں کو سمجھ کر پورا کر سکیں تاکہ ترقی کی دوڑ میں پاکستان پیچھے نہ رہ جائے۔

ترقی اور تغیّر ایک ناگزیر عمل ہے۔ حالات کی تبدیلی کے ساتھ ضروریات اور تقاضے بھی بدل جاتے ہیں۔ علم میں بھی اضافے ہوئے ہیں اور سائنس نے بھی بہت ترقی کی ہے۔ صنعت کی ترقی نے بھی بہت سے نئے مسائل پیدا کیے ہیں۔ معاشی عوامل بھی معاشرتی اقدار پر اثر انداز ہو رہے ہیں۔ ایک زندہ قوم کی حیثیت سے ہمیں وقت کے چیلنج کا مقابلہ کرنا ہے اور پاکستان کو علم و حکمت کی دولت سے مالا مال کرنا ہے۔ دوسری قوموں کے دوش بدوش آگے بڑھنے کے لیے تغیّر و تبدیلی کو قبول کرنا پڑتا ہے۔ اور ہم اس تغیّر اور پیش رفت کو قبول کرنے کے لیے تیار ہیں لیکن ہم اپنی تہذیب کو برقرار رکھتے ہوئے اور اپنی روایات کو آگے بڑھاتے ہوئے نئے تقاضوں کی تکمیل کریں گے۔

ہم جدید چیزوں کے خلاف نہیں ہیں اور ان سے استفادہ کرنے میں کوئی حرج نہیں سمجھتے بلکہ ہم اچھی بات کو اپنی میراث سمجھتے ہیں، کیوں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ حکمت کو مومن اپنی گم شدہ میراث سمجھتا ہے۔ وہ جہاں بھی اس کو پاتا ہے حاصل کر لیتا ہے:

Marfat.com

"الحکمۃ ضالۃ المومن اخذھا حیث وجدھا"

لیکن ہر نئی چیز حکمت نہیں ہوتی اور اس قابل نہیں ہوتی ہے کہ اس کو بلا تامّل اپنا لیا جائے۔ اس لیے نظامِ تعلیم کی خوبی یہ ہونا چاہیے کہ طالبِ علم اپنے ثقافتی ورثے سے پوری طرح باخبر ہونے کے ساتھ ذہنی صلاحیتوں اور فنّی مہارتوں سے بھی اچھی طرح لیس ہوں۔

بانیِ پاکستان حضرت قائدِاعظمؒ نے تعلیم کے سلسلے میں ایک بار فرمایا تھا:

"اگر ہمیں حقیقی اور تیز رفتار ترقی کرنی ہے تو ہمیں تعلیم کے مسئلے پر خاص توجّہ دینی چاہیے۔ اپنی تعلیمی پالیسی اور پروگرام کو ایسے خطوط پر چلانا چاہیے جو ہماری قوم کے مزاج کے مطابق ہوں، جو ہماری تاریخ اور ثقافت سے ہم آہنگ ہوں اور جدید تقاضوں کے مُطابق ہوں۔"

Marfat.com

Marfat.com

وَمَنْ تَزَكّٰى فَاِنَّمَا يَتَزَكّٰى لِنَفْسِهٖ ؕ

(فاطر: ۱۸)

جو شخص بھی پاکیزگی اختیار کرتا ہے اپنی ہی بھلائی کے لیے کرتا ہے۔

تزکیۂ نفس اور عمل

Marfat.com

تزکیۂ نفس

دنیا کے بیشتر مذاہب میں ایک بنیادی عقیدہ یہ ہے کہ انسان پیدائشی طور پر گناہ گار ہے، لیکن اسلام نے اس باطل عقیدے کی، جو گمراہ کن بھی ہے اور شرفِ انسانیت کے منافی بھی، تردید کی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تخلیقِ انسان کے بارے میں اپنا یہ اصول قرآنِ پاک میں بیان فرمایا ہے:

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ؇ (التین: ۴)

یعنی: "ہم نے ہر لحاظ سے انسان کو بہترین پیمانے پر تخلیق کیا ہے۔"

سورۃ الشمس میں اللہ تعالیٰ نے جہاں اپنی دیگر مخلوقات کو اپنی ربوبیت پر گواہ کے طور پر بیان کیا اور ان کی قسم کھائی ہے، اور اس میں نفس انسانی کی استواری اور سلامتی کو بھی شامل فرمایا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا (الشمس: ۸)

یعنی: "اور قسم ہے نفس انسانی کی اور اس کو استوار کرنے والی ذات کی۔"

اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کا نفس حقیقت میں ایک بے غبار آئینہ ہے، لیکن زندگی کے تقاضے اور اس کے مسائل جو ان گنت، بے شمار اور مختلف النوع ہیں، ان کی تکمیل کی تگ و دو انسان کو ہمہ وقت اس گرد و غبار کے زیرِ اثر رکھتی ہے جو اس آئینے کو گدلا دیتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان اپنی شعوری زندگی کے ہر لمحے میں تین قسم کے حقوق ادا کرتے رہنے کا پابند ہے یعنی حقوق اللہ، حقوق العباد اور حقوقِ نفس۔

کارِ دنیا کی انجام دہی کی اس تگ و دو میں آدمی ان تینوں قسم کے حقوق کی ادائی میں وہ توازن قائم نہیں رکھ سکتا جو اگر قائم رہے تو آئینۂ دل کی صفائی میں فرق نہیں آسکتا۔ یہ فضیلت صرف انبیائے کرام کے حصے میں آئی ہے۔ درحقیقت حقوق اللہ، حقوق العباد اور حقوق نفس میں ہر کوتاہی آئینۂ دل کو زنگ آلود کر دیتی ہے۔ دل کی اس صفائی کا ہر وقت خیال رکھنا اور شعوری یا غیر شعوری کوتاہی کی وجہ سے اس پر آجانے والے داغ دھبوں اور کدورت کو صاف کرتے رہنا

Marfat.com

ہی تزکیۂ نفس ہے اور نفس کو کدورتوں سے صاف رکھنے کا یہ عمل اللہ کے نزدیک حصولِ فلاح کا ضامن ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَکّٰهَا ۝

یعنی: "اللہ کا ہر وہ بندہ فلاح سے ہم کنار ہوا جو اپنے نفس کا تزکیہ کرتا رہا"۔

سورۃ الشمس ہی میں اللہ تعالیٰ نے نفسِ انسانی کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے کہ اس نے اس کو نیکی اور بُرائی میں تمیز اور فرق کرنے کی صلاحیت سے بھی مالامال فرمایا ہے۔

ارشاد ہوتا ہے:

فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا ۝

اسی خداداد صلاحیت کا اثر ہے کہ آدمی جب اللہ یا اس کے بندوں کے حقوق کی ادائی میں کوئی کوتاہی کرتا ہے، کسی پر کوئی ظلم دانستہ یا نادانستہ کر بیٹھتا ہے یا اس سے کوئی ایسا قول یا فعل سرزد ہو جاتا ہے جو اللہ کے کسی بندے کی دل آزاری کا سبب ہو، تو اس کے دل پر ایک غبار سا چھا جاتا ہے۔ اس حقیقت کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے گناہ کی اس تعریف کے ذریعہ سے سمجھایا ہے کہ:

اَلْاِثْمُ مَا حَاكَ فِیْ صَدْرِكَ

مطلب یہ کہ گناہ ایک سلیم القلب فرد کے دل میں کانٹے کی طرح کھٹکتا ہے۔"

اسلام کی تعلیمات یعنی قرآن حکیم کی آیات اور رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات سے ہمیں یہ تعلیم ملتی ہے کہ جو شخص اس طرح اپنے ضمیر کی خاموش آواز کو سن لیتا اور اس گناہ کی تلافی کی کوشش کر لیتا ہے تو اس کا نفس گناہ کی کثافت سے پاک ہو جاتا ہے۔

دل کے آئینے کو ہر گناہ سے خواہ اس کا تعلق حقوق اللہ سے ہو خواہ حقوق العباد یا حقوقِ نفس سے، پاک کرنے کی کوشش تزکیۂ نفس ہے۔

ساری گفت گو کا ماحصل یہ ہے کہ انسان کا نفس شعوری اور غیر شعوری طور پر غلطیوں، کوتاہیوں اور بے احتیاطیوں کی وجہ سے مکدّر ہوتا رہتا ہے۔ نفس کی اس خرابی پر متوجہ رہنا اور اس کی صفائی سے غفلت نہ برتنا ہی تزکیۂ نفس ہے۔ یہ عمل اللہ کی نظروں میں اس قدر اہم ہے کہ اسے انبیائے کرام کے فرائضِ منصبی میں شامل فرمایا گیا ہے۔ اسی لیے رسول اللہ ؐ نے اپنی اُمّت کو ان طریقوں کی خصوصی طور پر تعلیم دی ہے، جو تزکیۂ نفس کے لیے ضروری ہیں۔ آپ ؐ کی

Marfat.com

تعلیمات اور ہدایات پر غور کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسان جو کوتاہیاں اور غلطیاں حقوق ا
کے بارے میں کرتا ہے ان کی تلافی اور ان کے بُرے اثرات کو نفس سے دور کرنے کی تدبیر یہ
کہ آدمی اللہ سے معافی مانگتا رہے۔ اللہ سے معافی مانگنے کا یہ عمل استغفار کہلاتا ہے جس کے
بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "میں دن میں ستّر سے زیادہ بار استغفار کر
ہوں"۔ لیکن جہاں تک حقوق العباد کے سلسلے میں ہونے والی غلطیوں، کوتاہیوں اور خطاؤں
معاملہ ہے یہ کام ضرورت اور اہمیت کے لحاظ سے سب سے زیادہ ہے۔ رسول اللہؐ نے ارش
فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ حقوق العباد کو اس وقت تک معاف نہیں فرماتا جب تک متاثر ہو
والے فرد سے حساب صاف نہ کر لیا جائے۔ ایک انسان کے کسی غلط طرزِ عمل، کسی ناروا سلوک یا
زیادتی سے کبھی تو ایک یا چند افراد متاثر ہوتے ہیں اور کبھی ان اثرات کا دائرہ بڑھ کر معاشر
قوم، ملک اور بسا اوقات ساری انسانیت تک جا پہنچتا ہے۔ اور اسی مناسبت سے نفس کی کا
میں اضافہ ہوتا جاتا ہے اور اسی تناسب سے تزکیۂ نفس کا کام مشکل تر ہو جاتا ہے۔ اس
دوسروں کو اپنے ہاتھ، زبان، قلم، قوت و صلاحیت کے غلط استعمال اور افکار و اعمال کی خرابیو
کے بُرے اثرات سے محفوظ رکھنا ضروری ہے۔ تزکیۂ نفس کا عمل صرف نفس کے آئینے سے
گرد و غبار کو صاف ہی نہیں کرتا بلکہ آدمی میں اس ضرورت کا احساس بھی پیدا کرتا ہے کہ ا
آئندہ زندگی میں کوئی ایسا کام نہیں کرنا چاہیے جو دوسروں کے لیے حق تلفی یا ان پر ظلم و زیاد
موجب ہوتا ہے اور اس کے نتیجے میں اس کے اپنے نفس کو بھی داغ دار کر دیتا ہے۔

اس سے واضح ہوا کہ تزکیۂ نفس کے سلسلے میں اللہ کے رسولؐ نے جو ہدایات فرمائی
ان پر مسلمان افراد اور مسلمان معاشرے دونوں کو کاربند رہنا چاہیے تاکہ اس طرح ہم اس
مسلم کے حامل بن سکیں جو اللہ کو مطلوب ہے اور محبوب۔

Marfat.com

تربیتِ نفس

نفس ـــــ روح، جان، قالب، وجود، مزاج، طبیعت اور فطرت کے معنوں میں مستعمل ہے اور یہ مختلف معنی قرآن کریم کی متعدد آیات سے ثابت ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی مبارک کتاب میں سب سے زیادہ یہی لفظ استعمال فرمایا گیا ہے، اور بات بالکل صاف اور واضح ہے کہ قرآن کریم کا مخاطب انسان اور اس کا نفس ہی ہے، خواہ اسے آپ وجود و ذات کے معنی میں استعمال کریں، یا قلب و روح کے معنی میں، یا مزاج و فطرت کے معنی میں۔ اب اس نفسِ انسانی کی حقیقت قرآن کریم کی زبان سے سنیے:

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ۝ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ۝ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ۝ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا ۝ (الشمس: ۷تا۱۰)

ترجمہ: اور اس ذات کی قسم جس نے نفسِ انسانی کو ہموار کیا، پھر اس کی بدی اور اس کی پرہیزگاری اس پر الہام کر دی، یقیناً فلاح پا گیا وہ جس نے نفس کا تزکیہ کیا، اور نامراد ہوا وہ جس نے اس کو دبا دیا۔

خالقِ کائنات نے ہر انسان کی فطرت میں یہ بات رکھ دی ہے کہ وہ اچھائی اور برائی میں فرق کر سکتا ہے، اس طرح یہ انسانی فکر بھی فطری ہے کہ اچھائیوں کو اختیار کرنا اور برائیوں سے بچنا ضروری ہے۔ دراصل اچھائی اور برائی، خیر و شر اور زشت و خوب کے درمیان تمیز کرنا ہی انسانیت کا جوہر ہے۔ لیکن عقل کے نہاں خانے سے اس جوہر کو ابھارنے کے لیے مسلسل عمل اور جہدِ پیہم کی ضرورت ہے۔ اس کوشش کے بغیر یہ جوہر نہیں ابھر سکتا۔ قرآن کریم نے جس تزکیے پر زور دیا ہے اور جس کو کامیابی کا راز بتایا ہے، وہ بھی ہم سے اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ عملِ مسلسل کے ذریعے اس کی تربیت کرتے رہیں۔ یہ طریقہ بھی خود قرآن شریف ہی نے بتایا ہے:

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ؕ (العنکبوت: ۶۹)

ترجمہ: اور جو لوگ ہماری راہ میں جدوجہد کریں گے ان کی ہم اپنی راہ تک ضرور رہنمائی کریں گے۔

انسان ہر طرح کی کشمکش سے گزر کر استقامت کے ساتھ جب نیکی اور پرہیزگاری کی

Marfat.com

راہ پر گام زن ہوتا ہے تو اسے صراط مستقیم نصیب ہوتی ہے۔ اس راہ میں موانع بہت ہیں۔ مشکلات کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے۔ نفس خیر و شر کی کشمکش سے ہمیشہ دوچار رہتا ہے، حقیقتیں کبھی کبھی ملتبس ہو کر سامنے آتی ہیں، برائیاں نفس انسانی میں سر اٹھاتی رہتی ہیں اس لیے اسلام نے ایمان و عمل کی تربیت پر بھی زور دیا ہے، کیوں کہ ایمان تو درحقیقت ایک پودا ہے اور جب سرزمین قلب میں اس کو لگایا جاتا ہے تو اس وقت ثمر آفرین بنتا ہے جب اس کی آبیاری کی جائے، اس کی نگہداشت کی جائے، اس کا احتساب کیا جائے، اپنی نیتوں کا جائزہ لیا جائے، اپنے دلوں کو ٹٹولا جائے کہ خوفِ خدا کس حد تک ہے اور اس کی رضا کی طلب کے لیے نفس کون کون سی قربانیاں دے سکتا ہے۔ اس تربیت کی طرف قرآن شریف کی اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے:

وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ۙ فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِىَ الْمَاْوٰى (النازعات ۴۰تا۴۱)

ترجمہ: اور جو اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرا اور جس نے اپنے نفس کو بری خواہشات سے روکا تو جنت اس کا ٹھکانا ہے۔

نفس کو برائیوں سے روکتے رہنا اور نیکیوں کی طرف اس کے رجحانات کو غالب بنانا، اس کی تربیت ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ چیز یک بارگی نہیں ہوتی۔ تربیت، قلب و نگاہ کا تازیانہ چاہتی ہے۔ یہ ہمارا فرض ہے کہ ہم خود اپنے دلوں کو ٹٹولتے رہیں اور اپنی نگاہوں کو اپنے نفس کے تعاقب میں دوڑاتے رہیں کہ اللہ اور اس کے رسول کے احکام کی اطاعت ہماری فطرت اور عادت بن جائے اور بدی کا رجحان مغلوب ہو جائے۔

اسلام کے ارکان خمسہ یعنی توحید و رسالت، نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ پر غور کیجیے۔ ان کے تسلسل اور ان کی مداومت میں یہی راز پنہاں ہے کہ نفس، اطاعت الٰہی کا عادی ہو جائے اور جو برائیاں ان عبادتوں کی روح کے خلاف ہیں، وہ رفتہ رفتہ اس طرح چھوٹ جائیں کہ پھر ان کا نفسِ انسانی کے قریب آنا ناممکن ہو جائے۔ مثلاً ہر بار کلمہ شریف پڑھنے سے اللہ کی وحدانیت اور رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا اقرار، اور ہر نماز سے عجز و انکسار، حضور قلب اور طہارت و پاکیزگی اپنے مکمل مفہوم میں پیدا ہو جائے۔ روزے سے ضبط نفس، مشقت اور اطاعت کی تربیت ہو جائے۔ زکوٰۃ سے بخل اور حُبِ مال کا عیب دور ہو جائے اور غربا کی مدد کا جذبہ پیدا ہو۔ حج سے اسلامی اخوت کی صفت پیدا ہو اور دنیا سے منہ موڑ کر خالص اللہ سے رجوع ہو جائے۔ ان تمام عبادتوں کا باطنی مقصد

Marfat.com

نفس کی تربیت ہی ہے۔

بخاری شریف میں آیا ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک صحابی نے گزارش کی کہ "یا رسول اللہ! مجھے کوئی ایسا عمل بتائیے کہ آپ کے بعد کسی سے پوچھنے کی ضرورت نہ پیش آئے۔" آپؐ نے ارشاد فرمایا، "جب تم نے لا الٰہ الا اللہ کہہ دیا تو اس پر استقامت اختیار کرو۔" استقامت کے ظاہری معنی تو ثابت قدمی ہی کے ہوتے ہیں، لیکن شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے کہا ہے کہ "استقامت، حسنِ عمل کی اس تکرار اور اس تسلسل کو کہتے ہیں جو نفس کی عادت ثانیہ اور مزاج کی اساسی خصوصیت بن جائے۔" جب کوئی نیک عمل کثرت سے کیا جاتا ہے اور اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت میں اپنے آپ کو مسلسل منہمک رکھنے کی ارادی کوشش کی جاتی ہے تو ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب اعمال حسنہ اور اخلاق فاضلہ اس کا مزاج بن جاتے ہیں اور اس سے بغیر کسی تکلف کے نیکیوں کا صدور ہوتا رہتا ہے۔ نفس کو مسلسل اطاعت میں منہمک رکھنا، اور جو باتیں اللہ اور اس کے رسولؐ کو ناپسند ہیں ان سے اس کو روکنے کی کوشش میں ہمہ وقت مصروف رہنا، اس کی تربیت ہے۔ قرآن شریف میں ارشاد ہے:

یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا عَلَیْکُمْ اَنْفُسَکُمْ لَا یَضُرُّکُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اھْتَدَیْتُمْ (المائدہ: ۱۰۵)

ترجمہ: اے ایمان والو! تم اپنے نفس کی حفاظت کرو، اگر تم سیدھی راہ پر ہو تو گمراہ ہونے والا تمھیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا

گویا اہلِ ایمان کے لیے اپنے نفس کی نگرانی بھی ضروری ہے۔ یہ تو صحیح ہے کہ ہر انسان اپنے عمل کا ذمہ دار ہے، دوسروں کی گمراہی اسے نقصان نہیں پہنچا سکتی، مگر یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب کہ وہ فرد خود اپنے نفس کا احتساب شدت سے کرتا ہو اور منکرات سے اسے بچاتا ہو۔ اسی کوشش کا نام تربیت نفس ہے، یہی مجاہدہ ہے اور یہی ریاضت ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کو قربِ خداوندی کا جو مقام حاصل تھا اور آپ کے تقویٰ کی جو شان تھی، وہ محتاجِ بیان نہیں۔ اس کے باوجود آپؐ نے فاقے کی شدت اٹھائی، پیہم روزے رکھے، راتیں قیام و سجود میں گزاریں، میدانِ جہاد میں دشمنوں کے مقابل ڈٹے رہے، باطل سے کبھی مرعوب نہیں ہوئے۔ آپؐ نے بزدلی، عجز، کسل، یاس، شدّتِ غم اور کاہلی سے ہمیشہ خدا کی پناہ مانگی۔

Marfat.com

حضرت ابوہریرہ رضؓ سے مروی ہے کہ مسجد نبوی کی تعمیر کے وقت میں نے دیکھا کہ حضورؐ اینٹ اٹھا رہے ہیں اور آپ کو زحمت ہو رہی ہے۔ مجھ سے دیکھا نہ گیا۔ میں آگے بڑھا اور میں نے عرض کیا: یا رسول اللہؐ! یہ اینٹ مجھے دے دیجیے، میں اٹھا کر رکھ دوں گا۔ آپ نے ارشاد فرمایا: ابوہریرہ! تم دوسری اینٹ اٹھا لو، اس لیے کہ آخرت کے آرام کے سوا کسی آرام کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ یہ جفاکشی اور مشقت طلبی دراصل امت کی اس رہنمائی کے لیے تھی کہ خدا کی رضا کے حصول کے لیے نفس کی مسلسل تربیت کرنی چاہیے اور اس سے کبھی غافل نہیں رہنا چاہیے۔ ایسا نہ ہو کہ اس کی چھپی ہوئی برائیاں سر اٹھا کر ہمارے ایمان کو تباہ کر دیں۔

Marfat.com

تقویٰ

سورۃ فاتحہ قرآنِ مجید و فرقانِ حمید کا "مقدمہ" ہے، یعنی پیش لفظ ہے، اور اس کا اساسی مفہوم اور بنیادی منشا طلبِ ہدایت ہے۔ چناں چہ جو شخص سورۃ فاتحہ کی تلاوت کرتا ہے وہ خداوند قدوس سے ہدایت یا فتنگی کی دعا کرتا ہے قرآنِ حکیم میں سورۃ فاتحہ کو اتنی اہمیت اور ایسا مقام حاصل ہے کہ یہ مختصر، مگر حسین و جمیل اور جامع و مانع سورہ، سارے قرآن یعنی کلامِ الٰہی کا گلِ سرسبد ہے۔ یہی سورہ قرآنِ پاک کا خلاصہ ہے، اور یہی سورہ قرآن کے سربستہ راز کی کنجی ہے۔

سورۃ فاتحہ کی پہلی آیت ہے:

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

یعنی: "سب تعریف اللہ ہی کے لیے ہے جو سارے جہانوں کا پالنے والا ہے"

اس آیت میں لفظ عالمین پر ہمیں خوب غور کرنا چاہیے جس کے معنیٰ ہیں بہت سے جہان۔ آج، کہ سائنس کی معراج ہے اور اہلِ سائنس فہم و فراست کی بلندیوں کو چھو لینے کے دعوے دار ہیں، اس کے باوصف یہ تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں ہے کہ عالمین یعنی جہانوں کے بارے میں ہم در حقیقت کوئی علم نہیں رکھتے۔ ان چاند ستاروں سے آگے نہ جانے کتنے جہان اور بھی ہیں جن کا جاننے والا صرف اللہ ہی ہے۔

اس دنیا و جہان، اور اس کائنات ارض و سما کو قائم و دائم رکھنے والا، اور اس کو منظم رکھنے والا اور چلانے والا ضرور کوئی ہے، کیوں کہ اس کے بغیر کائناتِ ارض و سما کا نظام ہرگز قائم نہیں رہ سکتا۔ یہ ذاتِ اعلیٰ و ارفع ذاتِ باری تعالیٰ ہے جس کی ہم تعریف کرتے ہیں، اور وہی سارے جہانوں کا پالنے والا ہے۔ ہم صرف اسی سے ڈرتے ہیں اور صرف اسی کا کہا مانتے ہیں۔ ہم اسی کی تعمیل کرتے ہیں اور اسی کے بتائے ہوئے راستے پر چلتے ہیں اور دعا مانگتے ہیں کہ:

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ

Marfat.com

یعنی: "خدایا ہمیں سیدھی راہ سمجھا۔ ہمیں سیدھی راہ دکھا اور چلا"

یعنی اپنی ذات کی محبت عطا فرما اور مشاہدے سے مشرف رکھ۔ اقوال، اعمال واحوال، ہر ایک میں ایک سیدھی راہ پر قائم رکھ۔

قرآنِ مجید و فرقانِ حمید انسانوں کے لیے سرچشمۂ ہدایت ہے۔ وہ جامع و مانع اور ایک مکمل قانون ہے جس کی روشنی میں ہم اپنی زندگیوں کو گزارتے ہیں اور زندگی کی راہوں کو ہموار کرتے ہیں۔ اس کتابِ مقدس اور اس قانونِ الٰہی سے ہدایت پانے کی شرائط ہیں۔ قرآن کے الفاظ میں پہلی شرط متقی ہونا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ:

ذَالِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ

یعنی: "(یہی) وہ (ذی مرتبت) کتاب ہے (جس کا وعدہ اللہ نے پہلی کتب سماویہ میں کیا) اس میں قطعاً شبہ نہیں (کہ یہ اللہ کا کلام ہے) اہلِ تقویٰ یعنی خدا سے ڈرنے والوں کے لیے ہدایت ہے (یہ پرہیزگاروں کے لیے رہنما ہے جن میں پرہیزگار بننے کی صلاحیت ہے۔ جن کو فکرِ نجات ہے ان ہی کو اس سے ہدایت حاصل ہوتی ہے۔)

اتنا سمجھنے کے بعد اب ہمیں یہ غور کرنا ہے کہ متقی کون لوگ ہیں اور تقویٰ کیا ہے؟ ہمیں اس پر اس لیے بھی غور کرنا ہے کہ ہادیِ برحق جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

اَلتَّقْوٰی مِلَاکُ الْحَسَنَاتِ (متفق علیہ)

یعنی: "تقویٰ نیکیوں کی اصل الاصول ہے۔ نیکیوں کی بنیاد ہے۔"

اس سلسلے میں قرآن ہی ہماری رہنمائی کرتا ہے۔ قرآنِ مجید میں تقویٰ ایک جگہ استغنا کے برخلاف مفہوم میں استعمال ہوا ہے اور استغنا کے معنیٰ ہیں لاپروائی اور عدمِ لحاظ۔ اس طرح تقویٰ کا مفہوم خود بخود متعین ہو جاتا ہے۔ اور وہ ہے: خدا کا لحاظ اور اس کا خوف اور خیال۔

خدا کی نظروں میں بھی سب سے زیادہ عزت و کرامت والا وہی ہے کہ جو اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہو۔

اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقَاکُمْ ○ (الحجرات: ۱۳)

قرآنِ کریم میں ایک جگہ اہلِ دانش و عقل کو مخاطب کر کے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَیْرَ الزَّادِ التَّقْوٰی وَاتَّقُوْنِ یَا اُولِی الْاَلْبَابِ ○ (البقرہ: ۱۹۷)

Marfat.com

یعنی "اور زادِ راہ مہیا کر لو (مگر سمجھ لو کہ) بہترین زادِ راہ تقویٰ ہے۔ اے اہلِ دانش و عقل! مجھ سے ڈرو۔"

ایک جگہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُتَّقِیْنَ (التوبہ ۴) یعنی: "خدا کو اہلِ تقویٰ محبوب ہیں"

ان آیاتِ قرآنی سے ہم نے یہ بات خوب سمجھ لی ہے کہ تقویٰ کو کیا اہمیت حاصل ہے۔ قرآنِ کریم کی فہم اور اس کتابِ ہدایت سے استفادے کی اوّلین شرط تقویٰ ہے۔

حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر ایک صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مخاطب ہو کر اور اپنے قلبِ مبارک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

اَلتَّقْوٰی هَاهُنَا۔ اَلتَّقْوٰی هَاهُنَا

"تقویٰ تو یہاں ہوتا ہے۔ تقویٰ کا مسکن تو یہ ہے"

اس سے ظاہر ہوا کہ تقویٰ نفس کی ایک کیفیت کا نام ہے۔ اور جس طرح ہر کیفیت اپنے بعض مظاہر اور علامات کی مدد سے اور ان کے واسطے سے پہچانی جاتی ہے، اسی طرح تقویٰ کے بعض مظاہر ہیں اور اس کی بھی علامات ہیں۔ اگر ہم یہ معلوم کرنا چاہیں کہ یہ علامات کیا ہیں جن سے تقویٰ کی نشان دہی ہوتی ہے تو خدا کی کتابِ ہدایات ہی ہماری رہ نمائی اور دست گیری کرتی ہے۔

آیئے غور کریں کہ قرآن کیا بتاتا ہے:

میں نے ابھی سورۃ بقرہ کی آیت پڑھی تھی: ذٰلِکَ الْکِتٰبُ لَا رَیْبَ فِیْهِ ۚ هُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ ۝ اب اس سے آگے پڑھیے۔ ارشادِ ربّانی ہے:

الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ وَیُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ یُنْفِقُوْنَ ۝ وَالَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِکَ وَبِالْاٰخِرَۃِ هُمْ یُوْقِنُوْنَ ۝

قرآن مجید کی انتہائی جامع آیات میں ان آیات کا شمار ہوتا ہے۔ تفاصیل میں جانے کا یہ موقع نہیں ہے۔ میں مختصراً یہ بتانے پر اکتفا کروں گا کہ ان آیاتِ قرآنی میں اہلِ تقویٰ کی کیا صفات بتائی گئی ہیں۔ اہلِ تقویٰ کی صفات پر آپ غور فرمایئے:

۱۔ جو غیب پر ایمان لاتے ہیں۔ خدا کی بتائی ہوئی باتوں کو بلا چون و چرا تسلیم کرتے ہیں۔ اسے قرآن ایمان بالغیب سے موسوم کرتا ہے۔

۲۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اور ان کی تعلیمات پر ایمان رکھتے ہیں اور انھیں

Marfat.com

حق پر مانتے ہیں۔ آپ کے فرمانے پر ان تمام حقائق پر جو نظروں سے اوجھل ہیں، ایسا یقین رکھتے ہیں گویا آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔

۳۔ وہ پابندی کے ساتھ اور اس طرح نماز ادا کرتے ہیں کہ نماز کے تمام حقوق مناسب طور پر ادا ہوں۔ اس مفہوم کو قرآن نے اقامتِ صلوٰۃ کی اصطلاح سے ظاہر کیا ہے۔

۴۔ اُنھیں خدا نے جو کچھ دے رکھا ہے وہ سب کا سب خود استعمال نہیں کر لیتے، اور اُسے اپنی ذاتی ملکیت نہیں خیال کرتے، بلکہ اس میں سے خدا کے دوسرے بندوں اور اہلِ حقوق پر بھی خرچ کرتے ہیں۔ اور جب اپنے لیے بھی استعمال کرتے ہیں تو اس خیال سے کہ یہ مال خدا کا ہے اور خدا ہی کا عطیہ ہے۔ یہ روزی، غذا، اور مال و دولت ہی پر موقوف نہیں ہے، بلکہ جو کچھ اللہ تعالیٰ نے علم و ہنر وغیرہ عطا فرمایا ہے اُس سے دوسروں کو فائدہ پہنچاتے ہیں۔

۵۔ وہ ان کتب اور صحیفوں پر ایمان رکھتے ہیں کہ جو محمد صلّی اللہ علیہ وسلّم سے پہلے پیغمبروں پر اتارے گئے۔

۶۔ وہ آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔

ان آیاتِ کریمہ میں قرآنِ کریم نے تقویٰ اور اہلِ تقویٰ کا مفہوم بالکل واضح کر دیا ہے۔ اس سے ہم واضح طور پر یہ سمجھ سکتے ہیں کہ انسان ہر اس چیز سے بچے کہ جو اس کی ذات کو اس کے ہم جنس انسانوں کو خواہ وہ دور ہوں یا قریب نقصان پہنچائے اور اس کے شریفانہ اغراض و مقاصد اور ممکن کمالات کی راہ میں حائل ہو۔

تقویٰ کا مطلب یہ ہے کہ تمام گناہوں کو ترک کر دیا جائے اور خدا کی اطاعت کی جائے۔ ان دنیاوی اسباب سے پرہیز کیا جائے جو کمالات و سعادتِ دارین کے حاصل کرتے میں کائنات کے فطری قوانین کے مطابق حائل ہوں۔ ان آیاتِ کریمہ کی رُو سے متقی کی واضح تعریف یہ ہے کہ وہ ہر اس شے کو کہ جو اس کی ملکیت ہے، عطیۂ خداوندی سمجھے۔ اور اس کی ملکیت کا فائدہ دوسروں کو بھی پہنچائے۔ اس چیز پر ہمیں اپنے آج کے حالات میں زیادہ غور کرنا چاہیے۔ آج جو بے چینی پائی جاتی ہے، اور آج جو پریشانیاں موجود ہیں، اور آج جو غربت و افلاس کا دور دورہ ہے، ان کے اسباب پر غور کرنا چاہیے۔

Marfat.com

دل کا اطمینان

دل کا اطمینان وہ متاعِ گراں بہا ہے جس کی تلاش میں ہر انسان رہتا ہے اور جس کو حاصل کرنا ہر ایک کی سعی وجہد کا مقصود ہوتا ہے۔ دل کے اطمینان کے لیے انسان اپنی ساری زندگی کوشاں رہتا ہے اور اس کے مل جانے کے بعد دنیا کی ہر دولت سے اپنے کو بے نیاز سمجھتا ہے۔ اگر کسی کو دنیا کی تمام نعمتیں حاصل ہوں ہر قسم کی سہولتیں اس کو میسر ہوں لیکن اس کو اطمینانِ قلب حاصل نہ ہو تو وہ کسی نعمت سے بہرہ اندوز نہیں ہو سکتا اور ہر سہولت اس کے لیے بے فائدہ ہے۔ اطمینانِ قلب اگر میسر ہو جائے تو سمجھیے کہ تمام کوششیں کارگر ہوئیں اور زندگی بامقصد ہو گئی۔

اسلام نے ہمیں ایک ایسا نظام کامل عطا کیا ہے جس میں انسان کے روحانی اور مادی دونوں پہلوؤں کی تسکین کا سامان موجود ہے۔ اسلام جہاں انسان کے حیوانی تقاضوں کی اہمیت کو تسلیم کرتا ہے وہاں اس کے روحانی وجود کا نشوونما بھی چاہتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں اسلام انسان کو حیوانِ محض نہیں بننے دینا چاہتا جس کا مقصد محض نفسانی خواہشات کی تکمیل ہو بلکہ وہ چاہتا ہے کہ انسان دنیا میں اس طرح زندگی گزارے کہ اس کے روحانی اور جسمانی داعیات کا متوازن نشوونما ہو۔ اسلام انسان کو شتر بے مہار بننے دینا نہیں چاہتا۔ اسلام کا منشا یہ ہے کہ انسان اس دنیا میں اس طرح زندگی گزارے کہ وہ قدرت کی عطا کی ہوئی تمام نعمتوں سے لطف اندوز ہو مگر اس کے ساتھ اُس دنیا کا بھی خیال رکھے جہاں انسان کو بالآخر جانا ہے اور جہاں کی زندگی اصلی اور دائمی زندگی ہے۔ اس بنا پر وہ انسان کی تمام سرگرمیوں اور افعال کے لیے کچھ حدود مقرر کرتا ہے اور ایک دائرہ کھینچ دیتا ہے کہ اس سے آگے بڑھنے کی اجازت نہیں ہے معاش ہو یا جنس، سیاست ہو یا تجارت ان حدود کی پابندی لازمی قرار دی گئی ہے۔ ان پابندیوں کا مقصد یہ ہے کہ انسان وقتی خواہشات اور عارضی کشش کے پیچھے توازن کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑ دے جس کے نتیجے میں انسان سے اس کا سکون واطمینان چھن جاتا ہے اور وہ اضطراب و انتشار کا شکار ہو جاتا ہے۔

قلب کو انسانی زندگی میں جو اہمیت اور مرکزیت حاصل ہے وہ ہر ذی ہوش پر عیاں ہے۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشادِ مبارک قلب کی اہمیت کو ایک نئے زاویے سے دیکھنے کی

Marfat.com

دعوت دیتا ہے۔ آپؐ نے فرمایا:

اَلَا اِنَّ فِی الْجَسَدِ مُضْغَۃً اِذَا صَلَحَتْ صَلَحَ الْجَسَدُ کُلُّہٗ وَاِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ کُلُّہٗ اَلَا وَھِیَ الْقَلْبُ۔

یعنی: "خوب سمجھ لو کہ جسم میں گوشت کا ایک لوتھڑا ہے جب یہ ٹھیک ہوتا ہے تو سارا جسم ٹھیک ہوتا ہے اور جب یہ بگڑ جاتا ہے تو سارا جسم بگڑ جاتا ہے اور یہ (گوشت کا ٹکڑا) قلب ہے۔"

اس ارشادِ رسول صلّی اللہ علیہ وسلّم سے معلوم ہوتا ہے کہ جسم کی صحت و بہتری کا انحصار قلب کی درستی پر ہے، قلب کی خرابی سارے جسم کے بگاڑ کے برابر ہے۔ جسم کی صحت میں ذہن ونفس کی صحت یقیناً شامل ہے۔ جسم اور نفس کا باہمی تعلق وانحصار ایک سائنسی حقیقت ہے۔ ایک کا دوسرے پر اثر انداز ہونا بھی مسلّم ہے۔ ذہن کے بگاڑ سے جسم متاثر ہوتا ہے اور اس کی صحت خراب ہوتی ہے۔ اسی طرح جسم کی تکلیف ذہن پر اثر انداز ہوتی ہے اور ذہنی صحت بھی متاثر ہوتی ہے۔ اگر قلب اطمینان سے محروم ہو تو ذہن اور جسم دونوں کو سکون اور اطمینان نصیب نہیں ہو سکتا۔ انسان فطری طور پر قلب وروح کے اطمینان کا طالب ہوتا ہے، اور اس کی سعی وعمل کا مرکز اطمینانِ قلب ہی ہے۔ اس اطمینان وسکون کی ضرورت کی جانب قرآن حکیم نے بھی اشارہ فرمایا ہے خالقِ کائنات نے فرمایا کہ اس نے نوعِ انسانی کو دو حصوں میں اس لیے تقسیم کیا ہے کہ وہ ایک دوسرے سے سکون وراحت حاصل کریں۔ پھر ایسا شخص کون سا ہے جسے سکون واطمینان کی ضرورت سے انکار ہو۔ یہی وجہ ہے کہ انسان اطمینانِ قلب کی خاطر ہر قسم کی جسمانی اور مادی قربانیوں کو خوشی خوشی برداشت کر لیتا ہے۔

تاہم یہاں اس نکتے کی جانب توجہ مبذول کرانا ضروری ہے کہ اطمینان وسکون کی ماہیت ونوعیت یکسر اضافی ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ ایک بے روزگار شخص کوئی ذریعۂ معاش نہ ہونے کی بنا پر اپنی ساری توجہات حصولِ معاش پر صرف کرتا ہے اور اس کو اتنا سکون نصیب نہیں ہوتا کہ اپنے بچوں کے ساتھ کچھ وقت گزار کر اور ہنس بول کر مسرت حاصل کرے، لیکن ایک دوسرا شخص جس کو کوئی فکرِ معاش نہیں ہوتی وہ اولاد کی تمنا میں بے چین رہتا ہے، اس کو فرصت حاصل ہے لیکن بچوں کی مسرّت حاصل نہیں ہے۔ اس طرح یہ دونوں خدا کے بندے سکونِ قلب کی تلاش میں ہیں۔ ایک کو دولت دنیا حاصل ہے مگر وہ نعمتِ اولاد سے محروم ہے، دوسرے کو بچوں کے ساتھ وقت گزارنے کے لیے جس سکون کی ضرورت ہے وہ حاصل نہیں ہے۔ گویا سکونِ قلب اور دل کا اطمینان کسی خاص چیز سے وابستہ نہیں ہے بلکہ یہ مسرت سراسر اضافی ہے۔

Marfat.com

ہر حالت میں اطمینانِ قلب کی صورت صرف یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت پر انسان یقین کامل پیدا کرے اور اپنے دل کو اپنی خواہشوں اور خوشیوں کو اس کی رضا جوئی سے وابستہ کر لے۔ راضی برضا ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کو اور اس کی حکمت کو مقدم سمجھنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کو ہر تکلیف راحت معلوم ہونے لگتی ہے اور وہ ہر حال میں خوش رہتا ہے، اس کا قلب مطمئن رہتا ہے۔ دل کا سکون چھیننے والی سب سے بڑی چیز مایوسی ہے۔ مایوس انسان اطمینانِ قلب سے محروم ہو جاتا ہے۔ ناامیدی بے اطمینانی پیدا کرتی ہے اور امید دل بڑھاتی ہے۔ اسی لیے مایوسی کو کفر قرار دیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔

لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ (الزمر: ۵۳)

مایوسی آدمی کو عمل سے دور کرتی ہے اور بے عملی مزید مایوسی کو جنم دیتی ہے۔ بے عمل انسان عمل کے ثمرات سے محروم رہتا ہے جس کے نتیجے میں یاس و ناامیدی اور بڑھتی ہے۔ اطمینان اور توکل کی ایک عام مگر غلط تعبیر یہ ہے کہ خود کچھ نہ کرو، اللہ تعالیٰ پر بھروسا کرو، وہ سب کام بنا دے گا۔ لیکن یہ تصور نقصان دہ ہے۔ توکل کا مفہوم یہ ہے کہ انسان اپنی سی کوشش کر لے اس کے بعد نتائج کے لیے بے چین ہونے کے بجائے اللہ تعالیٰ پر بھروسا کرے اور اس سے اچھی امید رکھے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر انسان صرف اپنے آپ پر ہی بھروسا کرے گا تو وہ اپنی کامیابی پر مغرور ہو جائے گا اور ناکام ہوا تو مایوس اور بزدل ہو جائے گا۔ اس طرح اطمینانِ قلب کی دولت اس سے چھن جائے گی۔

اطمینانِ قلب کے لیے خدا اور آخرت پر ایمان کے ساتھ سعی و عمل بھی ضروری ہے۔ عمل سے خالی ایمان اور جدوجہد سے عاری ایقان، انسان کو کبھی اطمینانِ قلب نہیں دے سکتا۔ اللہ کے قادرِ مطلق ہونے پر ایمان جتنا پختہ ہوگا اور عمل جتنا اچھا ہوگا دل کا اطمینان اتنا ہی مستحکم ہوگا۔

اسلام انسانی زندگی میں توازن چاہتا ہے کہ وہ دنیا کی آسائشوں میں اتنا نہ کھو جائے کہ قلب و روح کے تقاضوں کو سراسر فراموش کر دے۔ اسلام میں نیکی کا یہ تصور نہیں ہے کہ انسان تمام دنیا سے قطع تعلق کر کے صرف عبادت میں مصروف ہو جائے۔ اسلام نے ہمیں عبادات کا بہت وسیع تصور دیا ہے۔ وہ نماز روزے کو ہی عبادت قرار نہیں دیتا بلکہ ہر انسانی فعل اسلامی نقطۂ نظر سے عبادت قرار پا سکتا ہے۔ بشرطیکہ وہ خدا اور رسول ؐ کے احکام کے مطابق ہو اور مقررہ حدود کے اندر ہو۔ اسلام یہ نہیں چاہتا کہ اللہ کے نیک بندے دنیا کو چھوڑ کر ذکرِ الٰہی میں مصروف ہو جائیں اور دنیا کا انتظام خدا کے باغی بندوں کے ہاتھوں میں چھوڑ دیں کہ اللہ کی مخلوق اطمینانِ قلب سے محروم ہو جائے۔ خدا پرستی، عمل اور انسان دوستی ہی میں انسان کی فلاح ہے۔

Marfat.com

حقوقِ نفس

اس دنیا میں جتنے مذاہب آئے ان میں سے اکثر میں معاشرتی حقوق کو اہمیت دی گئی ہے، اور سب سے زیادہ اہمیت ہر مذہب نے ماں باپ کے حقوق کو دی ہے۔ اگر بہ اعتبارِ فطرت اس پر غور کیا جائے تو ماں باپ کی اہمیت اور ان کے حقوق کی اہمیت اپنی جگہ مسلّم ہے۔ جہاں تک اسلام کا تعلق ہے، اسلام بھی ماں باپ کے حقوق کی اہمیت کو تسلیم کرتا ہے، مگر دوسرے مذاہب کے مقابلے میں اسلام نے ایک امتیازی شان اختیار کی ہے۔ حقوق کے معاملے میں اسلام نے یہ امتیاز قائم کیا ہے کہ اس نے انسانی حقوق کی درجہ وار تفصیل بھی مہیا کردی ہے اور حقوق کی فہرست میں تمام ممکنہ جزئیات کا اس طرح احاطہ کیا ہے کہ کوئی نکتہ تشنہ نہیں رہ گیا ہے۔ انسانوں کے انسانوں پر جو حقوق ہیں ان کی درجہ بندی کے علاوہ حیوانات اور نباتات اور جمادات کے حقوق کو بھی نظرانداز نہیں کیا گیا۔ انتہا یہ احتیاط یہ ہے کہ انسان پر اپنے نفس کا بھی جو حق ہے اس کو بھی بدرجہ کمال اہمیت دی گئی ہے، بلکہ اصرار ہے کہ اسلام میں دوسرے مذاہب کی طرح کی ایسی نفس کُشی جائز نہیں ہے جو انسان کی اپنی ہلاکت کے مترادف ہو۔ چناں چہ سرکارِ دوعالمؐ فخرِ رسل، رحمۃ للعالمین کے مطابق ہر انسان کا خود اپنے اوپر بھی حق ہے، بلکہ اس کے ایک ایک عضو کا اس کے اوپر حق ہے۔ صحیح بخاری میں ہے کہ آں حضرتؐ نے فرمایا:

فَإِنَّ لِنَفْسِكَ عَلَيْكَ حَقًّا

یعنی: "بے شک تیری جان کا تجھ پر حق ہے۔"

اسی طرح ایک اور حدیث میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا "تیرے بدن کا بھی تجھ پر حق ہے اور تیری آنکھوں کا بھی تجھ پر حق ہے۔"

بعض دوسرے مذاہب میں اس بات کو تقویٰ اور پرہیزگاری سمجھا جاتا تھا کہ انسان اپنے جسم کے اعضا کو زیادہ سے زیادہ مشقت میں مبتلا کرے، نفس کی خواہشات کو مختلف غیرفطری طریقوں سے ہلاک کرنے کی کوشش کرے، دنیا سے کنارہ کش ہوجائے اور آبادی سے الگ تھلگ دھیان گیان میں مشغول رہے، مگر اسلام نے پوری قطعیت کے ساتھ ان غیرفطری اصولوں پر

Marfat.com

پابندی لگادی اور اس نے یہ تعلیم دی کہ رہبانیت اور تقشف یعنی اپنے اوپر سختیاں عائد کرلینا اسلام کی نگاہ میں مطلوبہ طریقہ عبادت نہیں ہے، بلکہ اسلام اس کا سخت مخالف ہے۔

اسلام میں اس بات کی اجازت نہیں ہے کہ نفس کو مار ڈالا جائے، بلکہ اسلامی شریعت یہ چاہتی ہے کہ نفس کے تمام حقوق ادا کیے جائیں اور اُسے زندہ اور کارآمد رکھا جائے، لیکن اس طرح کہ نفس فرمانِ الٰہی کے تابع رہے۔ اسلام کا اندازِ فکر یہ ہے کہ نفس کو مار ڈالنا نہیں بلکہ اسے قابو میں رکھنا انسان کا تقویٰ ہے اور تزکیۂ نفس منتہائے مقصود ہے۔ اس کی مثال ایک تلوار کی سی ہے۔ تلوار سے بے گناہوں کا قتل کیا جاسکتا ہے، اس لیے سابق شریعتیں کہتی تھیں کہ تلوار کو توڑ پھینک دو یا اسے اس طرح کند کردو کہ اس میں کوئی قوت ہی باقی نہ رہ جائے۔ اس کے برعکس اسلام کہتا ہے کہ تلوار کو نہایت اچھی حالت میں رکھو، لیکن اسے فرمانِ الٰہی کے تابع کردو تاکہ مظلوموں کی حمایت کے کام آئے۔

آں حضرتؐ کبھی نفس کو اس کے حقوق سے محروم کرنے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ آپؐ کی تاکید یہ تھی کہ دنیا میں کھاؤ پیو، اچھے لباس پہنو، شادی بیاہ کرو، لیکن ہر حال میں اسلامی شریعت کی حدود میں رہنے کی کوشش کرو۔ اعتدال و توازن قائم رکھو۔

عبادت بے شک اللہ سے لو لگانے کا وسیلہ ہے، لیکن اسلام اس بات کو پسندیدہ نہیں سمجھتا کہ اپنے جسم کو اس سے زیادہ تکلیف دی جائے جس کو وہ برداشت کرسکتا ہے۔

ایک بار ایک صحابی خدمتِ اقدسؐ میں تشریف لائے اور عرض کیا کہ ہم میں سے ایک نے ترکِ غذا اور دوسرے نے ترکِ نکاح کا عزم کرلیا ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ میں تو دونوں سے متمتع ہوتا ہوں غذا سے بھی اور نکاح سے بھی۔ چناں چہ آپؐ کی مرضی نہ پاکر دونوں صحابی اپنے ارادے سے باز رہے۔ عرب میں مدت سے یہ طریقہ رائج تھا کہ بعض لوگ کئی کئی دن مسلسل روزے رکھتے تھے۔ بعض صحابہؓ نے بھی اس کا ارادہ کیا، لیکن آپؐ نے سختی کے ساتھ انھیں روک دیا۔

حضرت عبداللہ ابن عمرؓ زہد و تقویٰ کے لیے اپنے ہم عصروں میں بھی ممتاز سمجھے جاتے تھے۔ انھوں نے عہد کرلیا تھا کہ ہمیشہ دن کو روزے رکھیں گے اور رات بھر عبادت کریں گے۔ آنحضرتؐ کو خبر ہوئی تو بلا بھیجا اور پوچھا کہ کیا یہ خبر صحیح ہے؟ عرض کی "ہاں"۔ آپؐ نے فرمایا، تم پر تمھارے جسم کا حق ہے۔ آنکھ کا حق ہے، بیوی کا حق ہے۔ مہینے میں تین دن روزے کافی ہیں۔"

غرض آں حضرتؐ ہمیشہ اس بات کی تاکید فرماتے تھے کہ دوسرے مذاہب والوں کی طرح نفس کو اس کے حقوق سے محروم نہ کرو۔ اس کے حقوق ادا کرتے رہو اور قابو میں رکھنے کی

Marfat.com

کوشش کرو، اور نفس کے تزکیہ کی شان پیدا کرو۔ اصل کمال یہ ہے کہ اپنے نفس کے حقوق بھی ادا کیے جائیں اور اللہ تعالیٰ کے احکام کی پابندی بھی کی جائے۔ اسلام نے دین کے ساتھ دنیا کی فلاح وبہبود کا بھی انتظام کیا ہے۔ اور یہ دعا سکھائی کہ "اے ہمارے رب اس دنیا میں بھی ہمیں فلاح وخیر عطا فرما اور عاقبت میں بھی اپنی بخشش اور خوشنودی سے سرفراز فرما"۔ اس طرح دنیا کے کاموں کو بھی، اگر وہ شریعت کی حدود کے اندر رہوں، تو عبادت اور اللہ کی خوشنودی کا وسیلہ قرار دیا۔ یہی نہیں بلکہ آں حضرتؐ جو عبدیت کے اعلاترین مقام پر فائز تھے اور رسالت کے منصب سے بھی سرفراز فرمائے گئے تھے، جب عبادت و ریاضت میں اس سے زیادہ مشغول رہنے لگے جو خالقِ ارض وسما کو مطلوب تھا تو اللہ تعالیٰ نے سورۂ مزمل میں گویا اس بات کی جانب اشارہ کیا کہ نفس کے حقوق کا بھی خیال رکھیں، چناں چہ فرمایا:

قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا ۙ نِّصْفَهٗٓ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا ۙ اَوْ زِدْ عَلَيْهِ ــــ (المزمل: ۲-۴)

یعنی: "رات کو قیام کیا کریں مگر تھوڑی رات۔ قیام آدھی رات کریں یا اس سے کچھ کم یا کچھ زیادہ۔"

اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے محبوبؐ کی عبادت سے ہر طرح راضی تھا، لیکن اس کے ساتھ ہی وہ چاہتا تھا کہ آپؐ نفس کے حقوق بھی ادا کرتے رہیں، یعنی آرام بھی کریں، رات کو سویا بھی کریں۔ اس سے نفس اور جسم زیادتی کا شکار نہیں ہوں گے بلکہ انھیں جو اُن کا حق ہے وہ ملتا رہے گا۔

غرض اسلامی شریعت اس بات پر اصرار کرتی ہے کہ انسان احکامِ الٰہی کے دائرے میں رہ کر اس دنیا میں اس طرح زندگی بسر کرے کہ تمام ابنائے جنس کے حقوق بھی ادا ہوتے رہیں اور نفس بھی ظلم وزیادتی کا شکار نہ ہو۔

اسلام ایک دینِ فطرت ہے اس کی شریعت کا کوئی امر اور کوئی حکم فطرت کے خلاف نہیں ہے۔ اسلام جب توازن اور عدل واعتدال کا مشورہ دیتا ہے اور میانہ روی کو خیر قرار دیتا ہے تو وہ فطرت کے عین تقاضے پورے کرتا ہے۔

نفس اور حقوقِ نفس کے باب میں بھی شریعتِ اسلامیہ نے اعتدال کو بدرجۂ کمال اہمیت دی ہے۔ ایک طرف اصرار کیا ہے کہ نفسِ انسانی کے تمام حقوق ادا ہونے چاہییں اور اس کے ساتھ ہی فیصلہ دیا ہے کہ نفس کو تابعِ فرمانِ الٰہی ہونا اور رہنا چاہیے۔ نفس کے تزکیے کی راہ بتادی اور اسے اختیار کرنے کا حکم دیا ہے۔ اس روشنی میں ہمیں چاہیے کہ ہم افراط وتفریط سے بچتے رہیں۔ عبادت بھی کریں اور دوسروں کے حقوق بھی ادا کریں۔

Marfat.com

دین میں اِستقامت

اللہ تعالیٰ نے اپنے تمام انبیاے کرام کو بعض خصوصیات ایسی عطا فرمائیں جو اُن نفوسِ قدسیہ کے لیے امتیازی خصوصیات ہی نہ تھیں بلکہ ان کا تعلق فرائضِ نبوت کی کما حقہٗ تکمیل سے بھی تھا۔ ان ہی خصوصیات میں ایک یہ بھی ہے کہ اللہ کا رسول فصیح اللسان ہو اور بلیغ الکلام ہو۔ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو منصبِ نبوت پر سرفراز فرمایا تو آپ نے اللہ تعالیٰ سے درخواست فرمائی کہ میرے بھائی حضرت ہارون کو بھی اس منصب میں ان کا شریک بنایا جائے۔ قرآنِ مجید میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی یہ درخواست ان الفاظ میں نقل فرمائی گئی ہے:

وَاَخِیْ هٰرُوْنُ هُوَ اَفْصَحُ مِنِّیْ لِسَانًا فَاَرْسِلْهُ مَعِیَ رِدْاً یُّصَدِّقُنِیْٓ (القصص: ۳۴)

یعنی: "میرا بھائی ہارون مجھ سے زیادہ فصیح اللسان ہے، اسے میرے ساتھ مددگار کے طور پر بھیج کہ وہ میری تائید کر سکے۔"

اسی طرح حضرتِ داؤد علیہ السلام کی قادر الکلامی کا ذکر قرآنِ حکیم میں ان الفاظ میں آیا ہے:

وَاٰتَیْنٰهُ الْحِکْمَةَ وَفَصْلَ الْخِطَابِ۔ (ص: ۲۰)

یعنی: "اور ہم نے (داؤد کو) دانش مندی اور قادر الکلامی سے سرفراز کیا۔"

کمالاتِ اوّلین و آخرین کے جامع خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی یہ صلاحیت بطورِ خاص عطا کی گئی تھی۔ آپؐ کے سیرت نگاروں نے آپؐ کے فضائل و شمائل نویسوں نے اور آپ کے اخلاق و عادات اور ذاتی اور شخصی خصوصیات کا بیان کرنے والے حضرات نے آپؐ کی فصاحت و بلاغت اور آپ کے الفاظ و فرمودات کا بطورِ خاص ذکر کیا ہے۔

مورخینِ ادب اس امر پر متفق ہیں کہ آپ کا کلام قرآنِ مجید کے بعد فصاحت و بلاغت اور ایجاز و بیان میں لاثانی ہے۔ افصح العرب والعجم کے کلام کی بلاغت و جامعیت کی ایک مثال یہ ہے کہ ایک صحابیؓ نے آپؐ سے عرض کیا کہ مجھے آپ اسلام کی ایک ایسی جامع بات بتا دیں جو میرے لیے کافی ہو اور پھر مجھے کسی اور سے پوچھنے کی ضرورت باقی نہ رہے۔

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا۔

Marfat.com

قُلْ اٰمَنْتُ بِاللّٰہِ ثُمَّ اسْتَقِمْ

یعنی: ”اللہ پر اپنے ایمان کا اقرار کرو اور پھر اس پر استقامت سے قائم رہو۔“

آدمی دراصل ایمان باللہ کا اقرار کر کے اپنے لیے دنیا اور آخرت کی سعادت کا دروازہ کھول لیتا ہے، لیکن انسان اپنے اس اقرار سے غفلت برت کر، خطا و نسیان کا شکار بن کے اور وقتی مفادات اور اپنی اور دوسروں کی فوری مصلحتوں کے پیچھے پڑ کر سعادت کے حصول کی یہ راہ کھوٹی کر لیتا ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس بلیغ ارشاد کے مطابق ایمان باللہ کے تقاضوں پر استقامت اور ثابت قدمی اِن خطرات اور اِن گمراہیوں سے بچائے رکھتی ہے۔

استقامت میں راہِ مستقیم پر تسلسل کے ساتھ چلتے رہنے اور دل جمعی اور مستقل مزاجی سے اپنے اختیار کردہ طریقِ حیات پر قائم رہنے کا مفہوم شامل ہے جبکہ عزم اور ارادے کی کمزوری اور تھڑدلی استقامت کی ضد ہیں۔ جو شخص ان خرابیوں سے دامن بچا لے اُس میں یہ صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ اپنے موقف پر مضبوطی سے قائم رہ سکتا ہے اور موانع اور مشکلات سے گھبرا کر اور کم اہم ترجیحات کی لالچ میں آ کر راہِ راست سے بھٹکنے نہیں پاتا۔ مصلحتیں اسے ابدی نجات کی راہ سے دور نہیں کر سکتیں خواہ یہ اس کی اپنی مصلحتیں ہوں یا دوسروں کی۔ یہاں ایک قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ آدمی اپنی مصلحتوں کو تو آسانی سے قربان کر دیتا ہے، لیکن دوسروں کی مصلحتوں کی رعایت کو نظر انداز کرنا نسبتاً مشکل ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب کرتے ہوئے ارشاد:

وَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ ۚ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ ۚ (الشوریٰ: ۱۵)

یعنی: ”جس طرح تمھیں حکم دیا گیا ہے مضبوطی سے جمے رہو اور ان لوگوں کی خواہشات کے پیچھے نہ چلو۔“

استقامت اور ثابت قدمی کی فضیلت اس آیت مبارکہ سے بھی معلوم ہوتی ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ۝ نَحْنُ اَوْلِيٰٓؤُكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ ۚ

(حٰمٓ السجدہ: ۳۰)

یعنی: ”جن لوگوں نے کہا کہ اللہ ہمارا رب ہے اور پھر اپنے اس قول پر ثابت قدم رہے تو ان پر فرشتے اترتے رہتے ہیں اور انھیں اطمینان دلاتے ہیں کہ خوف نہ کرو، رنجیدہ نہ ہو اور خوش ہو جاؤ اس جنت کی بشارت سے کہ جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے۔ ہم دنیا کی زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی تمہارے ساتھ ہیں۔“

استقامت وہ ملکہ اور وہ خصوصیت ہے جو انسان کو ترغیب و تحریص اور تخویف و ترہیب سے

Marfat.com

بے نیاز رکھ کر اپنے طے کردہ مقاصد کی تکمیل میں مصروف رکھتی ہے۔

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ کا یہ واقعہ آپ نے بارہا سنا ہوگا کہ جب مشرکینِ مکہ سارا زور و جبر استعمال کر کے بھی آپؐ کو دعوتِ حق پیش کرنے سے روک نہ سکے تو انھوں نے آپؐ کے سرپرست اور حامی ابوطالب پر دباؤ ڈالا کہ یا تو آپ کو منصبِ نبوت کی تکمیل سے باز رہنے کا مشورہ دیں، یا پھر ہم سے دوبدو مقابلے کے لیے تیار ہو جائیں۔ ابوطالب نے ان ہی لوگوں کے سامنے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بلا کر یہ بات بتائی تو آپؐ نے آسمان کی طرف نگاہ اٹھائی اور قریش کے سرداروں سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ آسمان پر جو یہ سورج چمک رہا ہے کیا آپ کا خیال ہے کہ یہ آپ حضرات کے مطالبے پر روشنی دینا چھوڑ دے گا؟ پھر ابوطالب سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ "چچا جان! اگر یہ لوگ میرے ایک ہاتھ میں سورج اور دوسرے میں چاند لاکر رکھ دیں تب بھی میں اس فریضے کی تکمیل سے باز نہ آؤں گا جو اللہ نے میرے اوپر عائد کیا ہے۔"

یہ تو صرف ایک واقعہ ہے، حضورؐ کی تو ساری زندگی اس عزم و استقلال، اس عزیمت و استقامت کی تصویر ہے جس کا پرتو آپؐ کے صحابہ کرامؓ کی زندگیوں پر بھی پڑا اور انھوں نے اس رنگ کو ایسے جذب کیا کہ رہتی دنیا تک کے لیے مثال بن گئے۔

ہمارا روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ دنیا میں وہی لوگ کامیاب و بامراد ہوتے ہیں جو اپنے مقصد پر یقین کے ساتھ ساتھ عزم و ثبات کے جوہر رکھتے ہیں۔ ایسے افراد اپنی جو منزل منتخب کر لیتے ہیں اس تک پہنچنے کے لیے راہ کی مشکلات اور راستے کے کانٹوں کی پروا کیے بغیر رواں دواں رہتے ہیں۔ ایمان بالغیب کی تو یہ خصوصیت ہے کہ وہ انسان میں عزم و اعتماد اور استقلال و ثبات کے جوہروں کو بیدار کر دیتا ہے۔ ان جوہروں کی پرورش و تربیت کرنے والے افراد ہی دنیا میں بڑے بڑے انقلابات کے پیش رو بنتے ہیں اور اصلاحِ ملت کے کارنامے انجام دیتے ہیں۔

استقامت اُن صفات میں سے ہے جن کے بغیر کوئی فرد نہ دنیا میں کامران ہو سکتا ہے اور نہ آخرت میں سرخ روئی کی امید کر سکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ اپنے نبیِ پاکؐ پر اور آپ کے اصحابِ کرامؓ پر اپنی رحمتوں کی بارش فرمائے اور ہمیں ان کے نقوشِ قدم کے اتباع کی توفیق دے کہ ہم استقلال و استقامت کے ساتھ اپنے ایمان پر قائم رہیں۔

Marfat.com

شکرِ خداوندی

سورۃ ابراہیم میں اللہ تعالیٰ نے اپنے اُن احسانات اور اپنی ان نعمتوں کا تفصیل سے ذکر فرمایا ہے کہ جو اس نے انسان کو عطا کی ہیں، اور جن پر اس کی زندگی اور اس کی معاش و اقتصاد کا انحصار ہے۔ اس کے بعد ارشاد فرمایا ہے کہ:

وَاٰتٰکُمْ مِّنْ کُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْہُ ط وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰہِ لَا تُحْصُوْھَا ط (ابراہیم، ۳۴)

یعنی "ان نعمتوں کے ساتھ ساتھ اللہ کا انسان پر مزید ایک فضل اور ایک مستقل احسان یہ ہے کہ اس نے اسے ہر وہ چیز عطا کی جس کی اُسے ضرورت اور خواہش ہوتی ہے۔"

اِن ضرورتوں اور اِن خواہشات میں انسان کی تمام مادّی اور معنوی ضروریات اور خواہشات شامل ہیں۔ آگے چل کر ارشاد فرمایا کہ اللہ کی تم پر یہ نعمتیں اور اس کے یہ انعامات و احسانات اس قدر ہیں کہ اگر تم ان کا شمار کرنا چاہو بھی تو نہیں کر سکتے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے جسم کا رُواں رُواں، ہمارا بال بال، ہمارا ہر نفس اور ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی کا ہر قدم اللہ ربّ العالمین کے ان بے پایاں احسانات کا زیر بار اور مرہونِ منّت ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ہم پر مزید ایک احسان یہ فرمایا کہ ہم انسانوں کو اپنی اس زمین پر اپنا نائب اور خلیفہ قرار دیا۔ اور امت مسلمہ کی حیثیت سے ہمیں یہ اعزاز بھی عطا ہوا کہ اس نے ہمیں اِس زمین پر اللہ کی بادشاہت قائم کرنے کی ذمہ داری اٹھانے کا اہل قرار دیا، اور اس عظیم مقصد کی تکمیل کے لیے اس نے کتابِ ہدایات نازل فرمائی ہے اور ہمیں اپنے رسولؐ کے واسطے سے اِس کتابِ عظیم کا مخاطب بنایا۔ اس مؤخر الذکر اعزاز کا ذکر قرآنِ مجید میں ان الفاظ میں فرمایا گیا ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْکُمْ مَّوْعِظَۃٌ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ وَھُدًی وَّرَحْمَۃٌ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ ۝ قُلْ بِفَضْلِ اللّٰہِ وَبِرَحْمَتِہٖ فَبِذٰلِکَ فَلْیَفْرَحُوْا ط (یونس ۵۷-۵۸)

یعنی "لوگو! تمھیں تمھارے رب نے پند و موعظت کا خزینہ عطا فرمایا ہے جو تمھارے دلوں کے امراض

Marfat.com

کی شفا ہے، اور جو اُس پر کان دھریں ان کے لیے سامانِ ہدایت ہے، اور ان کے حق میں سراپا رحمت ہے۔ یہ محض تم پر اللہ کا فضل ہے، ایسا فضل کہ جس کے میسر آنے پر خوشی منانی چاہیے۔"

اللہ تعالیٰ کے یہ احسانات اور اس کا یہ کرم اور انسان کے حق میں اس کی جانب سے یہ اعزاز اور یہ اکرام و شرف ہم سے تقاضا کرتا ہے کہ زندگی بھر ہمارا کوئی لمحہ، ہمارے اوقات کا چھوٹے سے چھوٹا حصہ ایسا نہ گزرے کہ ہم باری تعالیٰ کا شکر ادا نہ کر رہے ہوں۔ لیکن انسان اپنی فطری کمزوریوں اور طبعی نقائص اور اپنی مادّی زندگی کے تقاضوں کی وجہ سے اس بات پر قدرت نہیں رکھتا اور اگر قدرت ہو بھی تو ساری عمر کی شکر گزاری، اظہارِ منّت پذیری اور اظہارِ احسان مندی ان تمام احسانات کا حق اور شکر ادا کرنے کے لیے ناکافی ہے۔ خالقِ کائنات اور اس عاجز انسان کا پیدا کرنے والا جو اس کے نقائص، اس کے عجز اور اس کی کمزوریوں سے بھی پوری طرح واقف ہے، اس سے یہ مطالبہ بھی نہیں فرماتا۔ اللہ کے فرمان کے مطابق انسان اللہ کی شکر گزاری کا یہ حق اس کی بندگی اور اس کی اطاعت کر کے ہی ادا کر سکتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ کے احسانات کا شکر ادا کرنا تو انسان کے بس سے باہر ہے لیکن وہ ان انعامات و احسانات کے اعتراف کے طور پر اللہ تعالیٰ کی اطاعت و فرمان برداری کا پابند ہے۔ جو آدمی ان تمام نعمتوں سے متمتع ہونے کے باوجود اللہ کی اطاعت نہیں کرتا اور اس کی بندگی اختیار نہیں کرتا اللہ تعالیٰ اس کی اِس ناشکری کو اور اس کفرانِ نعمت کو کُفر قرار دیتا ہے۔

قرآن حکیم میں اللہ نے انسانوں سے خطاب کر کے ارشاد فرمایا ہے کہ:

لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ إِنَّ عَذَابِي لَشَدِيدٌ ۝ (ابراہیم: ۷)

یعنی "اگر تم میری نعمتوں پر میری بندگی اختیار کر کے اور میری اطاعت کے ذریعہ سے شکر ادا کرو گے تو میں تم پر مزید احسان کروں گا اور اپنی ان نعمتوں میں اضافہ کر دوں گا۔ لیکن اگر تم نے کفرانِ نعمت کیا اور ناشکری کی یعنی بجائے میری بندگی اختیار کرنے کے اپنی خواہشات کے بندے بن کر رہ گئے اور میرے بجائے میری مخلوق میں سے کسی کو اپنا الٰہ قرار دیا تو اس ناشکری کی سخت سزا دوں گا۔"

آئیے اب ہم خود اپنے حالات پر غور کریں۔ آج مشرق سے مغرب تک اور شمال سے جنوب تک اولادِ آدم جن مصیبتوں میں گرفتار ہے کیا یہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے مطابق ناشکری کا خمیازہ نہیں ہے؟ پھر خاص طور پر ہم امتِ مسلمہ کے افراد تمام عالم میں جس ناگفتہ بہ حالت میں مبتلا ہیں اور جس نکبت و خواری کا شکار ہیں کیا یہ ہماری عدمِ اطاعت،

Marfat.com

عدم فرماں برداری اور کفرانِ نعمت اور ناشکری کا نتیجہ نہیں ہے ؟

ہم اپنی زندگی کے خطرناک ترین دور سے گزر رہے ہیں، ہم آج اپنے محسنِ حقیقی کا احسان ادا نہیں کر رہے اور اُس کی اور اس کے رسول ؐ کی اطاعت سے روگردانی کا شرم ناک جرم ہم سے سرزد ہو رہا ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ ہم پوری بے شرمی کے ساتھ اپنے اللہ سے بغاوت اور سرکشی کی راہ پر چل رہے ہیں۔ آج ہماری زندگی کی روش اور حیاتِ دنیا میں ہمارا طریق کار وہ نہیں ہے جس کی طرف اللہ تعالیٰ اور اللہ کے رسول ؐ نے ہماری رہنمائی فرمائی ہے۔ آج ہماری انفرادی اور اجتماعی، معاشرتی اور قومی، سیاسی اور تعلیمی زندگی میں کہیں بھی اس ہدایت اور رہنمائی کے اثرات نمایاں نہیں ہیں۔ ہم مسلمان کی حیثیت سے اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ ہم اپنی عظمتِ رفتہ اور کھوئی ہوئی عزت کو دوبارہ حاصل نہیں کر سکتے جب تک اپنے اندر احسان مندی کے جذبات نہ پیدا کر لیں۔ یہ جذبات ہمارے اندر پیدا ہوں گے تو اس کی علامت یہ ہوگی کہ ہم دل و جان سے اپنی زندگی کے ہر گوشے میں اور اپنی زندگی کے ہر شعبے میں اللہ کی بندگی اور اس کی اطاعت گزاری کا عملی ثبوت پیش کریں گے۔

یہ ہمارے رحمٰن و رحیم آقا کی بُردباری اور اس کا حلم ہے کہ اس نے ہماری ساری کوتاہیوں کے باوجود ہمیں سنبھل جانے کا اور ناشکری کی اس روش کو بدل لینے کا اتنا بڑا موقع دیا ہے جو کسی اور امت کو نہیں دیا گیا۔

بہ حیثیتِ مجموعی اور بہ حیثیتِ ملّت ہماری ناشکرے پن کا یہ عالم ہے کہ نہ ہم اللہ تعالیٰ، خالقِ دوجہان کے احسانات کا شکر بجا لاتے ہیں اور نہ ہم اس قابل ہی ہیں کہ آپس کی زندگی میں ایک دوسرے کا احسان مانیں اور ایک دوسرے کا شکریہ ادا کریں۔ انسان کی پستی اور انسان میں زوالِ اخلاق کی انتہا اس سے زیادہ کوئی نہیں۔

ہمیں چاہیے کہ ہم ذاتی اور ملّی حیثیت سے اس پستی پر افسوس کریں اور اس شرمناک صورتِ حال سے خود کو نکالیں اور اخلاقی عظمتوں کا پاس و لحاظ کریں۔ اگر ہمیں زندہ و تابندہ رہنا ہے تو ہمیں اپنے حال کو بدلنا ہوگا۔ قرآن ندا دیتا ہے:

إِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِأَنْفُسِهِمْ ۗ وَإِذَا أَرَادَ اللّٰهُ بِقَوْمٍ سُوْٓءًا فَلَا مَرَدَّ لَهٗ ۚ وَمَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّالٍ ○ (الرعد: ۱۱)

یعنی "اللہ اس قوم کے حالات میں کوئی تغیر نہیں لاتا جو خود اپنے آپ کو بدلنے کا عزم نہ رکھتی ہو۔

Marfat.com

اور اللہ جس قوم کے حق میں تباہی کا فیصلہ فرما دے تو پھر کوئی طاقت اس فیصلے کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتی اور اللہ کے سوا کوئی کارکشا ہے نہ کارساز۔"

اور خود اس کا ارشاد ہے کہ:

مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَآمَنْتُمْ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِيْمًا ۝ (النساء: ۱۴۷)

یعنی "آخر اللہ کو کیا پڑی ہے کہ تمھیں خواہ مخواہ سزا دے اگر تم شکر گزار بنے رہو اور ایمان کی روش پر چلو۔ اللہ تو بڑا ہی قدر دان ہے اور سب کے حال سے خوب واقف ہے۔"

درحقیقت شکرِ خداوندی حاصلِ زندگی ہے۔ تشکّر و احسان مندی انسانی اخلاق کے مظاہر ہیں۔ اللہ سبحانہ و تعالیٰ ہمارے اخلاق بلند تر فرمائیں اور ہمیں صراطِ مستقیم پر چلائیں۔

Marfat.com

اخلاصِ نیت اور اخلاصِ عمل

نیّت کی درستی اور عمل کے اخلاص کو اسلامی شریعت میں بڑی اہمیّت حاصل ہے۔ جس طرح صحتِ عمل کا مَدار نیّت پر ہے اُسی طرح نیت کی قبولیت کا انحصار بھی خلوص پر ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ نیّت بھی صاف ہو اور عمل بھی مبنی بر اِخلاص ہو۔ چوں کہ اسلام میں اِخلاص کو بھی عبادت کا درجہ حاصل ہے اس لیے اس کی غرض و غایت بھی ہر قسم کی دنیاوی نفسانی اور ذاتی اغراض سے پاک ہونی چاہیے۔ اگر ایسا نہیں ہے تو ان کاموں کا مَدار اخلاص پر نہیں ہے، اِس لیے اُن میں کوئی نیکی اور ثواب نہیں اور نہ اُن کی حیثیت عبادت کی ہوگی۔

اسلام میں جہاد کو جو اہمیّت حاصل ہے وہ ہر شخص پر واضح ہے۔ اِسلام کی ترقّی اور توسیع کا یہ سب سے زیادہ کام یاب اور مؤثّر ذریعہ ہے۔ اس فریضے کی اہمیت کا انحصار نیت اور عمل کے اِخلاص پر ہے۔ مثلاً اگر کسی شخص نے یہ نیت کی کہ جہاد میں اس کی بہادری کے کارناموں کی لوگ قدر کریں گے تو چوں کہ یہ متبرّک کام نمود و نمائش اور نام آوری کے جذبے سے ملوّث ہوگیا اس لیے آخرت کے نقطۂ نظر سے اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔

اسی طرح ہجرت کا معاملہ ہے۔ اگر مسلمان ایک ملک سے دوسرے ملک محض ذاتی مفاد کے لیے چلے جائیں تو اس میں ہجرت کا کوئی ثواب نہیں ہوگا۔ اسلام میں اصل اہمیت اِخلاص کی ہے۔ نیت ہو یا عمل دونوں کی اسلامی شریعت میں اُسی وقت اہمیت ہوتی ہے کہ جب اُن میں اِخلاص شامل ہو۔ نماز سے بڑھ کر کوئی نیک کام کیا ہو سکتا ہے! لیکن اگر وہ بھی فخر، نمائش اور ریا یعنی دکھاوے کی خاطر کیا جائے تو ثواب کے بجائے الٹا عذاب کا باعث ہوگا۔ اسی طرح اگر کوئی مسلمان کسی حاجت مند کی امداد اس لیے کرے کہ لوگ اُس کی تعریف کریں گے تو اسلام کی نگاہ میں یہ کام اُس کی نیکی میں شمار نہیں ہوگا، کیوں کہ اس کی بِنا اِخلاص پر نہیں تھی۔ سورۃ آلِ عمران میں ایک جگہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

Marfat.com

وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۚ وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْهَا ؕ

یعنی "اور جو دُنیا کا بدلا چاہے گا اُس کو ہم دُنیا ہی دیں گے اور جو آخرت کا بدلا چاہے گا اسے آخرت کا اجر ملے گا۔" (آلِ عمران ۱۴۵)۔

ایک اور آیت میں اس کی تصریح کر دی گئی ہے کہ جس کام کا مقصد صرف نمائش اور دکھاوا ہو اس کی حیثیت سُراب سے زیادہ نہیں۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى ۙ كَالَّذِيْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ (البقرہ ۲۶۴)۔

یعنی: "اے ایمان والو تم اپنے صَدقات کو احسان جتاکر اور ستاکر برباد مت کرو جس طرح وہ شخص اپنے مال کو برباد کرتا ہے جو لوگوں کے دکھاوے کے لیے خرچ کرتا ہے اور اللہ اور قیامت پر یقین نہیں رکھتا۔"

مُنافقوں کا حال معلوم ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آکر رسالت کا زبانی اقرار کرتے تھے، لیکن وہ اقرار مبنی بر اخلاص نہ تھا اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ ۚ (المنافقون - ۱)

یعنی: "اور اللہ شاہد ہے کہ یہ مُنافق جھوٹے ہیں۔"

یہ تو نیّت کا مُعاملہ ہوا۔ اسی طرح عمل کی سچائی اور اُس کا اِخلاص یہ ہے کہ جو نیک عمل ہو وہ ضمیر کے مُطابق ہو اور اخلاص و بے لوثی پر مبنی ہو۔ ایک شخص نے چھپا کر کسی مجبور کی مدد کی اور دل میں خوشی محسُوس کی تو یہ اُس کے اخلاصِ عمل کا ثبوت ہے۔ نہ یہ نمائش کا جذبہ ہے اور نہ ذاتی مفاد اس سے وابستہ ہے۔ نہ تعریف و توصیف کی خواہش ہے۔ بس اللہ کی خوشنودی اور دلی راحت و سکون مطلوب ہے۔

نیّت اور عمل میں اخلاص اور بے لوثی کا اِس زمانے میں بڑا فقدان ہے۔ اس لیے ہمارا فرض ہے کہ ہم ہر کام میں اچھی نیت یعنی اچھا ارادہ قائم کریں اور عمل کرتے وقت یہ پیشِ نظر رکھیں کہ ہم جو کچھ کر رہے ہیں اُس کا اجر صرف اور صرف اللہ سے چاہتے ہیں۔ ہم مسلمان ہیں۔ ہمارے پیشِ نظر صرف اللہ تعالیٰ کی خوشنودی ہونی چاہیے اور اپنے اعمال و افعال میں رسول اللہؐ کی پیروی ہی ہمارا سرمایۂ حیات ہونا چاہیے۔ آں حضرتؐ نے اس بات کی تاکید فرمائی ہے کہ مسلمان جو عمل کریں اس میں اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے سوا کوئی مقصد سامنے نہ رکھیں۔ اللہ کی خوشنودی اور رسول اللہؐ کی اطاعت ہی میں ہمارے لیے انفرادی اور اجتماعی عظمت پوشیدہ ہے۔ ہماری تمنا

Marfat.com

ہے کہ پاکستان اسلام کا قلعہ بنے۔ ہم چاہتے ہیں کہ زندگی کے تمام گوشوں میں اسلامی شریعت کی عمل داری ہو۔ یہ ساری برکتیں صرف اُسی وقت حاصل ہو سکتی ہیں جب ہماری نیت نیک اور ہمارے افعال مبنی بر اخلاص ہوں اور ہم اپنے ارادے اور اپنے کاموں کو شریعتِ اسلامیہ کے حدود میں رکھیں۔ اور کوئی ایسی بات نہ سوچیں جو اسلام میں مطلوب نہیں ہے اور نہ کوئی ایسا کام کریں جو ہمارے ملک اور قوم کے مفاد کے منافی ہو۔ جب ہم پاکستان میں انفرادی طور پر اور اجتماعی طور پر اپنی نیتوں میں اخلاص کی شان پیدا کر لیں گے اور ہماری ہر سوچ مبنی بر اخلاص ہو گی اور ہمارا ہر قدم اخلاص کی راہ پر اٹھے گا اور ہر کام میں ہمارا مقصد خوشنودیِ باری تعالیٰ ہو گا تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ پاکستان ایک عظیم مملکت نہ بن جائے۔ ایسی عظیم مملکت کہ جو تمام اقوام و ممالک کے لیے وجہِ فخر ہو اور لائقِ تقلید۔

اس موقع پر اگر میں یہ سوال کروں تو بے جا نہ ہو گا کہ وطنِ عزیز، پاکستان کے بارے میں من حیث المجموع اور من حیث الملت ہمارا اندازِ فکر کیا ہے؟ اور پاکستان کے لیے ہماری نیت کیا ہے؟ کیا ہم اور اس ملتِ عزیز کا ہر فرد اس وطنِ پاک سے محبت کرتا ہے اور اس ارضِ پاک کو اللہ تعالیٰ کا عطیہ، ہدیہ اور اس کی امانت سمجھتا ہے جس کے ہم واقعی امین ہیں؟

پاکستان میں ہم آج جس انداز سے زندگی بسر کر رہے ہیں اور ملت کے جو لیل و نہار ہیں اُن سے اخلاصِ نیت کا مظاہرہ نہیں ہو رہا ہے۔ ہم پاکستان میں اسلامی اقدار کی ہمہ گیری کے ساتھ اور قرآن و سنت کی روشنی میں زندگی گزارنے میں پُرخلوص نہیں معلوم ہوتے ہیں۔

اگر خدا ناکردہ ہمارا خلوصِ نیت مشتبہ ہے اور پاکستان کے ساتھ ہمارا اخلاص اُن عظمتوں کو نہیں چھو رہا ہے جس کی ضرورت ہے اور اسلام جس کا ہم سے تقاضا کرتا ہے، تو ہم خطرات کو دعوت دے رہے ہیں اور اپنی عظمت و رفعت کو غیر یقینی بنا رہے ہیں۔ حال آنکہ پاکستان ایک ملتِ اسلامیہ کی حیثیت سے ہمارے پاس ایک امانت ہے اور اشرف المخلوقات ہونے کی حیثیت سے پاکستان کی حفاظت ہمارا فرض ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں خلوص کی عظمتوں سے مالا مال فرمائیں اور اخلاص کی رفعتوں سے ہمیں نوازیں۔

Marfat.com

محاسبۂ عمل

اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے اپنے کلام قرآن مجید و فرقان حمید کے ذریعہ سے خیر و شر، نیک و بد اور اچھائی اور برائی کے معیارات قائم کر دیے ہیں اور اچھائی و بُرائی کے درمیان قطعی حدِّ فاصل مقرر کر دی ہے۔ وہ تمام اعمال کہ جو انسان کو انسان بناتے ہیں اور وہ تمام افعال کہ جو دوسرے انسانوں کے لیے راحت و آرام کا سامان کرتے ہیں اور وہ تمام اعمال کہ جو انسان کو اپنے خالق کی بندگی کا درس دیتے ہیں اور خالق و مخلوق کے رشتے کو مضبوط کرتے ہیں اور دنیا میں امن اور خوش حالی اور معاشرے میں فلاح و خیر قائم کرتے ہیں، ایسے تمام کے تمام اعمال خیر ہیں۔ اس کے برعکس وہ تمام اعمال و افعال اور وہ تمام حرکات و سکنات کہ جو ساکنانِ زمین کو ایک دوسرے سے متصادم کر دیں اور جو اللہ اور اس کے بندے کے رشتے کو توڑ دیں اور جو معاشرے میں فساد برپا کریں اور جو دین و دنیا کا توازن تباہ کر دیں یہ تمام باتیں بری ہیں اور شر ہیں۔ قرآن حکیم نے خیر و شر، نیک و بد اور اچھے اور بُرے کے جو معیارات ہم کو بتا دیے ہیں وہ حرفِ آخر ہیں اور تمام دنیا کے لیے لائقِ تسلیم ہیں اور ہمیشہ ہمیشہ تسلیم کیے جائیں گے۔ دین اسلام کی تعلیمات ابدی اور دائمی ہیں۔ اسلام نے جن چیزوں کو برا کہہ دیا ہے بس وہ بری ہیں اور دین اسلام نے جن اعمال و افعال کو اچھا کہہ دیا ہے بس وہ اچھے ہیں۔ ایک مسلمان کو اپنی زندگی تعلیماتِ اسلام کی روشنی اور ہدایت الٰہی کے مطابق ڈھالنے کا فریضہ ادا کرنا چاہیے۔

راہ حق پر چلنے کے لیے قرآن ایک کتاب ہدایت ہمارے پاس موجود ہے اور یہی قرآن ہمیں یہ سبق دیتا ہے اور یہ درس کہ ہم اپنی زندگی کا محاسبہ خود کریں اور ہم غور کریں کہ جو زندگی ہم گزار رہے ہیں اور جو اعمال ہم سے سرزد ہو رہے ہیں وہ صحیح ہیں یا غلط، نیک ہیں یا بد۔ ہمارے اعمال ہمیں راہ حق اور صراطِ مستقیم پر چلا رہے ہیں یا ہم غلط راہوں پر چل رہے ہیں اور اندھیروں میں بھٹک رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انسان

Marfat.com

کو عقل کی نعمت عطا فرمائی ہے۔ اس عقل کو سب سے پہلے انسان کو خود اپنے محاسبے کے لیے استعمال کرنا چاہیے۔ محاسبۂ عمل کی سب سے پہلی راہ یہی ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: حَاسِبُوْا اَنْفُسَکُمْ قَبْلَ اَنْ تُحَاسَبُوْا

حضرت عمرؓ کے ارشاد کا مفہوم یہ ہے کہ یہ تو طے شدہ ہے کہ ایک دن اپنا حساب پیش کرنا ہوگا تو بہتر ہے کہ اس یومِ حساب سے پہلے خود ہی اپنا محاسبہ کر لیا کرو۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے اس مشورے میں انسانوں کو بلیغ انداز میں یومِ حساب کی طرف متوجہ فرمایا ہے۔ مومنین اور اللہ اور آخرت پر یقین رکھنے والے جانتے ہیں کہ اس دنیا کو بالآخر ختم ہونا ہے اور پھر ایک دن اپنے دنیا کے اعمال و افعال کا حساب دینا ہے۔ یہ محاسبہ لازمی ہے۔ تو اس محاسبۂ لازمی سے قبل یہ اچھا ہے کہ جب تک ہم دنیا میں ہیں اپنا محاسبہ خود ہی کر لیا کریں تاکہ انسان کا اپنا ضمیر یا نفسِ لوّامہ خود انسان کو اس کے اپنے اعمال کی اچھائی اور برائی پر متوجہ کر دیا کرے اور اس طرح یومِ آخرت اور یومِ حساب میں نامۂ اعمال وجۂ شرمندگی و پریشانی اور سببِ عذاب نہ بن جائے۔

ایک حدیث شریف کا مطلب یہ ہے کہ: "عقل مند و دانا وہ ہے کہ جو خود ہی اپنا محاسبہ کرتا رہے اور اس وقت کو دھیان میں رکھ کر عمل کرتا رہے جو موت کے بعد آنے والا ہے۔ بے وقوف وہ ہے کہ جو نفس کو تو اس کی خواہشات کے پیچھے لگا دے اور اللہ سے بہت ساری امیدیں باندھ بیٹھے۔"

اَلْکَیِّسُ مَنْ دَانَ نَفْسَهٗ وَعَمِلَ لِمَا بَعْدَ الْمَوْتِ وَالْعَاجِزُ مَنْ اَتْبَعَ نَفْسَهٗ هَوَاهَا وَتَمَنّٰی عَلَی اللّٰهِ الْاَمَانِیَّ (الحدیث)

انسان کا نفس اور انسان کا دل خواہشات کا مرکز ہے اور تمناؤں اور آرزوؤں کی آماج گاہ۔ ان دلی خواہشات پر اور نفسانی آرزوؤں پر فکر و عقل کو نظم اور ضبط قائم کرنا چاہیے۔ عقل کو یہ فیصلہ کرنا چاہیے کہ برائی کیا ہے اور اچھائی کیا۔ نیک و بد اور گناہ و ثواب کے مابین عقلِ انسانی کو فرق کرنا چاہیے۔ اگر انسانی عقل یہ فریضہ انجام نہیں دیتی ہے تو پھر انسان اور حیوان کا فرق مٹ جاتا ہے۔ درحقیقت یہ انسانیت کی موت ہے۔ آدمی کو انسان ہونا میسّر اسی وقت ہو سکتا ہے کہ وہ عقل کو سلامت روی کے لیے استعمال کرے۔ اگر سلامتی کی راہ سے انسان ہٹ گیا اور نفس کا غلام ہو کر برائیوں کی گرفت میں آگیا تو وہ انسان کیسے رہ سکتا ہے۔

Marfat.com

دراصل محاسبۂ عمل اسی کا نام ہے کہ انسان جو کام کرے اس پر پہلے غور کرے اور جب کام کر چکے تو محاسبہ کرے کہ وہ صحیح تھا یا غلط۔ اگر دل یہ گواہی دے اور ضمیر یہ پکارے کہ ہمارا عمل غلط تھا، ہمارا اقدام صراطِ مستقیم سے ہٹا ہوا تھا تو توبہ کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ بروقت خود احتسابی اور اپنے اعمال کا خود محاسبہ کرنا ہی دراصل یومِ حساب کی شرمندگی سے بچا سکتا ہے۔

ایسا آج تک نہیں ہوا ہے اور نہ آئندہ ہوگا کہ انسان غلط کام کرے اور سرخ رُو ہو۔ غلط کام بہر حال غلط ہے، برائی ہمیشہ بری رہے گی اور برائی کرنے والا ہمیشہ پریشان اور بدنام رہے گا۔ یہ قانونِ فطرت ہے اور قوانین فطرت تبدیل نہیں ہوا کرتے۔

قرآنِ مجید وفرقانِ حمید میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے واضح طور پر فرمایا ہے:

وَنَضَعُ الْمَوَازِينَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيَامَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا ۖ وَإِن كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ أَتَيْنَا بِهَا ۗ وَكَفَىٰ بِنَا حَاسِبِينَ ۝ (الانبیاء: ۴۷)

یعنی ”قیامت کے دن ہم میزانِ عدل قائم کریں گے۔ کسی پر کوئی زیادتی نہ ہوگی۔ رتی برابر عمل بھی سامنے لایا جائے گا اور ہم خوب حساب کرنا جانتے ہیں۔“

آج ہم جس دنیا میں ہیں، ہم دیکھتے ہیں کہ اس کا ساکن، اس کا رہنے والا ہر ایک آج کسی نہ کسی پریشانی میں مبتلا ہے۔ اخلاقی نظام تباہ ہو چکا ہے اور معاشرتی ومعیشتی نظام تہ وبالا ہے۔ انسانیت دم توڑ رہی ہے، شرافت پر مُردنی طاری ہے، انسانی عظمت پامال ہے۔ دنیا کی یہ حالت اور اس کے بسنے والوں کی یہ کیفیت واضح طور پر نشان دہی کرتی ہے کہ انسان نے اپنے اعمال کا محاسبہ کرنا چھوڑ دیا ہے۔ آج کا انسان حق وانصاف سے بے نیاز ہو کر پریشان حال ہے۔ آج کا انسان فطرت سے متصادم ہو کر شکست خوردہ ہے اور اپنے اللہ سے اور اس کے کلام سے بے پروا ہو کر قعرِ مذلت میں ہے اور ہادیِ برحق صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت سے منھ موڑ کر اندھیروں میں چلا گیا ہے۔

جب انسان اپنے فکر وعمل کا خود محاسبہ کرنا چھوڑ دیتا ہے تو اس کی سوچ اور اس کی فکر بیمار ہو جایا کرتی ہے اور جب وہ آخرت سے بے پروا ہو جاتا ہے تو دنیا ہی میں وہ پریشان اور آشفتہ حال ہو جاتا ہے۔

ایسے ہی لوگوں کے لیے قرآن ندا دیتا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَلْتَنظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ ۖ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۚ إِنَّ اللَّهَ خَبِيرٌ

Marfat.com

بِمَا تَعْمَلُوْنَ ٥ (الحشر:۱۸)

یعنی "اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ سے ڈرو! ہر شخص کو چاہیے کہ یہ دیکھتا رہے کہ اس نے آخرت کے لیے کیا عمل آگے بڑھایا ہے۔ اللہ سے ڈرتے رہو۔ اللہ سب کچھ جانتا ہے کہ تم کیا کر رہے ہو۔"

آئیے! ہم غور کریں اور آج سے یہ فیصلہ کر لیں کہ ہم اس دنیا میں انسان بن کر رہیں گے اور اچھے عمل کریں گے اور اس دنیا کو گہوارۂ امن بنائیں گے۔ ہم اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کی حکومت قائم کریں گے۔ ہم اس دنیا میں قرآنی قانون نافذ کریں گے اور ہمارے رہنما ہادیٔ برحق صلی اللہ علیہ وسلم ہوں گے۔

حکیم الامت شاعرِ مشرق علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے مژدہ دیا ہے کہ

صورتِ شمشیر ہے دستِ قضا میں وہ قوم
کرتی ہے جو ہر زماں اپنے عمل کا حساب

Marfat.com

عملِ صالح

اللہ تبارک و تعالیٰ خالق ہمہ جہان ہے۔ زمین و آسمان اور اس کے آگے کے سارے جہان اللہ تعالیٰ نے پیدا کیے ہیں اور ان سارے جہانوں کی ہر ہر چیز اس نے بنائی ہے۔ چاند، سورج، ستارے اور سیارے، زمین و آسمان سب کو اللہ نے پیدا کیا ہے اور ان سب جہانوں میں رہنے بسنے والی ہر شے اور ہر مخلوق اپنے خالق کو جانتی ہے۔ فرشتے ہوں یا انسان، حیوان ہوں یا اشیائے بے جان، ان سب کو اللہ نے پیدا کیا ہے اور ایک نظم قائم کیا ہے کہ ہر شے اس نظم اور نظام کے تابع ہے۔ چاند اور سورج ایک نظام کے تحت ہیں اور کیا مجال کہ ان کی گردش میں کوئی فرق آجائے۔ ستاروں اور سیاروں کا بھی ایک مقررہ نظام ہے۔ آسمانوں کا بھی ایک نظام ہے۔ اور اس زمین کا بھی نظام ہے جس پر انسان آباد ہے اور لاکھوں سال سے آباد ہے۔ اس انسان کو اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے۔ ہر مخلوق کا خالق اللہ تعالیٰ ہے۔ انسان کی زندگی اور انسان کی موت بھی اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ کوئی انسان اپنی مرضی سے پیدا نہیں ہوا اور نہ وہ اپنے ارادے سے مرتا ہے۔ پس جو خالق ہے اور موت و زندگی پر کلیتہً قادر ہے وہی حاکمِ کُل ہے۔ اس دنیا و مافیہا پر حکومت صرف اللہ ہی کی ہو سکتی ہے اور قانون بھی وہی چل سکتا ہے جو اللہ کا قانون ہے۔

"بے شک زمین اللہ ہی کی ہے، وہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے اس کا وارث بناتا ہے اور اچھا انجام متقیوں کے لیے ہے۔"

"کہہ یا اللہ بادشاہی کے مالک! تو جسے چاہے بادشاہی دے اور جس سے چاہے چھین لے جسے چاہے عزت دے اور جس کو چاہے ذلیل کرے۔ تیرے ہی ہاتھ میں بھلائی ہے۔ بے شک تو ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔"

اسلام کا سیاسی نظام اس بنیاد پر ہے کہ اس زمین کا مالک حقیقی اللہ تعالیٰ ہے۔

میں نے ابھی جن دو آیتوں کا ترجمہ پڑھا ہے اس سے بات صاف اور واضح ہو جاتی ہے کہ بادشاہت اور حکومت صرف اللہ ہی کی ہے۔ اللہ کا دربار دنیا چلانے کے لیے اپنی مرضی اور مشیت کے مطابق اپنی مخلوق میں سے کسی کو مقرر کرتا ہے اور اسے راستہ بتا دیتا ہے۔ جو لوگ اس کی مرضی و منشا کے مطابق یعنی قرآن کی ہدایات اور رسولؐ کی رہ نمائی کے مطابق کاروبارِ دنیا چلانے کے لیے اختیارات

Marfat.com

پاکرمن مانی کرنے لگتے ہیں اور اپنی مرضی کے قانون ودساتیر بناتے ہیں، اپنی پسند اور ناپسند کو اہمیت دیتے ہیں، اسلام سے صرفِ نظر کرتے ہیں اور غیر اسلامی نظریات اختیار کرتے ہیں وہ اللہ کے باغی ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کو ضرور اس دنیا میں سزا دیتا ہے اور اسی زمین پر وہ بدنام اور ذلیل و خوار ہوتے ہیں بس یہ اللہ کا قانون ہے۔ اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ ہم نے اپنی زندگی میں بھی ایسے لاتعداد مشاہدات کیے ہیں اور تاریخ کا درس بھی یہی ہے۔

جب یہ بات حتمی طور پر اور آخری طور پر طے ہو گئی کہ خالق جہاں اللہ تعالیٰ ہے اور زمین بھی اسی کی ہے اور زمین کی ساری کی ساری مخلوق اللہ ہی کی ہے اور انسان بھی اللہ کا بندہ ہے تو پھر یہ بات خود بخود سمجھ میں آجاتی ہے کہ اس دنیا میں رہنے کا ڈھنگ، زندگی بسر کرنے کا انداز اور علم و عمل کا طریقہ اور راستہ وہی ہونا چاہیے کہ جو اللہ تعالیٰ نے مقرر فرما دیا ہے اور جس کو اللہ تعالیٰ کے رسولِ آخر الزماں جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کے ذریعہ سے ہم تک پہنچا دیا ہے اور اپنی زندگی اور اپنی سیرتِ پاک کے ذریعہ سے عمل کرکے ہماری رہ نمائی کر دی ہے۔ جو لوگ اللہ پر یقین رکھتے ہیں وہ ایمان دار ہیں۔ لفظ ایمان امن سے بنا ہے جس کے معنی بے خوفی کے ہیں۔ اس لیے ایمان کے لفظی معنی امن کے یا بے خوف کر دینے کے ہیں۔ قرآن مجید و فرقانِ حمید میں سورۂ قریش میں آیا ہے:

ترجمہ: "اس نے ان کو امن دیا، بے خوف کر دیا"

اللہ تعالیٰ کے بہت سے صفاتی ناموں میں سے ایک نام "المومن" بھی ہے یعنی امن عطا کرنے والا اور بے خوف کر دینے والا۔ ایمان کے معنی ہیں یقین کرنا، تصدیق کرنا، ماننا اور اعتماد کرنا۔ شریعتِ اسلامی میں ایمان سے مراد اس بات کی تصدیق کرنا ہے جس کی بابت یقینی طور پر معلوم ہو کہ یہ نبی کریمؐ کا فرمان ہے:

قرآن اور احادیث کی روشنی میں پانچ باتوں پر یقین کرنے کا نام ایمان ہے:

۱۔ اللہ تعالیٰ کی ذات پر اُس کی بے مثل صفات کے ساتھ۔
۲۔ فرشتوں کے وجود پر، کہ وہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق اور اس کے فرماں بردار بندے ہیں۔
۳۔ اللہ تعالیٰ کی کتابوں پر، بالخصوص قرآن مجید پر۔
۴۔ اللہ کے نبیوں پر اور اس کے آخری نبی حضرت محمدؐ پر۔
۵۔ آخرت کی زندگی اور اس میں جزا اور سزا پر۔

قرآنِ مجید میں متعدد مقامات پر ان باتوں پر ایمان لانے کا ذکر کیا گیا ہے۔ ایمان کے اجزائے اعظم سمجھانے کے لیے ایک آیت شریف ہے:

Marfat.com

ترجمہ: "رسولؐ اُس چیز پر یقین رکھتا ہے کہ جو اُس کے رب کی طرف سے اتاری گئی یعنی قرآن پر اور جو لوگ اس رسولؐ کے ماننے والے ہیں (وہ بھی یقین رکھتے ہیں) - یہ سب اللہ پر، اُس کے فرشتوں پر، اُس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے ہیں"۔

ایمان کے ساتھ عملِ صالح ضروری ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ زبان سے تو کہیں کہ ہم ایمان لائے، مگر آپ کا عمل صالح نہ ہو اور آپ وہ کام کریں کہ جن کو قرآن نے بُرا کہا ہے اور اللہ کے رسولؐ نے جن کو منع فرمایا ہے۔ یاد رکھیے اچھے اعمال کے بغیر نجات ممکن نہیں۔ قرآنِ مجید نے صاف صاف بتا دیا ہے کہ "جو لوگ ایمان لائیں گے اور نیک عمل کریں گے وہی جنت والے ہیں اور وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے"۔

آج کی اس گفت گو میں چند باتیں صاف ہو گئی ہیں:

- اللہ تعالیٰ مالکِ حقیقی ہے، وہی حاکمِ مطلق ہے۔ زمین اور زمین کی ہر چیز اس کی ہے۔ انسان اللہ کا بندہ ہے۔ انسان کا حاکم اللہ ہے۔
- اس دنیا میں اللہ کا قانون ہی دستورِ عمل ہے جو قانون اور دستور قرآن سے الگ ہو، مسلمان کے لیے وہ لائقِ قبول اور قابلِ عمل نہیں ہے۔ مسلمان غیر قرآنی دستور کی پیروی نہیں کر سکتا۔
- مسلمان وہ ہے کہ جو اللہ تعالیٰ، اس کی کتاب، قرآنِ مجید اور اس کے رسولؐ پر یقین رکھے اور ایمان لائے۔
- اس دنیا میں عملِ صالح یعنی نیک کام کرے۔

اچھے کاموں کے لیے اور عملِ صالح کے لیے انسان کو چار عبادتیں تیار کرتی ہیں، نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج۔ ان عبادات کے بغیر اسلامی زندگی نہیں بن سکتی۔ ایک مسلمان کو تمام دوسرے انسانوں سے مُمیّز اور مشخص کرنے کے لیے اِن عبادات کی پابندی کرنی چاہیے: اللہ سے لو لگائے جب آپ ہر نماز میں اور ہر رکعت میں پڑھیں گے اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ اور یہ یقین کامل ہو گا کہ آپ اپنے رب کے سامنے کھڑے ہیں اور سیدھے سچے راستے کی ہدایت کے طلب گار ہیں تو ضرور آپ کی دعا قبول ہو گی اور آپ کو اللہ سیدھا راستہ دکھائے گا۔

انسان انسان میں محبت اور بھائی چارہ، مسلمانوں میں باہمی خلوص اور رضامندی، انسان کی عزت اور مساواتِ انسانی کا احترام وہی لوگ کر سکتے ہیں کہ جو سیدھے راستے پر ہوں، بے شک ایسے ہی لوگوں کے لیے اللہ کا انعام ہے۔

Marfat.com

بُرائیوں سے اجتناب

ہر معاشرے کی فلاح وسعادت، امن واستحکام اور ترقی وبلندی ایک نظام اخلاق پر منحصر ہوتی ہے۔ اخلاق وہ ڈوراہے جو معاشرے کے مختلف اجزا کو ایک دوسرے سے باندھے رکھتا ہے اور بکھرنے اور بگڑنے سے بچاتا ہے۔ اخلاق سے مراد نیک وبد، خوب وناخوب، خیر وشر، اچھائی اور بُرائی میں تمیز کرنے والی اقدار ہیں۔ ان اقدار کی کسوٹی پر پرکھ کر انسان کو پہچانا جاتا ہے اچھے بُرے خانوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

اخلاقی اقدار ہی معاشرے کو فیصلہ کن معیار عطا کرتی ہیں جن کی بنا پر افراد کو عزت یا ذلت اور نیکی یا بدی کی سند دی جاتی ہے۔ اخلاقی اقدار کا پاس ولحاظ کرنے والے افراد معاشرے میں عزت وتوقیر کے مستحق سمجھے جاتے ہیں اور ان اقدار کو نظر انداز کرنے والے افراد کو معاشرہ مقام عظمت عطا نہیں کرتا۔ کسی معاشرے کا یہ رویہ اچھائیوں کی ترغیب اور برائیوں سے اجتناب کے لیے سب سے بڑا ہتھیار اور سب سے موثر وسیلہ ہوتا ہے۔ اگر افراد کو برائیوں سے بچانا اور بُرے کاموں سے محفوظ رکھنا ہے تو معاشرے کو اپنے اس رویّہ میں مخلص اور مستحکم ہونا چاہیے۔ معاشرے کا مجموعی نظام جن اقدار کو اوّلیت اور فوقیت دیتا ہے وہی اقدار اس کے افراد کے لیے نصب العین کی حیثیت رکھتی ہیں اور ان ہی کے حصول کے لیے وہ افراد اپنے کردار وعمل کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

قرآنِ حکیم نے ہمیں حکم دیا ہے کہ ہم اچھائیوں کی تلقین کریں اور برائیوں سے روکیں۔ قرآن کی یہ ہدایت محض ایک ترغیبی نصیحت کی حیثیت نہیں رکھتی بلکہ وہ اس کو اُمّت مسلمہ کا فریضہ قرار دیتا ہے اور اس عمل کو مسلمانوں کے لیے وجہ امتیاز قرار دیتا ہے۔

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ...

(آل عمران: ۱۱۰)

قرآنی تعلیم کا مقصد انسان کو ایک ایسا مثالی انسان بنانا ہے جو خیر وفلاح کا نمونہ ہو اور جس کا وجود اپنے ہم جنسوں کے علاوہ کائنات کے ہر وجود بلکہ ہر شے کے لیے رحمت ورافت ہو۔ انسان کو خلیفۃ اللہ فی الارض بنایا گیا ہے۔ اللہ کے نائب کی حیثیت سے انسان کو وہی کچھ کرنا چاہیے جس

Marfat.com

کے لیے اس کو یہ حیثیت دی گئی ہے اور جس کے لیے اس کو مامور کیا گیا ہے۔ اللہ کی مرضی یہی ہے کہ اس کی زمین میں نیکیاں اور اچھائیاں پھلیں پھولیں، خیر و فلاح کا دور دورہ ہو، امن و راحت عام ہو، شرافت و انسانیت کا بول بالا ہو، دیانت و امانت کا چلن ہو۔ برائیاں سر نہ اٹھانے پائیں، ظلم و زیادتی کا نام نہ ہو، ناانصافی اور بے دردی مغلوب ہو، کذب و بہتان کی گنجائش نہ ہو۔ اسلام ایسا ہی معاشرہ قائم کرنا چاہتا ہے۔ اسی لیے وہ ایسا ماحول پیدا کرنا چاہتا ہے جس میں نیکی کرنا آسان ہو اور برائی کرنا نہایت مشکل۔ اسی لیے اسلام محض وعظ و نصیحت اور اخلاقی ترغیب پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ وہ مجموعی طور پر نظامِ حیات کو اس طرح ڈھالنا چاہتا ہے کہ انسان کے لیے سیدھے راستے پر چلنا سہل ہو اور صراطِ مستقیم سے بھٹکنا دشوار۔ اس مقصد کے لیے وہ اخلاق و عبادات کے ساتھ معاملات میں بھی رہنمائی کرتا ہے۔ مسجد سے بڑھ کر وہ مدرسہ اور مدرسے سے بڑھ کر وہ سیاست و تجارت میں انسان کو رہنما اصول عطا کرتا ہے۔ نیک انسانوں کو بعض اوقات مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور وہ مایوس ہونے لگتے ہیں۔ قرآن ایسے لوگوں سے کہتا ہے کہ مایوس نہ ہو اور گھبراؤ مت، اگر تم ایمان والے ہو تو سرفرازی و سرداری تمھارے ہی لیے مقدر ہے۔

وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ○ (آل عمران: ۱۳۹)

عبادات بھی انسان کو خیر پر قائم رکھنے اور برائیوں سے بچانے کا ذریعہ ہیں۔ قرآنِ کریم نے عبادت کو انسان کی تخلیق کا مقصد قرار دیا ہے۔ عبادت انسان کو مقامِ عبدیت پر قائم رکھتی ہے، اس کو معبود سے قریب رکھ کر احکامِ الٰہی کا پابند بناتی ہے۔ احکامِ الٰہی کی پابندی انسان کو تمام برائیوں سے روکتی اور محفوظ رکھتی ہے۔ نماز کے لیے فرمایا گیا ہے:

اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ ؕ (العنکبوت: ۴۵)

یعنی: "بے شک نماز بے حیائی اور برائیوں سے باز رکھتی ہے۔" دراصل عبادات بھی مقصود بالذات نہیں ہیں، یہ بھی ایک برتر مقصد کا ذریعہ ہیں اور وہ مقصد ہے انسان کو اپنے معبود کی رضا کے آگے سر تسلیم خم کر دینے کی تربیت دینا جو کام اللہ کی نظر میں پسندیدہ ہیں ان کو انجام دینا اور جو اعمال خالقِ حقیقی کے نزدیک ناپسندیدہ اور غیر مستحسن ہیں ان سے دور رہنا۔

روزہ بھی اسلام کا اہم رکن ہے۔ اس کا مقصد بھی یہی بتایا گیا ہے کہ انسان میں تقویٰ پیدا ہو اور وہ برائیوں سے بچے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ○

(البقرہ: ۱۸۳)

Marfat.com

روزے، نفسِ انسانی کی تربیت کا ایک ایسا سالانہ کورس ہیں جو انسان کو ہر لمحہ حدود اللہ کو یاد دلا کر ان کی پابندی کرنے کی تربیت دیتے ہیں۔ روزے میں جائز چیز بھی ایک مقررہ وقت تک جائز نہیں رہتی۔ جو چیزیں انسان روزانہ کھاتا ہے اور اس کے لیے حلال ہیں ان کو بھی روزے کے دوران میں نہیں کھاتا، یہ اس بات کی علامت اور یاددہانی ہے کہ وہ اللہ کا بندہ ہے اور اس کو جب اور جیسا حکم دیا جائے وہ اس کا پابند ہے۔ جن باتوں کے کرنے کے لیے اس کو حکم دیا جائے وہ ان کو بہ رضا و رغبت انجام دینا ہے چاہے اس کا نفس کتنا ہی اس کے خلاف ترغیب دے۔ جن کاموں کی اس کو اللہ اور اس کے رسولؐ نے اجازت نہیں دی ہے ان کی طرف پھٹکتا بھی نہیں۔

برائیوں سے بچنے کے لیے محض وعظ و نصیحت ہی کافی نہیں، محض قاعدے قانون بنا دینا ہی کافی نہیں، اس کے لیے وہ فضا اور وہ ماحول بھی ضروری ہے جس میں انسان کے لیے برائیوں سے دور رہنا ممکن ہو۔ جو انسان برائی نہ کرنا چاہیں ان کو کوئی برائی کرنے پر مجبور نہ کرے۔ جو لوگ رشوت نہ دینا چاہیں ان کو رشوت دینے پر مجبور نہ ہونا پڑے۔ اسی طرح جو لوگ رشوت نہ لینا چاہیں ان کو مشکلات پیش نہ آئیں، ان کی قدر کی جائے، ان کو عزت کا مقام اور دیانت کی روزی میسر آسکے۔ اسی طرح ہر بدی سے اجتناب کے لیے ماحول سازگار ہو اور ہر نیکی کے اختیار کے لیے ماحول مددگار۔

اس سلسلے میں ایک نکتہ اور عرض کر دوں۔ اگر افراد کو برائیوں سے محفوظ رکھنا ہے تو اس کے لیے ہمیں مثبت اقدام کرنے ہوں گے اور لوگوں سے بُری عادتوں کو چھڑانے کے لیے ان کو اچھی عادتوں کی ترغیب دینی ہوگی۔ جھوٹ کی عادت اُسی وقت چھٹ سکتی ہے کہ جب سچ بولنے کی عادت اس کی جگہ لے لے۔ یہ انسانی فطرت ہے کہ جب تک وہ اچھی عادتیں اختیار نہ کرے اس وقت تک وہ بُری عادتیں نہیں چھوڑ سکتا۔ اور اس مقصد میں اسی وقت کامیابی ہو سکتی ہے کہ جب ہر خاص و عام اس کا عزم کرلے۔ کسی ایک طبقے پر اس کام کو نہ چھوڑا جائے۔ جب تک مجموعی طور پر ملت اور ملت کا ہر فرد اس مقصد کو عزیز نہ جانے یہ مقصد حاصل نہیں ہو سکتا۔ برائیوں کے نتائج بھی ساری قوم بھگتی ہے اور برائیوں سے دور رہ کر نیکیوں کو اختیار کرنے کے ثمرات بھی ساری ملت کو حاصل ہوں گے۔

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

Marfat.com

زندگی میں عمل کی اہمیّت

زندگی میں عمل کی اہمیت اسی سے واضح ہے کہ عمل کے بغیر زندگی کا تصور ہی ممکن نہیں۔ زندگی حرکت و عمل کا دوسرا نام ہے، اور بے عملی یا جمود کا دوسرا نام موت۔ عمل سے زندگی بنتی بگڑتی ہے۔ زندگی جنّت بھی عمل سے بنتی ہے اور اس کو جہنم بھی عمل ہی بناتا ہے۔ انسان اپنے عمل سے اپنے لیے جنت اور جہنم دونوں بنا سکتا ہے اور بناتا ہے۔ عمل نہ ہو تو زندہ رہنا محال ہو جائے۔ جام زندگی کے دوام کا راز گردش پیہم میں پوشیدہ ہے۔ بے عملی نہ صرف انسان کو سست، کاہل اور کمزور بناتی ہے بلکہ بے یقین اور بزدل بھی بناتی ہے۔ اس کے برعکس عمل انسان کو مستعد، معتمد اور معزز بناتا ہے۔ باعمل اور محنتی لوگوں کو اپنی ذات پر بھروسا اور اعتماد ہوتا ہے۔ یہ اعتماد ان سے بڑے بڑے کام انجام دلواتا ہے اور ان کو ترقی اور خوشحالی کے زینے پر چڑھاتا ہے۔ صرف خود اعتماد آدمی ہی کوئی کارنامہ انجام دے سکتا ہے۔ جس شخص کو اپنے آپ پر اور اپنی قوتوں پر اعتماد نہ ہو وہ کوئی کامیابی حاصل نہیں کر سکتا۔ عمل نہ کرنے سے انسان میں ایک قسم کی مایوسی اور بزدلی پیدا ہو جاتی ہے جو اس کے جسم و جان کو مزید زنگ لگا دیتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ سست ہو جاتا ہے اور پھر اس کے لیے کوئی کام خوبی اور سلیقہ سے انجام دینا مشکل سے مشکل تر ہو جاتا ہے۔ مایوسی اور بزدلی انسان کے ارادوں کو بے جان اور حوصلوں کو پست اور روح کو پژمردہ کر دیتی ہے۔

عمل کا عادی انسان اپنے کسی کام کے لیے دوسرے کا محتاج نہیں ہوتا۔ وہ اپنا کام خود کرتا ہے اور اس کی خوشی حاصل کرتا ہے۔ اس طرح اس کو نہ صرف یہ کہ دوسروں کا شرمندۂ احسان نہیں ہونا پڑتا بلکہ وہ مسرتِ عمل بھی حاصل کرتا ہے۔ ہمارے سرکار اور پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم مجسم عمل تھے اور اپنا کام خود اپنے دستِ مبارک سے کیا کرتے تھے۔ اس میں آپ کو نہ کوئی تکلیف ہوتی تھی اور نہ آپ

Marfat.com

اپنے ہاتھ سے اپنا کام کرنے میں شرماتے تھے۔ اپنے پھٹے ہوئے کپڑے خود سی لیتے تھے۔ بکریوں کا دودھ خود دوہ لیتے، آپؐ کے جوتے ٹوٹ جاتے تو اپنے ہاتھ سے گانٹھ لیتے۔ غرض دوسروں کو تکلیف دینے کے بجائے اپنا کام خود کرنا پسند فرماتے آپ کے خادم حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ میں نے آپ کی خدمت اتنی نہیں کی جتنے آپ نے میرے کام انجام دیئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بازار سے سودا سلف خود لے آتے جھاڑو خود دے لیتے۔ گھر کے دوسرے کاموں میں بھی گھر والوں کا ساتھ دیتے اور ہاتھ بٹاتے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ مجھے شیخی کی باتیں پسند نہیں ہیں۔ ایک بار آپ گھر کی مرمت کر رہے تھے کہ دو اصحاب آئے۔ حضورؐ کو کام کرتا دیکھ کر وہ دونوں حضرات بھی مرمت کے کام میں شریک ہو گئے۔ کام ختم ہوا تو آپ نے ان دونوں کے لیے دعا فرمائی۔

ایک سفر کے دوران صحابہؓ کو کھانا تیار کرنا پڑا۔ سب صحابہؓ نے ایک ایک کام بانٹ لیا۔ جنگل سے ایندھن بٹور کر لانے کا کام حضورؐ نے اپنے ذمہ لیا۔ صحابہؓ نے عرض کیا، "یارسول اللہ! یہ کام بھی ہم آپ کے غلام کر لیں گے۔" دونوں عالم کے سردارؐ نے فرمایا کہ "مجھے یہ پسند نہیں ہے کہ میں خود کو تم لوگوں سے الگ رکھوں یا اپنے کو بڑا سمجھوں، خدا اس بندے کو پسند نہیں کرتا جو اپنے ساتھیوں سے اپنے کو بڑا شمار کرتا ہو۔" تاج دارِ مدینہؐ کو معمولی معمولی لوگوں کے کام کرنے میں بھی کوئی عار نہ تھا۔ مدینے کی لڑکیاں آتیں اور عرض کرتیں:

"یارسول اللہ! ہمارا یہ کام ہے!"

آپؐ فوراً اٹھ کھڑے ہوتے اور ان کا کام کر دیتے۔

ایک بار نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ ایک غلام بیماری کی حالت میں اپنے آقا کے ڈر سے آٹا پیس رہا ہے اور روتا جا رہا ہے۔ آپؐ اس کو ہٹا کر خود آٹا پیسنے بیٹھ گئے۔ آٹا پس گیا تو فرمایا:

"آئندہ بھی ضرورت پڑے تو مجھے بلا لینا۔"

اسی طرح ایک بوڑھا غلام اپنے آقا کا باغ سینچ رہا تھا۔ آپ نے دیکھا کہ کنوئیں سے پانی نکالنے میں اس ضعیف غلام کے ہاتھ کانپ کانپ جاتے ہیں۔ آپؐ نے اس سے ڈول لے کر پانی بھرنا شروع کر دیا۔ جب کام پورا ہو گیا تو ہمارے آقائے نامدارؐ نے اس غلام

Marfat.com

سے ارشاد فرمایا:

"دیکھو، جب کبھی تمھیں مدد کی ضرورت ہو، مجھے خبر کرنا۔"

یہ تو چند مثالیں اور واقعات ہیں، جو یہ بتانے کے لیے میں نے آپ کی خدمت میں عرض کیے ہیں کہ عمل و محنت کی اہمیت کا اظہار رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عمل سے بھی فرمایا ہے اور ہمارے لیے ایک نمونہ چھوڑا ہے، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ حضور اکرمؐ کی ساری زندگی عزم و عمل، سعی و جہد اور استقلال و ثابت قدمی کا نمونہ ہے۔ آپ نے جب دینِ حق کی اشاعت و تبلیغ شروع کی تو ہر طرف سے مخالفت کا طوفان اٹھ کھڑا ہوا اور دشمنوں کی ریشہ دوانیوں اور مخالفتوں نے گھیر لیا۔ آپ کو بڑی بڑی مصیبتوں کا سامنا ہوا، لیکن آپ نے سعی و عمل سے منھ نہ موڑا اور مستقل مزاجی کے ساتھ اپنے کام میں لگے رہے، یہاں تک کہ مصائب کے تمام بادل چھٹ گئے اور مخالفتوں کے سب پہاڑ راہ سے ہٹ گئے۔ مقصد کی لگن اور اس کے لیے مسلسل عمل اور سعیِ پیہم انسان کو دیر سویر کامیابی اور شادمانی سے ہم کنار کر دیتی ہے اور مشکلات سے نجات مل جاتی ہے۔ کامیاب افراد اور زندہ اقوام کا یہی طریقہ ہے۔ یہ دنیا دار العمل ہے، سعی و جہد کی جگہ ہے۔ جب تک انسان زندہ ہے اس کو عمل کرنے کی مہلت ملی ہوئی ہے۔ جتنا اور جیسا عمل وہ کرے گا اتنا اور ویسا ہی بدلہ وہ پائے گا۔ اس کے بعد پھر اس کو عمل کا موقع نہ ملے گا۔ اس مہلتِ زندگی میں انسان کو یہ سمجھ کر عمل کرنا چاہیے کہ میرا ہر کام، میری ہر سعی اور ہر حرکت اپنا ایک اثر چھوڑے گی اور اسی کے مطابق مجھے بعد کی زندگی میں اچھا یا برا نتیجہ ملے گا۔ مجھے جو کچھ ملے گا وہ میرے اعمال کا بدلہ ہوگا۔ قرآن حکیم بھی ہمیں یہی تعلیم دیتا ہے:

فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۝ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ۝

(الزلزال ۷-۸)

یعنی: "پس جو شخص ذرّہ برابر نیک عمل کرے گا اس کا نتیجہ دیکھ لے گا اور جو شخص ذرہ برابر برا عمل کرے گا وہ اس کا نتیجہ بھی دیکھ لے گا۔"

اس آیت میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے بہت صاف الفاظ میں فرما دیا ہے کہ جو شخص جیسا عمل کرے گا اس کی جزا یا سزا اس کو ضرور ملے گی۔ جو جیسا بوئے گا ویسا ہی کاٹے گا۔ عمل کا ردِّ عمل ضروری ہے۔ کوئی شخص برا عمل کر کے یہ نہ سمجھے کہ اس کے انجام سے وہ

Marfat.com

بچ جائے گا۔ جس طرح سمندر میں پتھر پھینکا جائے تو وہ پانی کو ضرور متحرک کرتا ہے اسی طرح انسان کا عمل اپنے اثرات و نتائج ضرور چھوڑتا ہے۔ سورۂ نمل میں فرمایا گیا ہے کہ:

مَنْ جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهُ خَيْرٌ مِّنْهَا ۚ وَهُم مِّن فَزَعٍ يَوْمَئِذٍ آمِنُونَ ○ وَمَن جَاءَ بِالسَّيِّئَةِ فَكُبَّتْ وُجُوهُهُمْ فِي النَّارِ ۖ هَلْ تُجْزَوْنَ إِلَّا مَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ○ (النمل: ۸۹-۹۰)

یعنی "قیامت کے دن جو کوئی نیک عمل لے کر آئے گا وہ اس سے بہتر جزا پائے گا اور وہ امن سے رہے گا۔ اور جو شخص برے اعمال لے کر آئے گا تو وہ آگ میں جھونکا جائے گا۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ تمھیں تمھارے اعمال کے سوا کسی اور چیز کا بدلہ دیا جائے گا"۔

اس ارشادِ الٰہی سے یہ امر بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ حساب کے دن اور آخرت میں جزا اور سزا کے لیے کوئی دوسری بنیاد کام نہیں آئے گی۔ دولت، عزت، شہرت، حکومت، نسل، نسب غرض کوئی چیز کام نہیں آئے گی اگر انسان کے اعمال اس کے ساتھ نہ ہوں جیسا کہ حضورؐ نے اپنی صاحبزادی حضرت فاطمۃ الزہراؓ پر واضح فرمایا تھا کہ قیامت کے دن میں تمھارے کسی کام نہ آؤں گا بلکہ تمھارے اعمال تمھارے کام آئیں گے۔

Marfat.com

عملِ پیہم

عملِ پیہم کا تعلق انسان کے اخلاق اور کردار سے ہے، یہ اُن اخلاقی فضائل و محاسن میں ہے جس سے محرومی کی بنا پر معاشرے میں انسان کی کوئی قدر و قیمت باقی نہیں رہ جاتی۔ کسی منزل تک پہنچنے کے لیے جہدِ مسلسل وہی کرتا ہے کہ جو اعلا اخلاقی اقدار کا حامل ہوتا ہے۔ جمود اور تعطل خواہ انفرادی ہو یا اجتماعی، زوال کی علامت ہے اور عملِ پیہم عُروج و ترقی کی نشانی ہے۔

آپ اگر بہ نظرِ غور دیکھیں تو یقیناً آپ کو جہدِ پیہم سے محروم انسان کے بارے میں اس فیصلے سے اتفاق ہو گا کیوں کہ بدیہی چیز ہے کہ جو شخص فکر اور عقیدے کی حیثیت سے کسی چیز کو قبول کر چکا ہو اور اس کی حقانیت و صداقت اُس پر آشکارا ہو چکی ہو وہ اُس راہ کی مشکلات پر قابو پانے کی بھرپور جدّ و جہد کرے گا، بڑی سے بڑی طاقت اُسے مرعوب نہیں کر سکتی اور طوفانِ حوادث کا کوئی جھونکا اس کے پائے ثبات میں کوئی لغزش یا تزلزل نہیں پیدا کر سکتا۔ وہ اپنے ایمان و یقین کا سودا نہ جان و مال کے عوض کر سکتا ہے نہ طاقت و اقتدار کے عوض، کیوں کہ وہ جس منزل تک پہنچنے کے لیے عملِ پیہم کر رہا ہے وہ ان سے بالاتر ہے۔ فرض کر لیجیے کسی نے دارِ آخرت کو اپنی منزل قرار دے لیا ہے، اللہ اور اس کے رسولؐ کی خوشنودی اور اطاعت کو اپنا نصب العین بنا لیا ہے تو کیا وہ ایک لمحہ بھی غفلت اور جمود میں گزار سکتا ہے؟ وہ جانتا ہے کہ اس طرح منزل سے کوسوں دُور ہو جائے گا، اور قیامت میں جب زندگی کے قیمتی لمحات کے بارے میں بازپرس ہو گی تو وہ کوئی جواب نہ دے سکے گا کہ اُس نے یہ امانت کہاں صَرف کی، کس طرح جوانی گزاری اور کس طرح پیری کے دن آئے۔ اسی لیے اسلام نے دنیا کو دارالعمل قرار دیا ہے، اور بتایا ہے کہ ہر مومن پیکرِ عمل بن کر رہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے، "کہہ دو کہ لوگو! عمل کرو، جلد ہی اللہ اور اس کے رسولؐ تمھارے عملوں کو دیکھیں گے۔"

عمل کا لفظ متعدد مقامات پر آیا ہے، لیکن سب کی معنویت مشترک ہے اور مفسّرین کے نزدیک عمل عقیدۂ توحید پر ثبات و استقلال کے ساتھ جمے رہنے اور ابتلا و آزمائش کے ہر ہر مرحلے پر یقین و اعتماد اور عزم کے ساتھ قائم رہنے ہی کو کہتے ہیں۔ معنوی طور پر اس لفظ کی ایک اور

Marfat.com

خصوصیت ہے، اور وہ یہ کہ چوں کہ اس کا تعلق محاسنِ اخلاق سے ہے اس لیے غلط کام کے تسلسل کو عملِ پیہم نہیں کہیں گے، بلکہ قرآنی اصطلاح میں اسے معصیت پر اصرار یا حق سے اِعراض کہیں گے۔ کسی مقصد کے حصول کے لیے جہدِ مسلسل اور موانع کے باوجود ثابت قدمی کو استقامت کہتے ہیں۔ استقامت کے متعلق حدیث ہے کہ: حضرت عثمان غنیؓ سے پوچھا گیا کہ اس سے کیا مراد ہے؟" آپ نے فرمایا، "اخلاصِ عمل کا مفہوم بھی حقیقی توحید ہی ہے۔"

حضرت صدیق اکبرؓ نے جہد مسلسل کی ایک ایسی جامع و مانع تعریف کی ہے جس کی کوئی مثال نہیں ملتی، دراصل انھوں نے ایمان اور عملِ صالح کے مجموعے کو استقامت اور عملِ پیہم کہا ہے۔ توحید، انسانی زندگی پر اپنے اثرات کے لیے استقلال اور صبر کا تقاضا کرتی ہے، عملِ پیہم اور جہد مسلسل کا تقاضا کرتی ہے، اور یہ پورے معاشرے کے لیے وہ نظریۂ انقلاب ہے جس کی زد سیاست، معیشت، رسم درواج سب پر پڑتی ہے۔ وہ وقت بھی آتا ہے کہ جب اپنے بیگانے ہو جاتے ہیں اور زمین کا ذرّہ ذرّہ آمادۂ رزم و پیکار نظر آتا ہے۔ اگر صرف زبان اقرارِ توحید کرتی ہے، لیکن ان مشکلات و مصائب میں مبتلا ہو کر ہم قوتِ مدافعت کھو بیٹھتے ہیں تو ہمیں سمجھ لینا چاہیے کہ ایمان تو ہے مگر عملِ صالح سے دامن تہی ہے، اور ایمان نا مکمل ہے، کیوں کہ حضرت بلالؓ کی طرح گرم ریت پر تڑپتے ہوئے بھی کوئی اَحَدٌ اَحَدٌ کہہ سکتا ہے، حضرت عمارؓ و حضرت صہیبؓ کی طرح رُوح فرسا مظالم کے باوجود راہِ توحید سے سرِ مُو انحراف نہیں کر سکتا تو اس کو آخرت کے لیے عملِ پیہم یا حسنِ عمل کہیں گے۔

آپ نفسیاتی اور اخلاقی اعتبار سے بھی جائزہ لیں کہ جو شخص اپنے عقیدہ و تصوّر کے لیے اپنی زندگی کو سراپا حرکت و عمل نہیں بنا سکتا اور زمانے سے ٹکرانے کا حوصلہ نہیں رکھتا وہ صاحبِ کردار کس طرح کہا جا سکتا ہے؟ اور وہ مُعاشرے کو اپنے ایمان کے مطابق نظام کے سانچے میں ڈھالنے کی کوئی جدّ و جہد نہیں کرتا تو اُسے باعمل مسلمان کیوں کر کہا جا سکتا ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ ہم نے عمل کے مفہوم کو رکوع و سجود تک محدود کر دیا ہے۔ عملِ صالح ہر اُس اقدام کو کہتے ہیں جس سے بہ ظاہر کوئی انسان اللہ کے سوا نہ کسی کو اپنا رازق مانتا ہے، نہ خالق، نہ حاکم، نہ فرماں بردار۔ وہ صرف ایک کے احکام کا پابند ہے اور وہ کتابُ اللہ اور اُسی کے حکم سے اُس نبی کی سنّت کا اتباع جس کی دعوت خود قرآن نے دی ہے۔ یہی اصل توحید ہے اور یہی مومن کا حُسنِ عمل ہے۔ حضرت عثمان غنیؓ اور صدیق اکبرؓ نے ایسے ہی ایمان و عملِ صالح کے مجموعے کو استقامت کہا ہے۔

Marfat.com

مسلم کی روایت ہے کہ حضرت سفیان بن عبداللہ ثقفی رضی اللہ عنہ نے جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ یا رسول اللہ! مجھے اسلام کی ایک جامع بات بتا دیجیے جس کے بعد مجھے کسی اور سے پوچھنا نہ پڑے تو آپ نے فرمایا کہ "تم اللہ پر ایمان لانے کا اقرار کرو اور اس پر قائم رہو"۔ بظاہر یہ مختصر الفاظ پر مشتمل نصیحت بہت سادہ اور سیدھی معلوم ہوتی ہے مگر غور تو کیجیے کہ ان مختصر الفاظ میں کس طرزِ زندگی کی طرف رہنمائی فرمائی جا رہی ہے اور کس معیارِ اخلاق و کردار کا مطالبہ کیا جا رہا ہے۔

دراصل پہلا مطالبہ ایمان، دوسرا مطالبہ اس کی جملہ مقتضیات کی تکمیل کا ہے۔ ایمان جس صدق و راستی، اخلاص، اتحاد اور جہدِ پیہم کا تقاضا کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ نیز بندوں کے جو حقوق بتاتا ہے ان کو مسلسل اور نامساعد حالات میں بھی انجام دیتے رہنا ہی تقاضائے ایمان کی تکمیل ہے اور جس نے ایسا کر لیا وہ اس معیارِ ایمان و عمل تک پہنچ گیا جہاں انسان کو لانا مقصود ہے۔

مسلسل عمل کی تاکید اس بات کی غماز ہے کہ باطل کی ساری طاقتیں تمہارے اس عقیدے سے ٹکرائیں گی۔ اگر تم ثابت قدم اور مسلسل عمل کرتے رہے تو تم نے ایمان کا حق ادا کر دیا۔ اسی لیے حضرت سیدنا علی کرم اللہ وجہہ اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے جب مستقل مزاجی کا مفہوم پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا کہ "فرائض کی ادائی کا نام استقامت ہے"۔ بے شک اس کے مقامات بھی بڑے نازک ہیں اور نوبت کبھی کبھی رسن و دار تک آ جاتی ہے۔ اس لیے اگر کوئی سارے فرائض ادا کرتا رہا ہے تو اس نے بھی عمل کی بلندیوں کو چھو لیا ہے۔

قرآن شریف میں ایمان و اعتقاد کے بعد ہم سے عمل ہی کا تقاضا کیا گیا ہے، اور جمود و تغافل، خواہ معاش و معیشت کی راہ میں ہوں یا عبادات و معاملات میں یا علوم و فنون میں، اللہ اور اس کے رسول کے نزدیک مذموم باتوں میں سے ہیں۔ جس چیز کو کتاب و سنت میں استقامت کہتے ہیں، درحقیقت وہ عملِ پیہم ہی کا دوسرا نام ہے۔ اس لیے کہ استقامت محض ثبات نہیں بلکہ عمل کے دوام کی کیفیت کو کہتے ہیں اور آیتِ استقامت میں جو بشارت ہے اس کے مستحق وہ بھی ہیں جو حسنِ عمل میں مداومت رکھتے ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلَائِكَةُ أَلَّا تَخَافُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَبْشِرُوا بِالْجَنَّةِ الَّتِي كُنتُمْ تُوعَدُونَ ۝ نَحْنُ أَوْلِيَاؤُكُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ ۚ (حٰم السجدہ ۔ ۳۰:۳۱)

Marfat.com

یعنی" جو لوگ اللہ کے رب ہونے پر ایمان لائے اور پھر انھوں نے استقامت دکھائی تو اُن پر اللہ کے فرشتے نازل ہوتے ہیں، یہ بشارت دیتے ہوئے کہ نہ خوف کرو، نہ غم گین ہو، اور اُس جنّت کی خوش خبری سنو کہ جس کا وعدہ تم سے اللہ نے کیا ہے کہ وہ دُنیا کی زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی تمھارا کارساز ہوگا۔"

یہ بشارت اور اس کے نتیجے میں حاصل ہونے والی زندگی عملِ پیہم ہی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اس بات کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح سمجھایا ہے۔ آپؐ کا ارشاد ہے:

اَحَبُّ الْاَعْمَالِ اِلَی اللّٰہِ اَدْوَمُھَا۔

یعنی" اللہ کو وہی اچھے کام محبوب ہیں جن پر پابندی سے اور تسلسل کے ساتھ عمل کیا جائے۔"

Marfat.com

إِنَّ الْإِنسَانَ لَفِي خُسْرٍ ۝ إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ

(العصر: ۲-۳)

انسان درحقیقت خسارے میں ہے، سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور نیک اعمال کرتے رہے۔

تہذیبی اقدار اور تقاضے

Marfat.com

اسلامی تہذیب کے بنیادی عناصر

اسلامی تہذیب اور اس کے بنیادی عناصر پر گفتگو کرنے سے پہلے مناسب اور ضروری ہے کہ قطعی طور پر تہذیب کے معنی و مفہوم کو سمجھ لیا جائے۔ تہذیب، ثقافت اور کلچر ہم معنی اور مترادف الفاظ کے طور پر استعمال ہو رہے ہیں۔ کلچر انگریزی لفظ ہے لیکن تہذیب و ثقافت کے معنی میں آج کل اردو میں بھی اس کا استعمال عام ہو گیا ہے۔ تہذیب کی مختلف تعریفیں کی جاتی ہیں۔ ہر صاحبِ قلم اور صاحبِ فکر، تہذیب کو مختلف انداز سے سمجھتا اور سمجھاتا ہے۔ ایک تعریف یہ کی گئی ہے کہ تہذیب کے معنی ذہنی نشوونما اور ارتقا کے ہیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ تہذیب کسی قوم کے مذاق، خیالات اور رہن سہن کا لب لباب ہے۔ کسی صاحبِ علم نے تہذیب کو خصائل، رسوم و رواج، معتقدات اور قوانین اور ان پر عمل درآمد کا ایسا مجموعہ قرار دیا ہے جن کی پابندی فرد یا افراد کا منظم گروہ یعنی معاشرہ کرتا ہے۔ کوئی صاحب لکھتے ہیں کہ کسی قوم کی ذہنی، اخلاقی، ادبی، معاشی اور سیاسی سرگرمیوں کے اس نتیجہ کو جو ایک مدتِ دراز کے تعامل سے پیدا ہوتا ہے اور ایک واضح شکل اختیار کرتا ہے، اس قوم کی تہذیب کہتے ہیں۔

غرض مختلف مفکرین نے تہذیب کے مفہوم کو اپنے اپنے انداز میں متعین اور واضح کرنے کی کوشش کی ہے لیکن یہ واقعہ ہے کہ تہذیب صرف کسی قوم کے علم و ادب، زبان، آرٹ، مصوری، اندازِ تمدن، طرزِ معیشت اور طریقِ سیاست کا نام نہیں ہے بلکہ تہذیب اس روح کا نام ہے جو کسی قوم کے ان تمام اعمال اور اطوار میں جاری و ساری ہوتی ہے اور اسی روح پر ان چیزوں کی اساس ہوتی ہے اور اسی روح سے مختلف قوموں کی تہذیبیں باہم ممتاز و ممیز ہوتی ہیں۔

تہذیب کی روح کا تعلق تصورِ حیات اور تصورِ انسان سے ہوتا ہے۔ اسی تصورِ حیات سے کسی قوم کی زبان، اس کے علوم و فنون، اس کی معاشرت، معیشت اور سیاست متاثر ہوتی ہے اور اس کی انفرادی و اجتماعی زندگی کا رخ متعین ہوتا ہے۔ اسی لیے بعض مفکرین نے تہذیب کو اجتماعی سیرت کا نام دیا ہے۔ جس طرح کسی آدمی کی ظاہری شکل و صورت اس کی سیرت کی عکاسی کرتی ہے اسی طرح کسی قوم کے ظاہری اعمال یا مظاہر اس کی سیرت یعنی تہذیب

Marfat.com

سے اثر پذیر ہوتے ہیں۔

میرے خیال میں اسلامی تہذیب کے بنیادی عناصر میں سب سے پہلا اور سب سے اہم عنصر ایمان ہے۔ خدا، خدا کی کتابوں، فرشتوں، خدا کے رسولوں اور آخرت پر ایمان۔ یہ ایمان ہی انسان کو اس کی صحیح حیثیت بتاتا ہے اور زندگی کا اصلی مقصد متعین کر کے ایک واضح تصورِ حیات دیتا ہے۔ اس ایمان کی روشنی میں انسان دوسرے انسانوں سے اپنے تعلق کو متعین و منضبط کرتا ہے۔ اس دنیا میں انسان کی حیثیت کیا ہے؟ وہ مختارِ مطلق ہے یا مجبورِ محض یا کسی حد تک مختار ہے اور کسی حد تک مجبور! اسلام انسان کو ایک متوازن تصور دیتا ہے۔ اگر انسان اس دنیا میں اپنے کو بالکل مختار سمجھنے لگے تو اس کو ظلم و جور، قتل و غارت اور فتنہ و فساد سے کون روکے گا۔ اسی طرح اگر وہ اپنے کو بالکل ہی حقیر و مجبور سمجھنے لگے تو پھر اس کے قوائے عمل بے کار ہو جائیں گے اور وہ ہر ایک کے آگے جھک کر یا اس کی پرستش کر کے اپنا شرف کھو دے گا اور تمدن کے گل بوٹے مرجھا جائیں گے۔ اسی لیے اسلام انسان کو ایک قادرِ مطلق ہستی کا نائب قرار دے کر اس کو انتہائی عظمت عطا کرتا ہے اور اسی کے ساتھ ہی اس کی آزادی اور خود مختاری کو محدود بھی کر دیتا ہے۔ اسلامی تہذیب کی ایک خصوصیت اس کی عالمگیری اور اس کی آفاقیت بھی ہے۔ یہ تہذیب کسی خاص علاقے یا کسی خاص زمانے کے لیے مخصوص نہیں ہے۔ یہ تمام انسانوں کے لیے ہے اور ہر زمانے کے لیے ہے۔

اسی خصوصیت سے انسانی مساوات کا تصور پیدا ہوتا ہے۔ تمام انسان آدم کی اولاد ہیں۔ تمام انسان مٹی سے بنائے گئے ہیں۔ ایک اعلا تہذیب کی علامت یہ ہوتی ہے کہ اس میں معاشرے کے ہر رکن کو، یعنی ہر انسان کو چاہے وہ کالا ہو یا گورا، غریب ہو یا امیر، ایک زبان بولتا ہو یا دوسری، ایک نسل سے تعلق رکھتا ہو یا دوسری سے، اِس خطے کا رہنے والا ہو یا اُس خطے کا، اپنی صلاحیتوں اور اپنی امنگوں کے مطابق مقام حاصل کرنے کے مواقع حاصل ہوں۔ کوئی فرد دوسرے فرد کا غلام نہ ہو۔ ہر فرد کو کمال حاصل کرنے اور درجۂ کمال تک پہنچنے کے پورے مواقع حاصل ہوں۔ ان مواقع کے باوجود وہ کمال حاصل کرنے میں پیچھے رہ جائے یا معاشی تگ و دو میں کوئی زیادہ بڑھ جائے اور کوئی کم بڑھے، تو یہ اس کی صلاحیت اور کوشش کا نتیجہ ہے۔ لیکن مواقع سب کو یکساں ملنے چاہئیں اور مواقع میں مساوات ہونی چاہیے۔ اسلامی تہذیب کا ایک عنصر معاشرتی مساوات بھی ہے۔ اسلامی معاشرہ میں سب کو یکساں آزادی اور سب کو مساوی حقوق حاصل ہوتے ہیں۔

علم کی قدر بھی اسلامی تہذیب کا ایک اہم عنصر ہے۔ قرآنِ حکیم کے نزول کا آغاز ہی لفظ اقرا

Marfat.com

سے ہوا۔ حضورؐ کا یہ ارشاد کہ مجھے معلّم بنا کر بھیجا گیا ہے، علم کی اہمیت کو واضح کرتا ہے۔ حضورؐ نے طالب علم کی روشنائی کو مجاہد کے خون سے زیادہ قیمتی فرما کر علم کو اسلامی تہذیب کا جزو لاینفک بنا دیا ہے۔

انسان کی تکریم بھی اسلامی تہذیب کے بنیادی عناصر میں سے ہے۔ قرآن کا ارشاد ہے:

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ ...... (الاسراء: ۷۰)

یعنی: "اور ہم نے آدم کو مکرم و محترم بنا دیا۔"

انسان چاہے کوئی عقیدہ رکھتا ہو اس کی جان کی حرمت اللہ تعالیٰ نے قائم فرما دی ہے۔ اسلامی حکومت کے فرائض میں سے ہے کہ وہ اپنے تمام شہریوں کی جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کرے۔ اخلاقی اصولوں کی برتری بھی اسلامی تہذیب کا جزو ہے اور بہت اہم جزو۔ اسلام میں فضیلت و برتری کا معیار نیکی اور تقویٰ ہے:

إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ (الحجرات: ۱۳)

یعنی: "تم میں سب سے زیادہ قابلِ عزت وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے۔"

جو جتنا نیک ہو گا وہ اتنا ہی معزز ہو گا اور احترام کے لائق۔ یہ معیارِ فضیلت قائم کر کے اسلام نے اخلاق کو معاشرے کی سب سے اعلا قدر کی حیثیت عطا کر دی ہے۔ اس تعلیم کی روشنی میں اخلاق سے عاری لوگ چاہے کتنے ہی مقتدر و موثر ہوں عزت و تکریم کے لائق نہیں ٹھہرتے۔ صاحبِ عزت بننا ہے تو تقویٰ پیدا کرو اور نیکی کی راہ پر چلو۔

عدل و انصاف کو اسلامی تہذیب کی جان کہا جا سکتا ہے۔ قرآن حکیم نے بار بار عدل کو اختیار کرنے کی ہدایت فرمائی ہے۔ جو سوسائٹی عدل کو اپنا شعار نہیں بناتی وہ استحکام و استحسان سے عاری رہتی ہے۔ عدل و انصاف کے نتیجے میں ایک طرف افراد اپنی صلاحیت اور محنت کا صلہ پاتے ہیں اور دوسری طرف معاشرے کو اپنی صلاحیتوں سے ثروت و ترقی عطا کرتے ہیں جس کا ثمر نہ صرف اس معاشرے کے تمام افراد کو ملتا ہے بلکہ پوری دنیا اس سے مستفید ہوتی ہے۔

مختصراً اسلامی تہذیب ایک ایسے متوازن نظامِ زندگی کو جنم دیتی ہے جس میں امن اور آزادی، ترقی اور خوش حالی کے چشمے اُبلتے ہیں۔

Marfat.com

اتحادِ اُمّت

اسلام ایک ایسا دین ہے کہ جو انسانی زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہے، جن میں عبادات کے ساتھ معاملات بھی شامل ہیں۔ دینِ اسلام کی ہمہ گیری کا تقاضا ہے کہ امت ایک وحدت کی حیثیت سے آپس میں متحد اور متفق رہے۔ اس کے علاوہ مسلمانوں کو اس بات کا حکم دیا گیا ہے کہ وہ خود اسلامی شریعت پر عمل کریں اور دوسروں کے سامنے بھی اسلام کی دعوت پیش کریں۔ ساتھ ہی آپس میں احتساب کا فرض بھی ادا کرتے رہیں۔ یعنی نیکیوں کا حکم دیں اور بُری باتوں سے لوگوں کو روکتے رہیں۔ یہ سب کچھ اسی وقت ممکن ہے کہ جب اُمّتِ مسلمہ آپس میں متحد رہے اور اتحاد کی برکت سے امت میں ایسی طاقت موجود ہو کہ اسلامی نظریہ حیات کے نفاذ میں اسے دقّت نہ ہو۔ مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ نے بہترین امت بنایا ہے اور اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ وہ معروف کا حکم دیتے ہیں اور منکر سے روکتے ہیں۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ اُسی وقت ادا ہو سکتا ہے کہ جب مسلمان بحیثیت ایک امت کے آپس میں اس طرح متحد ہوں کہ وہ دنیا میں ایک ناقابلِ تسخیر طاقت بن کر رہیں۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فتح و نصرت کو اجتماعی ایمان سے مشروط فرما دیا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَاَنۡتُمُ الۡاَعۡلَوۡنَ اِنۡ كُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِيۡنَ۝ (آلِ عمران: ۱۳۹)

یعنی: "تم ہی غالب رہو گے اگر تم سچّے مومن ہو۔"

گویا برتری اور غلبہ حاصل کرنا، جو انسان کی ایک فطری تمنا بھی کہی جا سکتی ہے، اسی وقت ممکن ہے جب ساری امتِ مسلمہ کے تمام افراد میں ایسا اتحاد قائم رہے جو انھیں ایک دوسرے سے مربوط رکھے، ایک دوسرے کا جاں نثار اور ہمدرد بنائے اور ایسی شیرازہ بندی قائم کر دے کہ بڑی سے بڑی طاقت بھی ان کی راہ میں رکاوٹ نہ بن سکے اور وہ کامیابی کے ساتھ دینِ اسلام کو تمام دوسرے طریقہ ہائے زندگی اور افکار و اعمال کے تمام نظاموں پر غالب کر سکیں۔ امتِ مسلمہ کو جو فرائض اور ذمہ داریاں تفویض کی گئی ہیں ان پر اس وقت تک عمل نہیں ہو سکتا جب تک پوری امت ایک ناقابلِ شکست وحدت کی طرح اور افرادِ امت باہم و گر شیر و شکر نہ ہوں۔

Marfat.com

اللہ تعالیٰ نے اس سلسلے میں جو حکم دیا اس میں فرمایا کہ:

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا (آل عمران: ۱۰۳)

یعنی: "تم سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی کے ساتھ پکڑے رہو اور افتراق و انتشار پیدا نہ ہونے دو۔"

اس اتحاد کی ضرورت اللہ تعالیٰ سے بہتر کون جانتا ہے۔ اس کے بغیر امت مسلمہ دنیا کی دوسری قوموں کی طرح نااتفاقی کا شکار ہو کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گی اور پھر قدرت کا منشا تشنۂ تکمیل رہ جائے گا۔ اللہ تعالیٰ کی مشیت ہے کہ مسلمان دنیا کی بہترین امت ہوں یا چھائی کا حکم دیں اور برائی سے روکیں، دینِ اسلام کا پیغام دنیا کے گوشے گوشے میں پہنچا دیں اور دینِ اسلام کو غالب بنانے کی کوشش کریں۔ یہ فرائض کم زور اور منتشر قوم ادا نہیں کر سکتی۔ اس منصب پر فائز قوم کو اتحاد و اتفاق کی عدیم النظیر مثال ہونا چاہیے۔ ایسا اتحاد کہ جو پوری امت کو ناقابلِ تسخیر بنا دے اور ان کے اقوال و افعال کی یکسانیت اور افکار و قلوب کی ہم آہنگی دوسری قوموں کے لیے نمونہ بن سکے۔ اسلام کوئی ایسا دین بھی نہیں ہے کہ جو زبردستی لوگوں پر تھوپا جا سکے۔ ایسا کرنے کی ہمارے دین میں اجازت نہیں ہے۔ لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قف (البقرہ: ۲۵۶) کہہ کر اسلام کو بزور قوت پھیلانے کا کام اللہ تعالیٰ نے ممنوع کر دیا ہے۔ بدیہی طور پر اسلام کا منشا یہ ہے کہ مسلمان خود اسلامی تعلیم کا نمونہ بن کر رہیں اور آپس میں اس طرح متحد ہو کر رہیں کہ دوسرے لوگ یہ محسوس کریں کہ مسلمان بحیثیت امت ایک منفرد اور قابلِ تقلید قوم ہیں۔ اسی لیے آں حضرت ﷺ نے ہدایت فرمائی کہ مسلمان آپس میں اس طرح ایک دوسرے سے منسلک رہیں جس طرح دیوار کی اینٹیں ایک دوسرے کو سہارا دیے رہتی ہیں اور یہ سب مل کر خود کو ایک مضبوط اور مستحکم دیوار کی حیثیت سے قائم رکھتی ہیں۔ مسلمان بھی آپس میں ایک دوسرے کے سہارا بن کر رہیں گے تو ایک ناقابلِ تسخیر امت کی حیثیت سے اس دنیا میں عزت اور اقتدار کے ساتھ زندہ رہیں گے۔ اس اتحادِ امت پر زور دیتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ سب مسلمان آپس میں بھائی ہیں۔ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ ..... (الحجرات: ۱۰) ان کا نفع مشترک اور ان کا نقصان ایک ہے، ان کی طاقت اُن کا اتحاد ہے۔ اُن کی برتری دنیا کی دوسری قوموں کے مقابلے میں اس لیے بھی ہوگی کہ مسلمان اُمت کی برتری اور فلاح کے لیے کوشش کرتا ہے اور اتحاد و اتفاق کو قائم رکھنے کے لیے بڑی سے بڑی انفرادی قربانی پیش کرتا ہے۔

اور حقیقت یہ ہے کہ یہ اتحادِ امت کا فیضان ہے کہ مسلمان دنیا کی سب سے زیادہ طاقتور

Marfat.com

اور کامیاب قوم تھے۔ اُن کی حیثیت ایک مضبوط و مستحکم دیوار کی تھی۔ مگر جیسے جیسے لوگ اینٹیں نکال نکال کر اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجدیں بنانے لگے ویسے ہی ویسے عزت و وقار کی دیوار کمزور ہو کر منہدم ہونے لگی۔ عالمِ اسلام میں آج ہم یہی دردناک منظر دیکھ رہے ہیں اور خود ہمارے پیارے وطن پاکستان میں کچھ ایسا ہی ہو رہا ہے۔ ہم نے احکامِ قرآنی کو نظر انداز کرنے کا گناہ کبیرہ کیا ہے اور ہم نے ہادیِ برحقؐ کی ہدایت سے صرفِ نظر کیا ہے۔ اس لیے پاکستان مفلوک الحال ہے اور ہر فردِ ملت پریشان ہے۔

حالات پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ شیرازہ بندیِ ملّت ضروری ہے، یک جہتی لازمی ہے، فکری ہم آہنگی ہماری احتیاج ہے اور حاجت ہے۔ اسلام انسان کو سبق سکھاتا ہے کہ ایثار کرو اور ہمدردی برتو اور دوسروں کے لیے خود کو بھول جاؤ، ذاتی مفادات کو نظر انداز کر دو۔ مگر جب بھی یہ اعلا اخلاقی اقدار کمزور ہوتی ہیں جماعت کا شیرازہ بکھرتے دیر نہیں لگتی۔ اگر کسی امت کے افراد خود غرضی پر کمر باندھ لیں اور دوسروں کے مقابلے میں خود کو اور اپنے مفادات کو زیادہ اہمیت دینے لگیں، ان کی نظروں میں اپنی ضروریات اوروں کی حاجات پر تقدم حاصل کر لیں تو پھر ایسی امت داخلی لوٹ پھوٹ کا شکار ہو کر رہ جاتی ہے، اور اس کی ہیئت اجتماعی میں شگاف پڑنے لگتے ہیں۔ ہم اپنی جس بدحالی پر آج پریشان ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے ملّت کے جسم کو اپنی خود غرضیوں اور ذاتی مفاد پرستیوں سے کمزور کیا ہے اور نقصان پہنچایا ہے۔ ہم مسلمانوں کا انفرادی وجود درحقیقت ہمارے ملّی وجود کا پر تو اور اس کا سایہ ہے۔ جب ہماری ان حرکتوں سے ہمارے سروں پر سایہ کرنے والا یہ وجود کمزور ہو گیا تو ہم کیسے خوش حال رہ سکتے ہیں۔ اگر ہمیں بحیثیت فرد کے ترقی کرنی ہے تو ہمیں اپنے اندر اور اپنی صفوں میں وہ اتحاد و اتفاق پیدا کرنا ہو گا جس کا ہمارے خالق نے حکم دیا ہے۔ اور جس کی طرف آنے کی دعوت ہمیں ہمارا قرآن دیتا ہے اور جس کی سمت چلنے اور بڑھنے کی ہدایت ہمیں ہمارے رسول صلّی اللہ علیہ وسلّم نے دی ہے۔ میں برادرانِ ملت سے یہ سب کچھ کہہ رہا ہوں اور میرے کانوں میں یہ قرآنی دعوت اور یہ ربّانی پکار گونج رہی ہے کہ:

وَاِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُوْنِ ۝ (المومنون: ۵۲)

میں بارگاہِ الٰہی میں دستِ دعا دراز کرتا ہوں کہ یہ حیات افزا صدائے ربانی آپ کے کانوں سے گزر کر آپ کے قلوب تک پہنچ جائے اور ہم بہ حیثیت امتِ مسلمہ اتحاد بین المسلمین کی جدوجہد کریں۔ یاد رکھیے ہماری فلاح اتحاد و اتفاق ہی میں ہے۔

Marfat.com

تعاون علی الخیر

خالقِ کائنات اپنے بندوں سے بے پناہ محبت کرتا ہے اور اسی لیے وہ چاہتا ہے کہ تمام انسان اپنے معبود کی اطاعت کریں اور آپس میں شیر و شکر ہو کر رہیں تاکہ کرۂ ارض امن و امان اور سکون و اطمینان کا گہوارہ بنا رہے اور تمام مخلوقات چین کی زندگی بسر کرے۔

امن و سکون کی سب سے بڑی نشانی یہ ہے کہ تمام لوگ ایک ایک دوسرے سے محبت کریں، ایک دوسرے کے ساتھ ہمدردی اور مساوات کا سلوک کریں، ایک دوسرے کا ہاتھ بٹائیں، ایک دوسرے کے دکھ درد میں کام آئیں۔ اس نکتے کو ایک شعر میں کیسی اچھی طرح واضح کیا گیا ہے:

درد دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو ورنہ طاعت کے لیے کچھ کم نہ تھے کروبیاں

اب سوال یہ ہوتا ہے کہ کیا ہر معاملے میں انسان بلا امتیاز ایک دوسرے کا ہاتھ بٹائے؟ اسلامی شریعت اس قسم کے بے مقصد اور ضرر رساں تعاون کی قائل نہیں ہے۔ اسلام انسانوں کو حکم دیتا ہے کہ پُرسکون معاشرہ قائم کرنے کے لیے صرف خیر، نیکی اور بھلائی کے کاموں میں ہی تعاون اور اشتراکِ عمل ضروری ہے۔ بُرے کاموں میں اللہ کی معصیت میں اور ابنائے جنس کو نقصان پہنچانے میں ہرگز تعاون نہ کیا جائے یعنی تعاون اور اشتراک، خیر اور حُسنِ عمل کی بنیاد پر ہونا چاہیے۔ بُرے کاموں میں کسی کی معاونت صرف گناہ ہی نہیں ہے بلکہ نیکیوں کے ساتھ ظلم و زیادتی ہے اس لیے کہ بُرائیوں کی حوصلہ افزائی سے نیکی مقہور و مغلوب ہوتی ہے اور انسان دوسرے گناہ کا مرتکب ہوتا ہے۔ اس کی مثال اس ترقی یافتہ دور میں بھی ملتی ہے اور قدیم زمانے میں بھی قدم قدم پر اس کا نمونہ نظر آتا تھا۔

قدیم دور میں زیادہ تر جنگیں اور خوں ریزیاں اسی وجہ سے ہوتی تھیں کہ تعاون کے لیے خیر کی شرط کا فقدان تھا۔ کسی قبیلے کے ایک شخص نے کوئی کام کیا اور اس نے قبیلہ والوں کو آواز دی تو بلا امتیاز خیر و شر اس قبیلے کے تمام افراد کے لیے ضروری ہوتا تھا کہ اس کی مدد کو آگے بڑھیں۔ آج بھی قبیلی و جغرافیائی حدود کی بنیاد پر بڑی بڑی زیادتیاں اور ناانصافیاں کی جا رہی ہیں۔ اسلام اس قسم کی عصبیت کا نہ صرف مخالف ہے بلکہ اس کو صفت جاہلیت سے تعبیر کرتا ہے چنانچہ

Marfat.com

قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے واشگاف الفاظ میں فرمایا کہ تقویٰ اور نیکی کے کاموں میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرو، گناہ اور سرکشی کے کاموں میں ہرگز تعاون نہ کرو۔ اس طرح اسلام نے تمام حق پرست انسانوں کو تعاون کا پیمانہ عطا کر دیا اور یہ بتا دیا کہ نیکی اور خیر میں تعاون رضائے الٰہی کا وسیلہ ہے اور فطرتِ الٰہی کے عین مطابق ہے۔ اس کے مقابلے میں شر اور برائی میں تعاون اللہ کی ناراضگی اور فطرتِ الٰہی کی بدترین خلاف ورزی ہے۔

آں حضرتؐ کا یہ بہت ہی مشہور فرمان ہے کہ اپنے بھائیوں کی مدد کرو، خواہ وہ ظالم ہوں یا مظلوم۔ اصحابہ کرامؓ نے حیرت کے ساتھ دریافت کیا کہ مظلوموں کی حمایت کی بات تو سمجھ میں آگئی، لیکن ظالم کی حمایت...... جملہ پورا نہ ہوا تھا کہ آں حضرتؐ نے فرمایا کہ ظالموں کی حمایت یہ ہے کہ انھیں ظلم سے روکا جائے۔ نصرت اور اعانت کا یہی مطلب ہے کہ ظلم سے باز رکھا جائے جو عتابِ الٰہی اور عذابِ جہنم سے بچانے کا موجب ہوگا۔ اس سے بڑھ کر کسی کے ساتھ تعاون کیا ہو سکتا ہے کہ اس کی عاقبت سنوار دی جائے۔

تعاون علی الخیر ہر حال میں ضروری ہے۔ ظالم اگر اپنا بھائی بھی ہو تو بھی اس کے ظلم کی حمایت اسلامی شریعت میں جائز نہیں ہے۔ اس لیے کہ اسلام میں تعاون کی شرط خیر کے ساتھ وابستہ ہے۔ اگر کوئی آدمی اسکول اور مدرسہ قائم کرتا ہے، ہسپتال بناتا ہے، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے کاموں میں لگا رہتا ہے تو مسلمانوں پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ اپنے ان بھائیوں کی اُن کے اچھے کاموں میں امداد کریں۔ اس کے برخلاف اسمگلنگ، بلیک مارکیٹنگ، ملاوٹ، چور بازاری، فریب، رشوت ستانی وغیرہ میں ہرگز تعاون نہ کیا جائے۔ چور، ضمیر فروش مجرم اور بے ایمان کے ساتھ تعاون کا مطلب ان کے گناہوں میں شریک ہونا ہے۔ اسی لیے فرمایا کہ سُود لینے والے سود دینے والے اور اس آلودگی میں بالواسطہ ملوث ہونے والے سب گنہگار ہیں۔ ان غیر اسلامی کاموں میں اشتراکِ عمل اسلامی تعلیم کے منافی ہے اور اس سے مُعاشرے کو سخت نقصان پہنچنے کا احتمال ہے۔

اس لیے مسلمانوں کا فرض ہے کہ تعاون صرف اچھے کاموں میں کریں۔ اس نقطۂ نظر سے یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ جو لوگ زکوٰۃ اور صدقات اور امداد کی رقوم یتیم خانوں، درس گاہوں اور دوسرے خیر کے کاموں میں لگانے کے بجائے پیشہ ور سائلوں کو دیتے ہیں کیا وہ تعاون علی الخیر کر رہے ہیں یا پیشہ ورانہ گداگری کو فروغ دے رہے ہیں؟ یہ بات اصولی طور پر یاد رکھنے کی ہے کہ بُرے کام میں ہرگز تعاون نہیں کرنا ہے بلکہ ان کی حوصلہ شکنی کرنی چاہیے تاکہ مفاسد

Marfat.com

کا قلع قمع ہوسکے۔

افراد ہی کے مجموعے کا نام مُعاشرہ ہے۔ اِسی لیے تمام افراد کی خوشی اور خوش حالی اس بات پر منحصر ہے کہ افراد خوش اخلاق ہوں، ایک دوسرے کے ساتھ اچھے کاموں میں اشتراکِ عمل کریں اور حتی الامکان بُرے کاموں سے بچنے کی تلقین کرتے رہیں۔ جب ایسا ہوگا تو قدرتی طور پر مُعاشرہ اچھے لوگوں کا مجموعہ ہوگا اور تمام افراد نیکی اور خیر کی کوشش کرتے رہیں گے۔

اس حقیقت کے پیشِ نظر معاشرے کے ہر فرد کا یہ بنیادی فرض ہے کہ اچھے کاموں میں ہاتھ بٹائے اور خیر کی تلقین کرتا رہے۔ ہمارے مُعاشرے میں ابھی اس قسم کے امتیاز کی بڑی کمی ہے۔ مثلاً اسمگلر جو ملک اور قوم کا دشمن ہوتا ہے عام طور پر دولت مند ہونے کی وجہ سے بُرائیوں میں ملوث رہتا ہے اور عوام بالواسطہ اس کے ساتھ تعاون کرتے ہیں یعنی دیدہ و دانستہ اس بدترین عیب سے اغماض کرتے ہیں۔ اس طرح پورے مُعاشرے کو اور اپنی ذات کو نقصان پہنچانے کا سبب بنتے ہیں۔

عام طور پر یہ شکایت سنی جاتی ہے کہ بعض افراد چور بازاری کرتے ہیں قیمتوں میں من مانا اضافہ کرتے رہتے ہیں، کھانے کی چیزوں میں بھی ملاوٹ سے باز نہیں آتے اور انتہا یہ ہے کہ محافظ حیات ادویہ بھی ان کی بدولت ملاوٹ سے محفوظ نہیں اور سب بُرائیاں اس لیے پروان چڑھتی رہتی ہیں کہ ہم ان سے غفلت برتتے ہیں ہم جرائم پیشہ لوگوں کی نشان دہی نہیں کرتے، حکام کو بروقت اطلاع نہیں دیتے، بلکہ ان جرائم پیشہ لوگوں کے ساتھ اکرام و محبت کا سلوک کرتے ہیں۔ یعنی ایک جانب تو ہم مجرموں کو متنبہ نہیں کرتے اور اُن کے استیصال کے لیے حکومت وقت کا ہاتھ نہیں بٹاتے اور دوسری جانب انھیں مُعاشرے میں عزت اور شرافت کا مقام دیتے ہیں اور اُن کی ایسی اشیا خرید کر بُرائی کی سرپرستی کا سنگین جرم کرتے ہیں۔

اسلامی شریعت کے احکام اس مُعاملے میں بالکل واضح ہیں۔ تعاون صرف خیر میں ہونا چاہیے اور ہمیں اللہ تعالیٰ سے دُعا کرنی چاہیے کہ تمام افرادِ مُعاشرہ کو وہ توفیق عطا فرمائے کہ وہ اپنی ذمہ داریوں کو سمجھیں۔ اگر ایسا ہوا تو معاشرے سے بُرائیوں کا بہت جلد خاتمہ ہوسکتا ہے۔ پاکستان ایک اسلامی مُعاشرہ بنانے کی جدوجہد میں لگا ہوا ہے اس لیے ہماری سب کی ذمہ داری اس خیر کے ساتھ تعاون ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ایسا مُعاشرہ بنانے کی ہدایت کرے جو ہر قسم کے ذمائم سے پاک ہو۔

Marfat.com

امن

رُوئے زمین پر استقرار کے بعد نوعِ انسانی کا سب سے بڑا مسئلہ امن و سلامتی کو یقینی بنانا ہے، لیکن جس طرح فرشِ زمین پر انسانوں کی بود و باش کو اللہ تعالیٰ ہی نے آسان بنایا اُسی طرح انسانی مُعاشرے کو خوف و ہراس سے پاک کرکے پُر امن زندگی گزارنے کی ہدایت بھی اُسی کی بارگاہ سے نصیب ہوئی۔ اگر مُعاشرے سے امن کی صورت ختم ہو جائے اور فساد اس کی جگہ لے لے تو انسان کو انفرادی یا اجتماعی کسی فرض کی ادائی کا موقع نہیں مل سکتا، اس لیے امن کو بھی اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنی نعمت قرار دیا ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے:

فَلْيَعْبُدُوا رَبَّ هٰذَا الْبَيْتِ ۝ الَّذِيْٓ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ ۝ وَّاٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ ۝ (قریش ۔ ۳، ۴)

یعنی "ان پر اس گھر کے رب کی عبادت لازم ہے جس نے انھیں بھوک میں رزق دیا اور خوف سے امان دی"۔

اگر پروردگارِ عالم کے اس ارشاد پر غور و تعمق کی نظر ڈالی جائے تو یہ بات بہ آسانی معلوم ہو جائے گی کہ امن کی اہمیت کیا ہے اور کیوں ہے۔ اسی آیت میں اس نعمتِ خداوندی کے ضمن میں اُن ثمرات کا تذکرہ بھی کر دیا گیا ہے جو امن ہی سے متعلق ہیں یعنی جب حالتِ امن باقی نہیں تھی تو تم ربُّ البیت کی حقیقی بندگی سے قاصر تھے، تمھارے لیے معاش و کفاف کا حصول بھی دشوار تھا، کیوں کہ معاشی جدّوجہد ـــــ حرکت، محنت، بے خطر سفر اور امن و سلامتی کو یقینی بنائے بغیر ناممکن ہے اور جب معیشت کا دائرہ تنگ ہو جائے گا، قُوتِ لایمُوت حاصل کرنے کی بھی کوئی صورت باقی نہیں رہ جائے گی تو زندگی موت سے بدل جائے گی۔ اللہ کی زمین پر استقرار کی نعمت کی اصل معنویت ختم ہو جائے گی۔ اس لیے زندگی کے پہلے سانس کے ساتھ ساتھ گہوارۂ امن ضروری ہے ورنہ حیات کے وسیع تر تقاضوں کی تکمیل نہ ہو سکے گی۔

دنیا میں اسی امن کو یقینی بنانے کے لیے اور فتنہ و فساد، جنگ و جدال، باہمی خوں ریزی اور معرکہ آرائی، تشدّد اور جبر و استبداد، ظلم، دھونس، دھمکی اور انسانوں پر انسانوں کی خُدائی کو

Marfat.com

ختم کرنے کے لیے ہی انبیائے کرام علیہم السّلام کی بعثت ہوتی رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے وہ جو پیام لے کر آتے رہے ہیں اور جو دعوت پیش کرتے رہے ہیں، اس دعوت کا نام ہی ایمان ہے۔ بلاشبہ اس لفظ کے متعدد ماٰخذ کی طرف مفسّرین نے اشارے کیے ہیں، مگر جمہور کو اتفاق ہے کہ ایمان کی اصل امن ہی ہے۔ ایمان، امن اس لیے ہے کہ ایک آدمی اللہ اور رسول پر اپنے پختہ یقین کا اظہار کر کے آخرت کے عذاب سے مامون ہوتا ہے، اور دُنیا میں بھی انتشار و فساد کو خلافِ ایمان سمجھ کر تشدّد، خوں ریزی اور جنگ و جدال سے دور رہتا ہے اور جب مُعاشرہ اللہ پر یقین، انبیا اور کتبِ آسمانی پر اذعان وعمل کے ستونوں پر قائم ہو جاتا ہے تو زمین سے فساد کا مکمل ازالہ ہو جاتا ہے اور اس فرشِ خاکی پر حیات صرف ایک نعمت ہی نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی عظیم الشان نعمت معلوم ہونے لگتی ہے۔

قرآنِ پاک میں انسانوں کے ایسے سارے اقدامات کی مذمّت کی گئی ہے جن سے امن کو خطرہ ہو اور فساد پھیلے۔ اس آیتِ قرآنی پر غور فرمائیے:

وَمِنَ النَّاسِ مَن يُعْجِبُكَ قَوْلُهُ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰى مَا فِي قَلْبِهٖ ۙ وَهُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ ○ وَاِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِي الْاَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيْهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ ؕ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ ○ (البقرہ: ۲۰۴-۲۰۵)

یعنی "اور بعض ایسے لوگ بھی ہیں جن کی بات دنیا کی زندگی میں آپ کو بھلی معلوم ہوتی ہے اور وہ اپنے دل کی باتوں پر اللہ کو گواہ بناتے ہیں، حال آنکہ وہ سخت جھگڑالو ہوتے ہیں اور جب پیٹھ پھیر کر جاتے ہیں تو ملک میں فساد پیدا کرتے ہیں، کھیتی اور نسل کو برباد کرتے ہیں، اور اللہ فساد کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔"

اِس آیت سے یہ بات تو بہت نمایاں ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک فساد کیا ہے۔ متعدد آیات میں خوں ریزی، جدال اور ظلم کا تذکرہ ہے اور اِس کے ساتھ ساتھ یہ بھی کہ عناد و خصومت میں کھیتوں کو جلا دینا، نسلِ انسانی کو ہلاک کر دینا بھی فساد ہے اور اللہ تعالیٰ فساد کو ہرگز پسند نہیں کرتا۔

سوال اس کا نہیں ہے کہ کوئی ایسا کیوں کرتا ہے؟ بلکہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ فی نفسہٖ یہ کام کیسا ہے؟ اور اسے کس چیز سے تعبیر کیا جا سکتا ہے؟ املاک کی تباہی کی کوشش، خرمنوں میں آتش زنی کی کوشش، قطعِ طریق کی کوشش، مال و دولت لوٹنے کی کوشش، انسانوں کی جانوں کے اتلاف کی کوشش، پھلوں سے لدے ہوتے باغات کو تاراج کرنے کی

Marfat.com

کوشش، بھرے بازاروں کو سنسان و ویران کرنے کی کوشش، انسانی آبادیوں کو ویران کرنے کی کوشش کو شاید نہیں بلکہ یقیناً مذہب اور انسانیت نے فتنہ و فساد ہی کہا ہے اور اسے بربادیٔ امن سے تعبیر کیا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ قوم جو اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان لا کر دنیا میں قیامِ امن کی پوری پوری ذمے داری قبول کر لیتی ہے، اس کا کیا طرزِ عمل ہونا چاہیے؟ یہ تو نا ممکن ہے کہ کبھی کوئی تصادم نہ ہو، یہ بات بھی بالکل منطقی ہے کہ کبھی کبھی کوئی اختلاف ہو جائے، لیکن یہ واضح رہے کہ اختلاف الگ چیز ہے اور نقضِ امن الگ چیز ہے۔ ان دونوں کی حدود مقرر ہیں۔ اختلاف اگر فتنہ و فساد، تشدد اور تباہیٔ املاک کی راہ اختیار کر لے تو ایمان والا امن کی حدود سے دُور جا نکلتا ہے اور اس کے ایک اہم جُز سے محروم ہو جاتا ہے۔ وہ مسلمان ہوتے ہوئے بھی مفسدوں کے گروہ میں شمار کیا جاتا ہے۔ بلاشبہ تصادم کا ایک موقع وہ بھی آتا ہے جب اسلام اور کفر آمنے سامنے ہوتے ہیں۔ پھر تو سر دھڑ کی بازی لگا دی جاتی ہے۔ اس لیے کہ اہلِ اسلام وسیع تر امن کے قیام کے لیے ایسا کرتے ہیں اور اہلِ کفر دُنیا میں باطل کے غلبے کے لیے کرتے ہیں جو سراسر فتنہ و فساد ہے۔

تاہم تاریخ شاہد ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ سے امکانی طور پر احتراز ہی فرمایا اور صلح کو ترجیح دی۔ گفت و شنید اور مذاکرات کا طریقہ اختیار فرمایا۔ امن و صلح کے لیے اپنے جاں نثاروں کی صفوں کو مقامِ حُدیبیہ پر پیچھے ہٹا لینے میں بھی تامّل نہیں فرمایا۔ قرآنِ پاک کا تو حکم یہ بھی ہے کہ لڑتے لڑتے اگر مقابل صلح کی درخواست پیش کر دیں تو اُن سے جنگ نہ کرو:

فَاِنِ اعْتَزَلُوْكُمْ فَلَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ وَاَلْقَوْا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ ۙ فَمَا جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيْلًا ۝ (النساء - ۹۰)

یعنی "اگر وہ لڑائی کرتے کرتے اس سے گریز کریں، تم سے نہ لڑیں، اور تمھیں صلح پیش کریں تو پھر اللہ تمھیں ان سے لڑنے کی اجازت نہیں دیتا۔"

یہ حکم بھی ہے کہ:

وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۭ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝
وَاِنْ يُّرِيْدُوْٓا اَنْ يَّخْدَعُوْكَ فَاِنَّ حَسْبَكَ اللّٰهُ ۭ (الانفال - ۶۱)

یعنی "اگر دشمن صلح و سلامتی کا ہاتھ پھیلائے تو تم بھی اپنا ہاتھ آگے کر دو اور اللہ پر توکل کرو کہ وہ سمیع و علیم ہے۔ اگر وہ تم سے دھوکا کرنا چاہیں تو جان لو کہ اللہ تمھارے لیے کافی ہے۔"

اس سے یہ صاف ظاہر ہے کہ امن و سلامتی جنگ و جدال پر اس درجہ مقدم ہے کہ اس

Marfat.com

خدشے کے باوجود کہ دشمن کا مقصود فریب دہی ہو، تم اپنی طرف سے صلح کی پیش کش کو نہ ٹھکراؤ۔ اسلام نے جانوں کے تحفظ کا حکم دیا ہے، مال و املاک کے تحفظ کا حکم دیا ہے، تشدد اور بلا وجہ طاقت کے مظاہرے کو ناپسند کیا ہے۔

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم بہ زورِ شمشیر مکہ بہت پہلے فتح کر سکتے تھے، لیکن آپ اپنی طرف سے پیش قدمی نہیں کرنا چاہتے تھے، اور فتح مکہ کے بعد تاریخ نے یہ دیکھا کہ مکہ مکرمہ کی سرزمین واقعی امن کا گہوارہ بن گئی، اور یہ عظیم الشان فتح کسی خوں ریزی یا انتقامی کارروائی سے یکسر پاک تھی۔

امن کی یہ اہمیت تو اُس صورت میں بھی باقی رہی کہ جب کفر و اسلام کی معرکہ آرائی ہوتی تاکہ دنیا جان لے کہ جسے ایمان کہتے ہیں وہ اپنے نتیجے کے اعتبار سے امن ہی امن ہے اور اہلِ ایمان کا وجود دنیا کے لیے پیامِ امن ہے۔ اس لیے آپؐ نے فتح مکہ کے بعد اعلان فرمایا کہ "اَلْیَوْمَ یَوْمُ بِرٍّ وَّ وَفَاءٍ" یعنی "آج نیکی اور ایفائے عہد کا دن ہے۔" جب معاندینِ اسلام کے مقابلے میں اہلِ ایمان کے لیے یہ اسوۂ نبوی، اور قرآنی تعلیمات موجود ہیں تو پھر باہمی اختلاف کی صورت میں جنگ و جدال اور فتنہ و فساد اسلام کی نظر میں کس قدر مذموم ہوگا اس کا اندازہ کرنا کچھ دشوار نہیں ہے۔

حق یہ ہے کہ اہلِ ایمان نے قیامِ امن کو اپنی اہم ترین ذمہ داری سمجھتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی اس سرزمین کو فتنہ و فساد سے پاک رکھنے کی ایسی کام یاب کوشش کی ہے جس کی مثال نہیں مل سکتی۔ دنیا کے گوشے گوشے میں انھوں نے امن و سلامتی کی فضا پیدا کی۔ کیا تاریخ اس حقیقت کو جھٹلا سکتی ہے کہ کاروانِ اسلام کو ہر دور میں امن کی علامت سمجھا گیا۔ انھوں نے انسانی معاشرے سے بدامنی کو دور کر کے سلامتی اور تحفظ کے تاریخ ساز عہد کا آغاز کیا، اس لیے کہ امتِ مسلمہ امن و عدل ہی کے قیام کے لیے وجود میں آئی ہے، اور اللہ کے رسولؐ پر یقین رکھنے والے کو امن پسندی اور امن آفرینی ہی کی وجہ سے مومن کہا گیا ہے۔

آج اگر امنِ عامہ کو اُس کے کسی اقدام سے نقصان پہنچتا ہے تو اُسے اپنا احتساب کرنا چاہیے کہ کیا وہ مومن ہوتے ہوئے جو کچھ کر رہا ہے اس کا تعلق ایمان سے ہے؟ اگر اس کا وجود امن کی ضمانت ہے تو پھر امن شکنی کا کیا جواز ہے؟ کیا یہ کہنا غلط ہوگا کہ ایسا مسلمان اپنی زندگی کی صحیح راہ و منزل سے دور ہو گیا ہے اور ایمان و امن کے تعلق کو فراموش کر بیٹھا ہے؟

Marfat.com

زندگی برتنے کی اسلامی تعلیم

زندگی محض زندہ رہنے کا نام نہیں ہے۔ زندگی فقط جسم کے برقرار رہنے کو بھی نہیں کہتے اور نہ زندگی اس لیے ہے کہ جسمانی تقاضوں کی نفی کی جائے۔ جسمانی زندگی ایک حقیقت ہے۔ زندہ رہنے کے لیے جسم کا باقی رہنا اور اس میں تاب و توانائی کا برقرار رہنا بھی ضروری ہے۔ یہ تصوّر کر لینا کہ جسم کا خیال رکھنا اور جسمانی تقاضوں کی تکمیل کرنا رُوحانی تقاضوں کے خلاف ہے یا اس سے رُوحانی مرتبہ گھٹ جاتا ہے، غلط اور راہبانہ تصوّر ہے۔ ظاہر ہے کہ ترکِ دنیا اور رہبانیت کو دنیا کا کوئی نظامِ حیات پسند نہیں کرتا۔ خود نظامِ حیات کے الفاظ ہی ظاہر کرتے ہیں کہ اہمیت زندگی کی ہے۔ زندگی کی نفی اگر مقصود ہو تو اس کے لیے کسی تنظیم، کسی نظام کی ضرورت نہیں۔

اسلام تو ایک زندہ دین ہے، زندگی کا مذہب ہے۔ ایک مکمل اور بھرپور نظامِ حیات ہے۔ حیات کے تمام گوشوں کو اپنے میں سمیٹے ہوئے، سموئے ہوئے اور سمائے ہوئے، اسلام ایک ایسا متوازن اور جامع فلسفۂ حیات انسان کو دیتا ہے جو اُس کی مادّی اور رُوحانی زندگی کو توانائیوں اور مسرّتوں سے مالا مال کر دیتا ہے۔ صاف فرمایا گیا ہے کہ اسلام میں رہبانیت نہیں ہے۔

اسلام رہبانیت اور ترکِ دُنیا کی تعلیم نہیں دیتا بلکہ وہ مثبت طور پر زندگی کو اس کی تمام نعمتوں، برکتوں، لطافتوں اور رعنائیوں کے ساتھ برتنے کی تعلیم دیتا ہے۔ فرمایا گیا ہے کہ زمین اور آسمان میں جو کچھ ہے وہ انسان کے لیے مسخّر کر دیا گیا ہے۔

زمین و آسمان میں جو کچھ ہے اللہ ہی نے پیدا کیا ہے اور انسان کی بھلائی اور فائدے کے لیے پیدا کیا ہے کہ وہ اس سے تمتّع حاصل کرے اور دنیا کا انتظام خوش اسلوبی اور حسنِ اہتمام کے ساتھ چلائے۔ انسان زمین پر اللہ کا خلیفہ اور نائب ہے۔ نائب کی حیثیت سے دنیا کے نظم و نسق کو صحیح بنیادوں پر استوار کرنے کی ذمّہ داری انسان پر عائد ہوتی ہے۔ اس مقصد کے لیے اللہ کے نیک بندوں کو اگر ترکِ دنیا پر مجبور کر دیا جائے یا وہ خود دنیاوی معاملات کو رُوحانی زندگی سے متصادم سمجھ کر گوشۂ عافیت میں بیٹھ جائیں یا پہاڑوں یا جنگلوں میں پناہ لینا چاہیں تو ظاہر ہے دنیا کا نظام فاسق و فاجر لوگوں کے ہاتھ میں آجائے گا اور وہ خلقِ خدا کی

Marfat.com

[illegible]

اسلام نے انسانی زندگی کا مقصد [illegible] قرار دیا ہے [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

اللہ تعالیٰ نے انسان کو زندگی اس لیے عطا نہیں کی ہے کہ وہ اس کی قدر نہ کرے اور اسے حقیر [illegible] سمجھے [illegible] بلکہ زندگی کا مقصد یہ ہے کہ آدمی اللہ تعالیٰ کے الطاف سے بہرہ ور ہو اور دوسری طرف زندگی کو حسن و خوبی سے آراستہ کرے۔ زندگی کو برتے اور حیاتِ ابدی حاصل کرے۔ دنیا کو چھوڑ کر قسمت کی نعمتوں کو ٹھکرانا خدا کے منشا کا تقاضا نہیں ہے۔

اگر ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات اور تعلیمات پر غور کریں اور آپ کے اسوۂ حسنہ کو پیشِ نظر رکھیں تو ہم دیکھیں گے کہ حضور نے زندگی کو بھرپور انداز میں برتا ہے۔ آپ نے کسبِ معاش کے لیے جدوجہد بھی فرمائی، رشتۂ مناکحت بھی استوار کیا، جنگ وجہاد میں بھی شرکت فرمائی، امن وصلح کے معاہدے بھی کیے، نظمِ مملکت بھی قائم فرمایا، بیت المال بھی منظم فرمایا۔ غرض دنیا کے تمام معاملات میں حصہ لیا اور زندگی کے ہر شعبے میں اعلیٰ معیارات قائم کیے۔ اسی طرح صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی پاک زندگیاں اس کی گواہ ہیں کہ انھوں نے دنیا کو چھوڑ کر رُوحانیت کے اعلیٰ مراتب

Marfat.com

حاصل نہیں کیے بلکہ دنیا میں رہ کر دنیا کو برت کر پاکیزہ زندگی گزاری اور زندگی کے حسن میں اضافہ کیا اور دنیا کے ساتھ ساتھ روحانی مراتب حاصل کیے۔

خود قرآن حکیم نے سرکار دو عالم کو ہدایت کی کہ آپ لوگوں کو بتا دیں کہ میں بھی تمھاری ہی طرح کا انسان ہوں۔ اس ہدایت سے یہ نکتہ پوری طرح واضح ہو جاتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک انسان ہی تھے اور بشری تقاضوں سے ماورا نہ تھے۔ آپ بیٹے بھی تھے اور باپ بھی، آپ داماد بھی تھے اور خسر بھی، آپ تاجر بھی تھے اور خریدار بھی، آپ حاکم بھی تھے اور قائد بھی، آپ مجاہد بھی تھے اور امن کے پیامی بھی، آپ مدبر بھی تھے اور معاہد بھی۔

ہم اس دنیا میں کیوں بھیجے گئے، اس دنیا میں ہمارے فرائض کیا ہیں اور اس دنیا کے بعد بہر حال ایک دوسری دنیا میں جانا ہے۔ اگر ہر انسان کے دل و دماغ میں یہ حقیقت واضح ہو تو زندگی برتنے کا اسلوب بھی اُسے آجاتا ہے۔ اس موقع پر یہ سوال ضرور ذہن میں آتا ہے کہ پاکستان میں من حیث المجموع ہم کیسی اور کون سی زندگی گزار رہے ہیں؟ کیا یہ زندگی انسانی اور اسلامی ہے؟ کیا ہماری زندگی کے لمحات رضائے الٰہی اور منشائے ربانی کی جستجو میں گزرتے ہیں؟ ہادیٔ برحق جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو ہدایت دی اور جو راستہ دکھایا کیا ہم اس پر چل رہے ہیں؟

پاکستان کے ہر مسلمان کو اپنی زندگی کا جائزہ لینا چاہیے؟ اگر اس کا ضمیر اس کی گواہی دے کہ اس کی زندگی مقاصد سے خالی اور منشائے ایزدی سے عاری ہے تو اسے بڑی سنجیدگی کے ساتھ اپنے حال پر غور کرنا چاہیے اور ایک انقلاب کی فکر کرنی چاہیے۔

باور کرنا چاہیے کہ پاکستان میں ہر مسلمان نے اگر اپنی زندگی اسلام کی روشنی میں نہ گزاری تو اس نے مقررہ اور تسلیم کردہ راہ سے فرار حاصل کیا ہے اور قرآن و حدیث سے یہ فرار اور بُعد اس کو مقام عزّ و شرف سے محروم کر دے گا۔

آیئے ہم اپنا عہد پورا کریں اور پاکستان میں اپنی زندگی کو اسلام کے ڈھانچے میں ڈھال کر سربلندی اور سرفرازی حاصل کریں۔ اللہ تعالیٰ ہمارا حامی و ناصر ہو۔ آمین۔

Marfat.com

شرفِ انسانی

اس صفحۂ ارض پر انسان اپنی حقیقت سے قطعی ناواقف تھا اور اپنے حقیقی مقام سے ناآشنا تھا۔ طلوعِ اسلام سے قبل اس کا حال یہ تھا کہ وہ اپنے ہاتھوں سے بت بناتا تھا اور ان بتوں کے آگے اپنی مرادوں کے لیے سر جھکاتا تھا۔ ورودِ اسلام سے قبل انسان کا حال یہ تھا کہ وہ درختوں، دریاؤں، سمندروں اور چاند و سورج کو اپنے سے زیادہ بڑا اور محترم سمجھتا تھا۔ اپنے سے ہر قوی کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا اس کا مزاج تھا اور اپنے سے توانا کے آگے جھک جانا اور اس کی پرستش کرنا اُس کی عادت تھی حتیٰ کہ ایسے حالات میں ایسے انسان بھی ہوئے کہ انھوں نے اپنی معبودیت کا رنگ رچایا اور انسان نے انسان کو مجبور کیا کہ وہ اسے اپنا معبود مانے۔

یہ سارا دور انسان کی تاریکی کا دور ہے۔ یہ وہ دور اور زمانہ ہے کہ انسان کو اپنی حقیقت کا پتا نہ تھا اور اپنے مقام کا اسے احساس تھا نہ ادراک۔ وہ ایک شدید غلط فہمی میں مبتلا تھا۔ وہ افراط پر اترا تو اس نے خود کو دنیا کی سب سے بلند شے سمجھا، غرور و تکبر، جبر و قہر، ظلم و جور اور شر و فساد اس کا مزاج بنا۔ مگر یہی انسان جب تفریط پر اترا تو اس نے خود کو دنیا کی ذلیل ترین ہستی سمجھا اور جس شے سے اس کو فائدہ کی توقع ہوئی اور مضرت کا خوف، اس نے اس کو اپنا معبود تسلیم کر لیا۔

اسلام نے ان دو انتہائی تصورات کو باطل کر کے انسان کے سامنے اس کی اصل حقیقت رکھ دی۔ ایک طرف اسلام نے انسان کے غرور و تکبر کو پاش پاش کر دیا، یہ بتا کر کہ وہ ایک گندے قطرۂ آب سے پیدا ہوا اور مٹی اور پھر مٹی کے نچوڑ سے کہ جو ایک حقیر پانی ہے اس کی نسل چلائی گئی۔ اس تکبر شکنی کے بعد اسلام نوعِ بشر کو بتاتا ہے کہ وہ اتنا بھی ذلیل نہیں کہ جتنا وہ خود کو سمجھتا ہے۔

قرآن نے کہا:

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا ○ (الاسراء: ۷۰)

یعنی: "اور ہم نے بنی آدم کو عزت بخشی اور ان کو خشکی و تری میں سواریاں دیں، پاک چیزوں سے رزق عطا کیا۔ اور بہت سی چیزوں پر جن کو ہم نے پیدا کیا، ان کو ایک طرح کی فضیلت عطا کی ہے۔"

Marfat.com

انسان کی یہ دونوں حیثیتیں جب سامنے آتی ہیں تو ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر اس دنیا میں انسان کا صحیح مرتبہ و مقام کیا ہے؟ اس کا جواب قرآن حکیم نے یہ دیا ہے: (ترجمہ)

"اور جب کہ تیرے پروردگار نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین پر ایک خلیفہ (نائب) بنانے والا ہوں تو انھوں نے عرض کیا کہ کیا تو زمین میں اس کو نائب بناتا ہے جو وہاں فساد پھیلائے گا اور خون ریزیاں کرے گا؟ حال آنکہ ہم تیری حمد کے ساتھ تیری تسبیح اور تیری تقدیس کرتے ہیں اللہ نے فرمایا: میں وہ باتیں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے اور اس نے آدم کو نام سکھا دیے۔ پھر ان کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور کہا: اگر تم سچے ہو تو ان چیزوں کے نام بتاؤ۔ انھوں نے کہا: پاک ذات ہے تیری۔ ہم اس کے سوا کچھ نہیں جانتے جو تو نے ہم کو سکھا دیا ہے۔ تو ہی علم رکھنے والا ہے اور تو ہی حکمت کا مالک ہے۔ خدا نے کہا: اے آدم ان فرشتوں کو ان چیزوں کے نام بتا۔ پس جب آدم نے ان کو ان اشیا کے نام بتائے تو خدا نے کہا: کیا میں نے تم سے نہ کہا تھا کہ میں آسمانوں اور زمین کی سب مخفی باتیں جانتا ہوں اور جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو اور چھپاتے ہو اس کا سب کا علم رکھتا ہوں۔ اور جب ہم نے ملائکہ سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو تو ان سب نے سجدہ کیا بجز ابلیس کے کہ اس نے انکار کیا اور تکبر کیا اور نافرمانوں میں سے ہو گیا۔ اور ہم نے آدم سے کہا: کہ تو اور تیری بیوی دونوں جنت میں رہو مگر اس درخت کے پاس بھی نہ پھٹکو کہ تم ظالموں میں سے ہو جاؤ گے۔ مگر شیطان نے ان کو جنت سے اکھاڑ دیا اور وہ جس خوش حالی میں تھے اس سے ان کو نکلوا دیا۔ (البقرہ آیات ۳۰ تا جز و ۳۶)

سورۃ البقرہ کی ان آیات کریمہ میں انسان کا مقام واضح طور پر متعین ہو جاتا ہے حق یہ ہے کہ اسلام کی تعلیمات انسان کے لیے سراپا رحمت ہیں۔ اور اس دین کی تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے کائنات کے اندر جو بلند مقام عطا فرمایا ہے وہ اسے معلوم ہو تاکہ دنیا میں عزت و فلاح کی زندگی بسر کرے اور مرنے کے بعد ابدی زندگی میں اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا مستحق ٹھہرے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب فرعون سے کہا کہ میرا رب وہ ہے کہ جو مارتا ہے اور جلاتا ہے تو فرعون کی عقل انسانی اس حد تک منجمد ہو چکی تھی کہ وہ کہنے لگا کہ یہ کام تو میں بھی کر سکتا ہوں۔

اس پس منظر میں رسول اللہ ﷺ تشریف لائے اور اللہ تعالیٰ نے اعلان فرمایا کہ ہم نے بنی آدم کو عزت بخشی یہ ایک انقلابی اعلان تھا جس نے انسانوں کو پہلی بار بتایا کہ انسان ہی عزت و شرف کا مستحق ہے۔ اور کائنات کی تمام مخلوقات اس کے تابع ہیں، اس کی خدمت کے لیے ہیں، اُسے فائدہ پہنچانے کے لیے ہیں، اس لیے کہ خالق کائنات اللہ جل جلالہٗ نے انسان کو اس کرۂ ارض پر اپنا خلیفہ اور نائب مقرر کیا ہے۔ اب دنیا میں انسان ہی کا حکم چلے گا۔ انسان اللہ تعالیٰ کی اطاعت

Marfat.com

کرے گا اور کائنات کی تمام دوسری مخلوقات کو تصرف میں لائے گا۔

شرف انسانی کے تخیّل کو عام کرنے کے لیے مزید تشریح یہ فرمائی کہ اس شرف میں تمام انسان برابر کے حق دار ہیں۔ نسل اور رنگ اور وطن یہ سب محض پہچان اور تشخص کے لیے ہیں۔ گورے کو کالے پر اور کالے کو گورے پر یا عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر کوئی فوقیت اور کسی قسم کا امتیاز حاصل نہیں ہے۔ کیوں؟ اس لیے کہ دنیا کے تمام انسان ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہیں، ایک خاندان کے افراد ہیں، لہٰذا انسان اور انسان کے درمیان فرق و امتیاز محض جہالت و کم نظری کی پیداوار ہے۔ شرفِ انسانی عام ہے۔ ہاں اس میں درجہ درجہ کا فرق ہو سکتا ہے۔ مثلاً جو لوگ متقی ہیں اللہ کے حکم کی پابندی کرتے ہیں، اور رسول پاکؐ کے اسوۂ حسنہ کو اپنی ہدایت کا سرچشمہ سمجھتے ہیں وہ یقینی طور پر ان بھائیوں سے زیادہ مستحق شرف ہیں جنھوں نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کر کے اپنی زندگی کو عام شرفِ انسانی سے بڑی حد تک محروم کر رکھا ہے۔

اب یہاں ایک اور نکتے پر غور فرمایئے۔ انسان اس کرۂ ارض پر اللہ تعالیٰ کا خلیفہ ہے اور نائب ہے۔ یہی اس کا مقام شرف ہے۔ اس شرف کا سب سے بڑا اور سب سے اہم اور لازمی تقاضا یہ ہے کہ انسان کو اپنے فعل و عمل میں اور اپنے کردار میں اور اپنے فکر و نظر میں اللہ تعالیٰ کے تابع فرمان و عمل ہونا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ منبع اخلاق ہے، انسان کو بھی صاحب اخلاق ہونا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ رحیم و کریم ہے، انسان کو بھی انسان کے ساتھ ایسا ہی سلوک کرنا چاہیے وغیرہ۔

حضرتِ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے ایک سوال پر جواب عطا فرمایا کہ حیاتِ رسولؐ عمل بر قرآن ہے۔ قرآنِ حکیم فرمان و ارشادِ الٰہی ہے۔ سرورِ کائنات، فخرِ موجودات، نورِ مجسمؐ نے قرآن پر عمل کر کے زندگی کا وہ نمونہ پیش کیا کہ جو اللہ تعالیٰ چاہتا تھا۔ وہ اللہ کے رسول تھے، انسان تھے اور مرتبۂ شرفِ انسانی پر فائز۔ ثابت ہوا کہ اس کرۂ ارض اور اس دنیا کے ہر انسان کو وہی زندگی گزارنی چاہیے جس کا نمونہ ذاتِ رسولِ اکرمؐ ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر انسان سے ایسی ہی زندگی کا مطالبہ کرتا ہے۔

شرفِ انسانی کا نظریہ سب سے پہلے اسلام نے پیش کیا، اور انسان کو دوسری مخلوقات کی ذہنی غلامی سے نجات دلائی، اور اسے مشرف کیا۔ اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ ہمیں توفیق عطا فرمائیں کہ ہم انسانی شرف کو قائم رکھیں اور اپنی زندگیاں قرآن و سنت کے مطابق بسر کریں۔

Marfat.com

حرّیت

حرّیت کے واضح تر، صحیح تر اور وسیع تر معنی ایک ہی ہیں، یعنی آزادی! حرّیت کے معنیٰ و مفہوم کو اسلام نے جس قدر گہرائی اور گیرائی کے ساتھ سمجھایا ہے، اور اہلِ ایمان نے جن جذبات و احساسات کے ساتھ حریت کو اپنی زندگی کا مقصود اور اپنی حیات کا منتہا بنایا ہے دیگر ادیان و مذاہب اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہیں۔ درحقیقت حریت وہ جوہرِ آب دار ہے اور وہ دُرِ تاب ناک ہے کہ جو ایک مسلمان کو اقوام و مللِ عالم میں ممتاز بناتا ہے اور تشخص رکھتا ہے۔ ایک سچے مسلمان اور ایک صادق و راسخ کلمہ گو کا امتیاز فکر اور اس کی معراجِ فکر یہ ہے کہ وہ دنیا کی ہر طاقت کا باغی ہوتا ہے اور وہ صرف ذاتِ باری تعالیٰ جل شانہٗ سے ڈرتا ہے، اور تقویٰ کی ایسی شان اور آن بان کے ساتھ وہ کارزارِ حیات میں قدم رکھتا ہے کہ وہ اپنی حریت فکر اور اپنی حریت عمل کے مظاہر سے چشمِ عالم کو خیرہ کر دیتا ہے۔ حریت ایک مسلمان کا سب سے بڑا امتیاز ہے کہ جو تقویٰ کی صفت سے آراستہ ہو کر رزم گاہِ خیر و شر میں تیغ اصیل بن کر ظاہر ہوتا ہے، اور مسلمانوں کو تسخیرِ باطل کے ساتھ ساتھ رفعت دین سے بھی ہم کنار کر دیتا ہے اور اس کی زندگی کا ہر لمحہ حریت اور آزادی سے عبارت ہو جاتا ہے۔

اسلام حریت اور جمہوریت کا ایک مکمل نظام ہے اور یہ وہ دینِ متین ہے کہ جو نوعِ انسانی کو اس کی غصب کی ہوئی آزادی اور حریتِ فکر و عمل واپس دلانے کے لیے آیا تھا۔ انسان کی حریت کو بادشاہوں نے، اجنبی حکومتوں نے اور خود غرض پیشواؤں نے اور معاشرے اور سوسائٹی کی طاقت ور جماعتوں نے غصب کر رکھا تھا۔ ان غاصبوں کا دعوا یہ تھا کہ طاقت، حق ہے، لیکن اسلام نے اس ادعا کی صریحاً نفی کی اور برملا تردید کی اور اپنے ظہور کے ساتھ ہی اعلان کیا کہ طاقت حق نہیں ہے بلکہ حق طاقت ہے، اور اللہ کے سوا کوئی دوسری طاقت انسانوں کو غلام و محکوم بنانے کی مجاز نہیں۔ اسلام ہی وہ دینِ عظیم ہے کہ جس نے حریتِ انسانی اور حریتِ فکر و عمل کو بدرجۂ کمال اہمیت دی ہے اور انسانی اخوت اور مساوات کا عالمی درس دے کر نوعِ انسانی کو عظمتوں سے روشناس اور رفعتوں سے ہم کنار کیا۔ اسلام نے صاف صاف کہہ دیا کہ اس کرۂ ارض پر تمام انسان

Marfat.com

آزاد ہیں اور حریت ان کا مقام ہے، اور یہ کہ بہ حیثیت انسان برابر ہیں، اس بنا پر سب کا درجہ یکساں ہے۔ نسل، قومیت، رنگ معیارِ فضیلت نہیں، بلکہ معیارِ فضیلت عمل ہے اور انسانوں میں سب سے بڑا وہی ہے کہ جس کے کام اچھے ہوں۔

یٰاَیُّھَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰکُمْ مِّنْ ذَکَرٍ وَّ اُنْثٰی وَجَعَلْنٰکُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ط اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ ہ (الحجرات: ۱۳)

آج کی اس دنیا میں حریت اور آزادی کے لفظ محض دوسروں کے سیاسی تسلط سے آزاد ہو جانے کے لیے استعمال ہوتے ہیں، لیکن اسلام انسان کو حریت اور آزادی کا جو تصور دیتا ہے اس کے دو خاص عناصر ہیں: ایک تو یہ کہ انسان اللہ تعالیٰ کی بندگی اس طرح اختیار کرے کہ سوائے خالقِ کائنات کے عبدیت کا رشتہ کسی اور سے منسلک نہ رہے۔ اور دوسرا عنصر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے لیے جو طریقۂ زندگی اسلام کی صورت میں مقرر فرما دیا ہے اور جو خود اللہ کی گواہی (شہادت) کے مطابق دینِ کامل ہے، انسان اسے اس حد تک اور اس طرح کامل سمجھے کہ اسے اپنی زندگی کے طور طریقوں کے تعین میں کسی اور سے مدد و تعاون کی ضرورت نہ ہو۔ اگر ہم اپنے حالات کا ان دونوں باتوں کی روشنی میں جائزہ لیں تو ہم یہ فیصلہ بڑی آسانی سے کر سکیں گے کہ ہم آزادی کی جس منزل تک پہنچ جانے کے دعوے دار ہیں درحقیقت ہم ہنوز اس سے بہت دور ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے مقصد کا تعین کرتے ہوئے قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

ھُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْھُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْھِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّهٖ (التوبہ: ۳۳)

یعنی: "اللہ تعالیٰ نے ہی تو اپنے رسول کو سامانِ ہدایت اور دینِ حق دے کر اس غرض سے بھیجا ہے کہ وہ اس دین کو تمام دیگر طریق ہائے حیات پر غالب کر دے۔"

یہ آیت کریمہ مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کے بارے میں جو رہنما اصول متعین کرتی ہے وہ یہ ہے کہ اسلام پر ایمان رکھنے والی امت اور اسے دینِ برحق تسلیم کرنے والی امت کسی بھی درجے میں اور کسی بھی حیثیت سے غیر اسلامی طاقت کی پابند نہیں رہ سکتی، اور کسی بھی طور غیر اسلامی نقطۂ فکر و نظر کے زیرِ نگین نہیں رہ سکتی۔ حریت اور آزادی کی یہی تعریف ہے جس کا اسلام متقاضی ہے، اور ایسی ہی حریت آئینِ اسلام کی تعریف میں آتی ہے۔ حریتِ اسلامی کا ہرگز یہ مفہوم نہیں ہو سکتا کہ ایک مسلمان فکری توانائیوں سے محروم ہو کر ضعفِ ایمانی کا مظاہرہ کرے اور اس کے دل و دماغ کے راستے فکرِ اغیار کے لیے کھل جائیں۔ ایسے حالات لازماً غلامی کا طوق گلے میں ڈال

Marfat.com

یتے ہیں اور حریت و آزادی کا ہر مفہوم فنا ہو جاتا ہے۔

برادرانِ وطن و خواہرانِ پاکستان! اگر ہمیں حریت عزیز ہے اور آزادی ہمارا مقصود ہے اور اگر م خود کو ایک آزاد امت کی حیثیت سے برقرار رکھنا چاہتے ہیں تو ہمیں لازمًا اپنی انفرادی، اجتماعی ور ملی زندگی میں صرف خالقِ کائنات سے رشتۂ عبدیت قائم کرنا ہوگا اور اپنی تمام زندگی کو اسلامی قدار کے سانچے میں ڈھالنا ہوگا۔ حریت کا تصورِ کامل اس کے بغیر ممکن نہیں ہے کہ ہم اپنے نظام سیاست کو، اپنے نظامِ اقتصاد و معاشرت کو، اپنے نظامِ تعلیم و تربیت وغیرہ کو اپنے نظریہ حیات کی روشنی میں مرتب کریں اور فکرِ اغیار اور نظریۂ باطل کی غلامی سے نجاتِ کامل حاصل کریں۔

جب حریت کی بات کریں، اور آزادی کی گفت گو کریں، تو ہمیں ایک لمحے کے لیے بھی اس حقیقت و فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ حریتِ فکر اور آزادیِ عمل کے لیے ہمیں خود اپنی خواہشات سے جنگ رنی ہوگی۔ جسمانی اور سیاسی آزادی کے لیے ہمیں اغیار کی غلامی کا جوا اپنی گردن سے اتار پھینکنا ہوگا۔ حریت میں خودارادیت اور استقلال کا سیاسی مفہوم بھی پنہاں ہے۔ اغیار پر انحصار، خواہ کر و نظر کے دائرے میں ہو یا عزم و عمل کی راہوں میں، معاش و معیشت کے سلسلے میں ہو، یا ین و سیاست کے تناظر میں، بہر حال حریت کے خلاف ہے، آستانۂ غیر سے منھ موڑ کر صرف اللہ ی کے سامنے جھکنا حریت ہے اور یہی راستہ اختیار کر کے ہم اقوامِ عالم میں خود کو ممتاز اور مشخص ر سکتے ہیں اور یہی طریقہ اختیار کر کے ہم سرفراز اور سربلند ہو سکتے ہیں۔ اور یہی وہ ساعت ہوگی ہ ہم اس وعدۂ ربانی کے مصداق بن کر ابھریں گے کہ

وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ (آل عمران: ۱۳۹)

یعنی: "تم ہی سربلند رہو گے اگر تم مومن ہو۔"

عزیزانِ وطن! یہی ہے وہ حریت کہ جو اسلام ہمیں عطا کرنا چاہتا ہے، اور یہی ہے وہ آزادی کہ جو ہمارے مسائل کا حقیقی حل ہے۔ آیئے اس میدان میں قدم رکھ دیں۔ اللہ تعالیٰ ہمارا امی ہو اور ناصر۔

Marfat.com

حرّیت و آزادی

اسلام نے حریت اور آزادی کا جو تصوّر پیش کیا وہ اپنی جگہ منفرد ہے اور بے مثل ہے۔ اسلام نے اس آزادی کے لیے جن باتوں کا اہتمام کیا' ان میں سب سے پہلے یہ بتایا کہ تمام انسان آدم کی اولاد ہیں اس لیے وہ مساویانہ سلوک کے مستحق ہیں۔ انسانی لحاظ سے نہ کوئی بڑا ہے نہ چھوٹا، سب برابر ہیں۔ دوسری بات یہ بتائی کہ انسان اپنے اعمال کے لیے خود ذمہ دار ہے۔ اچھے اعمال کی جزا اور برے افعال کی سزا متعین کردی گئی ہے۔ اور تیسرا اصول یہ متعین کیا کہ تم جو کچھ اپنے لیے چاہتے ہو وہی دوسروں کے لیے چاہو۔

غور کیا جائے تو یہ بات عیاں ہو جائے گی کہ آزادی یا حریت کا جو تصوّر اسلام نے پیش کیا اور جس کا نمونہ آں حضرتؐ نے اپنے اسوۂ حسنہ میں پیش کیا، اس کی بنیاد ان ہی تین اصولوں پر تھی۔

آزادی انسان کا پیدائشی حق ہے۔ اس کی فطرت یہ ہے کہ اجتماعی زندگی بسر کرے اور جماعتی نظام کی کامیاب ترین شکل یہ ہے کہ جماعت کے تمام افراد یہ محسوس کریں کہ انھیں فکر وعمل کی آزادی حاصل ہے اور انھیں معاشرے کے انتظام میں برابر کا دخل ہے۔ انسان کو اللہ تعالیٰ نے عقل عنایت فرمائی اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے بہرہ مند کیا۔ عقل وفکر کی اس امتیازی خصوصیت کا تقاضا ہے کہ انسان کو رائے ظاہر کرنے کی آزادی حاصل ہو اور جو نظام سیاست یا معیشت کارفرما ہے اس کے حسن وقبح پر رائے دینے کا اسے اختیار ہو۔ انسان کی فکری صلاحیت کو سلب نہیں کیا جاسکتا اور جب تک یہ صلاحیت موجود ہے اس وقت تک اسے عمل کی آزادی سے بھی محروم نہیں کیا جاسکتا۔

اسلام دنیا کا وہ پہلا اور واحد دین ہے جو انسان کی فطری آزادی کو تسلیم کرتا ہے اور اس کا صحیح مصرف بتاتا ہے۔ قرآن حکیم میں بار بار اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ کائنات کی تخلیق پر غور کرو، خود اپنی ساخت، پیدائش اور اپنے وجود پر ٹھنڈے دل سے فکر کرو تو تمھیں ماننا پڑے گا کہ قادرِ مطلق ایسا ہے جو پیدا کرتا ہے اور کائنات کو ایک مربوط نظام کے تحت قائم رکھے ہوئے ہے۔

Marfat.com

اگر اللہ تعالیٰ انسان کی فطری آزادی کا حق تسلیم نہ کرتا تو دین میں غور وفکر کرنے کی ہدایت نہ دیتا۔
غور کرنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے دین کے معاملے میں بھی انسان کی آزادی کا اس حد تک اہتمام کیا کہ "لَا اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ" کہہ کر انسان کو علی الاعلان یہ بتا دیا کہ دین قبول کرنے کے معاملے میں بھی انھیں آزادی حاصل ہے، لیکن اس کے ساتھ انھیں صراطِ مستقیم اور راہِ ہدایت بھی دکھادی، حق اور باطل کی پہچان بتادی گئی۔ اب انھیں اختیار ہے کہ وہ ہدایت قبول کریں یا گم راہی میں پڑے رہیں۔ ان کی آزادی اپنی جگہ پر مسلّم ہے اور انھیں اس سے محروم نہیں کیا جاسکتا۔
انسان کی آزادی کا یہ اہتمام اسلام سے قبل نہ کسی معاشرے میں تھا نہ کسی دوسرے الہامی یا غیر الہامی مذہب میں۔ حاکم کا حکم مرگِ مفاجات ہوتا تھا۔ گویا "حکم کے آگے سر جھکا دو ورنہ زندگی سے محروم ہو جاؤ۔" جب حضرت ابراہیمؑ کو آتشِ نمرود کی نذر کیا گیا تو اس کا پس منظر یہی تھا کہ وقت کا حکمران آزادانہ اظہار رائے کے حق کو تسلیم نہیں کرتا تھا۔ آں حضرتؐ نے بعثت کے بعد جب اسلام کی تبلیغ شروع کی تو آپؐ کے خلاف پورا مکہ اسی لیے نبرد آزما ہو گیا کہ وہ آپ کی اس فطری آزادی کو تسلیم نہیں کرتا تھا کہ آپ جو کچھ سچ سمجھتے ہیں اس کا برملا اعلان بھی کریں۔ اسلام سے قبل دین ہو یا معاشرے کا انتظام۔ کسی چیز میں بھی انسان کو آزادی حاصل نہ تھی مروجہ نظام کو تسلیم کیے بغیر چارہ نہ تھا۔
جب قرآنِ حکیم نے علی الاعلان یہ بتایا کہ دین کے معاملے میں بھی انسان کو آزادی حاصل ہے تو اس نے دنیا کو ایک انقلابی پیغام سے روشناس کیا۔ اور اسی کے ساتھ دنیاوی معاملات میں جب یہ تاکید کی کہ اپنے تمام اجتماعی کاموں میں مشورے سے کام کیا کرو تو گویا اس نے انسانوں کے اظہارِ رائے کے حق کو تسلیم کیا۔ اس کی آزادیِ فکر و رائے کی اہمیت پر زور دیا۔
آں حضرتؐ کی حیاتِ طیبہ ہمارے لیے مشعلِ راہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ حکیم میں جو کچھ فرمایا آں حضرتؐ کی ذاتِ اقدس اس کا عملی نمونہ تھی۔ چناں چہ آپؐ نے جب مدینہ منورہ میں اسلامی معاشرے کی بنیاد رکھی تو اظہار رائے کی آزادی کا اس حد تک اہتمام کیا کہ بعض اوقات جاں نثاروں کی رایوں کو اپنی رائے پر بھی ترجیح دے دیتے تھے تاکہ ان کی ہمت افزائی ہو اور افرادِ معاشرہ کسی طرح کی گھٹن محسوس نہ کریں۔ ان میں حریتِ فکر اور آزادیِ رائے کا جذبہ پروان چڑھے اور وہ یہ محسوس کریں کہ ان کی آزادی پر کسی قسم کا قدغن نہیں ہے۔
مدینہ منورہ میں سب سے پہلا اہم معاملہ غزوۂ بدر کا پیش آیا۔ جب آں حضرتؐ کو حالات کی اطلاع ہوئی تو آپؐ نے یہ نہیں کیا کہ ایک دم مقابلے کی تیاری کا حکم دیدیں بلکہ آپؐ نے صحابہؓ

Marfat.com

کو جمع کیا اور واقعہ کا اظہار فرمایا۔ جب مہاجرین و انصار صحابہؓ نے بالاتفاق مقابلے کی رائے دی اور اس پر آمادگی کا اظہار کیا تو آپؐ خوش ہوئے اور جاں نثاروں کے ساتھ شہر سے باہر نکلے۔ اس طرح حریت فکر اور آزادیِ رائے کی پہلی اینٹ استوار کی۔

جب بدر کی جنگ کے قیدیوں کے ساتھ سلوک کا سوال پیدا ہوا تو پھر آپؐ نے صحابہؓ سے رائے طلب کی۔ حضرت عمرؓ نے قتل کی رائے دی۔ حضرت ابوبکرؓ نے معافی کی رائے دی۔ اس طرح اظہار رائے کی آزادی کا حق مستحکم کیا گیا۔

شادی بیاہ کے موقع پر ہمارے معاشرے میں لڑکی کی رائے کو شاید وہ اہمیت حاصل نہیں ہے، جس کا نمونہ رسول اللہؐ نے پیش فرمایا تھا۔ جب حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے شادی کی درخواست کی تو آپ کو یہ رشتہ بہ دل وجان منظور تھا پھر بھی آپ نے اپنی پیاری بیٹی حضرت فاطمہؓ کی رائے لینی ضروری سمجھی۔ چناں چہ حضرت فاطمہؓ کی مرضی دریافت کی اور جب عندیہ معلوم ہو گیا تو آپ کی شادی حضرت علیؓ کے ساتھ کر دی۔ اس طرح آپؐ نے مسلمانوں کو یہ بتایا کہ جس طرح امورِ مملکت میں لوگوں کی رائے کو اہمیت حاصل ہے اسی طرح شادی بیاہ کے معاملے میں لڑکے اور لڑکی دونوں کو انتخاب کی آزادی حاصل ہے۔

آزادیِ رائے کا یہ اہتمام تھا کہ جب اُحد کا معرکہ پیش آیا تو نوجوان صحابہؓ نے اس بات پر اصرار کیا کہ شہر سے نکل کر حملہ کیا جائے۔ خود آں حضرتؐ کو یہ رائے پسند نہ تھی پھر بھی امت کو یہ بتانے کے لیے کہ کسی معاملے میں مسلمانوں کی اکثریت اگر کسی رائے پر متفق ہو جائے تو ان کی آزادی رائے کو تسلیم کرتے ہوئے اس پر عمل کیا جائے، تو آپؐ نے ان کی رائے تسلیم کر لی۔

صلح حدیبیہ کے موقع پر جب شرائط طے کی گئیں تو بعض مسلمانوں نے سختی کے ساتھ برملا آں حضرتؐ کے سامنے اس کی مخالفت کی، لیکن آپؐ نہ خفا ہوئے نہ آپ نے اس پر ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا۔ بلکہ مسلمانوں کی تسلی کے لیے یہ بتا دیا کہ یہ اللہ کا حکم ہے۔

آں حضرتؐ نے مسلم معاشرے کی بنیاد اس بات پر رکھی کہ ہر شخص کو روزی کمانے، زندگی گزارنے اور ملکی معاملات میں ہر قسم کی آزادی حاصل ہے۔

موجودہ دور میں آزادی کی کئی قسمیں بتائی جاتی ہیں۔ مثلاً جلسہ اور جلوس کی آزادی، اخبار کی آزادی، رائے دینے کی آزادی، سماجی آزادی، جمہوریت کی آزادی وغیرہ، لیکن ان تمام قسموں کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ آزادی اصل میں دو ہی قسم کی ہے: سماجی اور اقتصادی۔ سماجی آزادی کے تحت سیاسی آزادی بھی آتی ہے۔ اقتصادی آزادی کا مطلب یہ ہے کہ روزی کے ذرائع، ہر

Marfat.com

شخص کے لیے کھلے ہوں اور اسے آزادی حاصل ہو کہ وہ جس پیشہ کو چاہے اختیار کرے۔ اسلام نے یہ دونوں بنیادی آزادیاں مہیا کردیں۔ سماجی آزادی یہ تھی کہ ایک دوسرے کے حقوق کا احترام کرتے ہوئے جیسے چاہو زندگی بسر کرو اور اسی کے تحت سیاسی آزادی یہ تھی کہ حاکم کا انتخاب آزادانہ رائے شماری سے ہو۔ اقتصادی آزادی یہ تھی کہ روزی کمانے کا کوئی ذریعہ بھی کسی پر بند نہ تھا۔

جب تمام انسان ایک ہی خاندان کے افراد ہیں تو اعمال و افعال کی آزادی میں بھی مساوی حقوق کے حامل ہیں۔ حکمران ہو یا محکوم، امیر ہو یا غریب، تعلیم یافتہ ہو یا جاہل، گورا ہو یا کالا، ہر انسان کو اسلامی معاشرے میں ایک طرح کی آزادی حاصل ہے اور وہ جو کچھ کرتا ہے اس کے لیے خود ذمہ دار ہے۔ جزا و سزا کا مستحق ہے۔ اسی طرح یہ بتا دیا گیا کہ حریت کا صحیح استعمال بھی ضروری ہے۔

آں حضرتؐ نے ایک کلیہ یہ متعین کر دیا کہ جو کچھ اپنے لیے پسند کرتے ہو وہی دوسروں کے لیے بھی پسند کرو۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر ایک شخص چاہتا ہے کہ اس کی حریتِ فکر پر کوئی قدغن نہ ہو، اس کی عزت محفوظ رہے، اس کی آزادیِ عمل پر کوئی دباؤ نہ ہو، غرض اسے کوئی دوسرا شخص کسی طرح کا نقصان نہ پہنچائے تو اس کا یہ فرض ہے کہ یہی حقوق وہ دوسروں کے لیے بھی ضروری سمجھے۔

اس طرح حریت کا مفہوم لاقانونیت نہیں ہے۔ اسلام میں اس آزادی کا کوئی تصور نہیں کہ جب بلیک آؤٹ ہو جائے تو لوگوں کی عزت اور دولت پر کھلم کھلا ڈاکا ڈال دیا جائے۔ اسلام آزادی کو ایسی پابندیوں سے لیس کرتا ہے کہ جس کے تحت معاشرہ امن و سکون کا گہوارہ ہو۔ لوگ اپنے گھروں کو رات کے وقت بند نہ کریں تو بھی محفوظ و مامون رہیں۔ اسلام عدل و انصاف اور توازنِ فکر و عمل کا داعی ہے۔ اس نے ہر فعل و عمل کی حدود مقرر کر دی ہیں۔

یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ یومِ نزولِ قرآن، یعنی ۲۷ رمضان کو ہمارا پاکستان عالمِ وجود میں آیا تھا اور اس لیے عالمِ وجود میں آیا تھا کہ ہم اس وطنِ پاک میں قرآن رول قائم کریں گے۔ اللہ کے دین، اسلام کا بول بالا کریں گے، اور اپنے فکر و عمل سے اسلام کا ایک حقیقی نمونہ پیش کریں گے۔ اپنی حریتِ فکر اور آزادیِ عمل سے ساری دنیا کے لیے سامانِ فکر و عمل فراہم کریں گے۔

ہم نے ہنوز اپنا یہ فرض ادا نہیں کیا ہے۔ ہمیں بڑی سنجیدگی کے ساتھ انفرادی طور پر اور من حیث الملت اپنی آزادی کا حق ادا کرنا چاہیے۔ پاکستان میں دستورِ اسلامی کا نفاذ حریتِ فکر اور آزادیِ عمل کا آئینہ دار ہو سکتا ہے۔ آئیے ہم اس جانب دلیری اور جرأت و شجاعت کے ساتھ قدم بڑھائیں۔ اہلِ پاکستان کی بھلائی اسی میں ہے کہ ہم اللہ کی بتائی ہوئی راہوں پر چلیں اور ہادیِ برحقؐ نے زندگی کا جو نمونہ پیش کیا ہے اس کو مشعلِ راہ بنائیں۔ ہماری آزادی کے بس یہی معنی ہیں۔

Marfat.com

فلاحی ریاست کا تصوّر

ایک فلاحی مملکت کا جو انتہائی تصوّر ہو سکتا ہے وہ یہ ہے کہ ایک انسان خیرات دینے کے لیے نکلے مگر اسے خیرات لینے والا کوئی نہ مل سکے۔ ایسی مملکت کہ جس میں خیرات لینے والا کوئی نہ ہو، اور ہر انسان مطمئن ہو اور محفوظ، اسلامی تصوّر ہے۔ تاریخِ معلوم شاہد ہے اور عادل کہ یہ تصوّرِ فلاح اور یہ تصوّرِ مملکت قرآنِ مجید اور فرقانِ حمید نے قائم کیا اور اسلام نے اس دنیا کے لیے اسے پیش کیا اور مسلمانوں نے اس راہ میں عملی اقدامات کیے اور اس دنیا کو ایک ایسا نظامِ مملکت عطا کیا کہ جس نے اس دنیا میں امن و سلامتی کی بنیاد ڈال دی، اخلاق اور انسانیت اور فلاح کی ساری راہیں پیدا و ہموار کر دیں، لہٰذا اسلامی تصوّرِ مملکت پوری قطعیت کے ساتھ یہ ہے کہ وہ ایک فلاحی اور خادمِ خلق مملکت ہو۔ ایسی ریاست اور مملکت اس کی ذمّے دار ہے کہ اس میں عوام الناس کو دنیوی اور اخروی دونوں قسم کی فلاح حاصل ہو۔ ایک طرف وہ علمِ دین کی تعلیم و ترویج کے لیے ذمّے دار ہے اور اَمر بِالمَعرُوف اور نَہی عَنِ المُنکَر کا فرض ادا کرتی ہے تو دوسری طرف وہ قیامِ امن و انصاف، معاشرتی و معاشی عدل نیز مستحقین کی معاشی کفالت کے لیے اپنے وسائل کو استعمال کرتی ہے۔

ایسی فلاحی مملکت کو عالمِ وجود میں لانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ انسانوں میں انسانوں سے محبّت کو قائم کیا جائے اور خلوص کو دائم کیا جائے۔ اسی صفتِ اخلاق اور وصفِ انسانیت سے ایک فلاحی مملکت عبارت ہوتی ہے۔ اسی طرح ایک فلاحی مملکت کے قیام کے لیے کلیے کے طور پر اس حقیقت کو تسلیم کرنا چاہیے کہ زمین اور تمام وسائلِ فطرت اصلاً اللہ تعالیٰ کی دین ہیں اور اللہ تبارک و تعالیٰ ہی ان کا مالکِ حقیقی ہے۔ تمام پیداوار، یعنی جمع شدہ خزانے، سونا چاندی، مویشی، کھیت وغیرہ ایک سرمائے کی حیثیت رکھتے ہیں اور عالمِ انسانیت کی مشترکہ دولت ہیں۔ ھُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَکُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا (البقرہ: ۲۹) معاشی دائرے میں ہر انسان کا ایک حق ہے، اور دنیا کی پیداوار میں اس کا

Marfat.com

حصّہ ہے۔ ہر انسان کو ہدایت ہے کہ وہ اپنے حصّے کو نہ بھولے۔ لاتنس نصیبک من الدنیا جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانی سوسائٹی کے لیے چار بنیادی حقوق رکھے ہیں:

۱۔ گھر، رہنے کے لیے (دبَیْتُ یَسْکُنُہٗ)

۲۔ کپڑا، تن ڈھکنے کے لیے (ثَوْبُ یُوَارِیْ عَوْرَتَہٗ)

۳۔ روٹی، پیٹ کے لیے (جِلْفُ الْخُبْزِ)

۴۔ پانی (اَلْمَاءُ)

تصوّرِ اسلامی کے مطابق ایک فلاحی مملکت اس کی ذمّے دار ہے کہ وہ ان چار بنیادی ضرورتوں کو پورا کر سکے۔ فروغِ پیداوار اور دولت کی منصفانہ تقسیم اس ذمّے داری کا اساسی نکتہ ہے۔ اس کے لیے تمام معاشی ذرائع کو حسنِ تدبیر اور خوبی تنظیم کے ساتھ متحرک کرنے سے یہ مقصد حاصل ہوتا ہے، یعنی زراعت کے میدان میں منصفانہ تنظیم، پاک صاف تجارت کا ایسا نظام کہ جس میں منافع تابع محنت ہو، صنعت و حرفت کا ایسا قیام کہ جس میں ہر انسان کو کام کرنے اور کسبِ حلال کے پورے مواقع حاصل ہوں۔ اس معاشی دائرے میں محنت و مزدوری کی مختلف و متعدد صورتیں قائم کرنا فلاحی مملکت کی ذمّے داری ہے۔ اِنَّ سَعْیَکُمْ لَشَتّٰی اور حق المحنت یعنی مزدور کی محنت کا پھل مزدور کو حاصل ہونے کا انصاف پسندانہ نظام۔ پھر لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی فرمایا گیا۔ اس سلسلے میں محنتِ مشترکہ یعنی امداد باہمی لازمی ہے۔ اچھے اور مفید کاموں میں اور ایک معاشی نظام کو پوری صلاحیتوں اور پوری تنظیم کے ساتھ چلانے میں محنتِ مشترکہ اور تعاونِ باہمی ضروری ہے۔

اس سلسلے میں اسلام نے آجر و اجیر میں باہمی اخوّت اور عزّت کو بڑی اہمیت دی ہے اور مزدور و سرمایہ دار میں ایک ایسا توازن قائم کیا ہے جس نے ہمیشہ فلاح کی راہیں کھولی ہیں۔ اسلام کا یہ نظامِ معاش شروع سے آج تک قابلِ عمل ہے اور آج بھی ہر مملکت، جو فلاح کی طرف اقدام کرتی ہے، اسی اسلامی نظام کی خوشہ چین ہے۔ اس اخوت و تعاون کا متعین معیار یہ ہے کہ انسان انسان برابر ہیں، اور سرمایہ میں حصہ دار۔

ساتھ ہی اچھے اخلاق پروان چڑھانے کے لیے اور معاشی آزادی کے تحفظ کے لیے اسلام انسان کو انفرادی ملکیت کا حق دیتا ہے، مگر حد قائم کرتا ہے کہ اس ملکیت کو

Marfat.com

کرنا نہیں بننے دیا جاتے اور جب انفرادی ملکیت دائرہ ظلم میں داخل ہوجائے تو پوری دیانت و امانت کے ساتھ ریاست کو مداخلت کا حق ہے کیوں کہ اس کے بغیر معاشی زندگی پُربہار نہیں ہوسکتی، تَعَاوَنُوْا عَلَی الْبِرِّ

ایک فلاحی مملکت کا منتہائے فکر و عمل اس سے عبارت ہوسکتا ہے کہ مملکت میں کوئی انسان مواقعِ صنعت و حرفت اور ذرائع تجارت سے محروم نہ رہے، اور نہ کوئی انسان مواقعِ محنت سے محروم رہے۔ معذور و مجبور انسان فقر و فاقہ کے شکار نہ ہوں اور ہر انسان کو چاروں بنیادی حقوق توازن و اعتدال کے ساتھ حاصل ہوں۔

فلاح عامہ سے متعلق جب ہم اسلامی احکام کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں قرآن حکیم سے روشنی ملتی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

والذین فی اموالہم حق معلوم ہ للسائل والمحروم (معارج: ۲۴:۲۵)

یعنی: "مسلمانوں کے مالوں میں حق ہے سائل کا اور کمانے سے اور تلاش معاش سے محروم رہ جانے والوں کا"

اس سلسلے میں ارشاد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم پر غور فرمائیے:

ان اللہ قد فرض علیہم صدقۃ توخذ من اغنیائہم وترد علی فقرائہم

یعنی: "مسلمانوں پر اللہ نے صدقے کو فرض کیا ہے جو ان کے مال داروں سے لیا جائے اور ان کے غریبوں میں تقسیم کر دیا جائے"

ایک بار ارشاد فرمایا:

اَلسُّلْطَانُ وَلِیُّ مَنْ لَّا وَلِیَّ لَہٗ

یعنی: "اسلامی حکومت سرپرست ہے ہر اس شخص کی جس کا کوئی سرپرست نہ ہو"

اس قسم کے احکام اور ایسی رہنمائی قرآن کریم اور احادیثِ طیّبہ سے ہمیں میسّر ہے۔ اس روشنی میں ضرور ایک ایسا معاشی نظام تشکیل دیا جاسکتا ہے جس پر فلاحی مملکت کی تعریف صادق آسکے۔ ایک فلاحی اور اسلامی مملکت اخلاقاً اور قانوناً شہریوں کی اقتصادی بہبود کی ذمّے دار ہے جس کا انتظام اس کے حوالے ہوا ہے۔ اس کا فرض ہے کہ وہ اس بات کا خیال رکھے کہ کسی شہری کا معیارِ معیشت منصفانہ سطح سے نیچے نہ رہے۔ ایک فلاحی مملکت وہی ہوسکتی ہے کہ جو اخلاقی نقطۂ نظر سے بھی راست باز ہو اور عملاً بھی راست بازی اس کا شیوہ ہو، کیوں کہ ایسی ہی ایک مملکت ہر فرد ملّت کے

Marfat.com

لیے کم از کم لازمی معاشی بہبود کا انصرام و اہتمام کر سکتی ہے۔ اس میں کوئی مملکت اس کا اہتمام نہیں کر سکتی کہ مملکت کے تمام شہری مسہل اور بے خلش زندگی بسر کر سکیں، لیکن اتنا ضرور ہو سکتا ہے، اور ہونا چاہیے کہ فراوانی کے پہلو بہ پہلو روح فرسا افلاس نہ ہو۔

اس موقع پر میں یہ یاد دلاؤں کہ اسلامی نقطۂ نظر سے دو باتیں زیادہ قابلِ لحاظ و توجہ ہیں۔ ایک یہ کہ بنی نوعِ انسان کے ہر فرد کے کچھ حقوق ہیں اور دوسرے یہ کہ تمام انسان اللہ کے نزدیک برابر ہیں چاہے وہ اونچے طبقے کے ہوں یا نیچے طبقے کے۔ اللہ ان کا پروردگار اور فرماں روا ہے اور وہ اس کے بندے اور اس کی رعایا ہیں۔ ایک فلاحی مملکت معاشی زندگی کے ہر دائرے میں ان دونوں باتوں کا لحاظ رکھنے پر مامور ہے۔ اللہ تعالیٰ کی مخلوق کا کوئی فرد کھانے، کپڑے اور مکان وغیرہ سے محروم نہ رہے اور اللہ کے بندوں میں سب کو انسانیت کے عام حقوق میں برابر سمجھا جائے۔ اگر ایسا نہ ہوگا تو انسانیت شرف و عظمت کے مرتبے سے گر جائے گی۔

اسلامی جمہوریۂ پاکستان کے لیے آج[1] کا دن بہت اہم ہے۔ یہ نہ صرف ہمیں یاد دلاتا ہے کہ ہم نے فکری آزادی کا عہد کیا تھا، بلکہ یہ ہماری سیاسی آزادی کا نقطۂ آغاز بھی ہے۔ ہم نے اسی نقطے سے تعمیرِ ملت کی ابتدا کی تھی۔ ہم اپنے معاہدات اور معتقدات کے مطابق پاکستان کو ایک ایسا دستورِ حیات دینے کے پابند ہیں جو کہ بہر صورت اسلامی ہو اور جس کے نتیجے میں وہ فلاحی مملکت معرضِ وجود میں آئے جس کا تصور قرآنِ مجید و فرقانِ حمید نے قائم کیا، اسلام نے دنیا کے لیے پیش کیا اور مسلمانوں نے جس کے لیے مثبت اقدامات کیے۔ ہم ان تصورات کے امین ہیں اور ہم پاکستان کو ایک فلاحی مملکت ہی بنائیں گے جہاں ہر انسان عزت و افتخار سے خوش حالی کے ساتھ رہے اور اس کا طرزِ حیات و معاش وہی ہو جس کی ہدایت ہادیِ برحقؐ نے دی ہے۔

---

[1] ۲۳ مارچ

Marfat.com

اِنفاق فی سبیل اللہ

صالح معاشرے اور اعلا سیرت و کردار اور بلند اخلاق کی تشکیل کے لیے اسلام جن باتوں سے ہمارے دلوں کو پاک دیکھنا چاہتا ہے، ان میں کفر و شرک اور نفاق کے بعد سب سے ناپسندیدہ چیز مال و دولت کی محبت ہے۔ دولت وہ غبار ہے کہ جو آئینۂ دل کو حق و صداقت کے جلووں سے ہمیشہ دور رکھتا ہے۔

اسلام نے جہاد کی دونوں قسموں پر زور دیا ہے، جن میں سے ایک جہاد بالنفس ہے ایک جہاد بالمال۔ اس جہاد بالمال کو قرآن نے اعلا اور انتہائی پُر یقین نتائج کی بنا پر بہترین تجارت قرار دیا ہے۔

اللہ کی راہ میں جو سرمایہ کاری کی جاتی ہے وہ منافع کے اعتبار سے دنیا کے دوسرے کاروبار سے بہت مختلف ہے۔ اس لیے قرآنِ پاک نے ہمیشہ مومنوں کو اللہ کی راہ میں اپنا مال خرچ کرنے کی تاکید کی، اور صاف لفظوں میں یہ اعلان فرما دیا:

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ؕ (آلِ عمران: ۹۲)

یعنی: "تم نیکی کے معیار مطلوب تک ہرگز نہیں پہنچ سکتے جب تک کہ اپنی وہ چیزیں اللہ کی راہ میں خرچ نہ کرو، جنھیں تم عزیز رکھتے ہو۔"

جو چیز انسان کو انفاق، فیاضی اور سخاوت سے روکتی ہے وہ حرص و طمع ہے اور بخل کی جس طرح مذمت کی گئی ہے اس سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ایک مسلمان کبھی حریص و بخیل نہیں ہو سکتا، اور نہ یہ ممکن ہے کہ وہ ہوسِ زر و مال کا شکار ہو جائے، کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ:

وَیْلٌ لِّکُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةِ ۙ الَّذِیْ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ ۙ یَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗۤ اَخْلَدَهٗ ۚ

(ہمزہ: ۱-۳)

یعنی "پھٹکار ہو ہر غیبت کرنے والے اور عیب جوئی کرنے والے پر، جس نے دولت اکٹھی کی، اور اس کو گن گن کر رکھا، سمجھتا ہے کہ یہ دولت اسے ہمیشہ رکھے گی۔"

Marfat.com

سچائی ہمیشہ سے جان و مال کی قربانی کا مطالبہ کرتی رہی ہے۔ جو آدمی مال کی محبت میں گرفتار ہوتا ہے وہ راہِ صداقت اختیار کرنے سے اس لیے گریز کرتا ہے کہ اس کی دولت صرف ہو جائے گی اور انتہائی جان فشانی کے ساتھ اس نے جو مال حاصل کیا ہے وہ اس کے ہاتھ سے نکل جائے گا اور وہ مفلس ہو کر رہ جائے گا۔ قرآنِ حکیم اسے وسوسۂ شیطانی قرار دیتا ہے۔ دراصل مال و دولت ایک آزمائش ہے۔ اس آزمائش میں پورا اترنا کامیابی کی شرطِ اولین ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جو بخل اور لالچ سے بچا وہی مراد کو پہنچا کیوں کہ ہر اونچے مقصد کے لیے جان و مال کی بازی لگانا ہی پہلی شرط ہے۔ نیک کاموں میں یا اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنا، آخرت کی کامیابی کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔

اسلام کے احکامِ عبادات اور احکامِ معاملات دونوں میں اجتماعی مصلحتیں پوشیدہ ہوتی ہیں۔ ہر معاشرے میں محروم، مجبور، نادار اور مفلس بھی ہوتے ہیں، اور مال دار و باثروت افراد بھی۔ مال داروں کو اسلام اس بات کی تاکید کرتا ہے کہ وہ اپنے مال میں محروموں کا حق تصور کرتے ہوئے انھیں دینے میں کسی بخل سے کام نہ لیں۔

اسلام فیاضی اور سخاوت کی تعلیم اس لیے بھی دیتا ہے کہ اس طرح دولت کبھی چند افراد کے ہاتھوں میں مرتکز نہ ہوگی اور اسلامی معاشرے کے سارے افراد اس سے بہرہ ور ہو کر متحد قوت کے ساتھ شر کا دفاع کر سکیں گے اور برائی کو روک سکیں گے۔

اسلام نے فیاضی، سخاوت اور انفاق کے تصور کو عقیدۂ آخرت سے وابستہ کیا ہے، اور ملکیتِ مال کے متعلق بنیادی طور پر یہ احساس دلایا ہے کہ یہ تمھارے لیے بھی ہے اور دوسروں کے لیے بھی۔ اسلام کی تعلیم کے مطابق مال و دولت ایک امانت ہے۔ اسی لیے قرآن انفاق کے لیے محض ترغیب کا پیرایہ نہیں اختیار کرتا بلکہ مال اور دولت کو راہِ خدا میں خرچ نہ کرنے پر وعید بھی سناتا ہے:

وَمَا لَكُمْ اَلَّا تُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (الحدید: ۱۰)

یعنی: "تم کو کیا ہوا ہے جو اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے۔"

دراصل اسلام انسانوں میں یہ شعور پیدا کرنا چاہتا ہے کہ وہ اس حقیقت کو محسوس کریں کہ روزی کی وسعت اور کشادگی، اس کی تنگی اور اس کی کمی دونوں برابر کی آزمائش ہیں۔

انسان اگر یہ سمجھتا ہے کہ اس کی کسی ذاتی خوبی یا اس کے کسی خاص ہنر کی وجہ سے دولت اس کی طرف سمٹی چلی آرہی ہے تو یہ اس کی خام خیالی ہے۔ یقین کرنا چاہیے کہ یہ سب کچھ

Marfat.com

محض [illegible] ہے۔ اللہ آسمان و زمین کے سارے خزانوں کا مالک ہے۔ جس طرح اور جسے چاہے وہ دولت سے نواز سکتا ہے اور سب کچھ سلب بھی کر سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس بات کا یقین دلاتا ہے کہ تم میری راہ میں جو کچھ بھی خرچ کرو گے اس کا تمھیں پورا پورا بدلہ ملے گا۔ کہیں اللہ تعالیٰ نے اپنی راہ میں خرچ کرنے کو قرض سے بھی تعبیر فرمایا ہے اور ارشاد فرمایا ہے کہ قیامت میں ہم اس کا بدلہ بڑھا چڑھا کر ادا کریں گے۔ اس لیے وہ تاکید فرماتا ہے کہ موت سے پہلے جو موقع مال اور دولت صرف کر کے تعمیر عاقبت کا مل گیا ہے اس سے فائدہ اٹھا لو۔

قرآنِ پاک انفاق کے اصول و ضوابط بھی بتاتا ہے۔ وہ سب سے پہلے اخلاصِ نیت پر زور دیتا ہے اور کہتا ہے کہ انفاق کا مقصد نام و نمود یا مال و دولت کی نمائش نہ ہو، بلکہ صرف اللہ کی رضا اور خوشنودی کا حصول ہو۔ اس اخلاص کے ساتھ دوسری چیز یہ ہے کہ جس پر خرچ کیا جائے، اس پر احسان جتا کر اس کو ایذا نہ پہنچائی جائے۔ اور تیسری چیز یہ ہے کہ کمائی کا بہترین حصہ اللہ کی راہ میں خرچ کیا جائے، ناقص یا بے کار حصہ اللہ کی راہ میں خرچ کر کے اجر و ثواب کی امید رکھنا حکمِ قرآنی کے خلاف ہے۔

قرآن نے مال خرچ کرنے کو اللہ تعالیٰ کے تقرب اور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاؤں کا ذریعہ قرار دیا ہے، اور وعدہ فرمایا ہے کہ اللہ ایسے لوگوں کو اپنی رحمت میں داخل فرمائے گا۔ فیاضوں اور خدا ترسوں کے لیے وسیع جنت کا وعدہ ہے۔ علاوہ ازیں ہم ایسا بھی دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی رضا، اجر و ثواب کی زیادتی، آخرت کی کامیابی اور وعدۂ جنت و رحمت کی بنا پر مسلمان اس وقت بھی نہایت اعلا حوصلگی سے اللہ کی راہ میں خرچ کرتا ہے کہ جب خود اس کے جیب و داماں خالی ہوتے ہیں۔ ایسے خوش نصیب اور ایثار پیشہ بندوں کا تذکرہ اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر کلام مجید میں ان الفاظ میں فرمایا ہے:

وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۚ (الحشر: ۹)

یعنی: "اپنی ضرورتیں روک کر دوسروں کے لیے ایثار کرتے ہیں، خواہ خود بھوکے رہ جائیں۔"

ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ سے پوچھا کہ تم میں سے کس کو اپنے مال کے مقابلے میں وارثوں کا مال زیادہ پسند ہے؟ لوگوں نے کہا کہ ہم میں کوئی ایسا نہیں جس کو اپنے مال سے زیادہ وارثوں کا مال عزیز ہو۔ فرمایا: "تو اس کا مال تو وہی ہے جس کو اس نے آگے بھیجا، یعنی اللہ کی راہ میں خرچ کیا، اور جو اس نے پیچھے چھوڑا وہ تو اس کے وارثوں کا مال ہے۔"

انفاق فی سبیل اللہ کی حقیقت کی اس سے بہتر ترجمانی اور کیا ہو سکتی ہے؟

Marfat.com

اسلام کا نظامِ تعزیرات

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دعوتِ اسلامی کے ابتدائی دور میں ایک دن دیوارِ کعبہ کے سائے میں تشریف رکھتے تھے کہ کچھ صحابہ جو اللہ اور رسولؐ پر ایمان لانے اور صالحیت کی راہ اپنانے کرنے کی پاداش میں مشرکینِ مکہ کی صعوبتیں سہتے سہتے ہلکان ہو چکے تھے، آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ حضورؐ! کیا ہم مصیبت کے ماروں کے لیے دعائے نصرت نہ فرمائیں گے۔ حضورؐ نے جواب دیا کہ تم سے پہلے جو لوگ اس دعوت کو لے کر اٹھے تم جانتے ہو ان کے ساتھ کیا ہوا۔ اللہ کے باغی انھیں کمر کمر تک زمین میں گاڑ دیتے تھے اور پھر اُن کے سروں پر لوہے کی کنگھیاں چلائی گئیں مگر اُن میں سے کوئی بھی راہِ حق سے ہٹنے کو تیار نہ ہوا۔ اللہ کی قسم اگر تم نے صبر سے کام لیا تو اللہ اپنے اِس آخری دین کی تکمیل فرمائے گا اور جب یہ دینِ اسلام غالب ہو جائے گا تو ایک تنہا مسافر صنعاء سے حضرموت تک چلا جائے گا اور اسے کسی گناہ پر اللہ کی پکڑ یا جنگل میں مل جانے والے کسی درندے کے سوا کسی کا خوف نہ ہوگا۔

یہ بات حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس زمانے میں ارشاد فرمائی تھی کہ جب انسان کی جان و مال اور عزت و آبرو کا کوئی محافظ نہیں تھا۔ جو جس غرض سے چاہتا اٹھتا اور جتنی دل چاہتا جانیں لے لیتا۔ جس کا جی چاہتا کسی کا مال لوٹ لیتا اور جس کی عزت و آبرو پر کسی کا ہاتھ پڑ جاتا پھر اس کا کوئی ٹھکانا نہ ہوتا۔

اِن حالات میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تکمیل اسلام اور غلبۂ دین کے جس سب سے نمایاں ثمر کا ذکر فرمایا وہ یہی تھا کہ دین غالب آئے گا تو لوگوں کی جان و مال محفوظ ہو جائے گی۔ اور اسلام نے یہ عظیم کام کر کے دکھا دیا، لیکن اس طرح نہیں کہ ہر ظالم پر ایک سپاہی مسلط کر دیا ہو بلکہ اس طرح کہ لوگوں کو یہ سمجھایا کہ اللہ کی ہر نافرمانی کا نتیجہ نکل کر رہے گا، نیز یہ کہ دوسروں پر ظلم ایسا جرم ہے جسے اللہ بھی مُعاف نہیں فرمائے گا، دوسروں کے حقوق غصب کرنا ایسا جرم ہے کہ اس سے آدمی کی اپنی طاعات اور اپنی نیکیاں بھی جھلس کر رہ جاتی ہیں۔

قرونِ اُولیٰ کے مسلمانوں نے اس تربیت کا ایسا اثر لیا کہ کسی سے تنہائی میں گناہ سرزد

Marfat.com

ہو جاتا ہے جہاں اُس کے اپنے ضمیر کے علاوہ اُس کا کوئی گواہ نہیں، پھر جب اُس کے گناہ کا واحد گواہ یعنی اس کا ضمیر اُسے احساس دلاتا تو یہ جاننے کے باوجود کہ اقرارِ جرم پر جان سے ہاتھ دھونے پڑیں گے، رسوائی ہوگی اور جیتے جی سنگسار ہونا پڑے گا، وہ اٹھتا ہے، عدالتِ نبوی میں اپنے جرم کا اقرار کر لیتا ہے اور اصرار کر کے اپنے خلاف حدُود اللہ کے اجرا کا فیصلہ حاصل کرتا ہے۔ غور کیجیے اس کی وجہ کیا تھی؟ صرف یہ یقین اور اس بات پر ایمان کہ گناہ کے نتائج بہر حال بھگتنے پڑیں گے اور آخرت کے مقابلے میں دنیا کی سخت ترین سزا بھی کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔

اسلام نے دُوسرا طریقہ یہ اختیار کیا کہ اس نے بدی کے تمام سوتوں پر رکاوٹیں کھڑی کر دیں جن سے گناہوں کی گندگی اُبلتی ہے اور لوگوں کے دامنوں کو داغ دار کرتی ہے۔ اسبابِ جرم و گناہ پر قدغن لگانے کا یہ عمل اخلاقی بھی ہے تعلیمی اور معاشی بھی۔ اِس طرح اسلام جس مُعاشرے کی تعمیر کرتا ہے وہ ہر لحاظ سے ایک صالح مُعاشرہ ہوتا ہے۔ اس صالح اور اصلاح یافتہ مُعاشرے میں جو نفوس تمام بیرونی محرّکات پر پابندی کے باوجود فساد پھیلانے کے موجب ہوں تو اسلام کا مزاج یہ ہے کہ جرم ثابت ہونے کے بعد سخت اور عبرت ناک سزا دی جائے اور بعض صورتوں میں ایسے متعفن عضو کو جسدِ ملّت سے کاٹ پھینکا جائے۔

میں بتا چکا ہوں کہ اسلام نے محض تعزیری قوانین نہیں نافذ کیے بلکہ ایسے حالات پیدا کرنے کا انتظام بھی کیا ہے جس میں بُرائی پر اُکسانے اور آمادہ کرنے والے اسباب نابود ہوں، اور یہ ماحول اُس وقت تک قائم نہیں ہو سکتا جب تک مُعاشرے کی بنیاد عدل و انصاف پر قائم نہ ہو۔ اسلام نے جرم و سزا کا تصوّر اسی بنیادی مقصد کے حصُول پر مبنی کیا ہے اور اسے انسانی فطرت سے مکمل طور پر ہم آہنگ کیا ہے۔

اِس کے علاوہ بھی اسلام کے تعزیری نظام کی بعض ایسی خصُوصیّات ہیں جو اسے دنیا کے ہر تعزیری نظام سے ممتاز کرتی ہیں۔ اِس کی ایک مثال قانونِ قصاص میں ملتی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلَى ط (سورہ بقرہ: ۱۷۸)

ترجمہ: "اے اہلِ ایمان! قتل کے سلسلے میں تم پر قصاص عائد کیا گیا ہے۔

اسی آیت میں آگے چل کر ارشاد ہوتا ہے:

فَمَنْ عُفِيَ لَهُ مِنْ أَخِيهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوفِ وَأَدَاءٌ إِلَيْهِ بِإِحْسَانٍ ط ذَٰلِكَ تَخْفِيفٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ فَمَنِ اعْتَدَىٰ بَعْدَ ذَٰلِكَ فَلَهُ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝ (سورہ بقرہ: ۱۷۸)

Marfat.com

یعنی: "ہاں اگر کسی قاتل کے ساتھ اس کا بھائی نرمی کرنے کو تیار ہو تو معروف طریقے کے مطابق خون بہا کا تصفیہ ہونا چاہیے اور قاتل کو لازم ہے کہ راستی کے ساتھ خوں بہا ادا کر دے۔ یہ تمہارے رب کی طرف سے نرمی اور رحم ہے۔ تو جو اس کے بعد بھی کوئی زیادتی کرے تو اس کے لیے دردناک عذاب ہے۔"

اس اصول کی معنویت اور اس کے دُور رس اثرات پر غور کیجیے۔ قاتل اور مقتول کے رشتے داروں کے درمیان کھلی دشمنی اور عداوت عین فطری بات ہے مگر اس کے باوجود انھیں ایک دوسرے کا بھائی بنا کر خوب صورتی کے ساتھ جذبۂ رحم کی تلقین کی گئی ہے۔ یہ خوبی محض اسلامی ضابطۂ جرم و سزا کے ساتھ خاص ہے کہ وہ قاتل اور مقتول کے خاندان میں ہمیشہ باقی رہنے والی کدورت اور رنجش کو بھی دُور کر دینا چاہتا ہے۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے اسلام نے جرم و سزا کا جو ضابطہ مقرر کیا ہے وہ اسلامی حکومت اور معاشرے پر پابندیاں بھی عائد کرتا ہے کہ ایسے حالات برقرار رکھنے کی کوشش ہوتی رہے کہ جرائم کے مواقع پیش نہ آسکیں۔

یہی وجہ ہے کہ مدینۂ منورہ میں قحط پڑا تو حضرت عمرؓ نے چوری کی حد پر عمل موقوف فرما دیا۔

اسلام کے ضابطۂ تعزیرات کا یہ نکتہ بھی بنیادی اہمیت کا حامل ہے کہ وہ کسی مجرم پر بے جا رحم کر کے پورے معاشرے کو فتنہ اور بدامنی میں مبتلا نہیں رکھنا چاہتا۔ اسلامی اصول کے تحت اگر چند آدمیوں سے کسی آبادی کے لوگوں کی عزت اور جان اور مال کو خطرہ پیش آتا رہتا ہے تو ایسے مجرموں کا استیصال اور خاتمہ ضروری ہے تاکہ عام لوگ امن و امان اور حفاظت جان و مال کے ساتھ دروازے پر قفل لگائے بغیر سو سکیں۔

اسلام گناہ کی ترغیبات کے دروازوں کو بند کر کے ارتکابِ جرائم کے لیے ایسی سزائیں متعین کرتا ہے کہ تمام ایمان دار، اچھے اور شریف لوگ اطمینان و سکون کے ساتھ زندگی بسر کریں۔ اُن کی عزت محفوظ رہے۔ اُن کی جان محفوظ رہے۔ اُن کا مال محفوظ رہے۔ وہ گھروں میں ہوں یا بازار میں، بے خطر و بے فکر رہیں، اس لیے کہ اللہ ان کا محافظ ہے اور اس کے قوانین اُن کے لیے حفاظتی ڈھال ہیں۔

غرض اسلام کا جرم و سزا کا تصوّر واضح اور غیر مبہم طور پر منفرد اور امتیازی خصوصیات کا حامل ہے لیکن اس سے معاشرے کو مطلوبہ فوائد صرف اُس صورت میں حاصل ہو سکتے ہیں کہ جب معاشرے اور اس کے افراد کی زندگیاں اُدْخُلُوا فِي السِّلْمِ

Marfat.com

كَآفَّةً (سورہ بقرہ ۲۰۸) کے مُطابق مکمل اسلامی نظام کے تحت ہوں۔ میں اللہ سے دُعا کرتا ہوں کہ وہ ہمیں پورے دین پر عمل کی توفیق عطا فرمائے اور ہمیں اس دین کے دنیوی اور اُخروی ثمرات سے متمتع ہونے کی سعادت سے بہرہ ور فرمائے۔

Marfat.com

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ ط

(آل عمران : ۱۱۰)

اب دنیا میں وہ بہترین گروہ تم ہو جسے انسانوں کی ہدایت و اصلاح کے لیے میدان میں لایا گیا ہے۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو، بدی کو روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔

انسان اور معاشرہ

Marfat.com

معاہدات

دنیا کی کوئی سوسائٹی، کوئی سماج، کوئی معاشرہ ہو اس کی بقا اور اس کی زندگی عہد و پیمان کے احترام پر مبنی و منحصر ہوتی ہے۔ جس معاشرے کے افراد باہمی تعلقات میں، انفرادی لین دین میں اور اجتماعی معاملات میں قابل اعتماد ہوں، وعدوں کا پاس و لحاظ کرتے ہوں اور جو بات کہتے ہوں اس کی صداقت مشکوک اور اس کا اعتبار مشتبہ نہ ہو وہ معاشرہ نہ صرف ترقی کرتا ہے بلکہ دنیا کے لیے ایک مثال بھی ہوتا ہے۔ اس کے برعکس جس معاشرے کے افراد عہد و پیمان کی پابندی نہیں کرتے وہ گویا زوال کو دعوت دیتے ہیں۔ ایسا معاشرہ اپنا اعتبار اور وقار کھو دیتا ہے اور اس کا دنیا میں کوئی مقام نہیں رہتا۔ فرد کی طرح ہر معاشرے کی بھی اپنی ایک شخصیت ہوتی ہے۔ یہ شخصیت ان اوصاف اور عوامل سے بنتی ہے کہ جو اس معاشرے کے افراد اپنے قول و عمل میں برتتے ہیں۔ یہی شخصیت ایک معاشرے کو دوسرے معاشرے سے ممتاز و ممیز کرتی ہے اور اس کی بنا پر قوموں کی برادری میں اس کا مقام متعین ہوتا ہے۔ جس معاشرے میں جس قسم کے لوگوں کی اکثریت ہوگی، اسی قسم کا اطلاق اس معاشرے پر بھی ہوگا۔ مثلاً اگر کسی جماعت یا قوم کے افراد کی زیادہ تعداد سست اور کاہل ہو تو اس قوم کو بھی مجموعی طور پر کاہل کا لقب مل جائے گا۔ اسی طرح افرادِ قوم کی اکثریت اپنے معاملات و معاہدات سے جس قسم کا تاثر دوسری اقوام پر قائم کرے گی وہی تاثر پوری قوم پر منطبق ہوگا۔ اسی لیے مصلحین اور ماہرینِ عمرانیات اپنی قوم کی بقا کے لیے وہ اوصاف نمایاں کرنا چاہتے ہیں جو اس کو قابلِ اعتبار اور باوقار بنا دیں اور جن سے قومی شخصیت نکھر کر سامنے آجائے۔ یہی چیز کسی معاشرے کو عزت و احترام کا مستحق بناتی ہے۔

اسلام نے معاشرے کے استحکام کے لیے جو بنیادیں فراہم کی ہیں ان میں دوسرے اعلا اخلاقی معیارات کے ساتھ عہد کی پابندی کو بڑی اہمیت دی ہے اور معاہدات کا احترام بڑی وضاحت کے ساتھ سمجھا دیا ہے۔ اسلام کے نزدیک عہد کی پابندی بنیادی اخلاقی

Marfat.com

اقدار میں سے ہے جس کے بغیر کسی اجتماعی نظام کی اساس مستحکم نہیں ہو سکتی، اور جس کے بغیر کوئی فرد، کوئی قوم یا کوئی معاشرہ امن وسلامتی کی زندگی نہیں گزار سکتا باہمی معاہدات کے علاوہ جو معاہدات ایک قوم دوسری قوم سے کرتی ہے وہ اور زیادہ اہمیت رکھتے ہیں، کیوں کہ قوموں کی برادری میں انھی کی پابندی یا عدم پابندی کی بنا پر کسی قوم کا مقام پست یا بلند ہوتا ہے۔ قرآن حکیم میں ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ:

وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ ۚ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا ○ (الاسراء: ۳۴)

یعنی: "عہد پورا کرو، کیوں کہ اس کے بارے میں تم سے جواب لیا جائے گا۔"

اس حکم سے بآسانی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ عہد کی پابندی کتنی ضروری قرار دی گئی ہے اور اس کے لیے صاف بتا دیا گیا ہے کہ عہد کے سلسلے میں جواب طلبی ہوگی۔ اگر جواب طلبی سے بچنا چاہتے ہو تو عہد کی پابندی کو قرآن حکیم لازمی قرار دیتا ہے:

وَاَوْفُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ اِذَا عٰهَدْتُّمْ (النحل: ۹۱)

یعنی: "جب کوئی معاہدہ کرو تو اس کی پابندی تم پر لازم ہے۔"

ان ارشادات کی روشنی میں یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ کوئی مسلمان عہد کی خلاف ورزی نہیں کر سکتا۔ مسلمان کے لیے وعدہ خلافی کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کو دنیا میں اس کے برے نتائج بھگتنے کے علاوہ آخرت میں جواب دِہ ہونا پڑے گا۔ ایک عام آدمی کو تو صرف مادّی نقصان کا خوف ہی عہد شکنی سے روکتا ہے، لیکن ایک مسلمان کو دنیا میں بے عزت ہونے کے علاوہ عقبیٰ میں سزا کا خوف بھی معاہدے کو توڑنے سے باز رکھتا ہے۔

بعض لوگ معاہدہ کرتے وقت صرف اس کے فوائد کو پیش نظر رکھتے ہیں، لیکن جو ذمہ داریاں اس معاہدے کی رو سے ان پر عائد ہوتی ہیں اُن کو یہ سوچ کر نظر انداز کر دیتے ہیں کہ دیکھا جائے گا۔ ظاہر ہے کہ یہ تصور صحیح نہیں ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کے دل میں معاہدے کے احترام کا صحیح جذبہ بیدار ہی نہیں ہوتا اور جب ذمہ داریوں کے پورا کرنے کا وقت آتا ہے تو وہ تاویلیں ڈھونڈنے لگتے ہیں اور ذمہ داریوں کی تکمیل سے گریز کرتے ہیں۔ سورۃ النحل میں ان لوگوں اور قوموں کو تنبیہ کی گئی ہے جو معاہدات کو دھوکے اور فریب کا ذریعہ بناتے ہیں اور معاہدہ کرتے وقت ان کے دل میں اس کا احترام نہیں ہوتا، بلکہ وہ یہ سوچ لیتے ہیں کہ معاہدے میں جو پہلو اُن کے فائدے

Marfat.com

کے ہیں ان سے تو مستفید ہوں گے، لیکن جن پہلوؤں یا شقوں سے ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں ان کا احترام نہیں کریں گے۔ فرمایا گیا ہے:

تَتَّخِذُوْنَ اَيْمَانَكُمْ دَخَلًا بَيْنَكُمْ اَنْ تَكُوْنَ اُمَّةٌ هِيَ اَرْبٰى مِنْ اُمَّةٍ ۭ اِنَّمَا يَبْلُوْكُمُ اللّٰهُ بِهٖ ۭ (النحل: ۹۲)

یعنی: "تم اپنی قسموں کو آپس کے معاملات میں مکر و فریب کا ذریعہ بناتے ہو، تاکہ ایک قوم یا جماعت دوسری قوم یا جماعت سے بڑھ کر فائدے حاصل کر لے۔ اللہ تعالیٰ تم کو عہد و پیمان کے بارے میں آزمانا چاہتا ہے۔"

اس انتباہ سے یہ نکتہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ اگر مکر و فریب کے ذریعہ سے ایک قوم دوسری قوم سے کوئی فائدے حاصل کرے تو یہ صورت بھی پسندیدہ نہیں ہے۔ یہاں یہ امر بھی غور طلب ہے کہ جب دو قوموں میں معاہدہ ہو تو ضروری نہیں ہے کہ دوسری قوم یا جماعت بھی مسلمان ہو۔ ایک مسلمان قوم ایک غیر مسلم قوم سے بھی کوئی معاہدہ کر سکتی ہے، لیکن اس صورت میں بھی معاہدے کی پابندی ہونی چاہیے اور معاہدے کے فوائد اور ذمہ داریوں دونوں کو پورا کرنا چاہیے، کیوں کہ اسلام کسی ایسے فائدے کو پسند نہیں کرتا جس کی بنیاد دغا اور فریب پر ہو اور وہ کسی دوسری قوم کو بھی نقصان نہیں پہنچانا چاہتا۔ چناں چہ اسلامی تاریخ میں ایسے متعدد واقعات موجود ہیں جن میں مسلمانوں نے غیر قوموں سے معاہدہ کر کے اس کی پوری پابندی کی ہے اور معاہدے کی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے لیے نقصانات بھی اٹھائے ہیں۔ البتہ اسلام مسلمانوں کو کوئی ایسا معاہدہ کرنے کی اجازت نہیں دیتا جو اسلام کو نقصان پہنچانے کا باعث ہو، کیوں کہ اگر مسلمان ایسا کوئی معاہدہ کر لیں گے تو اس کی پابندی ان پر لازم ہو جائے گی اور اس کے نتیجے میں اسلام کو اور ملّتِ اسلام کو نقصان پہنچے گا۔ اس لیے مسلمانوں پر فرض ہے کہ وہ کوئی معاہدہ کرنے سے پہلے خوب غور کر لیں اور سمجھ لیں کہ اس معاہدے کے نتیجے میں اسلام کے اصولوں کی خلاف ورزی تو نہ ہو گی۔ جب اچھی طرح سوچ سمجھ لیں اور تجزیہ کر کے دیکھ لیں کہ یہ معاہدہ اساسِ دین کے لیے مضر نہیں ہے تو پھر معاہدہ کریں اور اس جذبہ کے ساتھ کریں کہ وہ اس کا احترام کریں گے اور اس کی رو سے جو ذمہ داریاں ان پر عائد ہوں گی ان کو ہر قیمت پر نیک نیتی کے ساتھ پورا کریں گے۔

تجارت میں لوگ عام طور پر اپنے فائدے کو فوقیت دیتے ہیں اور اعتبار قائم کرنے کے لیے جھوٹے وعدے، حتیٰ کہ جھوٹی قسموں تک سے گریز نہیں کرتے۔ اس کے نتیجے

Marfat.com

میں عہد شکنی ہوتی ہے۔ اسلام اِس صورت کو بھی پسند نہیں کرتا اور سختی کے ساتھ جھوٹے عہد اور جھوٹی قسموں سے روکتا ہے۔ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "قیامت کے روز خدا تعالیٰ نہ اس شخص سے بات کرے گا نہ اس کی طرف منہ اٹھا کر دیکھے گا اور نہ اس کو پاک صاف کر کے جنّت میں داخل کرے گا جو جھوٹی قسمیں کھا کھا کر اپنے کاربار کو فروغ دینے کی کوشش کرتا ہے۔" حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد یہ بھی ہے کہ:

"سچا اور امانت دار تاجر قیامت میں نبیوں، صدیقوں اور شہیدوں کے ساتھ ساتھ ہوگا۔"

غرض معاہدہ چاہے دو افراد کے درمیان ہو، یا دو اقوام کے درمیان، چاہے اس کی نوعیت سیاسی ہو یا تجارتی، اجتماعی ہو یا ذاتی اس کی پابندی اور تعمیل ضروری ہے، اور یہ ہر مسلمان کا فرض ہے۔

اس روشنی میں ہمیں اپنے موجودہ طریقوں کا جائزہ لینا چاہیے کہ عہد و پیمان اور معاہدات کی پابندی کی جو تعلیم ہمیں دی گئی ہے ہم اس پر کس حد تک عامل ہیں اور اس کے ثمرات و فوائد سے کس حد تک مستفید ہو رہے ہیں۔

Marfat.com

معاشرتی آداب

روئے زمین پر ہر معاشرہ اپنے افراد کی زندگی کے آداب اور طور طریقوں کے بارے میں کچھ اصول رکھتا ہے۔ گزر بسر، رہن سہن، آپس کے روابط و تعلقات، ملنے جلنے اور مختلف اجتماعی موقعوں پر برتنے کے یہ اصول ہر معاشرے نے اپنی ذاتی ضروریات مقامی حالات اور رسم و رواج کے پیش نظر مقرر کیے ہیں، لیکن اسلام اس میدان میں بھی اپنی انفرادیت برقرار رکھتا ہے۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہمارے اصولِ حیات، طرزِ سلوک اور معاشرت کے آداب وحیِ الٰہی پر مبنی ہیں۔

اسلام میں معاشرتی آداب کی بنا، رسم و رواج اور اسی طرح کی عارضی اور محدود، غیر مستقل اور غیر حقیقی باتوں پر نہیں ہے۔ اور ایسا اس لیے ہے کہ دینِ اسلام روزِ اوّل ہی سے ایک آفاقی اور عالمگیر دین کی حیثیت سے وضع کیا گیا ہے۔ چناں چہ اس کے ماننے والوں کی زندگی میں ہم آہنگی کی روح اور یکسانیت ضروری تھی۔ ہم مسلمان اس بات پر فخر کر سکتے ہیں کہ ہمارے آدابِ معاشرت کی بنا اُس اللہ علیم و خبیر کی ہدایات پر ہے جو انسان اور حیاتِ انسانی کی ضروریات سے باخبر ہی نہیں ان کا خالق بھی ہے۔

اس طرح اسلامی معاشرتی آداب کو دو اہم خصوصیات حاصل ہوتی ہیں۔ ایک تو یکسانیت ہے۔ جس کی ایک معمولی مثال سلام کا طریقہ ہے۔ مشرق و مغرب اور شمال و جنوب میں جہاں کہیں بھی دو مسلمان آپس میں ملیں گے تو ان کے اس عالمی اسلامی برادری سے انتساب کی پہلی علامت "السلام علیکم" کے دل پذیر الفاظ ہوں گے۔ اور یہ یکسانیت ہر حال میں باقی رہے گی خواہ ان دونوں کی زبانوں میں کتنا ہی بُعد کیوں نہ ہو۔

دوسری خصوصیت یہ ہے کہ ان آداب کو وحیِ الٰہی پر مبنی رکھنے کے نتیجے میں انسانی زندگی کے تمام گوشے اور تمام پہلو براہ راست دین سے متعلق ہو جاتے ہیں۔ اور ان کی وجہ سے آدمی میں یہ احساس ہر وقت ہر جگہ اور ہر موقع پر زندہ اور موجود رہتا ہے کہ اسے اپنے ہر انفرادی فعل اور اجتماعی عمل میں وحیِ ربّانی کا اتباع کرنا ہے۔ قرآن وہ کلامِ الٰہی ہے

Marfat.com

کہ جس میں حق تعالیٰ جل شانہٗ نے اس دنیائے فانی میں زندہ رہنے کے ضابطے اور معاشرت و معیشت کے تمام اصول پوری جامعیت کے ساتھ اور بڑی فصاحت و بلاغت کے ساتھ بیان کر دیے ہیں۔ پھر اللہ کے رسول نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کے تمام اصول و احکامات کے مطابق اپنی زندگی بسر کر کے عمل کا راستہ دکھا دیا۔ آں حضرتؐ کی حیات کا کوئی گوشہ کسی انسان سے پوشیدہ نہیں رہا۔ اور ان کا کوئی قول نہیں کہ جو ریکارڈ نہ کیا گیا ہو۔ ان کی پوری زندگی اور نمونۂ عمل ہمارے سامنے ہے اور ساری دنیا کے سامنے موجود ہے۔ جب ہم معاشرتی آداب کی بات کرتے ہیں تو سب سے پہلے ہم کو قرآن و حدیث پر یقین کامل اور ایمان راسخ ہونا چاہیے۔ آج بھی یہ بات ساری دنیا تسلیم کرتی ہے کہ قرآن وہ کتاب ہے کہ جس نے اس دنیا میں سب سے بڑا اور سب سے عظیم انقلاب برپا کیا ہے۔ اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہ عظیم و بلند شخصیت ہیں کہ جن کی ذات والا صفات نے اس دنیا کے انسانوں کو سب سے زیادہ متاثر کیا ہے۔

یہ دور علم و حکمت کی عظمتوں کا دور ہے اور آج کا انسان سائنس کی بے مثال اور بے تکان پیش رفت کی بدولت انکشافات و اکتشافات کے علم بلند کرتا چلا جا رہا ہے اور تسلیم کر رہا ہے کہ قرآن اور محمدؐ نے اس کرۂ ارض کو سب سے عظیم انقلاب سے روشناس کیا ہے۔ حتیٰ کہ وہ اقوام و ملل کہ جو آج سر بلند و سرفراز ہیں ان کے آدابِ معاشرت اور اصولِ معیشت حتمی طور پر اور یقینی طور پر قرآن اور حدیث سے متاثر اور ماخوذ ہیں۔ حیرت ہوتی ہے اور دل دکھتا ہے اور احساسِ شرم ہوتا ہے کہ وہ اسلام کہ جس نے اس صفحۂ ارض کی ہر قوم و ملت کو اس طرح اور اس درجہ متاثر کیا ہو خود اس کے پیرو، یعنی مسلمان اس سے آج متاثر نظر نہیں آتے۔ ان کی اپنی زندگیاں نمونۂ اصول اسلام نہیں رہی ہیں۔ اس کے نتیجے میں مسلمان ہی خود غور کریں کہ آج اس دنیا میں وہ کہاں کھڑے ہیں؟ اقوام و ملل میں ان کا مقام کیا ہے؟

معاشرتی آداب میں سب سے بلند مقام اخلاق کا ہے۔ اسلام نے زندگی میں اخلاق کو سب سے زیادہ بلند مقام دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے رسول برحقؐ کو معلم الاخلاق فرمایا ہے۔ اور ان کے لیے فرمایا:

اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ٥ (القلم: ۴)

اور پھر اللہ کے رسولؐ نے فرمایا:

Marfat.com

"مسلمانوں میں سب سے زیادہ کامل ایمان اس شخص کا ہے جس کے اخلاق عمدہ ہوں"
اور فرمایا:
"میزان میں جو چیز سب سے زیادہ بھاری ہوگی وہ حسنِ اخلاق ہے" اور یہ کہ "کسی انسان کا ایمان کامل نہیں ہوتا جب تک اس کے اخلاق اچھے نہ ہوں"
بے شک اسلام کی روشنی تھی اور بلاشبہ اخلاق کا نور تھا کہ مٹھی بھر مسلمان صحرائے عرب سے اٹھے اور سورج کی روشنی اور چاند کے نور کی طرح صفحۂ ارض پر ضیا پاشی کرنے لگے۔ ان سچے اور پکے مسلمانوں نے اللہ کی مخلوق کے دل جیت لیے اور عظمتِ اسلام کے جھنڈے بلند کر دیے۔ فضائے ارض اللہ اکبر، اللہ اکبر کی پُر سُرور آوازوں سے معطر ہوگئی۔ ہم اس دور کے مسلمان بھی اپنے اس ماضی پر غور کریں اور ذرا اپنے حال کو دیکھیں۔ اخلاق کی بلندی جب کیا تھی اور زوالِ اخلاق کی اب کیا کیفیت ہے۔

یاد رکھنا چاہیے کہ قرآن کی ہدایت دائمی ہے اور تبدیل نہیں ہو سکتی۔ رسولِ برحق کی رہنمائی ابدی ہے، کیوں کہ وہ تابعِ قرآن ہے۔ ہم جب تک اس سرچشمۂ ہدایت سے فیض حاصل کریں گے اور اعمالِ نبوی کو رہنما بنائیں گے سربلندی ہمارا مقدر رہوگی۔ مگر جب ہم اس سے روگردانی کریں گے ذلت کے گڑھے میں جا گریں گے اور اقوامِ عالم میں ہمارا کوئی ممتاز مقام نہ ہوگا۔

معاشرتی آداب میں سب سے پہلا ادب یہ ہے کہ ہم اپنے اخلاق کو بلند کریں۔ ہم مسلمان ہیں اور بھائی بھائی ہیں۔ ہم ایک دوسرے کی عزت کریں اور ایک دوسرے کا احترام کریں۔

عزت و احترام سب سے اہم اخلاق ہے۔ معاشرتی آداب یہ ہیں کہ اولاد، ماں باپ کا احترام کرے۔ شاگرد استاد کا ادب کرے۔ بزرگ بچوں سے محبت کریں اور بچے بزرگوں کے سامنے سرِ تسلیم خم کریں۔ اس کے بغیر معاشرتی ادب کا کبھی حق ادا نہ ہوگا۔

ہماری معاشرتی ناہمواریوں نے اور آدابِ معاشرت سے صرفِ نظر نے نہ صرف ہماری اپنی زندگیوں کو بے مزہ اور تلخ کر دیا ہے اور سکون و اطمینان کی سچی دولت سے ہمیں محروم کر کے رکھ دیا ہے بلکہ ہمارے پیارے وطن کے لیے شدید ترین مسائل پیدا کر دیے ہیں۔

Marfat.com

معاشرتی آداب کا سب سے پہلا اور سب سے بڑا تقاضا یہ ہے کہ ہم اپنے دین اور دنیا کے ہر معاملے کو درست کریں۔ اتحاد و اتفاق کا مظاہرہ کریں۔ امانت اور دیانت کو اپنائیں۔ پرہیزگاری کی زندگی بسر کریں۔ حیا و شرم کو زیور بنائیں۔ ایفائے عہد کریں غیرت اور قناعت کی راہ اختیار کریں۔ ہماری زبانوں پر کلمہ کذب اور ایک لفظ جھوٹ کا نہ آئے اور ہم صدق مقال ہوں اور سچائی ہمارا شیوہ ہو۔ کسبِ حلال اور رزقِ حلال پر ہمارا یقین ہو۔ عجز و انکسار ہمارا اصول ہو۔ حفظِ لسان ہمارا وطیرہ ہو۔

یہ سب معاشرتی آداب ہیں جن کو ہم سب جانتے ہیں۔ یہ قرآن و حدیث سے ماخوذ ہیں۔ آئیے ہم پوری قوم و ملت مل کر ان پر عمل کریں۔ یاد رکھیے زبانی جمع خرچ اب بے کار ہے۔ یہ عمل اور عملِ پیہم کا وقت ہے۔ اگر ہم کو زندہ رہنا ہے اور پاکستان کو زندہ جاوید بنانا ہے تو ہم کو انسان بننا ہو گا اور سچّا مسلمان بننا ہو گا۔ قرآن کی تعلیم اور اللہ کے رسول ﷺ کی عملی زندگی کو نمونہ بنا کر ہم یقیناً اپنا کھویا ہوا مقام اور اپنا گنوایا ہوا احترام حاصل کر سکتے ہیں۔

پاکستان کے سچے مسلمان نوجوانوں کے بازو عالمی انقلاب کو جنم دے سکتے ہیں اور عالم اسلام میں ایک بحرانی دور کا دھارا ہم موڑ سکتے ہیں۔ اللہ تبارک و تعالیٰ ہمارا حامی و ناصر ہو۔

Marfat.com

رسموں کی پابندی

انسان اپنی اجتماعی زندگی کے مختلف شعبوں میں ان اساسی اور اجمالی احکام و ہدایات کے علاوہ، جو مذہب اور شریعت اسے عطا کرتے ہیں، خود بھی کچھ قاعدے اور آداب وضع اور اختیار کر لیتا ہے جن کو رسوم بھی کہا جاتا ہے۔ اور اس طرح ایک حد تک یہ رسوم مذہب و شریعت کے اساسی و اجمالی احکام و ہدایات کی تفصیل کے طور پر ہوتی ہیں، مگر ایک پہلو سے ان کی نوعیت شرعی احکام و ہدایات میں اضافے کی بھی ہوتی ہے اور کبھی یہ رسوم احکام شرعی کی روح سے متصادم اور ان کے منافی بھی ہوتی ہیں۔

ہر مسلمان جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں زندگی کے ہر شعبے اور ہر مرحلے کے متعلق ہدایات عطا فرمائی ہیں اور رسولِ خدا نے اللہ تعالیٰ کے ارشادات و احکامات کی وضاحت اپنی زبانِ مبارک سے بھی فرما دی ہے، اور اپنے عمل سے بھی اس کا نمونہ دکھا دیا ہے۔ ہمیں اپنی اجتماعی زندگی میں مختلف مراحل سے گزرنا پڑتا ہے اور مختلف مواقع سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ یہ مراحل اور مواقع بنیادی طور پر دو ہی نوعیت کے ہوتے ہیں، خوشی اور غم۔ ہماری بعض تقریبات خوشی پر مبنی ہوتی ہیں اور اظہار مسرت کے لیے منعقد کی جاتی ہیں۔ بعض تقریبات کسی غم ناک حادثے اور واقعے سے متعلق ہوتی ہیں اور اظہار غم اور اظہار ہمدردی کے لیے برپا ہوتی ہیں۔ شادی، بچے کی ولادت، عقیقہ، ختنہ، بسم اللہ، آمین، صحت یابی، طویل سفر سے واپسی، کسی مقصد میں کامیابی اور کسی ادارے کے افتتاح پر خوشی کی تقریبیں ہوتی ہیں۔ موت، بیماری، ناکامی وغیرہ غم کے مواقع ہوتے ہیں۔

خوشی اور غم کے مواقع پر جو جو رسمیں ہمارے ملک میں رائج ہیں ان میں سے بعض کے جائز ہونے سے انکار مشکل ہے، لیکن بعض ایسی بھی ہیں جن کی کراہت میں شبہ نہیں کیا جا سکتا اور بعض میں ناجائز ہونے کا پہلو بھی نکلتا ہے۔ آپ اس قسم کے مواقع پر ادا کی جانے والی رسموں کا تجزیہ کریں تو اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ خوشی کے مختلف

Marfat.com

مواقع پر ہمارے ہاں جو رسمیں عام ہو گئی ان میں سے بہت سی رسمیں جائز اور مباح ہیں، بشرطیکہ ان میں اسراف سے کام نہ لیا گیا ہو، ان میں غیر ضروری خرچ نہ کیا گیا ہو۔ البتہ بعض رسمیں شرعی نقطۂ نظر سے ہمت افزائی کی مستحق نہیں ہیں۔

اس کے برعکس غم کے مواقع پر ادا کی جانے والی رسموں میں سے کچھ رسمیں مباح و جائز ہیں، کچھ مکروہ ہیں اور کچھ ایسی بھی ہیں جن کو علمائے اسلام نے جائز نہیں بتایا ہے۔ اس کا سبب یہی سمجھ میں آتا ہے کہ تقاریبِ مسرّت کی رسوم میں اسراف اور جذبۂ نمائش کی تسکین سے آگے بات نہیں بڑھتی، مگر تقاریبِ غم کی رسوم کے ساتھ تقرّبِ الٰہی کا تصوّر بھی ہوتا ہے یعنی غم کے مواقع پر اور خصوصاً موت کی مجلسوں میں ہم بعض ایسے افعال انجام دے کر اور ایسے مصارف کر کے اور بعض رسمیں ادا کر کے یہ گمان کرنے لگتے ہیں کہ یہ تقرّبِ خداوندی کا ذریعہ ثابت ہوں گی، حالانکہ کسی ایسے قاعدے کو جو خود ہمارا اپنا بنایا ہوا ہو اور جس کا شارع علیہ الصلوٰۃ والسّلام کی حیاتِ مبارکہ میں کوئی نمونہ نہ ملتا ہو، بلکہ جس میں ناجائز ہونے کا پہلو نکلتا ہو، اُس کو اللہ تعالیٰ کی رضامندی کا ذریعہ سمجھنا حرام ہے۔

شادی کے سلسلے میں ہمیں سرکارِ دوعالم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی سیرتِ پاک اور صحابۂ کرام[رض] کی سیرتوں میں جو نمونے ملتے ہیں وہ سادگی کے معیاری نمونے ہیں۔ صحیح چیز یہی ہے کہ اپنی تقریبوں میں ہم ان معیاری نمونوں کی کامل تقلید کریں۔ ہمیں ان رسوم سے ضرور بچنا چاہیے جن میں حرمت اور کراہت کا پہلو نکلتا ہو اور ان رواجوں سے پرہیز کرنا چاہیے جو اسراف و تبذیر اور بے جا خرچ کے ذیل میں آتے ہیں۔ البتہ ان رسموں کے برتنے میں کوئی حرج نہیں ہے جو تمدّن کی پیچیدگی کی بنا پر رائج ہوئی ہیں اور جن میں بہت سی معاشرتی مصلحتیں ہیں جو بے ضرر ہیں، نقصان رساں نہیں ہیں اور جن میں نمائش کا پہلو نہیں ہے۔

رسموں کے سلسلے میں ایک خاص بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ جن رسموں میں عقیدے کی کھُلی کھُلی گمراہی ہوتی ہے اُن پر عمل کرنا تو ظاہر ہے کہ سراسر گناہ ہے، لیکن جن رسموں کو علمائے دین نے جائز اور مباح قرار دیا ہے وہ بھی ضروری، واجب العمل اور فرض تو نہیں ہیں۔ سوچنے کی بات یہ ہے، اور اس پر ہمیں بار بار غور کرنا چاہیے کہ ایسی رسمیں جو نہ ضروری ہوں اور نہ فرض بلکہ جن کو صرف جائز کہا جا سکتا ہو اُن پر

Marfat.com

اصرار آخر کہاں کی عقل مندی ہے! خصوصاً ایسی صورت میں کہ جب ان رسموں پر عمل کرنے کے لیے کچھ فرائض و واجبات کو ترک کرنا پڑے، مثلاً شادی میں دولہا کی طرف سے ولیمے کی دعوت سنّت ہے۔ آپ کو اللہ نے دیا ہے تو عزیزوں اور دوستوں کو مدعو کیجیے۔ اچھے سے اچھا کھانا کھلائیے اسی کے ساتھ غریبوں اور ناداروں کا بھی خیال رکھیے۔ دعوت کو اپنے ہمسروں اور ہم مرتبہ لوگوں تک محدود نہ رکھیے بلکہ معاشرتی مساوات کا اظہار کیجیے۔

دلہن والوں کی طرف سے برات کے کھانے کا اہتمام ایک ایسی رسم ہے جس کا سنّت نبوی میں کوئی نمونہ نہیں ملتا اور نہ صحابہ کرام کے عہد میں کوئی نظیر ملتی ہے۔ پھر بھی شریعت میں اس کی اجازت ہے، لیکن سوچنا یہ ہے کہ ہم فرائض اور واجبات کے ادا کرنے میں اتنے مستعد کیوں نہیں ہیں جتنے ناجائز یا غیر واجب امور کے ادا کرنے پر مُصر اور بضد ہیں؟ پھر اس جائز اور صرف جائز رسم یعنی برات کے کھانے کی خاطر اگر ہمیں کسی ناجائز فعل کا ارتکاب کرنا پڑے مثلاً سود پر قرض لینا یا زیادہ رقم صرف کر دینا جس سے دوسروں کے حقوق تلف ہوتے ہوں تو اس رسم کا جائز رہنا بھی مشکوک و مجروح ہو جاتا ہے، یا رسم کی ادائی کے لیے وسائل فراہم نہ ہونے کی وجہ سے اصل کام میں تاخیر، مثلاً بچے کی ختنہ کرانا سنّت ہے۔ آپ اس سنت کی ادائی کی خوشی میں ایک تقریب بھی کرنا چاہتے ہیں۔ آپ کی یہ خواہش فطری ہے اور ناجائز نہیں کہی جا سکتی، لیکن اس خواہش کو پورا کرنے کے انتظام میں بچے کی عمر زیادہ ہو جاتی ہے اور اس عمر میں ختنہ کروانے سے بے حیائی و بے حجابی کی نوبت آجاتی ہے تو آپ کی یہ خواہش جائز نہیں رہے گی۔

غور کیجیے تو اندازہ ہوگا کہ بہت سی رسموں میں اسراف اور فضول خرچی راہ پا گئی ہے۔ فضول خرچی کے نقصانات اور تکلیفیں ظاہر ہیں۔ اس کی وجہ سے انسان نہ صرف مالی طور پر پریشان ہوتا ہے بلکہ اخلاقی لحاظ سے بھی نقصان اٹھاتا ہے۔ اللہ نے اسراف کرنے والوں کو پسند نہیں فرمایا:

اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ ۝ (الاعراف: ۳۱)

فضول خرچی پر ناپسندیدگی کا اظہار فرما کر اللہ تعالیٰ نے انسان کو غیر ضروری بوجھ سے آزاد کیا ہے، لیکن انسان خود اپنے اوپر زیادہ سے زیادہ بوجھ لادتے جا رہے ہیں۔ رسم و رواج کی پابندیوں کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دینا اور ان کو اپنے اوپر لازم

Marfat.com

قرار دے لینا بھی اپنے اوپر بوجھ میں اضافہ کرنا ہے جس سے بہت سی اقتصادی، معاشرتی اور اخلاقی برائیاں پیدا ہوتی ہیں اور فرد اور معاشرہ دونوں متاثر ہوتے ہیں۔

رسموں کی پابندی کا ایک اور پہلو بھی ہے۔ جائز رسموں میں بعض رسمیں اپنے نتائج کے لحاظ سے مفید بھی ہیں، لیکن عجیب بات یہ ہے کہ ان کا رواج کم سے کم تر ہوتا جا رہا ہے۔ مثلاً بسم اللہ کی رسم ہے جس کو لوگ اب اتنا ضروری نہیں سمجھتے جتنا پہلے سمجھا جاتا تھا۔ اس رسم سے بچے کی تعلیم کا آغاز ہوتا ہے اور اس طرح تعلیم اور حصول تعلیم کی اہمیت غیر شعوری طور پر اس کے ذہن نشین ہو جاتی ہے۔ بچہ اپنی زندگی کے ایک نئے دور کا آغاز کرتے ہوئے اس کے لیے تیار ہو جاتا ہے، اور اس تقریب سے خود اس کی نظر میں اپنی قدر و قیمت بڑھ جاتی ہے۔ اس کے ساتھ تقریب میں شریک دوسرے بچوں کو بھی پڑھنے لکھنے کی ترغیب ہوتی ہے اور ان کے شوق میں اضافہ ہوتا ہے۔ اسی طرح ختمِ قرآنِ مجید پر آمین کی رسم ہے۔ یہ بھی یہی مقصد پورا کرتی ہے۔ ایسی رسموں کو برقرار رکھنے میں فائدہ ہے۔ شرط وہی ہے کہ رسم کو رسم ہی رہنے دیا جائے فرض نہ بنا لیا جائے اور تقریب میں سادگی اور اعتدال کو ملحوظ رکھا جائے۔ فضول خرچی، نمائش اور دوسروں پر برتری اور تفوق کا ذریعہ نہ بنایا جائے جس سے سماجی ہم آہنگی کے بجائے معاشرتی برائیاں پھیلتی ہیں۔

اپنی تمام رسموں میں ہمیں اس نکتے کو پیشِ نظر رکھنا چاہیے۔

Marfat.com

آدابِ محفل

اسلام چوں کہ ایک مکمل نظامِ حیات ہے، اس لیے انسانوں کو ان کی تمام ضرورتوں کے لیے مناسب ہدایات پیش کرتا ہے اور طریقے بتاتا ہے۔ عقائد اور عبادات کی اہمیت تو تقریباً تمام ہی ادیان میں کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے، لیکن ان دو باتوں کے علاوہ معاملاتِ زندگی کے متعلق بھی کچھ نہ کچھ باتیں بتائی گئی ہیں۔ سبھی مذہبوں میں اخلاق پر زور دیا گیا ہے۔ اچھی عادتوں کی تلقین کی گئی ہے اور بری باتوں سے بچنے کی تاکید کی گئی ہے۔

اگرچہ معاملات کے سلسلے میں جتنی تفصیلی اور مکمل ہدایات اسلامی شریعت میں پائی جاتی ہیں ویسی دوسرے مذاہب میں موجود نہیں ہیں، بہ ایں ہمہ زمانے کی ضرورت کے مطابق کچھ نہ کچھ ہدایات وہاں بھی موجود ضرور ہیں۔ اسلام ایک مکمل دین ہے اس لیے معاملات اور اخلاقِ حسنہ پر بڑا زور دیا گیا ہے اور اس بات پر اصرار کیا گیا ہے کہ انسان بہ حیثیتِ انسان جب اسلام کے حلقے میں آتا ہے تو اسے اپنی گفتار، کردار اور معاملات سے بہ ظاہر کرنا چاہیے کہ وہ ایک برتر شریعت کا حامل ہے ــــ ایسی شریعت کا کہ جب اس پر عمل کیا جائے تو انسان کی قلب ماہیت ہو جاتی ہے اور وہ فرشتوں کے لیے بھی باعثِ رشک ہو جاتا ہے۔

اسی لیے عقائد و عبادات اور معاملات کے علاوہ اسلام نے مجلس کے آداب کی بھی تعلیم دی ہے۔ ایک انسان گھر میں اکیلا ہو تو آزاد ہے، جیسے چاہے رہے، لیکن جب وہ کسی مجمع یا جماعت یا مجلس میں شریک ہوتا ہے تو اس کی حیثیت مجلس کے ایک فرد کی ہوتی ہے، اس لیے اس پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ مجلس میں اس طرح شریک ہو اور اس طرح بات چیت کرے کہ تمام مجلس والوں کے لیے اس کی موجودگی خوش گوار اور پسندیدہ ہو۔ اس کا آنا جبر نہ ہو۔ اور مجلس میں تہذیب اور وقار کی شکل پیدا ہو۔ اس کا بنیادی اصول یہ ہے کہ ہر شخص اس بات کو مدنظر رکھے کہ تمام شرکائے مجلس میں سے ہر ایک کا حق برابر ہے۔ مساوات اور برابری کا ماحول اس طرح قائم کیا جائے کہ شرکائے مجلس میں باہمی محبت والفت بڑھے۔ غرض مجلس ایک باوقار نشست ہو اور محبت والفت کا گہوارہ ہو۔

Marfat.com

اسی لیے اسلام یہ بتاتا ہے کہ مجلس میں انسان کو جہاں بلا تکلف پہلے جگہ مل جائے، یعنی جہاں تک نشست کا دائرہ اس کے آنے تک پہنچ چکا ہے، وہیں بیٹھ جانا چاہیے۔ یہ نہیں کرنا چاہیے کہ مجمع کو چیر کر خواہ مخواہ آگے بیٹھنے کی کوشش کرے کیوں کہ اس سے ایک تو پہلے سے آنے والوں اور بیٹھنے والوں کو تکلیف ہوتی ہے اور دوسرے ایسا کرنے والوں میں احساسِ برتری پیدا ہوتا ہے۔ اکثر جمعہ کی نماز میں یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ جو لوگ پہلے آتے ہیں وہ بے ترتیب بیٹھ جاتے ہیں۔ اگلی صف میں جگہ چھوڑ کر پیچھے کی صف میں بیٹھ جاتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جو لوگ بالکل آخر وقت آتے ہیں وہ دیکھتے ہیں کہ اگلی صفوں میں جگہیں موجود ہیں تو صفوں کو چیر کر آگے بڑھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ بے ترتیبی بے حد تکلیف دہ ہے۔

اس کا نتیجہ یہ بھی ہوتا ہے کہ جب اگلی صفوں میں جگہ نہ ہو تو بھی کچھ لوگ، جو دیر سے آئے ہیں، لوگوں کو تکلیف دے کر اپنی برتری جتانے کے لیے آگے کی صفوں میں بیٹھنا چاہتے ہیں۔ ایسے لوگ نہ صرف آدابِ مجلس کی خلاف ورزی کرتے بلکہ اپنے بھائیوں کو جان بوجھ کر تکلیف دینے کا گناہ بھی کرتے ہیں۔ اس لیے اس بات سے خاص طور پر منع کیا گیا ہے۔

بعض مجلسوں میں دیکھا گیا ہے کہ کچھ لوگ دوسروں کو اٹھا کر ان کی جگہ بیٹھنا چاہتے ہیں۔ یہ لوگ شاید احساسِ برتری کا شکار ہیں۔ یہ بات بھی اکثر دیکھی گئی ہے کہ دو اشخاص آپس میں بات چیت کرنے یا کسی اور مصلحت باہمی کی وجہ سے آس پاس بیٹھے ہیں کہ ایک تیسرا آدمی آیا اور دونوں کے درمیان دھنس گیا۔ اس طرح اس نے دونوں کے دلوں میں اپنے خلاف ناپسندیدگی بلکہ ناراضی کا جذبہ پیدا کر دیا جو کسی مسلمان کے شایانِ شان نہیں ہے۔

مجلس میں بیٹھ کر نرمی اور محبت کی باتیں کرنی چاہیے۔ کوئی مسئلہ ایسا آجائے جس میں اختلاف کرنا ہی ہے تو بھی حسنِ تکلم کے ساتھ مداخلت کی جائے اور کسی طرح مجلس میں تکدر پیدا نہیں ہونے دینا چاہیے۔ رسول اللہ ؐ کی خدمت میں صحابہ کرامؓ حاضر ہوتے رہتے تھے اور وہ ہر طرح مجلسی آداب کا اہتمام کرتے تھے۔ اور سرکارِ دو عالم ؐ انھیں اس سلسلے میں ضروری ہدایات بھی دیتے رہتے تھے۔ ترمذی کی ایک روایت میں ہے کہ کچھ لوگ مجلس میں حلقہ باندھ کر بیٹھے ہوں تو کسی کو اس حلقے کے وسط میں نہیں بیٹھنا چاہیے۔ ایسے شخص پر رسول اللہ ؐ نے لعنت بھیجی ہے، کیوں کہ اس حالت میں کچھ لوگوں کی طرف اس کا منھ ہوگا اور کچھ لوگوں کی طرف پیٹھ ہوگی جو بڑی بدتمیزی ہے۔

یہ بھی ممکن ہے کہ مسخرے لوگ اس طرح بیٹھتے ہوں تا کہ سب کو ہنسا سکیں۔ اس طرح

Marfat.com

یہ طریقہ نہایت ناپسندیدہ ہے اور مجلسی آداب کی سخت خلاف ورزی ہے۔ اسی طرح مجلس میں کسی شخص کے گرد یا سامنے کسی کو کھڑا نہیں رہنا چاہیے کیوں کہ یہ غیر مسلم بادشاہوں کی عادت تھی کہ نوکر چاکر اور درباری وزرا و امرا بادشاہ کے گرد کھڑے رہتے تھے اور یہ ایک ایسی مبالغہ آمیز تعظیم تھی جو شرک کی حد تک پہنچ جاتی ہے۔

مسافروں اور راستہ چلنے والوں کے لیے یہ حکم ہے کہ راستہ میں بیٹھ کر مجلس نہ جمائیں کیوں کہ یہ وقار کے خلاف ہے۔ اسی طرح آنے جانے والے کو تکنا بھی بداخلاقی ہے۔ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ چند ایسی اخلاقی باتوں کی پابندی کرنی چاہیے، جیسے نگاہ نیچی رکھنا، تکلیف دہ چیزوں کا راستہ سے دور کرنا، سلام کا جواب دینا، نیکی کا حکم دینا، بری باتوں سے روکنا، راستہ بھولے ہوؤں کو راستہ دکھانا اور مصیبت زدوں کی مدد کرنا۔ یہ تفصیلات ابوداؤد میں موجود ہیں۔

انسان پر سب سے زیادہ اثر صحبت کا پڑتا ہے۔ شیخ سعدی نے فرمایا ہے:

صحبتِ صالح ترا صالح کند   صحبتِ طالح ترا طالح کند

اس لیے ہمیشہ ایسی مجلسوں اور صحبتوں میں شریک ہونا چاہیے جو نیک اور اللہ والے اور متقی لوگوں کی ہوں۔ ایک انسان جن لوگوں کی صحبت کو پسند کرتا ہے، اس سے خود انسان کی فطری استعداد اور فطری مناسبت کا پتہ چلتا ہے۔ ایک مشہور مثل ہے کہ اگر کسی کے اخلاق کا پتہ لگانا ہو تو اس کے دوستوں کے اخلاق کا پتہ لگاؤ۔ اسے رسول اللہؐ نے ان لفظوں میں ظاہر کیا ہے کہ آدمی اپنے دوست کے دین پر ہوتا ہے۔

سورۂ مجادلہ میں اللہ تعالیٰ نے مجلس کے کچھ آداب بیان فرمائے ہیں۔ مثلاً

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا قِيلَ لَكُمْ تَفَسَّحُوا فِي الْمَجَالِسِ فَافْسَحُوا يَفْسَحِ اللَّهُ لَكُمْ ۖ (المجادلہ:۱۱)

یعنی: "اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، جب تمھیں کہا جائے کہ مجلسوں میں کھل کر بیٹھو تو کھل جایا کرو تاکہ اللہ تعالیٰ تم کو فراخی دے۔"

مختصر یہ ہے کہ مسلمان کی مجلسیں ایسی ہونی چاہئیں جن سے وقار اور بردباری ظاہر ہو اور اس میں اچھی باتیں زیر بحث آیا کریں۔

Marfat.com

آدابِ مجلس

ادب، سلیقہ، شائستگی، پاکیزگی، تمیز و وقار، نظم و ضبط، عالی ظرفی، شرافت و متانت، جرأت و استقلال، ہمدردی اور خیر خواہی، حُسنِ ذوق اور حُسنِ انتخاب، ایثار و قربانی، خلوص اور بے لوثی، فرض شناسی، حِلم و بُردباری، علم و عمل، تواضع و انکسار، شیریں کلامی، خدا ترسی اور پرہیزگاری ——— اسلامی زندگی کے یہ وہ دلکش خدوخال ہیں، جن سے انسان کی حیات سنورتی ہے اور انسانیت اوجِ کمال کو پہنچتی ہے اور شرافت اپنی منتہا کو چھوتی ہے۔ اسلام نے ایک ایسے معاشرے کا تصور دیا ہے جس میں انسان اِن اوصافِ حسنہ سے متصف ہو اور اخلاقِ عالیہ سے سرشار و سرفراز۔ جس معاشرے میں ایسے انسان موجود ہوں، اُس کی معراج مسلّم اور اس کی بلندی شک و شبہ سے بالاتر۔ یہی معاشرہ اسلامی ہے اور اس معاشرے کا انسان وہی ہے کہ جس کے یہ خدوخال ہوں۔

اللہ کے رسُول اور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم دعا فرمایا کرتے تھے:

اَللّٰھُمَّ یَسِّرْلِیْ جَلِیْسًا صَالِحًا۔

یعنی: ”اے اللہ مجھے نیک لوگوں کی صحبت عطا فرما۔“

یہ نیک لوگ وہی ہیں جن کے خدوخال اسلامی ہوں اور جو ان تمام صفات سے متّصف ہوں اور جن میں تمام خوبیاں ہوں جن کا ذکر میں نے ابھی کیا ہے۔ اور ایسے افراد اُس وقت وجود میں آتے ہیں کہ جب وہ کتاب و سنّت، قرآن و حدیث اور اللہ اور اس کے رسول آخر الزمان جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کی ہدایات پر عمل کرتے ہیں اور اپنی زندگیوں کو ان ہدایات کے مطابق بناتے ہیں۔ یہی لوگ مسلمان ہیں اور اسلام کے مطابق اپنی حیات و زندگی بسر کرتے ہیں۔

اسلام نے ہر شعبۂ زندگی کے لیے بڑی واضح ہدایات دی ہیں۔ انسانی حیات کا کوئی گوشہ اور کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے کہ جس کے لیے جامع ہدایات اور بیّن احکامات نہ ہوں۔ اسلام نے ہر شعبۂ حیات کے لیے آداب کا تعیّن کیا ہے۔

Marfat.com

قرآنِ مجید و فرقانِ حمید کا ارشاد ہے:

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا قِيلَ لَكُمْ تَفَسَّحُوا فِي الْمَجَالِسِ فَافْسَحُوا يَفْسَحِ اللَّهُ لَكُمْ وَإِذَا قِيلَ انْشُزُوا فَانْشُزُوا يَرْفَعِ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَالَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ دَرَجَاتٍ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ ۝ (مجادلہ: ۱۱)

یعنی: "اے مومنو! جب تم سے کسی مجلس کے اندر بعد میں آنے والے کے لیے جگہ دینے کا اشارہ کیا جائے تو فوراً اس کے لیے جگہ نکالو اور جب تم سے یہ کہا جائے کہ اب مجلس برخاست ہوتی ہے تو بلا تامّل تعمیل کرو۔ دوسروں کی وسعت میں خود تمھارے لیے وسعت ہے اور دوسرے امور میں وسعت ہے۔ مومنین اور اہلِ علم کے لیے بلند درجات ہیں اور اللہ تمھارے اعمال سے باخبر ہے۔"

آدابِ مجلس جن کی طرف قرآن و حدیث نے دعوت دی ہے اُن میں سے چند یہ ہیں جن کا ہمیں خیال رکھنا چاہیے:

۱۔ جب کوئی مجلس میں پہنچے تو پہلے سلام کرے، کیوں کہ سلام سے باہمی تعلق و تعارف اور احترام و خیر خواہی کا اظہار ہوتا ہے۔

۲۔ مجلس میں جہاں جگہ ملے وہاں بیٹھ جانا چاہیے۔ مجلس میں کسی امتیازی جگہ پر جا کر بیٹھنے سے پرہیز کرنا چاہیے۔ جہاں میزبان بٹھانا چاہے اس کو اپنے لیے پسند کرنا چاہیے۔

۳۔ مجلس میں خندہ پیشانی، اطمینان و مسرت کے ساتھ بیٹھنا چاہیے اور گفت گو میں توجہ کے ساتھ حصّہ لینا چاہیے۔

۴۔ مجلس میں بیٹھے ہوئے لوگوں میں سے کوئی اٹھ کر چلا جائے تو اس کی جگہ پر قبضہ کرنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔

۵۔ مجلس میں دو آدمیوں کو کانا پھوسی اور سرگوشی نہیں کرنی چاہیے، کیوں کہ یہ حرکت مجلس کے دوسرے شرکا کے لیے پریشانی کا باعث ہوتی ہے۔

۶۔ مجلس میں جو کہنا ہو صدرِ مجلس کی اجازت سے کہنا چاہیے اور ایسا انداز اختیار نہیں کرنا چاہیے کہ صدر کا مقام مجروح ہو۔

۷۔ ایک دوسرے کی غیبت نہیں کرنی چاہیے:

لَا يَغْتَبْ بَعْضُكُمْ بَعْضًا

۸۔ گفت گو میں آواز کو نیچا رکھنا چاہیے:

Marfat.com

وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ

۹۔ ایک دوسرے کا مذاق نہیں اڑانا چاہیے:

لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ

۱۰۔ مجلس میں بے حیائی کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیے:

لَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ

۱۱۔ لوگوں سے بے رُخی نہیں کرنی چاہیے:

لَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ

۱۲۔ حق و باطل (سچ اور جھوٹ) کو گڈمڈ نہیں کرنا چاہیے:

لَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ

۱۳۔ لوگوں کو برے ناموں سے نہیں پکارنا چاہیے:

وَلَا تَنَابَزُوا بِالْاَلْقَابِ۔

آدابِ مجلس کے سلسلے میں یہ چند اسلامی نکات ہیں۔ اگر ہم ان کو اپنا رہنما بنا لیں اور اپنی تمام مجالس و محافل میں ان کا خیال کریں تو یقیناً ہماری مجلسیں و محفلیں زیادہ پُرلطف و مؤثر ہوں گی، اور پُرمقصد۔ اور جب ہم ان بنیادی آدابِ مجلس کو نظر انداز کریں گے تو ہماری مجلسیں بے لطف، بے اثر اور بے نتیجہ ہو جائیں گی۔

دراصل قوموں کو بنانے بگاڑنے میں مجلسی زندگی بڑا اہم کردار ادا کرتی ہے مجلسیں کسی قوم کی تہذیب و ثقافت کی آئینہ دار ہوتی ہیں۔ انھی کے ذریعہ سے وہ اخلاقی اقدار نشوونما پاتی ہیں جو فرد اور جماعت کا کردار متعین کرتی ہیں۔ مجلسیں زیادہ علم والوں اور کم علم والوں، زیادہ عمر والوں اور کم عمروں، تجربہ کاروں اور ناتجربہ کاروں کے درمیان رابطے کا ذریعہ بھی ہوتی ہیں۔ گویا پرانی اور نئی نسل میں یہ مجلسیں کوئی خلا پیدا نہیں ہونے دیتیں، اسی لیے مجلسی زندگی کی اہمیت بہت زیادہ ہے اور اسلام نے مجلسی زندگی کے لیے بھی واضح اشارات و ہدایات دی ہیں۔

ہمارا شمار ان اقوام و ملل میں ہے کہ جو تعمیر کی جدوجہد میں مصروف ہیں۔ ہم پاکستان کی تعمیر میں شب و روز لگے ہوئے ہیں۔ اس تعمیر میں اگر ہم نے نظامِ اسلامی اور اخلاقِ اسلامی کو نظر انداز کر دیا تو ہم نہ صرف تعمیری جدوجہد میں ناکام ہو جائیں گے، بلکہ ہماری مجلسی زندگی درہم برہم ہو جائے گی جس کے نتیجے میں ہم اپنے تشخص ملی سے بھی محروم ہو جائیں گے۔

Marfat.com

اجتماعی فلاح

ہر انسان اپنی بھلائی اور بہبود کا خواہش مند ہے اور یہ خواہش بُری نہیں ہے۔ یہ ایک فطری خواہش ہے۔ انسان کو زندہ رہنے اور اپنے وجود کو قائم رکھنے کے لیے سب سے زیادہ سعی خود ہی کرنی پڑتی ہے اور یہ اس کا فرض ہے، لیکن یہ سعی و عمل اس طرح ہونا چاہیے اور اس حد تک ہونا چاہیے جس حد تک وہ دوسروں کے لیے نقصان دہ اور مضر ثابت نہ ہو۔ جو شخص اپنی بھلائی کے لیے کام کرتا ہے اس کو کوئی بُرا نہیں کہہ سکتا، لیکن جو شخص دوسروں کا نقصان کر کے یا ان کو تکلیف پہنچا کر اپنا بھلا کرنا چاہے وہ پسندیدہ نہیں ہو سکتا اور اس شخص کی کبھی تعریف نہیں کی جا سکتی، بلکہ ایسے شخص کو لوگ خود غرض، مطلبی اور طرح طرح کے ناموں سے یاد کرتے ہیں۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ "ایک کی بھلائی اور دوسرے کا نقصان" کا طریقہ کبھی پسندیدہ نہیں رہا۔ کسی نظام نے اس کو مستحسن قرار نہیں دیا۔ کسی بھی معاشرے کی ترقی، استحکام اور کامیابی کا اصول یہ ہے کہ "ایک کی بھلائی، سب کی بھلائی"۔

اگر کوئی شخص اپنی بھلائی اس طرح چاہے جس میں کسی کا نقصان نہ ہو تو اس کی بھلائی سب کو قبول ہوگی، لیکن جہاں کسی شخص نے اپنے فائدے کے لیے دوسروں کو تکلیف دینی شروع کی وہیں فساد شروع ہوا اور معاشرے کی بنیاد کمزور ہونے لگی۔ معاشرے کے استحکام کی بنیاد باہمی تعاون، ایک دوسرے کے مفادات کے لحاظ اور بحیثیتِ مجموعی ان امور کی پاس داری پر ہے جو سب کے لیے مفید اور قابلِ قبول ہوں۔ اجتماعیت کا یہی احساس افراد کو باہم ایک دوسرے پر اعتماد و انحصار کرنے پر مائل کرتا ہے۔ جب تک آپس میں افراد کا باہمی اعتبار و اعتماد قائم نہ ہو اجتماعی فلاح کی بنیاد نہیں پڑتی۔ جس معاشرے کے افراد اپنے عمل سے اپنا اعتبار کھو دیتے ہیں اس معاشرے سے سکون و اطمینان اٹھ جاتا ہے اور وہاں ہر قدم پھونک پھونک کر اٹھانا پڑتا ہے لیکن جس معاشرے میں اعتماد و اعتبار کی فضا ہو وہاں افراد سکون محسوس کرتے ہیں اور ان کو تحفظ کا احساس ہوتا ہے۔ وہ نہایت بے فکری اور یک سوئی سے اپنی صلاحیتوں کے مطابق اپنے کاموں میں مصروف رہتے ہیں اور خوب ترقی کرتے ہیں۔ ان کی ترقی سے اجتماعی فلاح کے سوتے پھوٹتے

Marfat.com

ہیں۔ افراد کی وہ ترقی جو ایمان داری اور اہلیت کی بنیاد پر ہو، اجتماعی فلاح کے لیے ضروری ہے، بلکہ جب کسی معاشرے کے اکثر افراد کو صحیح بنیادوں پر پھلنے پھولنے اور آگے بڑھنے کے مواقع میسر آجائیں تو سمجھیے کہ اجتماعی فلاح کا عمل شروع ہو گیا۔

اسلام کا مزاج یہ ہے کہ وہ انفرادی مفاد کے مقابلے میں اجتماعی مفاد کو ترجیح دیتا ہے۔ جہاں دونوں مفادات ٹکرائیں اور کش مکش اور تصادم کی صورت پیدا ہو وہاں اسلامی مزاج کے مطابق اجتماعی مفاد کو فوقیت دی جائے گی اور انفرادی مفاد کو قربان کر دیا جائے گا، چناں چہ اسلامی تاریخ اس کی گواہ ہے کہ ہمارے اسلاف نے ذاتی مفاد کو ہمیشہ اجتماعی مفاد کے تابع رکھا ہے اور جماعت کے فائدے کے لیے اپنے بڑے سے بڑے فائدے کو تج دیا ہے۔ معاشرے کی بہبود اسی طرزِ عمل میں مضمر ہے اور یہی جذبہ قومی و ملّی ترقی کا باعث ہے۔ اس جذبہ کی کمی کے نتائج ہم خود دیکھ رہے ہیں بلکہ بھگت رہے ہیں۔ آج چوں کہ ہم میں یہ جذبہ کم زور ہو گیا ہے اور اجتماعی مفاد کو ہم اکثر پسِ پشت ڈال دیتے ہیں، اس لیے ہمیں ایک مضبوط اور منظم معاشرے کے فوائد حاصل نہیں ہیں۔

اسلام دینِ فطرت ہے۔ اس نے معاشرتی بہبود اور اجتماعی فلاح کے جو اہم اصول بتائے ہیں اگر ان پر کسی معاشرے کو استوار کیا جائے تو ہم فطرت سے بہت قریب ہو سکتے ہیں اور ان فیوض و برکات سے مستفید ہو سکتے ہیں جو فطرت سے قرب کا ثمر ہوتے ہیں۔ اجتماعی فلاح کا ایک اہم اصول جو قرآنِ حکیم نے بیان فرمایا ہے یہ ہے کہ ہر اچھے کام میں، ہر نیکی اور ہر بھلائی میں تعاون کرو، ایک دوسرے کی مدد کرو اور کسی بُرے کام میں، کسی بگاڑ میں، کسی تخریب میں، کسی گناہ میں تعاون نہ کرو۔ باہمی تعاون صرف خیر میں فرض ہے۔ شر اور بدی میں تعاون نہ کرنا ضروری ہے۔ بدی میں تعاون کیا جائے تو وہ خود بدی کرنے کے برابر ہے۔ سورۂ مائدہ کی دوسری آیت میں ارشاد فرمایا گیا:

تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ۖ وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۖ (المائدہ: ۲)

ان چند الفاظ میں دونوں جہان کی راحت پوشیدہ ہے۔ جب بدی کو کسی معاشرے میں پنپنے کا موقع نہ ملے تو وہ معاشرہ سراسر خیر کے سانچے میں ڈھل جاتا ہے۔ کوئی فرد اگر کوئی غلط کام کرنا چاہے تو وہ اس وقت تک کام یاب نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کو کسی کا تعاون حاصل نہ ہو، جب تک اس کی حوصلہ افزائی نہ ہو۔ اس سے یہ بات بالکل ظاہر و ثابت ہو جاتی ہے کہ خیر ہو یا شر، نیکی ہو یا بدی، اس کی کام یابی، اس کی وسعت اسی وقت ممکن ہے جب اس کو حمایت و تعاون حاصل ہو، جب اس میں شرکت ہو، تن تنہا کوئی فرد غلط کام اگر کر بھی لے گا تو وہ معاشرے کے عتاب سے اور عقوبت سے نہیں بچ سکے گا۔ گویا تعاون اور امدادِ باہمی وہ عامل ہے جو اجتماعی خسران یا اجتماعی

Marfat.com

فلاح دونوں میں بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ قرآنِ حکیم نے اسی لیے واضح الفاظ میں نیکی و بھلائی کے کاموں میں تعاون کرنے کا حکم دیا ہے اور بدی اور برائی کے کاموں میں تعاون نہ کرنے کی ہدایت کی ہے۔

یہاں میں ذرا اس نکتے کو مزید واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ قرآنِ حکیم نے یہ نہیں فرمایا ہے کہ بدی میں تعاون کرنا ضروری نہیں ہے، یعنی چاہے تعاون کرو، چاہے نہ کرو۔ بلکہ وہ حکم دیتا ہے کہ برائی میں تعاون نہ کرو، یعنی تعاون نہ کرنا مسلمان کا فرض ہے اور تعاون کرنا گناہ ہے۔

اجتماعی فلاح اس امر پر منحصر ہے کہ کسی سوسائٹی کے تمام ارکان وافراد یک دل، یک خیال اور یک سو ہو کر اعلا اقدار کی کامیابی کے لیے کام کریں اور وہ جہاں جس شکل میں اور جس وقت بھی خیر و سعادت کے کاموں کو ہوتا دیکھیں اس میں تعاون کے لیے آگے بڑھیں اور ہر طریقے سے اچھے کام کرنے والوں کی مدد، حمایت اور ہمت افزائی کریں۔ جس سوسائٹی یا جس معاشرے میں نیکی اور نیک کی قدر کی جاتی ہو، علم و عالم کی تکریم کی جاتی ہو اس معاشرے میں قدرتی طور پر یہی چیزیں فروغ پائیں گی یعنی لوگ نیک بننے کی کوشش کریں گے، علم حاصل کرنے میں اپنی بہترین صلاحیتیں صرف کریں گے اور پھر لازمی طور پر اس معاشرے میں امن و راحت کا دور دورہ ہوگا، ترقی و تعمیر کے لیے ہر شخص کوشاں ہوگا۔ باہمی اعتماد و خوش دلی کی فضا ہوگی۔ ہر ایک کی خوش حالی اور شادمانی کے لیے کام کیے جائیں گے ۔۔۔ معلوم ہے یہ کون سا معاشرہ ہوگا؟

ایسا معاشرہ صرف اور صرف اسلامی معاشرہ ہوگا۔

Marfat.com

اصلاحِ مُعاشرہ

اسلامی تعلیم کا بنیادی مقصد انسانی مُعاشرے کی اِصلاح کرنا ہے، اور اس طرح اصلاح کرنا ہے کہ دنیا میں تمام انسان امن و امان کی زندگی بسر کریں اور اس طرح زندہ رہیں کہ اخلاق کا دامن کبھی ہاتھ سے نہ چھُٹے اور آخرت کی لامتناہی زندگی کے لیے پورے اخلاق و تقویٰ کے ساتھ تیاری کریں کہ اللہ اُن سے راضی ہو۔ اسلامی تعلیم کا یہ بنیادی مقصد صرف اس طرح حاصل ہو سکتا ہے کہ خالقِ کائنات اور مالکِ کُل اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق ہم نورِ مجسّم رسولِ اکرمؐ کے اسوۂ حَسَنہ کی پیروی کرتے ہوئے یہ معلوم کریں کہ ختمی مرتبتؐ نے مُعاشرے کی اصلاح کس طرح کی تھی۔

ہمارے لیے اس دُنیا کے کسی دوسرے مفکّر اور مُصلح اور کسی فلسفی اور رہبر کی ضرورت نہیں ہے، کیوں کہ ہمارے سامنے ہر کام کی غایت اللہ سُبحانہٗ و تعالیٰ کی رِضا ہے اور اللہ نے قرآنِ حکیم میں واضح طور پر ہمیں یہ حکم دیا ہے کہ اس کی رِضا اور خوشنودی صرف رسول اللہؐ کی پیروی ہی سے حاصل ہو سکتی ہے، بلکہ اُس نے ہم سے یہ بھی وعدہ کیا ہے کہ تم اللہ کے رسولؐ کی پیروی کرو گے تو اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرے گا۔ ذرا غور فرمائیے کسی انسان کے لیے اس سے زیادہ بڑا مرتبہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ خود اللہ اس سے محبت کرنے لگے۔

اس تمہید سے یہ بات واضح ہو گئی کہ اصلاحِ مُعاشرہ کے لیے بھی ہمیں رسول اللہؐ کا ہی اتباع کرنا ہوگا اور آپؐ ہی کی بتائی ہوئی راہ پر چلنا ہوگا اور آپؐ کی حیاتِ طیّبہ کا مطالعہ کرنا ہوگا۔ ہماری خوش قسمتی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے آخری رسولؐ کی پوری زندگی کا رکارڈ ہمارے اسلاف نے ہمارے لیے جمع کر دیا ہے۔ اس کے علاوہ حضرت عائشہ صدیقہؓ کے بلیغ ارشاد کے مطابق خود قرآنِ حکیم ہی آپؐ کی مبارک زندگی کا سب سے زیادہ قابلِ اعتماد وسیلہ موجود ہے۔

اصلاحِ معاشرہ کے سلسلے میں رسولِ برحقؐ نے جو کامیابی حاصل کی وہ دنیا کی تاریخ کا سب سے بڑا اور سب سے اہم واقعہ ہے۔ عرب کے باشندے مختلف ٹولیوں میں بٹے ہوئے تھے، وہ عملی طور پر ایک قوم بھی نہ تھے۔ جہالت و سرکشی نے انھیں ایسے اوصاف سے بھی

Marfat.com

محروم کردیا تھا کہ جو تمام انسانوں کے لیے تو کیا خود اُن کے لیے ہی ایک پُرامن مُعاشرہ مہیّا کرتے۔ ایسے مُعاشرے میں اللہ کے رسولؐ پیدا ہوئے اور اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو نبوت سے سرفراز فرمایا اور آپؐ کے ذمّے یہ کام لگایا کہ مُعاشرے کو بُرائیوں سے پاک کریں اور اس طرح اصلاح کریں کہ وہ دنیا کا مثالی مُعاشرہ بن جائے اور افرادِ مُعاشرہ دُنیا کے بہترین افراد بن جائیں، اور آنے والی دنیا کے لیے ایک نمونہ بن جائیں۔

رسول اللہؐ کی حیاتِ طیّبہ کے مُطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اصلاحِ مُعاشرہ کے سلسلے میں آپؐ نے دُو بنیادی اصولوں پر عمل کیا۔ ایک تو یہ کہ آپؐ نے کبھی کوئی ایسی بات نہیں کہی جس پر آپؐ خود عمل نہ فرماتے ہوں۔ حضورؐ کے قول اور فعل میں کبھی کوئی تضاد نہ تھا۔ جو فرماتے تھے خود اُس پر عمل فرماتے تھے۔

اب یہ بات واضح ہوگئی کہ اصلاحِ مُعاشرہ کی کوئی کوشش اُس وقت تک کام یاب نہیں ہوسکتی جب تک اصلاح کرنے والا خود اُس پر عمل نہ کرتا ہو۔ قرآن حکیم میں بھی جا بجا اس کا ذکر ہے۔ مثلاً ایک جگہ فرمایا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَالَا تَفْعَلُوْنَ یعنی ”ایسی باتیں کیوں کہتے ہو جن پر خود عمل نہیں کرتے؟“

یہاں یہ نکتہ بھی قابلِ غور ہے کہ رسول اللہؐ کی تعلیم اور اصلاحِ مُعاشرہ کی کوششیں ایسی بارآور ہوئیں کہ لوگوں کی کایا پلٹ گئی۔ لیکن آپؐ سے قبل سُقراط، افلاطون اور ارسطو اور بیسیوں دُوسرے حکما اور فلسفی اور مصلحین وعظ و نصیحت کرتے رہے اور انھوں نے فلسفۂ حکمت اور عقل و دانائی کی بنیاد پر شان دار عمارتیں کھڑی کردیں، لیکن مُعاشرے پر اُن کا کوئی اثر نہیں پڑا۔ ایسا صرف اس لیے ہوا کہ وہ دُوسروں کو تو روشنی دکھاتے رہے لیکن خود تاریکی سے باہر نہیں آئے۔ وہ رحم و محبت کا سبق پڑھاتے رہے، لیکن خود غریبوں پر رحم کھانے سے عاری تھے اور دشمنوں سے محبت کرنے کی عظمت سے محروم تھے۔

بلاشک و شبہ پاکستان ایک اسلامی ملک ہے۔ ہم مسلمان ہیں۔ ہمارا شمار اہلِ اسلام میں ہے۔ ہم نے برصغیر میں قیامِ پاکستان کی ایک تاریخ ساز جدوجہد کی تھی اور قطعی طور پر اس بنیاد پر کی تھی کہ ہم روئے زمین پر ایک اسلامی مُملکت قائم کریں گے جہاں اللہ اور صرف اللہ کا قانون رائج ہوگا اور جہاں قرآن دستور ہوگا۔ پاکستان ایسی مملکتِ اسلامیہ ہوگی کہ جس میں اتباعِ رسولِ اکرمؐ کی نعمت سے ہر فرد و بشر مالامال ہوگا۔ ہم نے قیامِ پاکستان کی جدّوجہد اللہ تعالیٰ کے حکم سے کی تھی اور اس کے رسولِ برحقؐ کی تعلیمات کی روشنی میں کی تھی اور یہ وعدہ کیا تھا اور عزم کہ پاکستان

Marfat.com

صفحۂ ارض پر ایک مثالی مملکتِ اسلامیہ ہوگا۔

اِس پُرخلوص جدوجہد کے نتیجے میں پاکستان عالمِ وجود میں آیا۔ بے اندازہ قربانیوں کے نتیجے میں ایک مملکتِ اسلامیہ منصّۂ شہود پر جلوہ گر ہوئی اور عین اُس دن کہ یومِ نزولِ قرآن تھا، جمعۃ الوداع تھا۔ ۲۷ رمضان المبارک (۱۳۶۶ھ) کو اللہ رحیم و کریم نے ہماری دعائیں سُن لیں اور ایک مملکتِ اسلامیہ عالمِ وجود میں آ گئی۔ اللہ کا وعدہ پورا ہوگیا کہ جو انسان اللہ کی راہ پر چلیں گے اُن کے مراتب بلند ہوں گے اور وہ اللہ کی نعمتوں سے مالا مال ہوں گے۔

ہم نے فکری اور سیاسی آزادی کے بعد پیارے وطنِ پاکستان کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ اللہ کے احکام سے کس طرح رُوگردانی کی، رسول اللہ ﷺ کے اُسوۂ حسنہ سے کس طرح راہِ فرار اختیار کی۔ اِس سب پر صِدقِ دل کے ساتھ غور کرنا چاہیے۔ کیا ہم سرِ افتخار بلند کر سکتے ہیں؟ یا ہمارے نصیب میں شرم و ندامت ہے؟

آج ہمارے معاشرے کا کیا حال ہے؟ آج ہم کہاں کھڑے ہیں؟ پاکستان قائم کرنے کی جدوجہد کے وقت ہم نے جو وعدے کیے کیا ہم نے ان پر ایک دن بھی عمل کیا ہے؟ شجاعتِ قلب اور جرأتِ لِسان کا ہم نے کون سا مظاہرہ کیا ہے؟ قرآن نے کہا:

لَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّهْلُكَةِ ج (البقرہ ۱۹۵)

یعنی "اپنے تئیں اپنے ہاتھوں سے ہلاکت میں نہ ڈالو"

احکامِ الٰہی کی رُو سے انسان کو اپنے تئیں ہلاکت میں ڈالنا منع ہے۔ مگر ہم نے اللہ اور رسول ﷺ اور قرآن و سنّت سے صرفِ نظر کر کے خود کو اور پوری ملّتِ پاکستانیہ کو اس راہ پر ڈال دیا اور ڈالے رکھا جو صرف ہلاکت کی طرف لے جاتی ہے۔ چناں چہ آج حال یہ ہے کہ ہمارے مُعاشرے میں ہر قسم کے رذائل سرایت کر چکے ہیں۔ حد یہ ہے کہ عزت اور جان بھی اپنے ہی بھائیوں کے ہاتھوں خطرے میں رہتی ہے۔ اور ایسا بھی نہیں ہے کہ اصلاحِ مُعاشرہ کی کوشش نہ ہو رہی ہو۔ سیاست داں اصلاح کی تلقین کرتے رہتے ہیں، وعظ و تبلیغ کا ایک سلسلہ ہے جو قیامِ پاکستان کے بعد سے برابر جاری ہے۔ تیس سال سے مسجدوں کے امام ہر جمعہ کو لوگوں کو اچھا بننے کی تلقین بھی کرتے رہتے ہیں، لیکن ان تمام کوششوں کا بظاہر کوئی مُثبت نتیجہ نظر نہیں آتا۔ غالباً اس کی بہت بڑی وجہ یہی ہے کہ ہم جو بات یا کام ترک کرنے کو کہتے ہیں خود ترک نہیں کرتے۔ یہ طریقِ اصلاح سنّتِ رسول ﷺ کے خلاف ہے۔ اِس لیے کبھی بر آور نہیں ہو سکتا۔

اسلام میں اصلاحِ مُعاشرہ کا دوسرا بنیادی نکتہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اوائلِ زندگی ہی

Marfat.com

سے سچائی اور راست بازی پر سختی کے ساتھ عمل کیا اور مسلمانوں کو جھوٹ سے بچنے کی تلقین کرتے رہے۔ خود آپؐ نے زندگی میں کبھی جھوٹ نہیں بولا اور صحابیوں کو بھی اس رذیل ترین فعل سے احتراز کرنے کی تاکید فرماتے رہے۔ آپؐ کا یہ وصف بعثت سے قبل بھی اس قدر نمایاں تھا کہ کفّار و مشرکین بھی آپؐ کو صادق اور امین مانتے تھے۔

مُعاشرے کی تمام بُرائیوں میں سرِفہرست جھوٹ ہے۔ اسلام کی لُغت کا سخت ترین لفظ "لعنت" ہے۔ قرآن پاک میں اس کا مستحق شیطان اور اس کے بعد مشرک، کافر اور منافق کو بتایا گیا ہے، لیکن کسی مومن کو کذب یعنی جھوٹ کے سوا اس کے کسی فعل کی بنا پر لعنت سے یاد نہیں کیا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جھوٹ ایسی بُرائی ہے کہ مسلمان سے بھی سرزد ہو تو اس کے لیے لعنت کی وَعید ہے۔

پاکستان کا مُعاشرہ کئی قسم کی بُرائیوں میں مبتلا ہے۔ ذخیرہ اندوزی، چیزوں میں ملاوٹ، ناپ تول میں کمی، آپس ہی میں ایک دوسرے کو نقصان پہنچانے کی کوشش، لوٹ مار، ڈاکا، انسانوں اور ہوائی جہازوں کا اغوا اور قتل و غارت، وعدہ خلافی، خیانت اور بد دیانتی، چغل خوری، بُہتان اور غیبت، رشوت اور جُوا اور سود۔ سُوال یہ ہے کہ معاشرے کی اصلاح کیوں کر ہو؟ اس کا عملی جواب یہ ہے کہ سربراہانِ مُعاشرہ اپنے کردار کو درست کریں اور صرف ایک بُرائی چھوڑ دینے کا عہد کریں، یعنی جھوٹ۔ رسول اللہؐ کے نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش کریں یعنی وہی کہیں جو وہ خود کرتے ہیں اور جھوٹ نہ بولنے کا عہد کریں۔

ہمیں یقین ہے کہ اگر لوگ صرف ایک بُرائی کو چھوڑنے کی کوشش کریں تو معاشرہ بتدریج انشاء اللہ اصلاح کی راہ پر گامزن ہو جائے گا۔

اخلاق دنیا کی سب سے بڑی طاقت ہے۔ اللہ کی کتاب درسِ اخلاق دیتی ہے اور ہادی برحقؐ کی تمام زندگی اور زندگی کا ہر لمحہ اخلاق سے عبارت ہے۔ ہم نے یہاں پاکستان میں تیس سال ایسی زندگی گزاری کہ جس پر بلندیِ اخلاق کی کوئی تعریف صادق نہیں آتی۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج اِس عریض و بسیط دُنیا میں ہمارا کوئی شمار نہیں اور ہم صاحبانِ عظمت کی کسی قطار میں نہیں۔

آئیے اب رِفعتِ خُلق اور بلندیِ اخلاق کا تجربہ کر لیں اور اس حقیقت کو فراموش نہ کریں کہ صرف اخلاق کی اچھائی سے ہم مُعاشرے کی اصلاح کر سکتے ہیں اور پاکستان کو صحیح معنی میں پاکستان بنا سکتے ہیں۔

Marfat.com

حقوق العباد

انسانوں کی فلاح و بہبود اور ان کی خوش حالی اور ان کے امن و سکون کے لیے لازم ہے اور ضروری کہ وہ مل جل کر رہیں۔ آپس میں بھائی چارہ قائم کریں اور ایک دوسرے سے محبّت کریں اور باہمی احترام کی فضا پیدا کریں۔ اشتراک و تعاونِ باہمی کی اس فطری ضرورت نے قوم و قبیلہ اور گروہوں کو جنم دیا ہے۔ یعنی معاشرہ وجود میں آیا اور اس کی تاسیس حقوق و فرائض کی ادائی کی بنیادوں پر ہوئی۔ یہ بات خود بخود ناگزیر ہوگئی کہ عام انسانوں کے احساس و جذبات اور ان کی ضرورتوں یعنی ان کے حقوق کا دوسرے انسان پر ادا کرنا لازم ہے۔ اس احساسِ ذمہ داری کے بغیر نہ کوئی معاشرہ وجود میں آسکتا ہے نہ یہ ترقی کی منزلیں طے کر سکتا ہے۔

قرآنِ حکیم کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو یہ تعلیم دی ہے اور واضح کر دیا ہے کہ یہ کائنات اور کائنات کی تمام چیزیں جو ارد گرد موجود ہیں وہ ان کی خدمت اور منفعت کے لیے ہی پیدا کی گئی ہیں اور ان کا خالق اللہ ہے۔

هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُم مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا ق (البقرہ ۲۹:)

قدرتی طور پر یہ زمین اور اس زمین میں جو کچھ موجود ہے وہ اللہ تعالیٰ کے تمام بندوں کے استفادے کے لیے ہے۔ اس لیے تمام انسانوں پر کہ جو اس کرۂ ارض پر آباد ہیں، یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عطا کی ہوئی نعمتوں سے خود بھی فائدہ اٹھائیں اور دوسرے انسانوں کو بھی فائدہ پہنچائیں۔ دوسرے انسانوں کے مفاد کا، ان کے حصے کا اور ان کی ضرورتوں کا خیال رکھنا ہی حقوق العباد کی ادائی ہے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ نے جب کسی انسان کو دولت عطا فرمائی تو اس کا تقاضا یہ ہے کہ جن کو یہ چیز نہیں ملی ہے ان کو اس میں سے دیا جائے، اس لیے کہ یہ ان کا حق ہے اور اس کا شمار حقوق العباد میں ہوتا ہے۔

اسی طرح جب کسی کو اللہ تعالیٰ نے زمین کا کوئی حصہ عنایت کیا اور اس نے اس میں کچھ بویا اور اللہ تعالیٰ کی رحمتِ کاملہ سے ہری بھری کھیتی تیار ہوئی تو اس کا فرض ہے کہ پوری پیداوار کو خود نہ رکھ لے بلکہ اس کا حق ادا کرے اور اس میں سے ان کو بھی کچھ دے جن کو یہ

Marfat.com

نعمت نہیں ملی ہے۔

اسلام نے حقوق کے بیان کو ایسی وسعت دی ہے کہ بندوں کے حقوق کے علاوہ بندوں پر دوسری مخلوقات کے جو حقوق عائد ہوتے ہیں ان کی بھی وضاحت کے ساتھ نشان دہی کی ہے۔ یعنی بندوں کا تو ایک دوسرے پر جو حق ہے وہ صاف ہے، لیکن ان کے علاوہ حیوانات، نباتات اور جمادات کے حقوق بھی اُن پر عائد ہوتے ہیں۔

ایک بار سرورِ کائنات فخرِ موجودات جناب رسول اللہؐ نے فرمایا کہ ایک شخص صرف اس لیے بخشا گیا کہ اس نے ایک پیاسے کتے کو پانی پلا کر اس کی جان بچائی تھی اسی طرح آپؐ نے ایک عورت کے بارے میں، جس نے بلی کو رکھا تھا اور اسے کھانے کو بھی نہ دیتی تھی، فرمایا کہ اپنی بے رحمی کی وجہ سے اسے عذاب دیا جائے گا۔ مدعا یہ تھا کہ مسلمان یہ سمجھ لیں کہ انسانوں کے حقوق ادا کرنے کے ساتھ ساتھ تمام دوسری مخلوقات کے حقوق بھی ادا کرنے چاہئیں۔

حقوق کی ادائی کے سلسلے میں اسلام پہلا اور آخری دین ہے جس نے انسانوں کے مختلف رشتوں کے فطری تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان کی اولیت متعین کر دی ہے۔ حقوق العباد کی ادائی کا یہ طریقہ کہ والدین اور اعزہ محروم رہیں، لیکن دوسرے مستفید ہوں، اسلام کی نظر میں مستحسن نہیں ہے۔ اسلام اس قسم کے غیر انسانی اور غیر فطری سلوک کا قائل نہیں ہے۔ اسلام حقوق کی ادائی میں نسبی اور خاندانی قربت کو ترجیح دیتا ہے۔ تمام بندوں کے حقوق ادا کیے جائیں اور اس ترتیب اور درجہ بندی کے ساتھ جو اسلام نے مقرر کر دی ہیں۔ اگر کوئی شخص والدین کے حقوق ادا نہ کرے، قرابت داروں کے ساتھ احسان نہ کرے، یتیموں، مسکینوں اور پڑوسیوں کا خیال نہ کرے، مسافروں کی امداد نہ کرے، غلاموں کو آزادی دلانے اور مصیبت زدہ مسلمانوں کو ذلت و رسوائی اور غلامانہ ماحول سے نکالنے کی کوشش نہ کرے تو وہ دوسروں پر احسان و کرم کی جتنی بھی بارش کرے، حقوق العباد کے، اسلامی شریعت کے مطابق، ادا نہ کرنے کا مجرم ضرور قرار پائے گا۔ اور اس کی مثال بارش کے اس پانی کی سی ہوگی جو پہاڑ اور بنجر زمین پر برسے اور پیداوار والی زمین قحط سالی کا شکار ہو رہے۔

حقوق العباد کو اسلام میں جو اہمیت دی گئی ہے اس کا کوئی تصور اس سے قبل کسی شریعت یا معاشرے میں نہ تھا۔ اسلامی شریعت میں اس حکم کا خلاصہ یہ ہے "دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو"، اگر کوئی محتاج ہو تو اس کی احتیاج دور کرنا، اگر کوئی بیمار ہو تو اس کی عیادت کرنا، بیواؤں کی سرپرستی، یتیموں کی پرورش، مجبور و معذور افراد کی دست گیری، غیر پڑھے لکھے

Marfat.com

لوگوں کے لیے تعلیم کا انتظام ایسے معاملات اسلامی شریعت میں بہترین عبادت کا درجہ رکھتے ہیں۔ اسلامی شریعت میں یہ تاکید کی گئی ہے کہ کوئی پڑوسی بھوکا نہ رہے۔ اگر خود پیٹ بھر کر کھالیا اور پڑوسی بھوکا رہ گیا تو یہ کھانا ناجائز ہو گیا۔

انسانوں کے حقوق ادا کرنا اور ہر لحاظ سے انسانوں کا احترام کرنا اور ان کی عزت قائم کرنا اسلامی تعلیمات کے ذیل میں آتا ہے۔ جو انسان حقوق العباد کی ادائی کے مرتبے پر فائز ہوتے ہیں ان کا شمار اربابِ سربلند میں ہوتا ہے۔ یہ وہ انسان ہوتے ہیں کہ جو اپنے آرام و آسائش کو چھوڑتے ہیں اور بہ کمالِ ایثار دوسروں کے کام آتے ہیں۔ ایسے ایثار پیشہ اور محبِ انسان و انسانیت لوگوں کو اسلام بلند مقام عطا کرتا ہے اور ان کی رفعت و عظمت کا ذمّہ دار ہوتا ہے۔ اگر ہم کو اپنے ماحول میں اور اپنے معاشرے میں غربت و جہالت ملتی ہے اور معاشرے میں ہم دیکھتے ہیں کہ ضرورت مند اور یتیم و محتاج موجود ہیں، اگر ہماری نگاہیں بداخلاقیوں کو دیکھ رہی ہیں اور اگر ہمارا دل یہ گواہی دیتا ہے کہ معاشرے میں فسق و فجور موجود ہے اور کوئی معذور بے توجہی کا شکار ہے تو باور کرنا چاہیے کہ ہم نے اپنے معاشرے اور سوسائٹی کو قالب اسلام میں ڈھالنے میں کوتاہی کی ہے اور ہمارا دین ایسے حالات میں ہم سے مطالبہ کرتا ہے کہ ہم تعلیماتِ اسلام سے روشنی حاصل کریں اور اپنے ماحول اور معاشرے کو تمام گندگیوں اور اخلاقی غلاظتوں سے پاک کرنے کا عزم کریں۔

قرآنِ حکیم میں رسولِ اکرمؐ سے یہ فرمایا گیا کہ لوگ دریافت کرتے ہیں کہ آمدنی کا کتنا حصّہ دوسروں پر خرچ کریں۔ رسول مقبولؐ فرما دیجیے کہ جو کچھ بچ رہے سب دوسروں کو دے دیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ دولت لٹا کر خود بھی "سائل و محروم" کے زمرے میں شامل ہو جاؤ، بلکہ مقصد یہ ہے کہ اپنے کو احتیاج میں ڈالے بغیر اپنی آمدنی کا جتنا حصہ دوسروں پر صرف کر سکتے ہو کرو۔ لطف یہ کہ اسلام یہ نہیں کہتا تم احسان کر رہے ہو، بلکہ وہ اصرار کرتا ہے کہ بندوں کا حق ادا کرنا بندوں پر فرض ہے، اللہ کی رضا کا ذریعہ ہے اور رسول اللہؐ کی اطاعت و پیروی کا عملی طریقہ ہے۔

معذوری کی متعدد اقسام ہیں: ذہنی معذوری، جسمانی معذوری، نابینائی، بے بضاعتی یہ سب معذوریاں ہیں۔ ہمارے معاشرے میں ایسے افراد موجود ہیں کہ جو حوادثِ زمانہ کی وجہ سے معذوروں میں شمار ہو رہے ہیں تو ایسے تمام افراد معاشرے کے خوش حال، صنعت کار و تاجر وغیرہ کی توجہ چاہتے ہیں۔ تقاضائے حقوق العباد یہ ہے کہ تمام معذور افراد کا ہاتھ تھاما جائے اور ان کی باعزت زندگی کا سامان کیا جائے۔

Marfat.com

رنگ و نسل کا امتیاز

اگر ہم تاریخِ انسانی پر ایک نگاہِ عمیق ڈالیں اور فکر و نظر کی تمام توانائیوں کے ساتھ حالاتِ ماضی کا جائزہ لیں اور بالخصوص طلوعِ اسلام سے قبل اس کرۂ ارض کے شب و روز کو دیکھیں اور آج کی دنیا کے نقشے پر بھی نگاہ رکھیں تو معلوم ہو گا کہ یہ شقاوت صرف انسان کے حصے میں آئی ہے کہ وہ اپنے ہی ہم جنسوں کو اپنی درندگی کا شکار بنا لیتا ہے، اور جب خوں خواری پر اتر آتا ہے تو وہ اپنے ہی بھائیوں کے خون سے اپنی ہوس کی پیاس بجھاتا ہے۔ اپنے اقتدار اور اپنی حکومت کے پائے مضبوط کرنے کے لیے اپنے ہی جیسے انسانوں کے گوشت پوست کو بنیادوں میں چن دیتا ہے۔ اپنی شاہی کے محل کو سجانے کو اولادِ آدم کے سروں کی کھیتیاں کاٹ ڈالتا ہے۔

انسانوں کی اس بستی نے اور اس معمورۂ ہستی نے، انسان کے ہاتھوں، انسان کی تباہی کے جو دل خراش مناظر دیکھے ہیں اور آج بھی دیکھ رہی ہے، ان کے اسباب و عوامل کا مطالعہ کیجیے تو سب سے بڑا سبب، اور سب سے زیادہ تباہ کن سبب، انسان اور انسان کے درمیان رنگ و نسل کا امتیاز ہی نظر آئے گا۔

اُس دور میں اور تاریکیوں اور جاہلیت کے اس زمانے میں جب اللہ نے اپنے آخری پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ شمعِ ہدایت دے کر مبعوث فرمایا جس کی روشنی اور جس کی تابندگی لازوال ہے، تو اس وقت بھی ان ہی دو بنیادوں پر انسانوں کی تقسیم اور گروہ بندی کا مرض عام تھا۔ اس مرض نے ہمیشہ کی طرح اس زمانے میں بھی اللہ کی اس بستی کو فتنہ و فساد کی آماج گاہ بنا رکھا تھا۔

قرآنِ حکیم نے لوگوں کو بتایا کہ:

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ ۔۔۔۔ (الروم۔ ۴۱)

یعنی: "خشکی اور تری، فتنہ و فساد سے جو بھرے نظر آتے ہیں تو یہ سب انسانوں کے اپنے ہاتھوں کا کیا دھرا ہے"

قرآن نے اس بیماری کا جو علاج تجویز کیا وہ یہ تھا:

Marfat.com

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَى وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ (الحجرات : ١٣)

یعنی: ”اے لوگو! ہم نے تمھیں ایک ہی ماں باپ سے پیدا کیا اور خاندانوں اور قبیلوں میں تو صرف اس لیے تقسیم کیا کہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو۔ ہاں یاد رکھو خاندانوں اور قبیلوں کی یہ تقسیم از خود کسی عزّ و شرف یا تذلیل و اہانت کا سبب نہیں ہو سکتی، عزّ و شرف حاصل کرنا ہے تو اس کا سیدھا اور سچا طریقہ یہ اور بس یہ ہے کہ اپنے اندر اللہ کا خوف اور اس کا لحاظ پیدا کر لو تم میں سے جو جس قدر اللہ سے ڈرنے والا ہوگا وہ اللہ کے ہاں اور اسی طرح مخلوقِ خدا کے ہاں عزت و تکریم کا مستحق قرار پائے گا۔“

کتابِ عزیز کے اس درس کا نتیجہ تھا کہ جو لوگ اس ربانی ہدایت کو تسلیم کر لیتے، اور اپنے آپ کو اللہ اور اس کے رسولؐ کے سپرد کر دیتے وہ خاندانوں، نسلوں، قبیلوں، قومیتوں، وطن پرستیوں اور حسب نسب کے اختلافات اور رنگ و شباہت کی نسلی اور ملکی خصوصیات کو یکسر بھلا کر ایک اٹوٹ وحدت میں خود کو گم کر لیتے اور ایک آفاقی امت میں اس طرح ضم ہو کر رہ جاتے کہ سلمانِ فارسی، صہیبِ رومی اور بلالِ حبشی ـــــ اللہ ان سب سے راضی ہو ـــــ ساری نسبتیں مٹا کر صرف ابنائے اسلام اور اسلامی برادری کے ارکان بن جاتے ہیں۔

مسلمانوں کے درمیان اخوت اور آپس میں ایک دوسرے سے ہمدردی اور ایک دوسرے کے لیے جاں نثاری کا جو منظر یثرب نے اسلام کے ورود کے بعد دیکھا اس کا سبب یہی تھا کہ اسلام نے ایک عقیدے کی وحدت کے علاوہ تمام دیگر امتیازات کو کالعدم قرار دے دیا تھا۔ اور اس طرح کلمہ گو انسانوں کے درمیان جو رشتۂ مودت و اخوت قائم کر دیا تھا وہ حسب نسب کے تعلقات اور خون کے رشتوں سے کہیں زیادہ مضبوط تھا۔

اسلام کی اسی تعلیم کا اثر تھا کہ دو مسلمان جن کے درمیان مشرق و مغرب کا فاصلہ ہو اور جنوب و شمال کا بعد ہو، ان کے دل ایک ساتھ دھڑکتے تھے۔ اس طرح ایک عالمی امت نے وجود پایا جو مادی اور معنوی فاصلوں کے علی الرغم امت واحدہ تھی۔ یہاں ماضی کا صیغہ استعمال کرنے کی وجہ آپ جانتے ہیں۔ وہ یہ ہے کہ آج ہم پھر جاہلیت میں مبتلا ہو گئے ہیں جس سے ہمیں اسلام نے نکالا تھا۔ اس روح پرور تعلیم سے روگردانی نے آج ہمیں یہ دن دکھایا ہے کہ دنیا کے ایک حصے میں ہمارے اپنے بھائی اور ہمارے اپنے جگر گوشے اغیار کی تیغ و تفنگ کا شکار ہوتے ہیں اور ہم میں سے کسی کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔ ہمارے اپنے دست و بازو کاٹ کاٹ کر پھینکے جا رہے ہیں اور ہم کوئی تکلیف اور کوئی اذیت محسوس نہیں کرتے۔

Marfat.com

اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے اسلام کے کلمہ جامع کو تو بھلا دیا اور قومیتوں اور نسلوں کے بتوں کی پرستش شروع کر دی ہے۔ ہمیں اس بات کا احساس نہیں رہا کہ نسل پرستی اور قوم پرستی جس نے امت کا شیرازہ منتشر کر کے اسے ٹوٹی ہوئی تسبیح کے دانوں کی طرح بکھیر کر بے وقعت اور بے حیثیت بنا دیا ہے، رب واحد کی پرستش کرنے والی امت کے لیے شرک کے ہم معنی ہے۔

ہم تو اس لیے پیدا کیے گئے تھے، اور ہمیں تو اس بلند مقصد کے لیے وجود بخشا گیا تھا کہ ہم دوسروں کو اللہ کے رسولؐ کا یہ پیغام سنائیں گے کہ:

اَلَا کُلُّکُمْ مِنْ آدَمَ وَ آدَمُ مِنْ تُرَابٍ

یعنی: "لوگو! سنو تم سب اولادِ آدم ہو اور آدم مٹی سے پیدا کیے گئے تھے۔"

ہمیں تو اللہ کے آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آخری حج کے موقع پر یہ نصیحت فرمائی تھی:

لَا فَضْلَ لِعَرَبِیٍّ عَلٰی عَجَمِیٍّ وَلَا لِاَسْوَدَ عَلٰی اَحْمَرَ

یعنی: "عرب و عجم کے درمیان کوئی ایسا امتیاز نہیں جو ایک کو دوسرے سے زیادہ فضیلت عطا کرنے والا ہو۔ رنگوں اور نسلوں کا اختلاف بے حقیقت ہے۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں یہ پیغام دیا اور اس کے بعد ہمیں اس بات کا پابند فرمایا تھا کہ

اَلَا فَلْیُبَلِّغِ الشَّاھِدُ الْغَائِبَ

یعنی: "دیکھو! تم جو میری اس بات کے مخاطب ہو تم پر فرض ہے کہ میرا یہ پیغام ان لوگوں تک اور ان بندگانِ خدا تک پہنچا دینا جن تک میری آواز نہیں پہنچ رہی ہے۔"

پاکستان ۲۷ رمضان المبارک کو نزولِ قرآنِ حکیم کے دن معرضِ وجود میں آیا تو اس کی مشخص حیثیت ریاستِ اسلامی کی تھی اور اس کے کروڑوں باشندگان ایک امتِ واحدہ کے افراد تھے۔ نہ رنگ کا کوئی امتیاز تھا اور نہ نسل کا کوئی تشخص۔ یہ صوبوں پر مشتمل تھا، مگر اخوت اور وحدتِ اسلامی نے صوبائی حدود کو مسمار کر دیا تھا اور ایک ملتِ پاکستانیہ نے وحدت کی پوری شان کے ساتھ صفحۂ ارض پر سرِ افتخار بلند کیا تھا اور اقوام و امم عالم نے اس کا پرجوش استقبال کیا تھا اور عالمِ اسلام نے بالخصوص اسے خوش آمدید کہا تھا، کیوں کہ امتِ مسلمہ پاکستان اللہ پر ایمانِ کامل رکھتی تھی اور رسولِ برحق صلی اللہ علیہ وسلم کو ہادی تسلیم کرتی تھی اور تعلیمات قرآن و رسولِ اکرمؐ پر یقین اس کا امتیاز تھا اور اس پر عمل اس کا منشا و مقصود تھا۔

Marfat.com

مگر ہم جانتے ہیں کہ ہم نے رنگ و نسل کے بارے میں تعلیماتِ اسلامی سے صرفِ نظر اور گردانی کی، جس کی سخت ترین سزا ہمیں تقسیمِ وطن کی صورت میں مل چکی ہے۔ تعلیماتِ قرآن اور تعلیماتِ رسول ﷺ برحق ہیں اور ابدی ہیں اور ان تعلیمات سے صرفِ نظر اور ان پر عمل سے فرار سالمیتِ ملک اور یک جہتیِ ملّت کو پارہ پارہ کر سکتا ہے۔

اے اہلِ وطن! ہماری عافیت اسی میں ہے اور ہمارا امتیاز یہی ہو سکتا ہے کہ پاکستان میں ایک امّتِ واحدہ بن کر اس ریاستِ اسلامی کی عظمت و رفعت کا سامان کریں کہ خود ہماری سربلندی اور سرفرازی کا یہی راستہ ہے۔

وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا (آل عمران ۔ ۱۰۳)

اللہ تعالیٰ ہماری مدد فرمائے۔

Marfat.com

حثّ علی الجہاد

جہاد کے لغوی معنی ہیں " وہ جد و جہد اور کوشش و سعی کہ جو کسی ایسے مقصد کے لیے جو پہلے سے متعین ہو، تمام ممکنہ صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر کی جائے۔" اور جہاد کے اصطلاحی معنی ہیں " غلبۂ اسلام اور اسلام اور ملّت کی حفاظت کے لیے کی جانے والی ہر وہ کوشش جو خالصتہً اللہ کے لیے ہو۔" استحکام ملّت اور اعلائے کلمۃ اللہ کے حق میں ہر کوشش جہاد ہے۔ خواہ یہ کوشش قلم سے ہو یا زبان سے، تحریر سے ہو یا تقریر سے، فکر سے ہو یا اسلحہ سے۔ جہاد اسلام کے اہم فرائض میں داخل ہے اگر زمانہ امن نہ ہو یعنی اسلام اور ملّت کے خلاف کوئی معرکہ درپیش ہو تو جہاد ایک ایسا فرض ہے کہ جس میں حصہ نہ لینا ایمان اور اسلام کے تقاضوں کے منافی ہے۔ یہاں تک کہ حصہ لینے کے بعد پیٹھ دکھانا ارتداد ہے۔ قرآنِ مجید میں ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا لَقِيتُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوهُمُ الْأَدْبَارَ ۝ وَمَن يُوَلِّهِمْ يَوْمَئِذٍ دُبُرَهُ إِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ أَوْ مُتَحَيِّزًا إِلَىٰ فِئَةٍ فَقَدْ بَاءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللَّهِ وَمَأْوَاهُ جَهَنَّمُ ۖ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ ۝

(الانفال: ۱۵-۱۶)

یعنی: " مسلمانو! جب کافروں سے مقابلہ ہو تو اس روز انھیں پیٹھ نہ دکھانا اور جس نے ایسا کیا، سوائے اس کے کہ کوئی جنگی تدبیر اس کی داعی ہو یا اپنی جماعت سے جا کر ملنا ہو تو وہ اللہ کا غضب لے کر لوٹا۔ اس کا ٹھکانہ جہنّم ہے اور کیسا بُرا ٹھکانہ ہے۔"

یہ کون نہیں جانتا کہ اسلام اور ملّت دونوں دشمنوں کی یلغار کی زد میں ہیں۔ اب ہم مسلمانوں کا کام ہے کہ اس بات کی فکر یں کہ اس یلغار کا جواب کس طرح دینا چاہیے کہ دین و ملّت کے مفادات محفوظ رہ سکیں۔

پاکستان اور سارا عالمِ اسلام اس وقت انتہائی صبر آزما حالات سے دوچار ہے۔ ایک طرف اس کا اپنا یہ حال ہے کہ اس نے انسانیت کے نام اور اللہ اور قرآن کے پیغام کو فراموش کر دیا ہے اور دوسری طرف صورت یہ ہے کہ طاغوتی طاقتوں کی یلغار ہے۔ عین اس وقت کہ عالمِ اسلام اپنی ۱۵ ویں صدی میں داخل ہو رہا ہے اور ان عزائم کے ساتھ قدم زن ہے کہ استحکامِ امتِ مسلمہ

Marfat.com

اور اعلائے کلمۃ اللہ اس کا فرضِ عین ہوگا، شر کی تمام طاقتیں بیدار ہو کر اُس کے عزائم کو شکست دینے کا سامان کر رہی ہیں۔ اس صورتِ حال نے آج سارے عالمِ اسلام کو حالتِ جہاد میں کر دیا ہے اور اہلِ پاکستان کو اس جہاد میں پوری معنویت کے ساتھ شریک ہو جانا چاہیے۔ اللہ نے قرآنِ کریم میں دنیا کے تمام انسانوں سے خطاب کر کے ارشاد فرمایا ہے:

یٰاَیُّھَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْکُمْ مَّوْعِظَۃٌ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ۵ وَھُدًی وَّرَحْمَۃٌ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ ۵ قُلْ بِفَضْلِ اللّٰہِ وَبِرَحْمَتِہٖ فَبِذٰلِکَ فَلْیَفْرَحُوْا ط ھُوَ خَیْرٌ مِّمَّا یَجْمَعُوْنَ ۵

(یونس: ۵۷-۵۸)

یعنی: "اے انسانو! تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے وعظ و نصیحت پر مبنی صحیفہ اور سینوں اور عقل و ذہن کی تمام بیماریوں کے لیے سامانِ شفا اور ایک ایسی کتاب آئی ہے جو ایمان و یقین کی دولت رکھنے والوں کے لیے راہِ ہدایت روشن کرتی ہے۔ اللہ کا یہ فضل ایسا ہے جس پر لوگوں کو خوشی منانی چاہیے۔ اللہ کا یہ خصوصی فضل ان تمام چیزوں سے بہتر ہے جنھیں لوگ اکٹھا کرتے ہیں۔"

اسی قرآنِ مجید کی پہلی ہی سورت انسانوں کے لیے فلاح و کامرانی کا دروازہ کھولتی ہے اور اسی لیے سورۂ فاتحہ کہلاتی ہے۔ سورۂ فاتحہ انسانوں کو پیغام دیتی ہے کہ وہ صراطِ مستقیم کی تلاش کریں۔

یہ صراطِ مستقیم اللہ کا بتایا ہوا وہ راستہ ہے جس پر چلنے کے بعد افراد و اقوام اپنے انفرادی و اجتماعی حقوق سے پوری طرح بہرہ ور ہو کر دنیوی اور اُخروی کامیابی حاصل کر سکتے ہیں۔ "اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ" کی دعا جو اس سورت میں سارے انسانوں کو سکھائی گئی ہے، یہ بتاتی ہے کہ اللہ ربُّ العالمین ہے، اور اس بنا پر اس کی یہ تعلیم سارے انسانوں کے لیے ایک پیغام ہے۔

ہم اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے اپنی حیاتِ ملّی کی پندرھویں صدی میں داخل ہو گئے ہیں۔ چودہ صدیوں کی تاریخ، ملّتِ مسلمہ کے عروج و زوال، غفلت و آگہی اور خوابیدگی و بیداری کی ملی جلی داستان ہے۔ ۱۵ ویں صدی کے آغاز کو ہم اہلِ پاکستان نئی زندگی کا نقطۂ آغاز بنانا چاہتے ہیں۔ اس کے لیے ہمیں اپنا گہرا جائزہ لے کر تاریخ کی عبرتوں اور عظمتوں کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے اور اپنی کامرانیوں کے اسباب کے ساتھ اپنی ناکامیوں اور محرومیوں کے عوامل کا بھی تعین کرنا چاہیے۔ آج ہمیں اللہ ربّ العالمین کا شکر بھی ادا کرنا چاہیے کہ جس نے ہمیں اپنی ہدایات سے نوازا اور ہمیں ایمان پر قائم رہنے کی توفیق عطا فرمائی، جس

Marfat.com

کے نتیجے میں آج مسلمان اپنی تعداد کے لحاظ سے بھی اور مادّی وسائل کے اعتبار سے بھی دنیا کی توجہ کا مرکز ہیں۔ مگر اس کے ساتھ ہمیں یہ احساس بھی کرنا چاہیے کہ دولتِ ایمان سے مالامال ہونے کے باوجود ہم قیادتِ ارضی اور امامتِ عالم کے منصب پر کیوں فائز نہیں ہیں۔

حالات متقاضی ہیں کہ تمام برادرانِ اسلام اس مسئلے پر اس انداز سے غور کریں کہ جس ملّت کو سب سے پہلا سبق علم کا دیا گیا ہو اور ہادیِ برحق صلی اللہ علیہ وسلم پر سب سے پہلی وحی بھی اقراٗ (پڑھو) سے شروع ہوئی ہو وہ ملّت علم کے میدان میں سب سے آگے کیوں نہیں ہے۔ ہمیں تو علم کی اس منزل پر ہونا چاہیے تھا کہ جہاں دوسروں کا تصوّر بھی نہ جا سکے۔ اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان اور اس کی تمام موجودات کو اہلِ ایمان و اسلام کے لیے مسخّر کر دیا ہے، لیکن ہم اللہ تعالیٰ کی یہ عنایت بھول گئے اور دوسری قومیں تسخیرِ کائنات میں مصروف ہیں۔

ہمیں اپنی حیاتِ مستعار کے کسی لمحے بھی یہ فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولِ برحق ﷺ نے ہمیں علم حاصل کرنے اور علم کو پھیلانے کی ہدایت فرمائی ہے، اس لیے تمام نوجوانانِ اسلام کے لیے پیغام یہ ہے کہ وہ علم کے اسلحے سے لیس ہو کر ایک خدا پرست اور انسان دوست قیادت فراہم کر دیں کہ جو آج تمام عالم کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ دنیا اس وقت افتراق و انتشار، بدامنی اور بے یقینی سے تنگ آکر ایک منصفانہ اور متوازن نظامِ حیات کی متلاشی اور منتظر ہے۔ ایمان کے ساتھ ساتھ علم کی روشنی سے بہرہ ور نوجوان ہی انسانیت کے اس انتظار کو ختم کر سکتے ہیں۔ اسلام کی پندرھویں صدی ہجری میں داخل ہوتے وقت اہلِ پاکستان اور عالمِ اسلام کو اس یقین و ایمان کی دولت سے مالامال ہونا چاہیے کہ تمام عالم میں ایک ہی ذاتِ گرامی ہے کہ جو ہماری رہ نما ہو سکتی ہے اور ایک ہی چشمِ نگراں ہے کہ جو عالمِ اسلام کو لغزشوں سے بچا سکتی ہے۔ یہ وہ ہستی ہے کہ جو کبھی کوہِ سینا پر تجلّی بن کر چمکی، کبھی فاران پر ابرِ رحمت بن کر نمودار ہوئی، کبھی غارِ ثور میں "لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا" اور کبھی کنارۂ بدر پر "اِنْ یَّنْصُرْکُمُ اللّٰہُ فَلَا غَالِبَ لَکُمْ" (آلِ عمران: ۱۶۰) کا پیغام دے رہی تھی، اور کبھی اُحد کے دامن میں "وَکَانَ حَقًّا عَلَیْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِیْنَ ۝" (الروم: ۴۷) کی بشارت تھی۔ یہی ذاتِ باری تعالیٰ آج بھی لٹے ہوئے کارواں اور ایک برباد شدہ انجمن کے لیے امید کی روشنی ہے۔

۱۵ ویں صدی کے مسلمان کو محسوس کرنا چاہیے کہ اسلام کے دامنِ مقدس پر اس سے بڑھ کر کوئی اور بدنما داغ نہیں ہو سکتا کہ انسانی حریت اور ملکی و ملّی فلاح کا سبق مسلمان دوسری اقوام سے لیں۔ ہم یقین و ایمان رکھتے ہیں کہ اللہ اپنی ذات و صفات میں وحدہٗ لاشریک ہے ہم جانتے

Marfat.com

ہیں کہ قرآنِ حکیم اپنی جامعیت اور کمالِ تعلیم میں وحدہٗ لاشریک ہے۔ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ قرآن کا لانے والا رسول ؐ بھی کمالِ انسانیت و عبدیت اور اتمامِ دعوت و اصلاح میں بے مثال ہے۔

اس لیے یہ ضروری ہے اور لازمی کہ جو امّت اللہ واحد اور خاتم النبیّین کے دامنِ تعلیم سے وابستہ ہو وہ بھی اپنے اندر یکتائی کا جلوہ اور وحدت کی شان رکھے، اور وہ اپنے اعمالِ زندگی میں بے مثال ہو۔ اس امّتِ مسلمہ کے اپنے اعمال و خصائص، اس کے اپنے اخلاق و سلوک، اس کی علم و حکمت اور اس کے فنون و ثقافت کے معیار اس درجہ عظیم و بلند ہوں کہ دنیا کی ہر قوم اس کا اتباع کرے۔ زندگی کے ہر حُسن و جمال میں امّتِ مسلمہ کے خدوخال مرقع عالم کے لیے نمونہ بنیں۔

"وَکَذٰلِکَ جَعَلْنٰکُمْ اُمَّۃً وَّسَطًا" کے یہی معنی ہیں اور اس لیے مسلمانوں سے وعدہ کیا گیا تھا کہ:

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَتَّقُوا اللّٰہَ یَجْعَلْ لَّکُمْ فُرْقَانًا (الانفال: ۲۹)

یعنی: "مسلمانو! اگر تم اللہ کا خوف اپنے اندر پیدا کر کے متقی بن جاؤ گے، تو وہ تمھارے لیے تمام دنیا میں ایک خاص امتیاز اور خصوصیت پیدا کر دے گا۔"

اس دنیا میں کوئی لمحہ ایسا نہیں کہ جو نعرۂ تکبیر سے خالی ہو۔ ہر لمحہ دنیا میں کسی نہ کسی جگہ موذّن صدائے اللہ اکبر بلند کر رہا ہے، اور حی علی الصلوٰۃ اور حی علی الفلاح کی دعوت دے رہا ہے۔ عالمِ اسلام میں حالات حی علی الجہاد کی دعوت دے رہے ہیں۔ ہمیں اس دعوت اور اس چیلنج کو قبول کرنا چاہیے اور اپنی زندگیوں کو قالبِ اسلام میں ڈھال کر ۱۵ ویں صدی ہجری میں سربلندیِ اسلام اور سرفرازیِ مسلمین کا سامان کرنا چاہیے۔

Marfat.com

مسلمان کا لباس

اسلامی تعلیمات کا بہ غور مُطالعہ کرنے کے بعد ہر سلیم الطبع آدمی یہ نتیجہ اخذ کرسکتا ہے کہ یہ دین ہمہ گیر ہے، اور اس کی ہدایات کسی ایک طبقے یا کسی ایک فرقے کے لیے نہیں، بلکہ ساری دنیا اور سارے طبقاتِ عالم کے لیے ہیں۔ اسلام نے اگر اہلِ ثروت کو بے قید و بے زمام نہیں چھوڑا ہے تو اُس نے محروموں کی بے سر و سامانی کو دُور کرنے کے لیے بھی ایک مستحکم نظام عطا کیا ہے۔

جس کو فراوانیِ رزق بخشی گئی اُسے قدم قدم پر اس بات کا احساس دلایا گیا کہ یہ تمھاری اپنی تدبیروں کا نتیجہ نہیں، بلکہ اس کا بخشنے والا کوئی اور ہے، اور وہ جو بظاہر تم سے فروتر ہے اس کو بھی محروم رکھنے والا کوئی اور ہے۔ اس لیے کوئی خوش حال آدمی اپنی دولت مندی کی بنا پر اپنے ہی جیسے اِنسانوں کے مقابلے میں، محض ان کی غربت کی بنا پر اگر خدائی کا دعوا کرتا ہے تو یہ دعوا باطل ہے اس لیے کہ دولت سرے سے اُس کی چیز ہی نہیں، وہ تو فضلِ خداوندی ہے اور قطعی طور پر ایک امانت ہے۔ اور اسی طرح اگر غُربا اُن اُمرا کی باطل خدائی کے سامنے سر جھکاتے ہیں یا اس دولت کی بنا پر جو عطیۂ خداوندی ہے، اُن سے متصادم ہوتے ہیں یا برسرِ پیکار ہوتے ہیں تو وہ نہ صرف انسانی مُعاشرے کو تباہ و برباد کرتے ہیں، بلکہ توحید اور اللہ تعالیٰ کی عظمت و قدرت کے خلاف اعلانِ جنگ کرکے خودکشی کے مرتکب ہوتے ہیں۔

اس لیے انسانی مُعاشرے کو اِفلاس و دَولت کے باوجود باہمی خوں ریزی، نیز بغض و حسد جیسے رذیل اخلاق سے پاک کرنے کے لیے سب سے پہلی تعلیم توحید کی دی گئی جس کا مفہوم یہ ہے کہ ہر چیز کا مالکِ حقیقی اللہ تعالیٰ ہے، اس کے سوا کوئی اور نہیں۔ جو مالک ہے وہی معبود بھی ہے۔ عطا و بخشش بھی اُس کی صفت ہے۔ اسلام صرف یہی نہیں چاہتا کہ لوگ عقیدہ و تصوّر کی حیثیت سے نکتۂ توحید کو اپنا لیں بلکہ وہ عملی طور پر معاشی توازن بھی پیدا کرنا چاہتا ہے، اور ایک ایسے مُعاشرے کی تشکیل کرنا چاہتا ہے جس میں امارت و غربت کے

Marfat.com

درمیان ایسا عظیم تفاوت نہ پیدا ہو جائے کہ یہ دو طبقے دو الگ الگ مخلوق بن جائیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اسلام تفاوت کی اِس خلیج کو کس طرح کم کرتا ہے اور انسانی معاشرے میں کس طرح معاشی توازن پیدا کرتا ہے۔

معاشی بنیادوں پر انسانی طبقات کے درمیان تفاوت کا احساس اس وقت زیادہ ہوتا ہے جب باثروت طبقہ مسرفانہ طرزِ زندگی کا حامل بن جائے۔ دولت اور ثروت کی نمائش کو اپنی زندگی کا مقصود قرار دے لے۔ بود و باش، غذا و لباس میں تکلف اور تصنع کو اس قدر دخل ہو جائے کہ زندگی کے سارے خارجی اور داخلی شعبوں سے صرف تمول نہیں بلکہ احساسِ برتری کا اظہار ہوتا ہو، تو دوسرے اس امیرانہ ٹھاٹ باٹ کے سامنے اپنے آپ کو حقیر اور بے بس محسوس کرنے لگیں۔ اسلام نے نمائش، تصنع اور اسراف پر پابندی عائد کر کے ایک طرف خوش حال طبقے کو اخلاقی پستیوں سے نکالا، دوسری طرف سادگی کی تلقین کر کے غربا سے تفاوت کے احساس کو ختم کیا اور ایک معاشی توازن قائم کیا جس کی نظیر نہیں ملتی۔

اہلِ عجم اپنی شان و شوکت کے اظہار کے لیے زر و جواہر سے مرصّع لباس پہنتے تھے۔ الماس و گہر سے تخت و تاج سجاتے تھے، سیم و زر کی نمائش سے اپنی برتری کا اظہار کرتے تھے۔ اسلام اس تزک و احتشام کو ناپسند کرتا ہے۔ اس نے جس سادگی کی تعلیم دی ہے، اس کا تعلق رفتار و گفتار، عمل و کردار، غذا و لباس اور بود و باش سب سے ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ معاشرے کے افراد میں ہر اعتبار سے ہم آہنگی پیدا ہو اور کوئی فرد کسی مرحلے پر نمایاں تفاوت کے احساس میں مبتلا نہ ہو۔ اس لیے اُس نے تمدّن کو غیر ضروری لطافتوں اور نزاکتوں سے پاک رکھنے کی تاکید کی اور اسراف و تعیش کے اس رُجحان کو جو عجمیوں کا شعار تھا، ختم کرنے کے لیے سونے اور چاندی کا استعمال مردوں کے لیے ممنوع قرار دیا۔ ان کے ظروف کے استعمال کو ممنوع قرار دے دیا، ریشم اور زر و جواہر سے مرصّع لباس پہننے کو ممنوع قرار دے دیا، تاکہ سادگی اور جفاکوشی کی خصوصیت بھی برقرار رہے اور معاشی توازن بھی قائم رہ سکے۔

اسلام ہر شعبۂ زندگی میں اعتدال و توسّط کو پسند کرتا ہے، بے شک اس نے زینت کو حرام قرار نہیں دیا ہے، بلکہ قرآن یہ کہتا ہے کہ:

ترجمہ: ”کہہ دیجیے اے نبیؐ! کہ کس نے اللہ کی اس زینت کو حرام قرار دیا جو اُس نے بندوں کے لیے اتاری۔“

یقیناً لباس کا ایک مقصد زینت بھی ہے جیسا کہ سورۂ اعراف کی اسی آیت میں فرمایا:

Marfat.com

ترجمہ: "اے اولادِ آدم! ہم نے تم پر لباس نازل کیا ہے کہ تمھارے جسم کو ڈھانکے اور تمھارے لیے زینت و حفاظت کا ذریعہ بھی ہو۔"

لیکن اسی آیت میں دو اور مقاصد بیان کیے گئے ہیں اور وہ یہ ہیں کہ لباس سے انسان موسمی اثرات سے محفوظ رہتا ہے، اور اس سے شرم و حیا کے تقاضے پورے ہوتے ہیں۔ گویا جس لباس سے یہ مقاصد پورے نہ ہوں وہ اسلامی نقطہ نظر سے لباس نہیں کہا جاسکتا، مگر زینت سے تجمل یا شان و شوکت مراد نہیں ہے، یا وہ لباس مراد نہیں ہے جس کو اسلام نے عورتوں کے لیے مخصوص قرار دیا ہے، بلکہ زینت سے شائستہ اور مہذب لباس مراد لیا ہے، پاک و صاف لباس مراد لیا ہے۔ یہ صفائی اور پاکیزگی دونوں طرح کی ہونی چاہیے، ظاہری بھی اور باطنی بھی، اور اس میں سادگی بھی ہونی چاہیے۔ اُسے ریشم اور زر و جواہر سے آراستہ نہیں ہونا چاہیے۔

حضرتِ عمرؓ کی روایت ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ریشمی لباس نہ پہنو، کیوں کہ جو دُنیا میں اس کو پہنے گا وہ آخرت میں اس کو نہیں پہن سکے گا۔

مسلم کی حدیث ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے ایک بار ایک ریشمی کپڑے کے تحفے کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "اس کو پھاڑ کر اس کے دوپٹے بنادو اور ان کو عورتوں میں تقسیم کردو۔"

ابوداؤد کی حدیث ہے کہ جس شخص نے وسعت اور قدرت کے باوجود لباس میں سادگی اختیار کی، خداوند تعالیٰ اُسے قیامت میں بہترین لباس سے آراستہ کرے گا۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ انسان کو اپنی حیثیت کے مطابق لباس پہننا چاہیے، مگر سادگی اور وقار نیز توسط اور اعتدال ضروری ہے، اور ساتھ ہی یہ بھی ضروری ہے کہ ریشم نہ پہنا جائے، کیوں کہ حدیث شریف میں صریحاً اس کی ممانعت آئی ہے۔

ترمذی میں حضرت ابوموسیٰؓ سے یہ حدیث مروی ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "ریشم کا لباس اور سونا ہماری امت کے مردوں پر حرام ہے اور عورتوں کے لیے حلال ہے۔"

ریشم پہننے اور سونے اور چاندی کی ممانعت کا ذکر آچکا ہے، اور ان مصلحتوں پر بھی روشنی ڈالی جاچکی ہے جن کی بنا پر اسلام نے مردوں کے لیے ان چیزوں کو ممنوع قرار دیا ہے۔ ریشم کے متعلق یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ بعض صحابۂ کرام کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے علاج کے طور ریشم پہننے کی اجازت دی ہے۔

صحیحین میں یہ حدیث حضرت انس بن مالکؓ سے مروی ہے کہ حضورؐ نے حضرت

Marfat.com

عبدالرحمٰن بن عوفؓ اور حضرت زبیر بن العوامؓ کو مرض خارش کی وجہ سے ریشمی لباس پہننے کی اجازت دی تھی۔

ایک روایت یہ بھی ہے کہ متذکرہ اصحابِ رسولؐ نے ایک غزوے میں جوئیں پڑ جانے کی شکایت کی تو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے ریشم کی قمیص پہننے کی اجازت دی تھی۔

یہ تو اصولِ فقہ کا مسلّمہ مسئلہ ہے کہ عندالضرورت ممنوعات زُمرۂ مُباحات میں آجاتی ہیں۔ چناں چہ علامہ ابنِ قیّمؒ نے مندرجہ بالا احادیث کے ضمن میں یہ لکھا ہے کہ ان دو پہلوؤں میں ایک تو فقہی ہے دوسرا طبّی۔ فقہی حیثیت تو یہی ہے کہ عورتوں کے لیے مُباح اور مَردوں کے لیے ریشم حرام ہے۔ اب رہی حاجت و مصلحت تو ممکن ہے کہ سردی شدید ہو، اور رفع بُرودت کے لیے دوسرا کوئی لباس نہ ہو یا یہ بھی ممکن ہے کہ سَتر پوشی کی کوئی متبادل صورت نہ ہو، یا پھر خارش اور جُوئیں جیسے موقعوں پر علاجاً پہننا مُباح قرار دیا گیا ہو۔

شریعت میں اس کی متعدد مثالیں ہیں، مثلاً ممنوعہ اوقات میں نفل پڑھنے کی ممانعت اس لیے ہے کہ آفتاب پرستوں سے مشابہت نہ ہو، ورنہ ظاہر ہے کہ نفل میں اباحت ہے۔

جہاں تک ریشم کے طبّی خواص اور اس کی ماہیت کا تعلق ہے، اس کا شمار ادویۂ حیوانیہ میں ہے اور وہ مفرحِ قلب اور مقوی ہے۔ حکیم رازی نے لکھا ہے کہ ریشم جسم کو حرارت پہنچاتا ہے۔ بہرحال یہ ساری صورتیں استثنائی ہیں اور یہ مسلّمہ حقیقت ہے کہ اسلام نے مرد کو ریشم پہننے کی ممانعت کی ہے، اس لیے کہ عام حالات میں اس کا تعلق شان و شوکت کے اظہار ہی سے ہے، اور عجمی تمدّن کی اُن خصوصیات سے ہے جن سے تعیش اور اسراف کا رُجحان نمایاں ہوتا ہے اور ایسے ملبُوسات کی وجہ سے معاشی عدم توازن نیز غریب طبقے میں ناداری اور محرُومی کا احساس فزوں تر ہوتا ہے، جب کہ اسلام زندگی کے ہر شعبے میں توازن قائم کرتا ہے اور بڑھتے ہوئے تفاوت کو مٹا کر افراد کو ایک دوسرے کے قریب لانے کے لیے آیا ہے۔ اس کے نزدیک ہر وہ چیز ناپسندیدہ ہے جس سے غرور، نخوت اور ریا کی بُو آتی ہے۔ اسے سادگی اور میانہ رَوی پسند ہے۔

Marfat.com

زکوٰۃ کی معاشرتی و معاشی حیثیت

خیرات اور زکوٰۃ کی ترغیب اور تحریص اسلام میں ابتدا ہی سے شروع کر دی گئی چنانچہ سورۂ ماعون جو مکّہ میں نازل ہوئی، اس میں فرمایا گیا کہ "تم نے اس شخص کو دیکھا جو قیامت کو جھٹلاتا ہے۔ یہی وہ شخص ہے جو یتیم کو دھکّے دیتا ہے اور مسکین کے کھانا کھلانے کی لوگوں کو ترغیب نہیں دیتا۔" یہ ضرورت مندوں کے حقوق کی ادائی سے احتراز کرنے والوں پر کھلا عتاب ہے۔

ہجرت کے بعد زکوٰۃ و صدقات کی اہمیت دو گونہ ہو گئی کیوں کہ قیامِ مدینہ منورہ کے ابتدائی دنوں میں عام مسلمان اور خصوصاً مہاجرین سخت فقر و فاقہ میں مبتلا تھے۔ احادیث میں صحابہ کرامؓ کے فقر و تنگ دستی کے جو واقعات مذکور ہیں وہ زیادہ تر اسی زمانے کے ہیں۔ اسی بنا پر حکم ہوا کہ جس شخص کے پاس ضروری اخراجات کے بعد کچھ بچے اسے چاہیے کہ اسے دوسروں پر خرچ کر دے۔ مال کی محبت اور محفوظ رکھنے کی انسانی کم زوری کارِ خیر میں رکاوٹ بن جاتی ہے۔ چناں چہ بہت سے لوگ عمدہ مال محفوظ رکھتے اور ناپسندیدہ، ناقص اور خراب مال لوگوں کو دیتے تھے۔ انھیں یہ کہہ کر تنبیہ کی گئی کہ مسلمانو! اپنی کمائی میں سے اور اس چیز میں سے جو ہم نے تمھارے لیے زمین میں پیدا کی اچھا حصّہ، یعنی مالِ طیّب، اللہ کی راہ میں دو۔ سورۂ آلِ عمران میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ:

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ۝ (آلِ عمران: ۹۲)

یعنی: "نیکی تو یہ ہے کہ آدمی اللہ کی راہ میں اس کے دوسرے بندوں پر بہترین اور محبوب مال خرچ کرے۔"

ان تاکیدی احکام کا یہ اثر ہوا کہ جو خوش حال تھے وہ تو صدقات و زکوٰۃ کا پورا پورا اہتمام کرتے ہی تھے، جو غریب اور نادار لوگ تھے، ان میں بھی صدقہ اور خیرات کی طرف رغبت پیدا ہوئی اور وہ صرف اس لیے بازاروں میں مزدوری کرتے اور کندھوں پر بوجھ لاد کر لوگوں کے پاس پہنچاتے تھے کہ مزدوری ملے تو اللہ کی راہ میں اور اس کی محبت میں اس کے دوسرے بندوں پر خرچ کرنے کے قابل ہو سکیں۔

Marfat.com

زکوٰۃ کی معاشرتی اور معاشی اہمیت کا اندازہ صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں جو صدرِ اول کے مسلم معاشرہ کا بہ نظرِ غائر مطالعہ کریں اور یہ سمجھنے کی کوشش کریں کہ اسلام نے صرف زکوٰۃ کے ذریعہ کس کامیابی کے ساتھ معاشی مسئلے کا حل تلاش کر لیا تھا۔

اقتصادیات یا اکونومکس کا سب سے مشکل مسئلہ یہی ہے کہ افرادِ قوم میں بہ لحاظ فقر و غنا کیوں کر ایک تناسب و توازن قائم کیا جائے۔ عہدِ قدیم سے لے کر آج تک کوئی انسانی دماغ اس عقدہ کی گرہ کشائی نہ کر سکا۔ کسی نے یہ رائے دی کہ جملہ املاک پر افراد کا مساوی حق تصرف اور یکساں حقِ ملکیت تسلیم کیا جائے۔ دورِ جدید کے ماہرینِ معاشیات نے یہ حل پیش کیا کہ ملک کی تمام دولت پر حکمران پارٹی کا قبضہ ہو اور وہ لوگوں کو قوت لایموت مہیا کرنے کی ذمہ داری قبول کرے، لیکن اس شرط کے ساتھ کہ عوام انفرادی اور شخصی ملکیت سے دست بردار ہو جائیں۔ سرکاری فلیٹ میں پیدا ہوں، سرکار کا دیا کھائیں۔ ہسپتال میں مر جائیں۔

آج کل ترقی یافتہ ممالک، ترقی پذیر ممالک میں کروڑوں ڈالر اس بات پر صرف کر رہے ہیں کہ جو آ چکے سو آ چکے اب آنے والوں پر دنیا کا دروازہ بند کر دیا جائے۔

قرآنِ حکیم نے ایک نئی راہ متعین کی۔ اس نے کہا کہ مساوات کا یہ مصنوعی خیال محال اور خلافِ فطرتِ انسانی ہے، اس لیے کہ "رزق میں اللہ نے ایک کو دوسرے پر برتری دی ہے۔"

اللہ تعالیٰ نے اس اہم انسانی مسئلے کا یوں حل فرمایا کہ زکوٰۃ کو فرض قرار دیا، اور اسے دین کا تیسرا رکن بنایا، اور اس کی بنا قانون کے بجائے ایمان و ایثار اور ہمدردی کے فطری انسانی جذبات پر رکھی۔ اس نے زکوٰۃ کو عبادت قرار دیا۔ اس طرح یہ قربِ الٰہی کا ذریعہ بن گئی۔ اصول یہ قرار دیا گیا کہ اللہ کے بندوں کو اللہ کی محبت میں دو۔ اس طرح ذاتی احسان کا مسئلہ بھی ختم ہو گیا۔

نظامِ زکوٰۃ کا ایک اور فائدہ یہ بھی ہے کہ اہلِ حاجت اپنے صاحبِ حیثیت بھائیوں سے محبت کرنے لگتے ہیں۔ گویا دولت مند مسلمان کی دولت ایک ایسی کمپنی ہے جس میں غریب مسلمان بھی حصہ دار ہیں۔ زکوٰۃ پر عمل درآمد سے بھیک کی لعنت ختم ہو جاتی ہے۔

اسلامی قانون نے زکوٰۃ کے مستحقین کا بھی ذکر کیا ہے اور یہ ہدایت بھی دی ہے کہ جو مستحق نہ ہونے کے باوجود یہ مال لے گا، اس سے اللہ ناراض ہو گا اور یہ مال اس کے لیے حرام ہو گا۔

کوئی اقتصادی نظام اب تک ایسا پیش نہیں کیا جا سکا جس نے معاشی مسئلے کا ایسا متوازن حل تجویز کیا ہو کہ معاشرہ خوش حالی کا نمونہ بن جائے اور معاشی تنگی کا گلہ باقی نہ رہے۔

زکوٰۃ کے ذریعہ اسلام نے معاشی مسائل حل کرنے کی کوشش کی اور معاشرے میں ہم آہنگی

Marfat.com

اور اخوت و محبت کی فضا قائم کی۔ اسی لیے زکوٰۃ کے معاملے میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کے دورِ خلافت میں جب بعض مسلمانوں نے تساہل کا مظاہرہ کیا تو، اگرچہ اس وقت اسلامی ریاست ایک نازک دور سے گزر رہی تھی، تاہم حضرت صدیق اکبرؓ نے ان لوگوں کو کسی طرح کی بھی رعایت دینا منظور نہ کیا۔ اس وقت مدینہ کے مسلمان ایک بار پھر حیات و موت کی کشمکش میں مبتلا ہو گئے تھے اور حالات انتہائی مخدوش اور خطرناک ہو گئے تھے۔ اس کے علاوہ جیسا کہ عام انتشار کے موقع پر ہوتا ہے بعض مرتد سرداروں نے بھی بغاوت پر کمر باندھ لی تھی اور آزاد حکمران بننے کے خواب دیکھنے لگے تھے۔ رسول اکرمؐ کی وصیت کے مطابق شام کی جانب حضرت اسامہ بن زیدؓ کی سپہ سالاری میں لشکر بھی روانہ کرنا تھا۔ ایسے موقع پر بعض بااثر لوگوں نے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا۔ ان خطرناک حالات میں عام مسلمانوں کا ردعمل یہ تھا کہ منکرین زکوٰۃ کے خلاف تادیبی کارروائی ملتوی کر دی جائے۔ تمام شورشوں کے مقابلہ میں اہم اور نازک معاملہ منکرین زکوٰۃ کا تھا۔ یہ اسلام پر قائم رہنے کے مدعی بھی تھے اور زکوٰۃ کے منکر بھی۔ اس لیے ان پر تلوار اٹھانے کے بارے میں بعض صحابہ نے اختلاف کیا۔ ان کے خیال میں یہ تادیبی کارروائی جذبۂ جہاد کے تحت نہیں ہونی چاہیے تھی کیوں کہ وہ کلمہ گو تھے اور توحید و رسالت کا اقرار کرتے تھے، صرف زکوٰۃ دینے کے منکر تھے، اس لیے ان پر تلوار نہیں اٹھائی جا سکتی تھی۔

لیکن اس موقع پر حضرت ابوبکر صدیقؓ کی دینی بصیرت اور عرفانِ شریعت نے کام کیا۔ تاریخ کے صفحے اس بات کے شاہد ہیں کہ خلیفۂ اوّلؓ کی بصیرت بلند ترین مقام پر تھی۔ لوگ سروں پر بدلیاں منڈلاتے دیکھتے تھے، لیکن آپ بدلیوں میں پانی کی بوندیں بھی دیکھ لیتے تھے چنانچہ اس موقع پر آپ نے پورے اعتماد کے ساتھ فرمایا "اللہ کی قسم جو شخص رسول اللہؐ کی زندگی میں بکری کا ایک بچہ زکوٰۃ میں دیتا تھا اگر وہ اس سے بھی انکار کرے گا تو میں اس کے مقابلہ میں جہاد کروں گا" یہ روایت بخاری کی ہے۔

اس موقع پر حضرت عمرؓ کو بھی آپ کی اصابتِ رائے کا اعتراف کرنا پڑا کہ اگر آج انھیں زکوٰۃ کے معاملے میں چھوڑ دیا جائے گا تو کل صوم و صلوٰۃ کے منکرین کے ساتھ بھی ایسا ہی کرنا ہو گا۔ چناں چہ منکرین زکوٰۃ قبائل کے مقابلہ میں فوجیں بھیجی گئیں اور اسلام نے گویا دوبارہ زندگی حاصل کی۔ زکوٰۃ مسلم معاشرے میں معاشی اور معاشرتی فلاح و بہبود کا بہترین وسیلہ ہے

اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ پاکستان میں بھی اب زکوٰۃ کی وصولی کا سرکاری سطح پر باقاعدہ انتظام ہو گیا ہے۔

Marfat.com

اسلام میں اجتماعیّت کی اہمیّت

اجتماعیت پسندی انسانی فطرت کا تقاضا ہے۔ اگر انسانوں میں یہ جذبہ نہ ہوتا تو دنیا میں نہ خاندان بنتے نہ قبیلے اور نہ گاؤں اور شہر وجود میں آتے۔ یعنی مِل جُل کر رہنے کا فطری جذبہ دلوں میں کارفرمانہ ہوتا اور انسانی ضرورتیں اس بات کی متقاضی نہ ہوتیں تو معاشرہ ہی وجود میں نہ آتا، انسان جانوروں کی طرح غیر ترقی یافتہ زندگی گزارتا ہوتا۔ جب آں حضرتؐ تشریف لائے تو عرب کے باشندے اگرچہ خاندانی اور قبائلی تعصب میں مبتلا تھے، لیکن ان کی زندگی اجتماعیت کی رُوح سے محروم تھی۔ ایک قبیلہ دوسرے قبیلے کو اپنا دشمن سمجھتا اور معمولی معمولی اختلافات میں بھی ایک دوسرے کا اس طرح خون بہاتا گویا انسان کُشی جانوروں کے شکار سے بھی زیادہ دل چسپ اور نفع بخش مشغلہ ہو۔ ان کی عادتیں اس قدر جاہلانہ تھیں کہ ایک خون کا بدلہ کئی کئی پُشتوں تک جا کر لیتے تھے۔ اس طرح خاندانوں میں لڑائیوں اور خوں ریزیوں کا ایک لامتناہی سلسلہ تھا جو ختم ہونے کو نہیں آتا تھا۔

اللہ کے رسولؐ نے سب سے پہلے خون کے رشتے یا رنگ ونسل کے رشتوں کی جگہ ان میں دین کا رشتہ قائم کر دیا۔ گویا انسانیت کو پہلی بار یہ سبق دیا گیا کہ اصل رشتہ ذہنی ہم آہنگی، نظریاتی یکسانی اور دینی ہم خیالی سے قائم ہوتا ہے۔ گویا اسلام ایک نظریاتی ہیئت یا اُمّت ہے اور تمام مسلمان اس ہیئت کے ایسے مرکز ہیں کہ ایک دوسرے کے لیے بڑی سے بڑی قربانی دینے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ ہیئت سے غدّاری کرنے والوں کے لیے وہی سزا اسلام میں متعیّن کی گئی ہے جو آج کے جدید دور میں بھی نظریاتی ہیئت سے علاحدہ ہونے والوں کو دی جاتی ہے۔

اسلام میں اجتماعیت کو ایسی اہمیت حاصل ہے کہ اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زیرِ ہدایت دشمنوں کو بھائی بھائی بنا دیا۔ اور خاندانی اور قبائلی یگانگت سے

Marfat.com

بڑھ کر مسلمانوں کی اجتماعیت کی بنا اسلامی برادری کے جذبے پر رکھی۔ اس کی وجہ سے باہمی عداوتوں کا خاتمہ ہو گیا اور انھیں ایک مضبوط اور مستحکم اور ناقابلِ تسخیر اجتماعیت میں تبدیل کر دیا گیا۔ چناں چہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تُقَاتِهِ وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنتُم مُّسْلِمُونَ ○

وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا (آل عمران: ۱۰۲-۱۰۳)

یعنی "اے مسلمانو اللہ سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے اور تم مرو تو مسلمان ہی کی حیثیت سے مرو۔ اور اللہ کی رسّی کو سب مل کر مضبوطی سے پکڑے رہو اور ٹکڑے ٹکڑے نہ بنو۔"

یہ اللہ کا حکم ہے۔ اجتماعیت کی اہمیت کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ خود تاکید فرماتا ہے کہ سب مسلمان آپس میں مل جل کر رہیں۔

اجتماعیت کو اللہ عز و جل نے مسلمانوں کی عظمت اور طاقت کا وسیلہ بتایا ہے یعنی اگر تمام مسلمان آپس میں متحد ہو کر رہیں تو کوئی طاقت ایسی نہیں ہے جو انھیں مرعوب یا مغلوب کر سکے۔ اس کے برخلاف اگر انتشار کا شکار ہو گئے اور اگر اجتماعیت کو اپنی خود غرضیوں کی بھینٹ چڑھا دیا تو پھر اُن کی ذلّت و رُسوائی اور تباہی و بربادی کو کوئی نہیں روک سکتا' اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کی سنّت میں تبدیلی نہیں ہوتی۔ قانون سب کے لیے ایک ہے' جو جیسا کرے گا ویسا پائے گا۔ جو اللہ کے حکم کی خلاف ورزی کرے گا اس کی تباہی و بربادی ہو کر رہے گی۔

سورۃ انفال میں اللہ تعالیٰ نے صاف صاف فرمایا:

أَطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَلَا تَنَازَعُوا فَتَفْشَلُوا...

یعنی "اللہ اور رسول ؐ کی اطاعت کرو اور آپس میں اختلاف اور جھگڑا نہ پیدا کرو کہ اگر تم نے یہ کیا تو تمھاری قوت ٹوٹ کر رہ جائے گی اور تم کم زور ہو جاؤ گے۔"

یہی باہمی اتحاد و اتفاق ملّتِ اسلامیہ کی عمارت کا ستون ہے اور مسلمانوں کی جماعت کا یہ شیرازہ اُسی وقت تک قائم رہ سکتا ہے جب تک مسلمانوں میں اجتماعیت کی اہمیت کا احساس باقی رہے گا اور ان میں باہم الفت و محبّت قائم رہے گی۔

اجتماعیت کی اہمیت پر آں حضرت ؐ نے زور دیتے ہوئے تمثیلاً فرمایا کہ مسلمانوں کی جماعت ایک دیوار ہے اور افراد اس کی اینٹیں ہیں۔ یہ اینٹیں ایک دوسرے کو سہارا دیتی رہتی ہیں تو دیوار قائم رہتی ہے اور قلعہ ناقابلِ تسخیر بن جاتا ہے، لیکن جب اینٹیں ایک دوسرے سے علاحدہ ہو جائیں تو دیوار کے انہدام میں کوئی دیر نہیں لگتی۔ اسی طرح اجتماعیت کی اہمیت کو

Marfat.com

ایک اور موقع پر اس طرح سمجھایا کہ مسلم معاشرہ ایک جسم کے مانند ہے اور افراد اس کے اعضا ہیں۔ اگر اعضا ایک دوسرے کے مددومعاون ہیں تو جسم تن درست و توانا رہتا ہے۔ غرض اجتماعیت اسلام کی جان ہے۔ اسے ختم کر دیجیے تو مسلمان ایک جسمِ بے جان ہے۔

اسی اجتماعیت کا نتیجہ تھا کہ عرب کے مسلمان تعداد میں کم اور اسلحہ اور سازوسامان میں کم تر ہونے کے باوجود جب اس زمانے کی دو عظیم ترین طاقتوں سے ٹکرائے تو انھیں پاش پاش کر کے رکھ دیا۔ مسلمانوں کا کیریکٹر یہ تھا کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ حقیقی بھائیوں جیسا برتاؤ کرتے۔ اپنی اجتماعیت کو ایک دوسرے کی انفرادی فلاح و بہبود کا وسیلہ سمجھتے تھے۔ قرآنِ حکیم میں مسلمانوں کی اجتماعیت برقرار رکھنے کے لیے اتنا سخت حکم دیا گیا:

وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيْهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا ۝ (النساء ۹۳)

یعنی: "جس مسلمان نے کسی دوسرے مسلمان کو ارادتاً قتل کر دیا تو اس کی سزا جہنم ہے۔ وہ اس میں ہمیشہ رہے گا اور اس پر اللہ کا غضب اور اللہ کی لعنت نازل ہو گی اور اس کے لیے سخت عذاب تیار کیا گیا ہے۔"

شرک کے بعد اس جرم کے لیے عذابِ جہنم کی سزا کی سب بڑی وجہ یہی ہے اور غالباً یہ واحد جرم ہے جس کی سزا ایسی ہولناک مقرر کی گئی ہے کہ جہنم میں داخل کیا جائے گا اور ہمیشہ اسی میں رہے گا۔ اور اس پر اللہ کی لعنت ہو گی۔ اللہ کا غضب ہو گا۔ ایسی سخت اور ہولناک سزا یقیناً اسی لیے مقرر کی گئی ہے کہ مسلمان آپس میں ایک دوسرے کا خون نہ بہائیں، اس لیے کہ اس سے اجتماعیت کھوکھلی ہو جائے گی اور ان کی قوت منتشر ہو جائے گی۔ اس طرح وہ ذلت و رسوائی میں مبتلا ہو جائیں گے۔

آں حضرتؐ نے اپنے آخری خطبۂ حج میں جن اہم امور کی طرف توجہ دلائی ان میں اجتماعیت پر بھی بڑا زور دیا ہے۔ آپؐ نے تاکیداً فرمایا کہ تمام مسلمان بھائی بھائی ہیں، اس لیے ان کا فرض ہے کہ اجتماعیت اور اتحاد کو قائم رکھیں۔ ایک دوسرے کو نقصان نہ پہنچائیں۔ ایک دوسرے کا ناجائز طور پر مال نہ کھا جائیں اور ایک دوسرے کی گردن نہ مارنے لگ جائیں۔

تاریخ کے اوراق بھی شاہد ہیں کہ مسلمانوں نے جب تک اپنی ہیئتِ اجتماعی کی حفاظت کی اور وہ انفرادی مفاد پر اجتماعی مفاد کو ترجیح دیتے رہے، ناقابلِ تسخیر رہے، لیکن جب خانہ جنگی میں مبتلا ہو گئے اور بھائیوں نے بھائیوں کی گردنیں ناپنی شروع کر دیں تو ان کی قوت منتشر ہو کر رہ گئی اور دشمنانِ اسلام کے حملوں کا اس طرح شکار ہوئے کہ گویا کبھی عظمت ان

Marfat.com

کے حصے میں آئی ہی نہ تھی۔ اس کا سب سے زیادہ بھیانک انجام اسپین میں ہوا اور پھر ساری دنیا کے مسلمان اس کی لپیٹ میں آ گئے۔ عرصہ دراز تک انتشار و افتراق کے اندوہ ناک اور ہولناک نتائج کے تلخ تجربات کے بعد آج الحمدللہ عالمِ اسلام متحد و متفق ہو رہا ہے۔ اس میں شانِ اجتماعیت آ رہی ہے۔ گزشتہ دنوں اسلام آباد میں اسلامی ممالک کے وزرائے خارجہ کے اجتماعِ عظیم کے فیصلے اجتماعیت کے نقطے پر مرکوز رہے۔ پاکستان کے مسلمان اپنی بہترین اجتماعیت کے ساتھ عالمِ اسلام کے لیے بڑی طاقت کا درجہ رکھتے ہیں۔ انشاء اللہ پاکستان کی طاقت عالمِ اسلام کو اتحاد و اتفاق اور اجتماعیت کا مرتبہ بخشے گی۔

Marfat.com

وَإِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيمٍ ۝
(القلم: ۴)
اور بے شک تم اخلاق کے بڑے مرتبے پر ہو۔

آوازِ اخلاق

Marfat.com

اخلاق سب سے بڑی طاقت ہے

اِس دنیا میں انسان کی حیثیت کیا ہے؟ یہ سوال سب سے اہم ہے اور قطعی طور پر ایک بنیادی اور اساسی سوال ہے۔ اِس کا شافی و کافی جواب جب تک سامنے نہ ہو، علم و حکمت دانش و بینش، فلسفہ و منطق، اخلاق و اقدار کی کوئی اساس قائم ہوگی اور نہ بنیاد۔ ہر چیز کا فیصلہ اس سوال کے جواب پر منحصر ہے اور اس کے تابع ہے۔

اِسلام سب سے پہلے اِس سوال کی طرف توجہ کرتا ہے اور ہمیں بیّن طور پر اور واضح طور پر اور کسی شک و شبہ اور شائبہ اشتباہ کے بغیر بتاتا ہے کہ اس دنیا میں انسان کی حیثیت اللہ کے بندے کی ہے اور نائب کی ہے۔ اس کرۂ ارض کی ہر چیز جس سے انسان کو سابقہ پیش آتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی ملک ہے، ہر شے کا مالک و خالق اللہ ہے۔ انسان اور انسان کی ہر قوت اللہ کی ملکیت ہے۔ اِنسان کو تو بس اِن قوتوں کے استعمال کا حق دیا گیا ہے۔ اللہ کے نائب کی حیثیت سے اِس زمین کا ہر انسان ایک امتحان میں ہے اور اس دُنیا کے بعد آنے والی دنیا میں اس امتحان کا نتیجہ برآمد ہوگا۔ فرد و قوم اور پوری نوعِ انسانی کو ایک دن حساب دینا ہے۔

اِس سوال اور اس جواب کے بعد یہ فیصلہ ہو جاتا ہے کہ جہاں تک اخلاق کا تعلق ہے اِس کے معیار اور اصول کا فیصلہ انسان کا حق نہیں ہے بلکہ یہ حق سبحانہٗ و تعالیٰ کا ہے۔ اِس لیے معیارِ اخلاق متعیّن کرنے کے لیے ہم اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ روشنی سے استفادہ کرتے ہیں اور یہی راہِ حق اور صراطِ مُستقیم ہے۔ اِس اعتبار سے قرآنِ کریم ہمارے لیے مشعلِ راہ ہے اور اللہ تعالیٰ کے رسول خاتم النّبیینؐ ہمارے لیے ہادیِ برحق۔

اسلام کی نگاہ میں اخلاق کا مرتبہ یہ ہے کہ آں حضرتؐ نے نہایت واضح الفاظ میں اپنے رسول بنائے جانے کی غرض و غایت اخلاقِ نیک کی تکمیل ظاہر فرمائی۔ چناں چہ ارشادِ گرامی ہے:

بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَکَارِمَ الْاَخْلَاقِ

یعنی "میں صرف نیک اخلاق کی تکمیل کے لیے بھیجا گیا ہوں"۔

ایک موقع پر حضور رسالت مآبؐ نے فرمایا:

Marfat.com

ترجمہ: روزِ قیامت تم میں میرے سب سے پیارے اور نشست میں مجھ سے سب سے نزدیک وہ ہوں گے کہ جو تم میں خوش اخلاق ہیں۔

ایک بار فرمایا:

ترجمہ: ایمان والوں میں ایمانِ کامل اُس کا ہے جس کا اخلاق سب سے اچھا ہے۔

اقرارِ کلمۂ توحید کے بعد اسلام کی عمارت نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ پر قائم ہے۔ یہ چاروں ارکان بھی اخلاق کی تکمیل کرتے ہیں۔

حضورؐ نے فرمایا:

—— نماز عاجزی، فروتنی، زاری، دردمندی اور شرمندگی کا نام ہے۔

—— روزے کی رُوح یہ ہے کہ زبان بُری باتوں سے رُک جائے، دل میں بُرے وسوسے نہ آئیں، ہاتھ پاؤں بُرے افعال کے لیے حرکت میں نہ آئیں، آنکھ ممنوع چیز نہ دیکھے، کان غیبت و چغل خوری نہ سُنیں۔

—— زکوٰۃ سراپائے انسانی ہمدردی، غم خواری اور دست گیری ہے۔

—— حج کی رُوح عزم و صبر، تقویٰ اور اخلاق اور غریبوں کی مالی اعانت ہے۔

معلوم ہوا کہ ایمان اور اخلاق ایک دوسرے سے اس طرح وابستہ ہیں کہ ان کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ اسلام اخلاق کے بغیر بے جان ہے۔ ایک حدیث شریف میں اِسلام کو عینِ اخلاق فرمایا گیا ہے، اور دین کی ستھرائی پر منحصر کردیا گیا ہے، حتیٰ کہ عبادت کی خوبی اور مقبولیت کو پاکیزگیِ اخلاق سے مشروط کردیا گیا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ ایمان کی رُوح کے بعد دعوتِ محمدیؐ کے جسم کے دو بازو ہیں: ایک عبادت اور دوسرا اخلاق۔ ایک خالق کا حق ہے اور دوسرا مخلوق کا۔ انھی کے مجموعے کا نام اسلام ہے۔ واضح طور پر مطلب یہ ہوا کہ اخلاقِ اسلامی تقاضا کرتا ہے کہ مخلوق کے ساتھ پسندیدہ سلوک کیا جائے، کیوں کہ اس کے بغیر پُرامن اور صالح معاشرہ قائم نہیں ہوسکتا۔ اسلام یہ چاہتا ہے کہ اس دنیا میں تمام انسان اِس طرح زندگی بسر کریں کہ وہ ایک دوسرے کے ہمدرد، دوست اور مددگار اور بھی خواہ ہوں، کیوں کہ اس کے بغیر انھیں اِس دنیا میں سکون نہیں مل سکتا۔ اِسلام کا بنیادی مقصد فلاحِ دارین ہے اور یہ مقصد صرف اُسی وقت حاصل ہوسکتا ہے کہ ایک اِنسان دوسرے انسان بلکہ تمام مخلوقات سے محبت کرنا سیکھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایمان کے باب میں ایک نہایت بلیغ اور بڑی جامع ہدایت

Marfat.com

عطا فرماتی ہے:

"بندہ حقیقتِ ایمانی کے رتبے پر اُس وقت تک نہیں پہنچ سکتا جب تک کہ وہ سارے آدمیوں کے لیے وہی بھلائی نہ چاہے جو وہ اپنے نفس کے لیے چاہتا ہے۔"

اصل عبارت ہے: لَا یَبْلُغُ الْعَبْدُ حَقِیْقَۃَ الْاِیْمَانِ حَتّٰی یُحِبَّ لِلنَّاسِ مَا یُحِبُّ لِنَفْسِہٖ مِنَ الْخَیْرِ۔

اس سے بڑھ کر بنی نوعِ انسان کی خیر طلبی کا معیار نہیں ہو سکتا۔ کام یاب زندگی کا یہ ایک بڑا بنیادی نکتہ ہے اور تمام اخلاقی اعمال کی جڑ اور بنیاد ہے۔ اس سے ہمیں ایک سبق بھی ملتا ہے کہ نیکی کا فیض عام ہے، سب کے لیے ہے۔ ایک جگہ حضورؐ نے واضح بھی فرما دیا ہے کہ مسلمان جب نیکی کرے تو کافر، مسلمان، فاسق و فاجر سب سے کرے۔ اخلاق کی بلندی یہی ہے اور ایسے اچھے اخلاق ہی وہ ستون ہیں جن پر قوموں اور جماعتوں کی زندگی کی بنیاد رکھی جاتی ہے۔ اخلاق ہی سے قوت و طاقت اور عزت و سلطنت اور عظمت و رفعت حاصل ہوتی ہے۔ اخلاق ہی وہ شان ہے کہ جس میں اللہ تعالیٰ کی نیابت کا رنگ پایا جاتا ہے۔ داعیِ انقلابؐ نے فرمایا:

تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللہِ یعنی "اللہ تعالیٰ والے اخلاق کو اپنا اخلاق بناؤ۔"

اقوام و ملل کی ترقی مادی طاقتوں کی فراوانی سے نہیں ہوتی اور نہ صرف عقل و دماغ کی ترقی سے بلکہ اس کے لیے اخلاق کی ضرورت ہوتی ہے۔

وہ اخلاق جن سے قوموں میں زندگی پیدا ہوتی ہے اور انھیں سربلندی و سرفرازی حاصل ہوتی ہے یہ ہیں:

۱- اچھی اور صالح عادتیں۔
۲- مظلوم اور بے کس کی باتوں کی برداشت۔
۳- مکروہات و مصائب پر صبر کرنا۔
۴- محنت و مشقت اور جد و جہد سے کام لینا۔
۵- حق بات کو بغیر رعونت و تلخی سننا۔
۶- عہد کا پورا کرنا، وعدے کا لحاظ کرنا۔
۷- ضعیف الحال لوگوں کے ساتھ انصاف اور شفقت سے پیش آنا اور بذل و سخاوت سے کام لینا۔
۸- مسکینوں سے تواضع کے ساتھ ملنا۔

Marfat.com

۹۔ دادخواہوں کی فریاد سُننا۔
۱۰۔ عزت و عصمت کی حفاظت کے لیے تن من دھن کی بازی لگا دینا۔
۱۱۔ لوگوں سے کرم و عفو اور محبت کے ساتھ پیش آنا۔
۱۲۔ مہمانوں کی میزبانی کرنا۔

ان کے علاوہ اپنے تمام اعمال و افعال میں نیک و بد کا خیال رکھنا، انسانوں کی دل دہی اور تالیفِ قلب کا خیال رکھنا، حقوق اللہ اور حقوق العباد کا ادا کرنا اخلاق کے بنیادی تقاضے ہیں۔

یاد رکھنا چاہیے اور سمجھ لینا چاہیے کہ ہر قوم میں انقلابات و تغیرات صرف اخلاق کے ذریعہ سے ہوتے ہیں اور وہی اُن کے مستقبل کا سنگِ بنیاد رکھتے ہیں۔ اقوام و ملل کی زندگی کی بُنیاد صرف اخلاق پر ہے۔ پاکستان اس کلیے سے مستثنیٰ نہیں ہو سکتا۔ اگر ہمیں اقوام و مللِ عالم میں سربلندی حاصل کرنی ہے تو ملتِ پاکستانیہ کے ہر فرد کو اخلاق کی طاقت سے خود کو مالا مال کرنا ہوگا۔ پاکستانی قوم من حیث المجموع آج زوالِ اخلاق کی گرفت میں ہے۔ افرادِ ملت آج قرآن کی تعلیمات سے دُور ہیں اور ہادیٔ برحق صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت سے غافل ہیں۔ اس دُوری اور غفلت نے ہمارے درمیان محبت و اخوت، بھائی چارے اور لطف و کرم کے معیارات کو پست کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج اقوام و ملل کے سامنے پاکستان کا سر ندامت سے جھک گیا ہے۔

ہمیں اس صورتِ حال سے نکلنا چاہیے اور قرآنِ حکیم اور ہادیٔ برحقؐ کی ہدایت کو قبول کرنا چاہیے تاکہ ہم اپنے فرائض ادا کر سکیں اور اسلام کی سربلندی اور عالمِ اسلام کی سرفرازی کا سامان کر سکیں۔ پاکستان اسی لیے عالمِ وجود میں آیا ہے۔

اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ ہمیں توفیق عطا فرمائیں کہ ہم بلندیٔ اخلاق سے سرفراز ہوں۔

Marfat.com

آوازِ اخلاق

اسلام کا تصورِ اخلاق فلسفیوں، مفکروں اور نرے اخلاق پرستوں سے بالکل جدا ہے۔ اسلام کے نزدیک حسنِ اخلاق سچی بندگی کو پائۂ تکمیل تک پہنچانے کا ایک ذریعہ اور عبادات کا اہم حصہ ہے۔ یہ دونوں چیزیں الگ الگ خانوں میں منقسم نہیں ہیں بلکہ اپنے اندر ایک وحدت رکھتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے حقوق اور انسانوں کے حقوق کو بہ تمام و کمال ادا کرنے کا نام عملِ صالح ہے۔ یہ ایک جامع ترین لفظ ہے جسے قرآنِ پاک عبادات اور اخلاق دونوں کے لیے استعمال کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی بندگی کے ساتھ ساتھ انسانوں کے حقوق کا ذکر فرما کر ہمیں یہ بتا دیا ہے کہ ان کی اہمیت بھی حقوق اللہ سے کم نہیں ہے، اور یہ کہ کمالِ بندگی کا تصور حسنِ اخلاق کے بغیر ممکن ہی نہیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

واعبدوا اللہ ولا تشرکوا بہٖ شیئا وبالوالدین احسانا وبذی القربٰی والیتٰمٰی والمسٰکین والجار ذی القربٰی والجار الجنب والصاحب بالجنب وابن السبیل وما ملکت ایمانکم (النساء:۳۶)

یعنی: "اللہ کی بندگی کرو اور اس کے ساتھ (بندگی اور عبادت میں) کسی چیز کو شریک نہ ٹھہراؤ۔ ماں باپ کے ساتھ نیک برتاؤ کرو۔ رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ حسنِ سلوک کرو اور پڑوسی سے، رشتے دار سے، اجنبی ہمسائے سے پہلو کے ساتھی سے، مسافر سے اور ان لونڈی غلاموں سے کہ جو تمھاری ملکیت ہوں (یعنی زیر دستوں سے) احسان کا معاملہ رکھو"

کتاب اللہ میں واضح طور پر یہ بتا دیا گیا ہے کہ اخلاقی برائیاں کیا کیا ہیں، اور اخلاق کے محاسن کیا کیا ہیں، تاکہ ان برائیوں سے بچتے ہوئے فرد اور جماعت دونوں نیکی اور تقویٰ کی راہ پر گامزن رہیں اور سعیِ مسلسل سے اپنے نفس کو رذائلِ اخلاق سے پاک کر کے انسانیت کے اعلیٰ مقام پر پہنچ جائیں۔ چند وہ باتیں جنھیں اخلاقی اعتبار سے قرآن مذموم کہتا ہے، یہ ہیں:

ولا تاکلوا اموالکم بینکم بالباطل وتدلوا بھا الی الحکام لتاکلوا فریقا من اموال الناس بالاثم وانتم تعلمون ٥ (البقرہ:۱۸۸)

یعنی: "اور تم لوگ نہ تو آپس میں ایک دوسرے کے مال ناروا طریقے سے کھاؤ اور نہ حاکموں کے آگے ان کو اس غرض کے لیے پیش کرو کہ دوسرے کے مالوں کا حصہ جان بوجھ کر تمھیں گناہ کے ساتھ کھانے کا موقع مل جائے حال آنکہ تم اس کی برائی سے واقف ہو"

Marfat.com

رشوت کی ممانعت کے ساتھ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ کسی کا مال غلط طور پر نہ کھاؤ۔ ایک اور اخلاقی برائی جس سے بچنے کی تاکید کی گئی وہ یہ ہے:

واجتنبوا قول الزور (الحج: ۳۰)

یعنی: "جھوٹی بات کہنے سے پرہیز کرو۔"

اور ظاہر ہے کہ اس جامع نصیحت میں جھوٹ کے سارے پہلو آجاتے ہیں۔ اسی میں جھوٹی گواہی بھی آجاتی ہے جس کے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ جھوٹی گواہی شرک کے برابر رکھی گئی ہے۔

قرآنِ پاک یہ بھی تاکید کرتا ہے:

ولا تکن للخائنین خصیما (النسا: ۱۰۵)

یعنی: "اور تم کسی خائن کے حمایتی نہ بنو۔"

جھوٹ سے مکمل اجتناب کے ساتھ ساتھ خیانت اور خیانت کرنے والوں کی حمایت سے بھی بچنے کی جو تاکید کی گئی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا یہ اچھی طرح سمجھ لے کہ اسلام کی نظر میں صرف خائن ہی برا نہیں ہے، بلکہ اس کا حامی اور مددگار بھی اسی اخلاقی جرم کا مرتکب سمجھا جائے گا۔

اب قرآنِ حکیم کی ایک اور نصیحت سنیے:

یا ایھا الذین آمنوا لا تبطلوا صدقٰتکم بالمن والاذیٰ کالذی ینفق ماله رئآء الناس....

(البقرہ: ۲۶۴)

یعنی: "اپنی خیرات کو احسان جتا کر اور دکھ دے کر اس شخص کی طرح ضائع نہ کرو جو اپنا مال لوگوں کو دکھانے کے لیے خرچ کرتا ہے۔"

اخلاقی اعتبار سے یہ بات بہت بری ہے کہ ریا اور نمائش کے لیے نیکی کی جائے، یا کسی کے ساتھ حسنِ سلوک کر کے اس پر احسان جتایا جائے۔ ایسے صدقات وخیرات اور ایسی نیکیوں کی اللہ تعالیٰ کے نزدیک کوئی قدر وقیمت نہیں ہے۔ یہ اخلاقی اچھائی نہیں، برائی ہے، ایسی فیاضی، فیاضی نہیں ہے، بلکہ مال کو ضائع کرنا ہے۔

اس ریاکارانہ نیکی اور خیرات کے ساتھ ساتھ بعض مقامات پر قرآنِ پاک میں بخل کو بھی اخلاق کا بدترین پہلو بتایا گیا ہے، اور بخل صرف یہی نہیں ہے کہ آدمی اپنا مال نہ اپنی ذات پر خرچ کرے نہ اپنے بال بچوں پر، بلکہ بخل یہ بھی ہے کہ انسان اپنی دلچسپیوں، اپنی تفریحوں اور اپنے تعیشات پر تو صرف کرے مگر کسی نیک کام پر خرچ کرنے کے لیے اس کا دل آمادہ نہ ہو۔

Marfat.com

ایک اخلاقی عیب یا تنگ نظری یہ بھی ہے کہ جو لوگ معاشی یا اقتصادی یا کسی اور پہلو سے فضیلت رکھتے ہوں انہیں دیکھ کر انسان کے دل میں گھٹن پیدا ہو، اور وہ یہ چاہتا ہو کہ یہ فراوانی ان کے بجائے ہمارے لیے ہو۔ قرآن اس جذبے کو مذموم قرار دیتا ہے، اور کہتا ہے:

ولا تتمنّوا ما فضّل اللّٰہ بہٖ بعضکم علٰی بعض ط (النسا: ۳۲)

یعنی: "جو کچھ اللہ نے تم میں سے کسی کو دوسروں کے مقابلے میں زیادہ دیا ہے اس کی تمنا نہ کرو۔"

اس سے صاف ظاہر ہے کہ کسی کو اپنے مقابلے میں کسی حیثیت سے بڑھا ہوا دیکھ کر بے چین ہو جانا حسد و رقابت کا بدترین جذبہ ہے۔ آدمی اس برائی کی وجہ سے دوسروں سے نفرت اور عداوت جیسے گناہ کا مرتکب ہوتا ہے، لوگوں کا مذاق بھی اڑاتا ہے، ان سے سوئے ظن بھی رکھتا ہے، ان کے تجسّس میں بھی رہتا ہے۔

قرآن ان تمام اخلاقی برائیوں سے روکتا ہے:

یا ایھا الذین آمنوا اجتنبوا کثیرا من الظن ز ان بعض الظن اثم ولا تجسسوا ولا یغتب بعضکم بعضاً ط (الحجرات: ۱۲)

اس آیت میں بے جا بدگمانی، دوسروں کے حالات کے تجسس اور پیٹھ پیچھے ایک دوسرے کی برائی کرنے کی سختی سے ممانعت کی گئی ہے۔

دراصل یہ وہ بری باتیں ہیں جن سے اہلِ ایمان کا دامن پاک ہونا چاہیے۔

غرور و تکبّر بھی اللہ تعالیٰ کو سخت ناپسند ہے، اس لیے کہ اس اخلاقی برائی سے باہمی الفت اور محبت ختم ہو جاتی ہے۔ مغرور و متکبّر انسان اپنے معاشرے میں قابلِ نفرت سمجھا جاتا ہے۔ اس لیے تاکید کی گئی:

ولا تصعّر خدک للناس ولا تمش فی الارض مرحا ط ان اللّٰہ لا یحب کل مختال فخورٍ ج واقصد فی مشیک واغضض من صوتک ط (لقمان: ۱۸-۱۹)

یعنی: "لوگوں سے منہ پھیر کر بات نہ کر، اور زمین پر اکڑ کر نہ چل، اللہ کسی خود پسند اور فخر جتانے والے شخص کو پسند نہیں کرتا۔ اپنی چال میں اعتدال اختیار کر اور اپنی آواز آہستہ رکھ۔"

یہ برے اخلاق میں سے صرف چند باتیں بہ طورِ مثال پیش کی گئی ہیں، حقیقت یہ ہے کہ اخلاقی رذائل قرآنِ پاک میں اور بھی بیان کیے گئے ہیں۔ اب میں آپ کی توجہ ان محاسن کی طرف دلانا چاہتا ہوں جن کی دعوت قرآن دیتا ہے اور ایک آدمی جب ایمان کے ساتھ ان خوبیوں کا حامل ہو جاتا ہے تو اس کی انسانیت پایۂ تکمیل تک پہنچ کر ایک صالح معاشرے کو وجود میں لانے کا سبب بنتی ہے۔ وہ محاسن

Marfat.com

ایسے ہیں جن کا برحق ہونا ہر سلیم الطبع آدمی تسلیم کرتا ہے۔ ان میں صداقت اور واقعیت ہے، کشش اور دل آویزی ہے اور عمل کی دنیا میں ان کی مثالیں اور ان کے نمونے موجود ہیں:

ان اللہ یامر بالعدل والاحسان وایتائ ذی القربی وینھی عن الفحشاء والمنکر والبغی ج یعظکم لعلکم تذکرون ٥ (النحل: ۹۰)

یعنی: "اللہ عدل اور احسان اور رشتہ داروں کی مدد کا حکم دیتا ہے اور بدی و بے حیائی اور ظلم و زیادتی سے منع کرتا ہے۔ وہ تمھیں نصیحت کرتا ہے تاکہ تم سبق حاصل کر سکو۔"

دراصل نیکی اور تقویٰ میں تعاون، بُرائی کی بھلائی سے مدافعت، راہِ خیر میں مال و دولت کا صرف کرنا، یتیموں، بیواؤں، مسکینوں اور معذوروں کی سرپرستی، محتاجوں کی خبر گیری، اعزہ اور اقربا کے ساتھ حسنِ کلام، صبر اور ایفائے عہد وغیرہ کا مقصد نہ معاشرے میں اپنی فوقیت اور برتری ہے نہ دوسروں پر بالادستی کے حصول کی کوشش، بلکہ اللہ اور صرف اللہ کی رضا ہے، اور دنیا کو فساد سے پاک کرنا ہے اسلام نے یہی آوازِ اخلاق بلند کی تھی اور مسلمان انھی تعلیمات سے فیض یاب ہو کر تاریخِ عالم میں نئی تہذیب، نئے تمدن اور صلاح و فلاح سے معمور معاشرے کے بانی ہوئے۔ آج پھر تاریخ اسی دور کی منتظر ہے اس لئے کہ نئے عہد کی تاریخ ساز قیادت کا مرتبہ اسی کو ملے گا جو اسلام کی آوازِ اخلاق دنیا کو سنا کر فکر و عمل میں انقلاب برپا کر سکے گا، اور یہ ذمہ داری انھی کی ہے جو ایمان کی دولت سے بہرہ ور ہیں۔

Marfat.com

اچھے اخلاق کی اہمیت

دنیا کے تمام مذاہب میں اخلاق کو خاص اہمیت حاصل ہے، اور اگر یہ کہا جائے تو صحیح ہوگا کہ دین اور اخلاق کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ دین کی تکمیل ممکن ہی نہیں ہے جب تک اخلاق کی بلندی حاصل نہ ہو۔

ایک حدیث شریف میں ہے کہ آں حضرتؐ نے فرمایا کہ "میں حسنِ اخلاق کی تکمیل کے لیے بھیجا گیا ہوں"۔ ایک دوسری حدیث میں اس سے زیادہ اور واضح الفاظ میں فرمایا کہ:

"میں تو اسی لیے بھیجا گیا کہ اخلاقِ حسنہ کی تکمیل کروں"۔

ان واضح اعلانات کا صاف مطلب یہ ہے کہ رسول اللہؐ دنیا میں اللہ کی کتاب لے کر مبعوث ہوئے اور آپؐ نے لوگوں کے اخلاق درست کیے تاکہ وہ دوسرے انسانوں کے لیے محبت و راحت اور ہمدردی و غم گساری کا نمونہ بن کر رہیں اور کرۂ ارض انسان کے لیے امن و امان کا گہوارہ بن جائے۔

سیرتِ رسولؐ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانی تعلقات کو معیاری حد تک درست کرنے کا کام آپؐ نے ابتدائی مکی دور ہی میں شروع کر دیا تھا۔ نبوت کا ابتدائی دور تھا کہ حضرت ابوذرؓ نے اپنے بھائی کو اس نئے پیغمبر کے حالات اور تعلیمات کی تحقیق کے لیے مکہ بھیجا۔ انھوں نے واپس آکر اپنے بھائی کو بتایا کہ "میں نے محمدؐ کو دیکھا کہ آپؐ لوگوں کو اخلاقِ حسنہ کی تعلیم دیتے ہیں"۔ اس بیان سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ رسول اللہؐ نے دین کی تبلیغ کے ساتھ ہی اخلاقِ حسنہ کی تعلیم بھی شروع کر دی تھی۔

اسی دور میں جب مکے کے قریش کے مظالم سے تنگ آکر چند مسلمان آں حضرتؐ کی اجازت سے حبشہ کو ہجرت کر گئے تو یہ بات اہلِ مکہ پر شاق گزری اور انھوں نے حبش کے بادشاہ کے پاس ایک وفد بھیجا، جس نے تحفے تحائف بھی پیش کیے اور مہاجروں کے خلاف طرح طرح کی باتیں بھی اس کے کان میں ڈالیں۔ مقصد یہ تھا کہ حبش کا بادشاہ جو عیسائی تھا، مسلمانوں کا مخالف بن جائے اور انھیں اہلِ مکہ کے حوالے کر دے۔ نجاشی نے تفتیشِ حال کے لیے مسلمانوں

Marfat.com

کو بلایا، ان کی جانب سے حضرت جعفر طیارؓ نے نمائندے کی حیثیت سے جو باتیں بتائیں ان میں یہ فقرے بھی شامل تھے:

"اے بادشاہ! ہم لوگ ایک جاہل قوم تھے، بتوں کو پوجتے تھے، مردار کھاتے تھے، بدکاریاں کرتے تھے، ہمسایوں کو ستاتے تھے، بھائی بھائی پر ظلم کرتا تھا، زبردست زیردستوں کو کھا جاتے تھے! اس اثنا میں ایک شخص ہم میں پیدا ہوا، اس نے ہم کو سکھایا کہ ہم پتھروں کو پوجنا چھوڑ دیں، سچ بولیں، خوں ریزی سے باز آئیں، یتیموں کا مال نہ کھائیں، ہمسایوں کو آرام دیں، اور پاک دامنوں پر تہمت نہ لگائیں۔"

یہ تمام باتیں اخلاقِ حسنہ کے بنیادی اصولوں میں شامل تھیں اور اسی لیے انھیں سننے کے بعد نجاشی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

حضرت جعفر طیارؓ تو مسلمان ہو چکے تھے اس لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے عقیدت و محبت میں یہ کہا ہو گا، لیکن قیصرِ روم کے دربار میں بالکل اسی طرح کا واقعہ ابو سفیان کے ساتھ پیش آیا، جو اس وقت اسلام کی نعمت سے فیض یاب نہیں ہوئے تھے۔ جب ان سے آں حضرتؐ کی اصلاحی دعوت کا حال پوچھا گیا تو انھوں نے جو الفاظ کہے ان کا خلاصہ یہ تھا کہ آں حضرتؐ توحید اور عبادت کے ساتھ لوگوں کو یہ سکھاتے ہیں کہ وہ پاک دامنی اختیار کریں، سچ بولیں اور قرابت کا حق ادا کریں۔

یہ شہادت اس وقت کی ہے کہ جب ابو سفیان اسلام کے مخالف تھے۔ ان باتوں کے پیشِ نظر پورے یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ دین کی تکمیل اخلاقِ حسنہ کے اپنانے پر منحصر ہے۔ دین نام ہے عقائد و عبادات اور اخلاقِ حسنہ کا۔ غور کیا جائے تو عقائد و عبادات کا ماحصل یہی ہے کہ انسان بہترین اخلاقی اصولوں کا حامل ہو تاکہ معاملات میں وہ بہترین نمونہ اور عام انسانوں کے لیے امن و عافیت کا پیغام بر ہو سکے

اللہ تعالیٰ ہی کائنات کا خالق ہے اور اسی نے انسان کو بھی پیدا کیا، اس لیے وہ چاہتا ہے کہ کرۂ ارض پر انسان آپس میں مل جل کر رہیں، فساد برپا نہ کریں، اللہ واحد کی پرستش کریں، اور ایک خاندان کے افراد کی طرح شیر و شکر ہو کر رہیں۔

اخلاق سے متعلق سب سے بھاری اور دشوار تعلیم جو اکثر افراد پر نہایت شاق گزرتی ہے وہ عفو و درگزر، ضبطِ نفس، تحمل و برداشت کی ہے، لیکن اسلام نے ان دشوار باتوں کو بھی ایسے موثر انداز میں بتایا ہے کہ وہ فوراً قلب و روح میں جاگزیں ہو جاتی ہیں، مثلاً سورۃ انعام میں یہ فرمایا:

Marfat.com

ترجمہ: "جن کو یہ مشرک اللہ کے سوا پکارتے ہیں ان کو برا نہ کہو کہیں وہ اللہ تعالیٰ کو بے ادبی سے نادانستہ برا نہ کہہ بیٹھیں۔"

سورۃ اعراف میں فرمایا:

ترجمہ: "معاف کرنے کی عادت ڈالو، نیک کام کا حکم دو اور جاہلوں سے کنارہ کش رہو۔"

سورۃ آلِ عمران میں نیکوکاروں کے اوصاف بیان کرتے ہوئے فرمایا:

ترجمہ: "اور جو غصے کو دبانے والے اور لوگوں کو معاف کرنے والے ہیں۔"

دین اور اخلاق دونوں لازم و ملزوم ہیں، مسلمانوں کے آپس کے معاملات میں حسن اخلاق کو جو اہمیت حاصل ہے وہ سب جانتے ہیں۔ انھیں تو ایک دوسرے کا بھائی کہہ کر اللہ تعالیٰ نے اسے ایک نعمت سے تعبیر کیا، لیکن کافروں اور مشرکوں کے ساتھ بھی نرمی اور حسن سلوک کی تاکید فرمائی۔

ترمذی میں یہ حدیث قدسی وارد ہے:

"اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے فرمایا کہ میرے خلیل! حسنِ سلوک کرو، خواہ کافروں کے ساتھ ہی کیوں نہ معاملہ پیش آئے، تو تمھیں ابرار کے مقامات حاصل ہوں گے اس لیے کہ میرا یہ فیصلہ ہے کہ جس کے اخلاق اچھے ہوں گے میں اسے اپنے عرش کے سایہ میں اور اپنے حظیرۃ قدس میں جگہ دوں گا اور اسے اپنی قربت سے سرفراز کروں گا۔"

حضرت معاذ بن جبلؓ سے روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ جہاں بھی رہو اللہ سے ڈرتے رہو، کوئی گناہ سرزد ہو جائے تو فوراً نیک کام کرو کیوں کہ نیکی گناہ کو مٹا دے گی اور تمام انسانوں کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آؤ۔

حضرت جابرؓ سے یہ حدیث مروی ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ تم میں مجھ کو سب سے زیادہ عزیز اور قیامت میں نشست کے اعتبار سے سب سے زیادہ قریب وہ لوگ ہوں گے جن کے اخلاق اچھے ہیں اور تم میں سب سے زیادہ معتوب اور قیامت میں مجھ سے سب سے زیادہ دور وہ لوگ ہوں گے جو تصنع کے ساتھ باتیں کرتے ہیں اور اپنی چرب زبانی سے دوسروں پر غالب آنا چاہتے ہیں۔

حضرت عبداللہ ابن مبارکؒ نے حسنِ خلق کی تفسیر اس طرح بیان فرمائی ہے کہ خندہ پیشانی، سخاوت و فیاضی اور لوگوں کی تکلیف و اذیت دور کرنے کا نام حسنِ خلق اور حسن سلوک ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ حسنِ خلق کے بغیر ایمان کی تکمیل نہیں ہو سکتی، یہ دین کا نصف حصہ ہے اور جس طرح دین میں عبادات کی اہمیت ہے، وہی اہمیت اخلاق و معاملات کی ہے۔ آں حضرتؐ کا

Marfat.com

ارشاد ہے کہ "تم میں مومنِ کامل وہی ہے جس کے اخلاق اچھے ہوں۔"

ان کلماتِ چند سے یہ نکتہ قطعی طور پر واضح ہو گیا ہے کہ دینِ اسلام اخلاق کو اس حد تک بلند مقام دیتا ہے کہ اسلام اور اخلاق ہم معنی اور ہم مفہوم ہو جاتے ہیں۔ اسلام کا اندازِ فکر یہ ہے کہ اخلاق، یعنی حسنِ اخلاق اور حسنِ سلوک کے بغیر معاملاتِ زندگی استوار نہیں ہو سکتے اور انسانیت کی بہتری کی راہیں آسان نہیں ہو سکتیں اور نہ امن و سلامتی کو قیام و دوام حاصل ہو سکتا ہے۔

جب حقیقت حال یہ ہے، اور جب قولِ فیصل یہ ہے تو ہمیں پاکستان میں اپنے حالات پر احتیاط کے ساتھ اور فہم و فراست کے ساتھ غور کرنا چاہیے۔ اگر ہمارا دل یہ گواہی دے کہ ہم احکامِ ربانی سے کنارہ کش ہیں، اور اگر ہمارا ضمیر پکار پکار کر کہے کہ ہم پیرویِ رسول مقبول ؐ سے دور اور بہت دور جا پڑے ہیں تو پھر یہ اعتراف کرنا ہو گا کہ ہماری موجودہ بد اخلاقی اور بدحالی اور ابتلا و نکبت کی وجہ اور ہمارے افلاس اور اضطراب کا اصل سبب قرآنِ حکیم سے ہمارا فرار ہے اور اس صورت حال نے ہمیں غیر محترم اور غیر ممتاز بنا کر رکھ دیا ہے، اور ہمیں اپنی منزل سے بہت دور کر دیا ہے۔

باور کرنا چاہیے، اور یقین کرنا چاہیے کہ اسلام کے بغیر ہم سربلند نہیں ہو سکتے اور اخلاق کے بغیر ہم سرفراز نہیں ہو سکتے۔ روشنیِ قرآن اور اتباعِ رسول ؐ کے ذریعہ ہی ہم منزلِ مقصود تک پہنچ سکتے ہیں۔

Marfat.com

دین اور اخلاق

دنیا کے تمام مذاہب میں اخلاق کو خاص اہمیت حاصل ہے، اور اگر یہ کہا جائے تو صحیح ہو گا کہ دین اور اخلاق کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ دین کی تکمیل ممکن ہی نہیں ہے جب تک اخلاق کی بلندی حاصل نہ ہو۔ عام طور پر دین کو صرف عقائد و عبادات سے متعلق سمجھا جاتا ہے، لیکن درحقیقت اخلاق بھی اس میں شامل ہے اور حُسنِ اخلاق کا درجہ تمام دینی اعمال میں سرِفہرست ہے۔ اس لیے عبادات اس وقت تک بے نتیجہ سمجھی جاتی ہیں جب تک انسان کے معاملات میں ان کی عکاسی نہ ہو۔ اور جن انسانوں سے معاملات پیش آئیں وہ یہ محسوس کریں کہ عبادات نے اس کے اخلاق میں بلندی پیدا کر دی ہے۔ اسی لیے عبادت گزار اگر اسلامی اخلاق پر پورا نہ اترے تو سمجھنا چاہیے کہ اس کی عبادت میں کوئی خامی ہے۔

ایک حدیث شریف میں ہے کہ آں حضرتؐ نے فرمایا:

"میں حُسنِ اخلاق کی تکمیل کے لیے بھیجا گیا ہوں۔"

ایک دوسری حدیث میں اس سے زیادہ اور واضح الفاظ میں فرمایا کہ:

"میں تو اسی لیے بھیجا گیا کہ اخلاقِ حسنہ کی تکمیل کروں۔"

ان واضح اعلانات کا صاف مطلب یہ ہے کہ رسول اللہؐ دنیا میں اللہ کی کتاب لے کر مبعوث ہوئے اور آپؐ نے لوگوں کے اخلاق کو درست کیا تاکہ وہ دوسرے انسانوں کے لیے محبت و راحت اور ہمدردی و غم گساری کا نمونہ بن کر رہیں، اور کرۂ ارض انسان کے لیے امن و امان کا گہوارہ بن جائے۔

سیرتِ رسولؐ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانی تعلقات کو معیاری حد تک درست کرنے کا کام آپؐ نے اپنے ابتدائی مکّی دور ہی میں شروع کر دیا تھا۔ نبوت کا ابتدائی دور تھا کہ حضرت ابوذرؓ نے اپنے بھائی کو اس نئے پیغمبر کے حالات اور تعلیمات کی تحقیق کے لیے مکّے بھیجا۔ انھوں نے واپس آ کر اپنے بھائی کو بتایا کہ "میں نے محمدؐ کو دیکھا کہ آپؐ لوگوں کو اخلاقِ حسنہ کی تعلیم دیتے ہیں۔" اس شہادت سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ رسول اللہؐ نے دین کی تبلیغ کے ساتھ ہی اخلاقِ حسنہ کی تعلیم

Marfat.com

بھی شروع کردی تھی۔

اُس دور میں جب مکّے کے قریش کے مظالم سے تنگ آکر چند مسلمان، آں حضرتؐ کی اجازت لیکر حبشہ کو ہجرت کر گئے تو یہ بات اہلِ مکّہ پر شاق گزری اور انھوں نے حبش کے بادشاہ نجاشی کے پاس ایک وفد بھیجا، جس نے تحفے تحائف بھی پیش کیے اور مسلمان مہاجروں کے خلاف طرح طرح کی باتیں بھی اس کے کان میں ڈالیں۔ مقصد یہ تھا کہ حبش کا بادشاہ جو عیسائی تھا، مسلمانوں کا مخالف بن جائے اور انھیں اہلِ مکّہ کے حوالے کر دے۔ نجاشی نے تفتیشِ حال کے لیے مسلمانوں کو بلوایا، ان کی جانب سے حضرت جعفر طیارؓ نے نمائندے کی حیثیت سے جو باتیں بتائیں ان میں یہ فقرے بھی شامل تھے: "اے بادشاہ! ہم لوگ ایک جاہل قوم تھے بتوں کو پوجتے تھے، مردار کھاتے تھے، بدکاریاں کرتے تھے، ہمسایوں کو ستاتے تھے، بھائی بھائی پر ظلم کرتا تھا، زبردست زیردستوں کو کھا جاتے تھے۔ اس اثنا میں ایک شخص ہم میں پیدا ہوا، اس نے ہم کو سکھایا کہ ہم پتھروں کو پوجنا چھوڑ دیں، سچ بولیں، خون ریزی سے باز آئیں، یتیموں کا مال نہ کھائیں، ہمسایوں کو آرام دیں، پاک دامنوں پر تہمت نہ لگائیں۔"

یہ تمام باتیں اخلاقِ حسنہ کے بنیادی اصولوں میں شامل تھیں اور اسی لیے نجاشی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

حضرت جعفر طیارؓ تو مسلمان ہو چکے تھے، اس لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے عقیدت و محبت میں یہ باتیں کہی ہوں گی، لیکن قیصر روم کے دربار میں بالکل اسی طرح کا واقعہ ابو سفیان کے ساتھ پیش آیا، جو اس وقت تک اسلام کی نعمت سے فیض یاب نہیں ہوئے تھے۔ جب ان سے آں حضرتؐ کی اصلاحی دعوت کا حال پوچھا گیا تو انھوں نے جو الفاظ کہے ان کا خلاصہ یہ تھا کہ آں حضرتؐ توحید اور عبادت کے ساتھ لوگوں کو یہ سکھاتے ہیں کہ وہ پاک دامنی اختیار کریں، سچ بولیں اور قرابت کا حق ادا کریں۔

یہ شہادت دشمن کی ہے۔ اس کے پیشِ نظر پورے یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ دین کی تکمیل اخلاقِ حسنہ کے اپنانے پر منحصر ہے۔ دین نام ہے عقائد، عبادات اور اخلاقِ حسنہ کا۔ غور کیا جائے تو عقائد و عبادات کا ماحصل یہی ہے کہ انسان بہترین اخلاقی اصولوں کا حامل ہو، تاکہ معاملات میں وہ بہترین نمونہ اور عام انسانوں کے لیے امن و عافیت کا پیغام بر ہو۔

اللہ تعالیٰ ہی کائنات کا خالق ہے اور اسی نے انسان کو بھی پیدا کیا، اس لیے وہ چاہتا ہے کہ کرۂ ارض پر انسان آپس میں مل جل کر رہیں، فساد برپا نہ کریں، اللہ واحد کی پرستش کریں، اور ایک

Marfat.com

خاندان کے افراد کی طرح شیر و شکر ہو کر رہیں۔ اسی لیے قرآن کی تعلیمات اتاری گئیں، تاکہ ان کے ذریعہ سے تمام انسان اللہ ہی کی عبادت کریں اور اپنے اخلاق کو ایسا بلند بنائیں کہ وہ ایک دوسرے کے لیے آرام و راحت کا ذریعہ بن جائیں۔ اگر دین کی تعلیمات پر عمل کے بعد اخلاق کی بلندی حاصل نہ ہو تو اس کی مثال ایسی ہوگی کہ دواؤں کے استعمال کے بعد بھی مریض کو شفا حاصل نہیں ہوئی۔

اخلاق کی سب سے بھاری اور دشوار تعلیم جو اکثر افراد پر نہایت شاق گزرتی ہے وہ عفو و درگزر، ضبطِ نفس، تحمّل و برداشت کی ہے۔ لیکن اسلام نے ان دشوار باتوں کو بھی ایسے موثر انداز میں بتایا ہے کہ وہ فوراً قلب و روح میں جاگزین ہو جاتی ہیں۔ مثلاً سورۂ انعام میں فرمایا:

لَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ ط (الانعام: ۱۰۸)

یعنی: "جن کو یہ مشرک اللہ کے سوا پکارتے ہیں ان کو برا نہ کہو کہیں وہ اللہ تعالیٰ کو بے ادبی سے نادانستہ برا نہ کہہ بیٹھیں۔"

سورۂ اعراف میں فرمایا:

خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ (الاعراف: ۱۹۹)

یعنی: "معاف کرنے کی عادت ڈالو، نیک کام کا حکم دو اور جاہلوں سے کنارہ کش رہو۔"

سورۂ آلِ عمران میں نیکوکاروں کے اوصاف بیان کرتے ہوئے فرمایا:

وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ط (آلِ عمران: ۱۳۴)

یعنی: "اور جو غصے کو دبانے والے اور لوگوں کو معاف کرنے والے ہیں۔"

دین اور اخلاق دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ مسلمانوں کے آپس کے معاملات میں حُسنِ اخلاق کو جو اہمیت حاصل ہے وہ سب ... تے ہیں۔ انھیں تو ایک دوسرے کا بھائی کہہ کر اللہ تعالیٰ نے اسے اپنی ایک بڑی نعمت سے تعبیر کیا، لیکن کافروں اور مشرکوں کے ساتھ بھی نرمی اور حُسنِ سلوک کی تاکید فرمائی یہاں تک کہ حکم دیا کہ ان کے طعنوں کا بھی برا نہ مانو، کیوں کہ دینی معاملے میں بھی غصے سے کوئی حرکت کر بیٹھنا شیطان کا کام ہے۔ اگر ایسا موقع پیش آجائے تو اللہ سے دعا مانگنی چاہیے کہ وہ شیطان ان کے پھندے سے بچائے اور اس کے غلبے سے محفوظ رکھے۔

ان قرآنی تعلیمات اور اسوۂ رسول اللہ ﷺ سے یہ بات واضح ہو گئی کہ دین پر عمل کے ذریعہ سے انسان کا اخلاق بلند اور عمدہ ہو جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ ہم مسلمانوں کو توفیق عطا فرمائے کہ ہم دین کی اس حقیقت کو سمجھیں اور اپنے اخلاق کو بلند اور پسندیدہ بنائیں۔

Marfat.com

انسان کی شرافت

تخلیقِ آدم کے موقع پر اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرشتوں سے خطاب فرما کر کہا میں زمین میں اپنے خلیفہ یعنی نائب کو پیدا کر رہا ہوں:

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّىْ جَاعِلٌ فِى الْاَرْضِ خَلِيْفَةً ۝ (البقرہ: ۳۰)

مفسرین نے خیال ظاہر کیا ہے کہ اس جگہ اشارہ حضرتِ آدم کی طرف نہیں ہے بلکہ نوعِ انسانی کی طرف ہے اور انسان بذاتِ خود خلافتِ الٰہیہ کے منصب پر ابتدا ہی سے فائز ہے۔

ایک اور آیتِ کریمہ میں اس حقیقت کو ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔ یہاں خطاب انسانوں سے ہے:

وَهُوَ الَّذِىْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ (الانعام: ۱۶۵)

یعنی: "اللہ وہی تو ہے جس نے تمھیں زمین پر خلیفہ بنایا ہے۔"

وَيَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ (النمل: ۶۲)

یعنی: "اور اسی نے تمھیں خلافتِ ارضی سے نوازا ہے۔"

اللہ تبارک وتعالیٰ خالقِ دوجہان ہے۔ وہی کون مکان کا بانی ہے۔ وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ کائنات کی ہر شے اور ہر چیز اس کے قبضہ و اختیار میں ہے۔ وہی اوّل ہے اور وہی آخر۔ زمین ہو یا آسمان، چاند ہو یا سورج، ستارے ہوں یا سیّارے، ہر چیز جس کا ہم تصوّر کر سکتے ہیں اور تصور نہیں کر سکتے، سب اللہ سے ہیں۔

تو اللہ نے انسان کو خلافتِ ارضی کے مقامِ ارفع و بلند پر جب فائز کر دیا تو اس کا مطلب صرف یہی ہے کہ اللہ نے انسان کو مشرف کر دیا۔ اس کو مقامِ شرف عطا فرما دیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس اولادِ آدم کو عزت دی۔ اسے خشکی، دریاؤں اور سمندروں پر سوار کیا، اسے لذیذ و نفیس چیزیں عطا فرمائیں اور اسے اپنی بہت سی مخلوقات پر فوقیت دی:

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِىْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِى الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا ۝ (الاسراء: ۷۰)

Marfat.com

اللہ تبارک و تعالیٰ نے انسان کو دنیا میں اپنا خلیفہ بنا کر اسے اشرف المخلوقات کا درجہ عطا فرما دیا اور پھر اس کی رہ نمائی کے لیے رسول بھیجے اور اپنی کتاب یعنی قرآنِ مجید و فرقانِ حمید رسولِ آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل فرمایا اور رسولؐ اور قرآن کی روشنی عطا فرما کر ایک دستورِ حیات، ایک اصولِ زندگی اور مقصدِ حیات دے دیا۔ عقل و نطق، فکر و زبان اور علم و حکمت بصارت و بصیرت اور تفکر فی الدین و دنیا، غرض ہر حسن اور ہر طاقت عطا فرما کر شرف و شرافت کی تکمیل فرما دی۔ اور پھر ایک قولِ فیصل بھی دے دیا کہ :

اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ (الحجرات : ۱۳)

یعنی: "تم میں جو جتنا پرہیزگار ہے وہ اللہ کے نزدیک اتنا ہی مکرم ہے"

قرآنِ مجید و فرقانِ حمید انسانوں کے لئے سرچشمۂ ہدایت ہے۔ وہ جامع و مانع اور ایک مکمل قانون ہے جس کی روشنی میں ہم اپنی زندگیوں کو گزارتے ہیں اور زندگی کی راہوں کو ہموار کرتے ہیں۔ اس کتابِ مقدس اور قانونِ الٰہی سے ہدایت پانے کے شرائط ہیں۔

قرآن کے الفاظ میں پہلی شرط متقی ہونا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ:

ذٰلِکَ الْکِتٰبُ لَا رَیْبَ فِیْہِ ۚ ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ (البقرہ : ۲)

یعنی: "یہی وہ ذی مرتبت کتاب ہے (جس کا وعدہ اللہ نے پہلی کتب سماویہ میں کیا) اس میں قطعاً شبہ (کہ یہ اللہ کا کلام ہے) اہلِ تقویٰ یعنی خدا سے ڈرنے والوں کے لیے ہدایت ہے۔ (یہ پرہیزگاروں کے لیے رہ نما ہے، جن میں پرہیزگار بننے کی صلاحیت ہے، جن کو فکرِ نجات ہے ان ہی کو اس سے ہدایت حاصل ہوتی ہے"

اتنا سمجھ لینے کے بعد اب یہ غور کرنا ہے کہ متقی کون لوگ ہیں اور تقویٰ کیا ہے۔ ہمیں اس پر اس لیے بھی غور کرنا ہے کہ ہادیٔ برحق جنابِ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے:

اَلتَّقْوٰی مِلَاکُ الْحَسَنٰتِ

یعنی: "تقویٰ نیکیوں کی اصل الاصول ہے۔ نیکیوں کی بنیاد ہے"

اس سلسلے میں قرآن بھی ہماری رہ نمائی کرتا ہے۔ قرآن مجید میں تقویٰ ایک جگہ "استغنا" کے برخلاف مفہوم میں استعمال ہوا ہے اور "استغنا" کے معنی ہیں بے پروائی اور عدمِ لحاظ۔ اس طرح تقویٰ کا مفہوم خود بخود متعین ہو جاتا ہے۔ اور وہ ہے: خدا کا لحاظ اور اس کا خوف اور خیال۔

قرآنِ کریم میں ایک جگہ اہلِ دانش و عقل کو مخاطب کر کے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَیْرَ الزَّادِ التَّقْوٰی وَاتَّقُوْنِ یٰٓاُولِی الْاَلْبَابِ ۝ (البقرہ : ۱۹۷)

یعنی: "اور زادِ راہ مہیا کر لو (مگر سمجھ لو کہ) بہترین زادِ راہ تقویٰ ہے۔ اے اہلِ دانش و عقل مجھ سے ڈرو"

Marfat.com

اللہ تبارک و تعالیٰ نے انسان کو اپنے دونوں ہاتھوں سے تخلیق کیا، فرشتوں کو اس عظمتِ آدم کے سامنے سجدہ ریز ہو جانے کا حکم دیا، انسان میں اپنی روح ودیعت فرمائی، خلافت ارض مقدّر کی، اشرف المخلوقات قرار دیا اور اس طرح انسان شرف کی بلندی اور شرافت کی رفعتوں تک پہنچ گیا۔

اس تمام شرف و رفعت کا تقاضا صرف یہی ہو سکتا ہے کہ انسان ذاتِ باری تعالیٰ کی بارگاہ میں سر بہ سجود رہو، اللہ تعالیٰ کے احکامات کا پابند ہو، اس کے بتائے ہوئے راستے پر چلے، تسلیم و رضا کا خوگر ہو، انسانوں کا ہمدرد رہو، خدمتِ خلق اس کا منتہائے مقصود ہو، اسلام اس کا دین ہو، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے ہادی ہوں، مساواتِ محمدی اس کا اصول ہو، قانونِ الٰہی اور شرع محمدی اس کی معاشرت و معیشت ہو اور اخلاقِ محمدی اس کا وطیرہ ہو۔

میرے نزدیک انسان کی شرافت کا صرف یہی معیار ہو سکتا ہے۔ جو انسان اپنی فانی زندگی کو اس سانچے میں ڈھال لے گا وہ یقینی طور پر اور لازمی طور پر معیارِ شرافت پر پورا اترے گا اس کی آخرت کی زندگی سنور جائے گی اور جو انسان اس راہ سے ہٹ جائے گا، بھٹک جائے گا وہ یقیناً شرافت کے مرتبے سے گر جائے گا اور تمام بلندیوں سے گر جائے گا۔

Marfat.com

خوب سے خوب تر

اللہ تعالیٰ نے انسان کو بہترین فطرت پر پیدا کیا ہے۔ انسان کی فطرت ہے کہ وہ ہمیشہ آگے بڑھنے کی کوشش کرتا ہے۔ کسی منزل پر ہو مستقل قیام اور ٹھہراؤ اس کی فطرت کے خلاف ہے۔ کوئی کام ہو کوئی مسئلہ ہو، وہ کبھی مطمئن ہو کر اپنی جدوجہد ختم نہیں کرتا۔ ایک منزل تک پہنچ جاتا ہے تو دوسری منزل کو اپنا مقصو بنا لیتا ہے اور پھر اس کی جانب اپنا رخ کر کے ترقی کا سفر شروع کر دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا منشا بھی یہی ہے کہ اس کی دنیا اس کی زمین اس کے بندوں کے لیے بہتر سے بہتر اسباب راحت وسکون فراہم کرے، اسی لیے انسان کی فطرت میں یہ جوہر رکھا گیا ہے کہ وہ کسی منزل کو آخری منزل نہ سمجھے بلکہ ہمیشہ خوبی اور بلندی پر نظر رکھے اور اس کی تلاش وجستجو میں سرگرم عمل رہے۔ یہی جذبہ دراصل انسانی تمدن کی وسعت اور رنگارنگی کا باعث ہے۔ انسان کی یہی وہ خواہش ہے جو اس کو ہمیشہ بے چین اور متحرک رکھتی ہے۔ وقتی طور پر تو انسان اپنی منزل کو پالینے کے بعد مطمئن ومسرور نظر آتا ہے، لیکن اس کا یہ اطمینان اور اس کی یہ مسرت عارضی ہوتی ہے اور بہت جلد اس سے آگے کی منزل تک پہنچنے کی تمنا اس کے دل میں مچلنے لگتی ہے اور پھر وہ آمادۂ عمل ہو جاتا ہے۔

تمام انسانی کوششوں کا محرک یہی جذبہ اور یہی اضطراب ہے کہ وہ آگے بڑھے۔ علم ہو یا ادب، تجارت ہو یا صحت، تعمیر ہو یا تخلیق، ایجاد ہو یا اختراع، غرض کوئی میدان ہو، کوئی شعبۂ زندگی ہو، اس میں اسی خوب سے خوب تر کی تلاش نے انسان کو جانفشانی اور عرق ریزی پر آمادہ کر کے بڑے بڑے کارنامے انجام دلوائے ہیں۔ ایک ادیب کبھی اپنی تحریر سے مطمئن نہیں ہوتا۔ وہ ایک تحریر کے بعد دوسری تحریر میں اس سے آگے بڑھنے، اپنے فن کو نکھارنے اور اپنے الفاظ کو ڈھالنے کی جستجو میں مصروف نظر آتا ہے۔ اسی طرح دوسرے اصحاب فن اور مختلف پیشوں کے افراد اپنی صلاحیت کے مطابق اپنے کاموں کو بہتر سے بہتر طریقے پر انجام دینے اور ان میں نئی نئی راہیں تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ہر انسان اس وصف کا حامل ہے لیکن مسلمان اس خصوصیت میں بھی دوسرے لوگوں

Marfat.com

سے کچھ آگے ہی ہیں۔ قرآن حکیم جس طرح زندگی کے دوسرے شعبوں میں ہماری رہنمائی کرتا ہے اسی طرح اس معاملے میں بھی وہ ہمیں بہتر ین راہ بتاتا ہے۔ وہ مسلمانوں کو اللہ کی بخشی ہوئی صلاحیتوں سے کام لینے کی تلقین کرتا ہے اور انفس و آفاق کی آیات پر غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔ وہ بار بار کہتا ہے کہ انسان کو عقل دی گئی ہے لیکن وہ غور و فکر سے کام نہیں لیتا۔ قرآنی تعلیمات میں عمل اور سعی کو بہت اہمیت دی گئی ہے۔

كُلُّ امْرِئٍۭ بِمَا كَسَبَ رَهِيْنٌ ٥ (الطور: ۲۱)

یعنی "ہر شخص اپنے عمل کے ساتھ وابستہ ہے۔"

سورۃ التحریم میں فرمایا گیا ہے:

لَا تَعْتَذِرُوا الْيَوْمَ ۖ اِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ٥ (التحریم: ۷)

یعنی "آج کے دن بہانے نہ بناؤ آج تمہیں اس کا بدلہ ملے گا جو تم کرتے رہے۔"

ان آیات کریمہ سے عمل کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے۔ عمل ہی انسان کو ترقی کی جانب لے جاتا ہے۔ قرآن صاف صاف کہتا ہے کہ انسان جب تک خود کوشش اور عمل نہ کرے اس کی حالت نہیں بدلی جا سکتی۔ جو قومیں خود کچھ نہیں کرنا چاہتیں قدرت بھی ان کی مدد نہیں کرتی:

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ۖ (الرعد: ۱۱)

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

قرآن جس معاشرے میں نازل ہوا تھا اس میں اس حد تک بگاڑ آ چکا تھا کہ اس کے اکثر افراد پر جمود طاری ہو چکا تھا۔ ان سے جب کہا جاتا کہ صحیح راستہ اختیار کرو اور غلط طریق زندگی ترک کر کے دین مبین کی روشنی سے مستفید ہو جاؤ تو وہ کہتے کہ ہم تو اپنے آبا و اجداد کے دین پر قائم ہیں، وہی صحیح ہے، ہم اس سے انحراف نہ کریں گے:

قَالُوْا حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ۖ (المائدہ: ۱۰۴)

لیکن قرآن نے ان کا جمود توڑا، ان کو صحیح اور غلط کی تمیز بخشی، حق و باطل میں امتیاز کی صلاحیت عطا کی اور انسانیت کی معراج پر پہنچا دیا۔ سرکار دو عالمؐ کے فیض سے عرب کے بادیہ پیما اور بوریا نشین، عظمت کی بلندیوں پر پہنچ گئے۔ ان کے فکر و عمل نے دنیا کے تمدن میں وہ گل بوٹے کھلائے کہ سارا عالم انگشت بدنداں رہ گیا۔ جہاں گیری اور جہاں بانی ان

Marfat.com

کے قدم چومنے لگی:

بقول علامہ اقبال:

وہ دانائے سُبل ختم الرُّسل مولائے کُل جس نے
غبارِ راہ کو بخشا فروغِ وادیِ سینا!

ذاتی زندگی میں خوب سے خوب تر کی جستجو انسان کو عظمت و رفعت عطا کرتی ہے اور اس کو اپنے اہلِ وطن کی نظر توقیر و تعظیم کا مستحق بناتی ہے، اس کے لیے کامیابی و کامرانی کی راہیں کھولتی ہے۔ اس جستجو کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنے ہر آنے والے کل کو آج سے بہتر بنانا چاہتا ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ وہ آدمی مومن کی حیثیت سے کامل نہیں ہے جس کے دو روز یکساں گزریں۔

سورۃ الضحیٰ میں ارشادِ ربانی ہے:

وَلَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى ۝ (الضحیٰ: ۴)

یعنی "اور یقیناً آنے والا زمانہ تمھارے لیے آج سے بہتر ہے۔"

اس آیت کی تفسیر میں علمائے کرام نے لکھا ہے کہ اس آیت کے مفہوم میں یہ امر پوشیدہ ہے کہ آنے والا دن گزرے ہوئے دن سے بہتر ہونا چاہیے۔ گویا مسلمانوں کو اپنے عمل میں، کردار میں، عبادات میں معاملات میں ترقی کی جانب بڑھنا چاہیے۔ انفرادی زندگی کی طرح اجتماعی زندگی میں بھی بلکہ اس سے بڑھ کر اس فطری اصول کو پیشِ نظر رکھنا چاہیے۔ جس طرح ہر انسان اپنی ذاتی زندگی میں خوب سے خوب تر کی جانب سفر کرتا ہے اور ترقی کے زینے طے کرتا ہے اسی طرح اس کا فرض ہے کہ وہ قومی اور ملّی زندگی میں بھی اس جذبے کو کارفرما کرے۔ اجتماعی زندگی میں بہتری اور ترقی کے لیے قوم کا ہر فرد کچھ نہ کچھ کر سکتا ہے۔ اور اس کو کرنا چاہیے۔ قوم افراد کا مجموعہ ہوتی ہے اور قومی ترقی کا انحصار افراد کی کوششوں پر ہی ہوتا ہے۔ فرد کا عمل قوم کے مزاج پر اثر انداز ہوتا ہے۔ قوم کے افراد کی زیادہ تعداد جس قسم کی ہوگی، جس کردار کی حامل ہوگی قوم بھی اسی کردار سے پہچانی جائے گی۔ ایمان دار افراد سے جو قوم بنے گی اس قوم کا نام اقوامِ عالم میں ایک ایمان دار قوم کی حیثیت سے ہی لیا جائے گا۔ اس لیے خوب سے خوب تر کی جستجو کو قومی و ملّی معاملات میں بھی اسی شدت سے پیشِ نظر رکھنا چاہیے تاکہ ہماری حیاتِ ملی کا ہر دن پچھلے دن سے اچھا ہو۔

Marfat.com

اسلام دینِ فطرت ہے، اس نے ہمیں دنیا میں رہنے اور اس کو خوب و خوبصورت بنانے کی پوری پوری آزادی دی ہے اور ایسے طریقے بتائے ہیں جن کی مدد سے ہم ترقی کو روکنے اور پریشانیوں میں مبتلا ہونے والے محرکات و عوامل سے محفوظ رہتے ہیں۔ ایک مسلمان کی حیثیت سے ہمارا فرض ہے کہ ہر نئی صبح جب طلوع ہو تو ہمارے لیے بہتری اور ترقی کا پیغام لائے اور ہم اپنے ایمان میں، اپنے اعمال میں، اپنے علم میں اور مقصد میں پچھلے دن کے مقابلے میں چند قدم آگے بڑھتے ہوئے ہوں اور ہمارے لیے یہ نہ کہا جا سکے کہ ہمارے دو دن یکساں گزرے بلکہ ہمارے لیے یہ کہا جا سکے کہ:

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں

Marfat.com

صدق

تاریخِ عالم پر جب ہم نگاہ ڈالتے ہیں اور تاریخ کے ہر گوشے پر غور و فکر کرتے ہیں تو ایک بات جو ہمیں بہت صاف، روشن اور واضح دکھائی دیتی ہے وہ یہ ہے کہ ہر وہ واقعہ اور ہر وہ حادثہ اور ہر وہ تاریخی حقیقت کہ جسے تمام دنیا کے صلحانے اور دنیا کے صاحبانِ فضل و کمال نے اور اہلِ فکر و نظر نے انسان و انسانیت کے لیے اچھا کہا ہے اور خیر قرار دیا ہے اس کی بنیاد میں صدق یعنی سچائی کارفرما رہی ہے۔ دوسرے لفظوں میں ہم یہ کہتے ہیں کہ کوئی اچھا کام اور کوئی نیک اقدام سچائی اور صدق سے خالی نہیں ہو سکتا۔ اگر ہم غور کریں اور دل کی تمام سچائی کے ساتھ فکر کریں تو ہمارے دینِ اسلام کی بنا صدق اور سچائی پر ہے۔

سرکارِ دو عالم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فاران کی چوٹی پر بہ بانگِ دُہل یہ سوال کیا کہ لوگو! اگر میں تم سے کوئی بات کہوں تو کیا تم اس کی تصدیق کرو گے؟ لوگوں نے بلا توقف اور بلا تامل جواب دیا کہ ہم نے تمھیں ہمیشہ سچ بولتے سنا، صدق مقال پایا، تم جو بھی کہو گے ہم اس کو سچ مانیں گے کیوں کہ ہم نے تمھیں کبھی جھوٹ بولتے نہیں پایا۔ یہ وہ تاریخی اور تاریخ ساز ادّعا ہے کہ جو سرورِ کائنات، ہادیِ برحق جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن لوگوں سے کیا تھا کہ جو وحی پر یقین نہیں رکھتے تھے۔

ہمارے رسول و رہنما اور ہمارے قائدِ حقیقی فخرِ موجودات صلی اللہ علیہ وسلم کے کردار کا سب سے اہم پہلو یہی ہے کہ وہ صادق تھے، سچے تھے، امین تھے اور کلمۂ حق ہی ان کی زبانِ مبارک سے ادا ہوا ہے۔ اسی بلندیِ کردار نے آں حضرتؐ کو اس بلند مرتبے تک پہنچایا کہ انھوں نے اللہ کے پیغام کو انسانوں کے دلوں میں اتار دیا اور دینِ اسلام کی روشنی سے اس کرۂ ارض کے ہر ہر گوشے کو منوّر کر دیا۔ اور صدق اور سچائی کی یہ روشنی آج بھی رہنما ہے اور قیامت تک انسان اس روشنی میں آگے بڑھتا رہے گا اور یہ حقیقت اور یہ سچائی ہمیشہ ثابت ہو کر رہے گی کہ اگر کوئی دینِ کامل ہے تو وہ اسلام ہے۔ اور اللہ کے نزدیک اگر کوئی دین ہے تو وہ صرف اسلام ہے۔ اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ قف (آلِ عمران: ۱۹)

Marfat.com

صدق اور سچائی کا تعلق انسان کے دل اور اس کی زبان سے ہے۔ دل اور زبان جب ہم آہنگ ہوتے ہیں اور ایک دوسرے کے مطابق ہوتے ہیں تو صدق جنم لیتا ہے اور سچائی معرضِ وجود میں آتی ہے۔ اگر دل اور زبان ہم آہنگ نہ ہوں اور ایک دوسرے کے مطابق نہ ہوں تو سچائی پیدا نہیں ہو سکتی۔

مولانا شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ نے کتب سیر کے حوالے سے ایک واقعہ درج کیا ہے۔

ایک شخص آں حضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا:

یارسول اللہ! مجھ میں چار بُری خصلتیں ہیں:

ایک یہ کہ میں بدکار ہوں۔

دوسری یہ کہ میں چوری کرتا ہوں۔

تیسری یہ کہ میں شراب پیتا ہوں۔

چوتھی یہ کہ میں جھوٹ بولتا ہوں۔

یارسول اللہ! ان چار بُری خصلتوں میں سے جس ایک کو فرمایئے آپ کی خاطر چھوڑ دوں۔

ارشاد ہوا: جھوٹ نہ بولا کرو۔

چنانچہ اس نے عہد کر لیا کہ جھوٹ نہیں بولوں گا۔

اب رات ہوئی تو شراب پینے کو اس کا جی چاہا اور پھر بدکاری کے لیے آمادہ ہوا تو اس کو خیال گزرا کہ صبح کو جب آں حضرتؐ دریافت فرمائیں گے کہ رات تم نے شراب پی اور بدکاری کی تو کیا جواب دوں گا! اگر ہاں کہوں گا تو شراب و زنا کی سزا دی جائے گی۔ اگر نہیں کہا تو عہد کے خلاف ہوگا۔ یہ سوچ کر وہ ان دونوں حرکتوں سے باز رہا۔ جب رات زیادہ گزر گئی اور اندھیرا چھا گیا تو چوری کے لیے گھر سے نکلنا چاہا تو پھر اس خیال نے اس کا دامن تھام لیا کہ کل پوچھ گچھ ہوئی تو کیا جواب دوں گا۔ ہاں کروں گا تو ہاتھ کاٹا جائے گا اور نہیں کرتا ہوں تو بدعہدی ہوگی۔ اس خیال کے آتے ہی وہ چوری کے جرم سے بھی باز آیا۔

صبح ہوئی تو وہ شخص خدمت نبویؐ میں حاضر ہوا اور عرض کیا:

یارسول اللہؐ! جھوٹ نہ بولنے سے میری چاروں بری خصلتیں مجھ سے چھوٹ گئیں۔

حق بات یہ ہے کہ سچائی اور سچ بولنا انسان کو برائیوں سے بچاتا ہے۔ جو انسان سچا اور صادق ہوگا وہ برائی سے پاک ہونے کی کوشش کرے گا۔ سچا انسان ایمان دار ہوگا، سچا انسان دلیر ہوگا اور دل کا صادق ہوگا۔ سچا انسان وعدہ خلاف نہیں ہو سکتا۔ وہ راست بازی اور راست

Marfat.com

گوئی کی دولت سے مالامال ہوگا۔

اس سلسلے میں آں حضرتؐ کا ایک قولِ فیصل ہے:

اَلصِّدْقُ یُنْجِیْ وَالْکِذْبُ یُھْلِکُ

یعنی: "سچ باعث نجات ہے اور جھوٹ سبب ہلاکت ہے"

اللہ تعالیٰ نے جن لوگوں کے لیے اپنی مغفرت اور اجرِ عظیم کے وعدے کیے ہیں ان میں اسلام و ایمان اور اللہ کی فرمان برداری کے بعد پہلا درجہ سچوں اور راست بازوں کا ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

اِنَّ الْمُسْلِمِیْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ وَالْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ وَالْقٰنِتِیْنَ وَالْقٰنِتٰتِ وَالصّٰدِقِیْنَ وَالصّٰدِقٰتِ (الاحزاب: ۳۵)

یعنی: "بے شک اسلام قبول کرنے والے مرد اور عورتیں اور ایمان لانے والے مرد اور عورتیں اور فرمان بردار مرد اور عورتیں اور سچے مرد اور عورتیں"

اسلام نے سچائی کی اہمیت کو بار بار جتایا ہے اور سچائی اختیار کرنے کا حکم پر حکم دیا ہے بلکہ اس سے آگے قدم بڑھا کر تاکید کی ہے کہ ہمیشہ سچوں کا ساتھ دو، سچوں کی جماعت سے تعلق رکھو، رابطہ رکھو۔

یٰۤاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللہَ وَکُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ ○ (التوبہ: ۱۱۹)

یعنی: "اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور سچوں کے ساتھ ہو جاؤ"

سچائی کے معنی عام طور پر صرف "سچ بولنے" کے لیے جاتے ہیں مگر اسلام کی نگاہ میں صدق اور سچائی کے وسیع معنی ہیں۔ سچائی صرف قول کی نہیں ہے بلکہ عمل کی سچائی کو بھی اہمیت حاصل ہے۔ یوں تو حضرت امام غزالیؒ نے بڑی دقّت نظر اور باریک بینی سے کام لیتے ہوئے چھے سچائیاں بیان کی ہیں:

بات میں سچائی، نیت میں سچائی، عزم میں سچائی، عزم کو پورا کرنے میں سچائی، عمل میں سچائی اور دین داری میں سچائی۔

لیکن اگر اختصار سے کام لیا جائے تو تین سچائیاں بڑی اہمیت کی حامل ہیں اور یہ ہر سچائی کو محیط ہیں: زبان کی سچائی، دل کی سچائی اور عمل کی سچائی۔

زبان کی سچائی یہ ہے کہ زبان سے جو لفظ ادا ہو وہ سچا ہو۔ ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اس کا احترام کرے۔ اس میں ایفائے عہد اور قول و قرار کا پاس و لحاظ شامل ہے۔ یہ ایمان

Marfat.com

اور اسلام کی بڑی نشانی ہے۔ دل کی سچائی کا تعلق انسان کے قلب سے ہے۔ اگر قلب مومن ہے اور اس میں اللہ کا نور ہے تو زبان سے حرف غلط نکل ہی نہیں سکتا۔ دل جب سچا ہوتا ہے تو اس میں خلوص بھی ہوتا ہے۔ اس لیے یہ صدق و خلوص دونوں پر حاوی ہے۔

عمل کی سچائی یہ ہے کہ انسان کا ہر فعل اس کے ضمیر کا آئینہ دار ہو۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہنا چاہیے کہ انسان کے ظاہری اعمال اس کے باطنی اوصاف کے مطابق ہوں۔

ایسے تمام لوگ کہ جن کی زبان سچی ہے، جن کا دل سچا ہے اور جن کا عمل صادق ہے ان کا ایمان قطعی غیر متزلزل ہوتا ہے۔ ان کو جادۂ مستقیم سے کوئی طاقت ہٹا نہیں سکتی اور در حقیقت ایسے ہی لوگ اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہیں۔ ایسے ہی لوگوں کے لیے ارشاد باری تعالیٰ ہے:

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوا وَجَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۚ أُولَٰئِكَ هُمُ الصَّادِقُونَ ٥ (الحجرات: ۱۵)

یعنی: "مسلمان تو وہی ہیں کہ جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے پھر کسی طرح کا شک و شبہ نہیں کیا۔ اور اللہ کے رستے میں اپنی جان اور اپنے مال سے جہاد کیا۔ یہی سچے لوگ ہیں۔"

صدقِ عمل کی اعلاترین صورت یہ ہے کہ انسان کے ظاہر و باطن یعنی اس کی زبان کا ہر حرف، دل کا ہر ارادہ اور عمل کی ہر جنبش و حرکت حق اور صداقت کی مظہر ہو۔ قرآن حکیم نے ایسے ہی لوگوں کو صادق کہا ہے کہ ان کی صدیقیت اور ان کی سچائی اُس ایمانِ کامل کے ذریعہ سے نصیب ہوتی ہے جس سے عمل ہرگز جدا نہیں ہو سکتا۔

اس موضوع پر غور و فکر کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ صدق یعنی سچائی اللہ تبارک و تعالیٰ کی سب سے بڑی صفت ہے۔ اللہ سے بڑھ کر اور کون سچا ہو سکتا ہے! اللہ تعالیٰ قرآن میں خود فرماتا ہے:

وَمَنْ أَصْدَقُ مِنَ اللَّهِ حَدِيثًا ٥ (النساء: ۸۷)

یعنی: "اور کون ہے کہ جو اللہ سے زیادہ سچا ہے۔"

انسان بندۂ خدا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے شرف عطا فرمایا ہے۔ انسان کا یہ شرف صرف اسی حال میں قائم و باقی رہ سکتا ہے کہ انسان سچائی کو اختیار کرے اور کذب اور جھوٹ کو گناہ سمجھے۔

Marfat.com

خدمتِ خلق

شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک شعر ہے:

ہر کہ خدمت کرد او مخدوم شد
ہر کہ خود را دید او محروم شد

اس عظیم اور پر معنی شعر کا مطلب یہ ہے کہ جس انسان نے خلق کی خدمت کو اپنا شعار بنایا وہ آخر کار انسانوں کی نگاہ میں عزت اور بلند مرتبہ کا حق دار ہو گیا۔ خدمت کرنے والے کو لوگ بالآخر معاشرے میں بلند مرتبہ دیتے ہیں اور وہ مخدوم، مربی اور محسن کے زمرے میں آجاتا ہے۔ شعر کا دوسرا مصرع ہے: ہر کہ خود را دید او محروم شد، یعنی جس انسان نے خود اپنے کو دیکھنا شروع کر دیا، خود اپنی خدمت کرنی شروع کر دی وہ بالآخر محروم ہو گیا۔ محروم ہو گیا ایک اعلا انسانی وصف سے، محروم ہو گیا کردار و اخلاق کے اعلا جوہر سے، محروم ہو گیا سر بلندی سے اور سرفرازی سے۔ شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ کے اس شعر میں ایک دنیا سمائی ہوئی ہے اور اس پر جتنا غور کریں اتنی ہی عظمتیں سامنے آتی جاتی ہیں۔

مخلوق کی بے لوث خدمت کرنا انسانی اخلاق کا نہایت اعلا جوہر ہے۔ جو انسان مخلوق کی خدمت کرتا ہے اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس کا مرتبہ اور درجہ بہت بلند ہے۔ جو شخص اللہ تعالیٰ کے بندوں سے پیار کرتا ہے اور ان کی کسی غرض اور لالچ کے بغیر، خدمت کرتا ہے حق تعالیٰ اُسے عزت سے نوازتے ہیں۔ قدرت کا یہ اصول ہے اور فطرت کا یہ قول فیصل ہے کہ مخلوق کی خدمت کرنے والے کا مرتبہ ہمیشہ بلند ہوتا ہے۔ دین و دنیا کی ہر دولت اسے میسر ہوتی ہے۔

لیکن یہ بات ہمیشہ یاد رکھنی چاہیے کہ اس بلند مرتبے پر صرف وہی لوگ پہنچ سکتے ہیں کہ جو خود کو دیکھنا چھوڑ دیں۔ اپنی ذات کو قربان کر دیں، اپنے عیش و آرام کا ایثار کر دیں، اپنی خواہشات کو ترک کر دیں اور اپنی ہستی کو فنا کر کے دوسرے انسانوں کے فائدے اور آرام اور ان کی خدمت کے لیے کمربستہ ہو جائیں۔ خدمتِ خلق کے اعلا معیارات اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے بلند درجات صرف اُسی صورت میں حاصل ہو سکتے ہیں کہ انسان خود کو بھول کر اور اپنی ذات کو فراموش کر کے

Marfat.com

اور اپنے آرام کو ترک کر کے دوسرے انسانوں کی خدمت میں مصروف و مشغول ہو جائے۔

غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ خدمتِ خلق سے زیادہ اور کوئی وصف ہے ہی نہیں جس سے معاشرے میں استحکام پیدا ہو، محبت والفت کی فضا قائم ہو اور لوگ ایک دوسرے کو اپنا دوست، ہمدرد اور بہی خواہ سمجھنے لگیں۔ محتاجوں کی ضرورت پوری کرنا، بھوکے کو کھانا کھلانا، ننگے کو کپڑے پہنانا، بیمار کے لیے علاج کا انتظام کرنا، یتیموں کے سر پر ہاتھ رکھنا اور ان کی اس طرح سرپرستی کرنا کہ وہ جوان ہو کر معاشرے کے لیے کار آمد افراد بن جائیں اور پھر وہ خود بھی خدمتِ خلق کریں، بیواؤں کی اس طرح سرپرستی کرنا کہ ان کو معاشرہ میں عزت کا مقام ملے اور ان کی ضرورتیں پوری ہوتی رہیں، یہ سب بنیادی خدمات ہیں جن سے نہ صرف خدمت کرنے والے کے جذبے کی تسکین ہوتی ہے، اور ضرورت مند کی ضرورتیں پوری ہوتی ہیں، بلکہ ان خدمات کے ذریعے سے معاشرہ امن وامان اور خوش حالی کا گہوارہ ہوتا ہے اور کسی کو کسی سے شکایت باقی نہیں رہتی تمام اشخاص ایک دوسرے کو اپنا بھائی، مددگار اور ہمدرد سمجھنے لگتے ہیں اور باہمی اعتماد اور الفت کا بے پناہ جذبہ جاری وساری رہتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی سیرت ہر مسلمان کے لیے بہترین نمونہ ہے۔ بلکہ یہی وہ نمونہ ہے جس کی اطاعت و پیروی کا ہمیں حکم دیا گیا ہے۔ آں حضرتؐ کی حیاتِ طیّبہ درحقیقت خدمتِ خلق سے عبارت ہے۔ آپؐ کی تمام زندگی خدمت ہی خدمت ہے۔

ایک مرتبہ ایک عورت مکّہ مکرّمہ کی ایک گلی سے گزر رہی تھی۔ اس کے سر پر اتنا بھاری بوجھ تھا کہ وہ بمشکل قدم اٹھا سکتی تھی۔ بعض لوگ اس کا مذاق اڑانے لگے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کہیں قریب ہی تھے۔ آپؐ اس عورت کو مشکل میں دیکھ کر فوراً آگے بڑھے اور اس کا بوجھ خود اٹھا کر اس کی منزل پر پہنچا دیا۔

ایک دن حضور اکرمؐ ایک گلی سے گزر رہے تھے کہ ایک اندھی عورت ٹھوکر کھا کر گر پڑی۔ بعض لوگ اسے دیکھ کر ہنسنے لگے۔ لیکن ہمارے پیارے نبیؐ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ آپؐ نے اس عورت کو اٹھایا اور اس کے گھر پہنچا دیا۔

خدمتِ خلق کی اسلام میں اس قدر تاکید کی گئی ہے اور رسول اللہؐ نے اتنی بے شمار مثالیں قائم فرمائی ہیں کہ ان سے متاثر ہو کر شاعر کہتا ہے:

دل بدست آور کہ حج اکبر است　　　از ہزاراں کعبہ یک دل بہتر است

رسول اللہؐ کو اللہ تعالیٰ نے خدمتِ خلق کا بے پناہ جذبہ عطا فرمایا تھا۔ آپؐ ہر وقت مخلوقِ خدا

Marfat.com

کی خدمت کے لیے کمربستہ رہتے تھے۔ اپنا ہو یا بیگانہ، مسلم ہو یا غیر مسلم، آقا ہو یا غلام آپؐ ہر ایک کے کام آتے تھے اور ان کے ادنا سے ادنا کام کر دیتے تھے آپؐ کو کوئی عار نہ تھا۔ مکی زندگی کے بعد جب آپؐ مدینہ منورہ تشریف لائے تو مشغولیت بہت زیادہ ہو گئی تھی۔ مخالفوں کی چیرہ دستیوں کا مقابلہ، اندرونی دشمنوں کی ستم رانیوں کے خلاف کامیاب مدافعت اور مسلمانوں کی تعلیم و تربیت اور ایک مثالی معاشرے کے قیام کی جدوجہد، یہ سارے کام آپؐ کی ہمہ تن اور ہمہ وقت توجہ کے محتاج تھے، لیکن اس کے باوجود جب بھی معمولی سے معمولی انسانی خدمت کا کوئی موقع آتا تو آپ ہمہ تن اس خدمت کی انجام دہی میں لگ جاتے۔

جنابِ ہادیٔ برحق، نورِ مجسمؐ نے اس کرۂ ارض پر انسان کو ایک نئی زندگی سے روشناس کرایا۔ انسان تاریکی میں تھا رسولِ برحقؐ نے اسے روشنی دکھائی۔ قرآنِ حکیم آپؐ کا رہ نما تھا، اس کی روشنی میں جنابِ رسولِ اکرمؐ نے ایک ایسا انسانی معاشرہ قائم کیا کہ اس نے ساری دنیا میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔ مسلمان صحرائے عرب سے ایمان کی طاقت اور ایقان کی قوت کے ساتھ نکلے۔ قرآنِ حکیم کی روشنی اور رسولِ برحقؐ کے عمل کا نمونہ ان کے ساتھ تھا۔ انھوں نے دنیا کے چپے چپے کو نورِ ایمان سے منور کر دیا۔ ان کے سامنے قرآن کا یہ فیصلہ تھا۔

اَحْسِنْ کَمَا اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَیْكَ

یعنی: "لوگوں کے ساتھ سلوک کرو جیسا کہ اللہ نے تمھارے ساتھ کیا ہے۔"

مسلمانوں نے اقصائے عالم میں حسنِ سلوک کا وہ عظیم مظاہرہ کیا کہ دنیا حیرت زدہ رہ گئی اور اسلام کی سربلندیوں کے سامنے سارا عالم سرنگوں ہو گیا۔ مسلمانوں کے پاس قرآنِ حکیم ہے، مسلمانوں کے سامنے پیارے نبی کریمؐ کا اسوۂ حسنہ ہے اور یہ اتنی بڑی دولت و عظمت ہے کہ مسلمان کو اس سے زیادہ کسی چیز کی ضرورت ہے نہ حاجت۔ ان کو ضرورت ہے اب، تو صرف عمل کی۔ ہمیں اس کا جلد احساس و ادراک کر لینا چاہیے اور اپنے کھوئے ہوئے مقام کو حاصل کرنے کی شدید جدوجہد کرنی چاہیے۔ عمل میں ایک عمل خدمتِ خلق ہے۔ ہمارا منتہائے فکر یہ ہونا چاہیے کہ ہم ایسے انسان بنیں جن کے بارے میں قرآن کہتا ہے:

وَیُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓی اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ کَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ

یعنی: "ترجیح دیتے ہیں اپنے پر دوسروں کو خواہ خود ضرورت مند ہی کیوں نہ ہوں۔"

اور ہمارا ایمان اس حدیث شریف پر ہونا چاہیے کہ: "اللہ اس بندے کی مدد کرتا ہے کہ جو دوسرے بندوں کی مدد کرتا ہے۔"

Marfat.com

خدمتِ خلق ہی کے اس جذبۂ صادق کا یہ اثر تھا کہ ہمارے اسلاف کو عزت و توقیر حاصل تھی۔ دنیا دل سے ان کی عظمت کی قائل تھی۔ بے لوث خدمتِ خلق نے لوگوں کے دلوں میں ان کے لیے اعلا مقام پیدا کر دیا تھا۔ اس کھوئے ہوئے مقام کی بازیافت ہی ہماری منزل ہے اور اس منزل کو پانے کی صرف ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ ہم رسولِ برحق ﷺ کی صدقِ دل سے پیروی کرتے ہوئے دکھی انسانیت کی خدمت کے لیے کمربستہ ہو جائیں۔

جس معاشرے میں خدمتِ خلق کو شعار بنانے والے لوگوں کی معتدبہ مقدار موجود ہو اس معاشرے میں سکون و راحت کا دور دورہ ہوتا ہے لوگ پریشانی کے وقت اپنے کو تنہا اور بے یار و مددگار محسوس نہیں کرتے۔ ان کو یقین ہوتا ہے کہ ہمارے بھائی ہماری مدد کریں گے۔ غور کیا جائے تو مسلم معاشرہ ہی ایسا معاشرہ ہو سکتا ہے، کیوں کہ ان کا رسول ؐ رحمتِ عالمین بنا کر بھیجا گیا تھا اور رحمت للعالمینؐ کا ارشاد ہے کہ تمام مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔

پاکستان میں ہمیں ایسا ہی معاشرہ تعمیر کرنا چاہیے۔

Marfat.com

حُسنِ سلوک

انسان کا سب سے قیمتی سرمایہ اس کے اعمال ہیں۔ اعمال ہی پر اس کی بلندی و پستی، اس کی ترقی و تنزّل، اس کی مقبولیت و نامقبولیت کا دار و مدار ہے۔ اعمال ہی انسان کو بامِ عروج پر لے جاتے ہیں اور اعمال ہی اس کو ذلّت و تباہی کے گڑھے میں پہنچا دیتے ہیں۔ یہی حال اجتماعی زندگی کا ہے۔ اگر کسی قوم کے افراد کی اکثریت حسنِ عمل کی سرمایہ دار ہوگی تو وہ قوم ترقی و عروج کی بلندیوں کو چھو لے گی اور جس قوم کے افراد حسنِ عمل سے محروم ہوں گے وہ قوم ترقی کے بجائے تنزّل کی طرف جائے گی۔ یہ وہ بات ہے جس کو علومِ عمرانی کے ماہر بھی تسلیم کرتے ہیں اور جس کی گواہی میں تاریخ کے اوراق بھی صف باندھے کھڑے ہیں۔

مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ نے ایک بہترین ضابطۂ حیات عطا فرمایا ہے جس سے زیادہ جامع اور مکمل کوئی دستورِ حیات، کوئی ضابطۂ عمل اور نظامِ اخلاق آج تک پیش نہیں کیا جا سکا اور مسلمان کی حیثیت سے ہمیں یقین ہے، ہمارا ایمان ہے کہ آئندہ بھی پیش نہیں کیا جا سکے گا۔ اسلامی نظامِ عمل میں جہاں انفرادی اور اجتماعی زندگی کے تمام شعبوں کے متعلق مکمل و مفصل ہدایات موجود ہیں اور ایک نمونۂ کامل محفوظ ہے وہیں زندگی کی چھوٹی چھوٹی باتوں اور معمولی معمولی گوشوں کو بھی ہدایات کی روشنی سے منوّر کر دیا گیا ہے۔ یہ چھوٹی چھوٹی باتیں زندگی کو خوش گوار اور کامیاب بنانے کے لیے بڑی کارآمد اور کارگر ہیں۔ ہادیٔ برحق کا فرمان ہے کہ ''مومن کی میزان میں اچھے اخلاق سے زیادہ کوئی چیز وزنی نہ ہوگی۔'' (مسلم و ترمذی) اخلاق کا تعلق پوری زندگی اور زندگی کی تمام سرگرمیوں سے ہے، لیکن ہم اس وقت اخلاق کے صرف اس پہلو کو پیش کر رہے ہیں جس کو عرفِ عام میں خوش اخلاقی یا خوش خلقی کہتے ہیں۔ اور اس کا تعلق دوسروں کے ساتھ سلوک اور برتاؤ سے ہوتا ہے۔ سرکارِ دو عالم نے فرمایا ہے کہ:

اِنَّ اللّٰہَ عَزَّ وَجَلَّ کَتَبَ الْاِحْسَانَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ فَاِذَا قَتَلْتُمْ فَاَحْسِنُوا الْقِتْلَۃَ وَاِذَا ذَبَحْتُمْ فَاَحْسِنُوا الذِّبْحَ (ابن ماجہ) ''ہر چیز میں اللہ تعالیٰ نے احسان فرض کیا ہے، قتل بھی کرو تو حسن کے ساتھ ذبح بھی کرو تو حسن کے ساتھ۔'' یعنی اللہ کو یہ بات پسند ہے کہ آدمی جب کوئی کام کرے تو خوش

Marfat.com

اسلوبی سے کرے۔ حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہؐ ایک ایسے آدمی کے پاس سے گزرے جو بکری کو گرا کر اس کے چہرے پر اپنا پیر رکھے ہوئے چھری کو تیز کر رہا تھا اور بکری اس کے اس عمل کو دیکھ رہی تھی۔ حضورؐ نے فرمایا "کیا یہ بکری ذبح کرنے سے پہلے نہ مر جائے گی؟ کیا تم اس کو دوہری موت دینا چاہتے ہو؟"

یہ حضورؐ کی تلقین تھی حسنِ سلوک کے لیے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حسن سلوک کی اہمیت زندگی میں کس قدر ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلّم نے جو طرزِ زندگی اپنی امت کو سکھایا ہے اس میں اچھے برتاؤ اور خوش خلقی کو کتنا اہم مقام حاصل ہے۔

حسنِ سلوک ایسی چیز ہے جس کا اظہار ہر وقت، ہر موقع پر، ہر شخص سے ہو سکتا ہے۔ روزانہ صبح سے شام تک سیکڑوں آدمیوں سے آپ کا واسطہ پڑتا ہے، کسی سے سرسری ملاقات ہوتی ہے اور کسی سے تفصیلی گفتگو اور تبادلِ خیال ہوتا ہے، کسی سے صرف سلام دعا ہی تک بات پہنچتی ہے، لیکن ان سب میں آپ کا طرزِ عمل اور برتاؤ ظاہر ہوتا ہے۔ اچھا برتاؤ ہوگا تو وہ بھی نمایاں ہوگا اور اپنے اثرات چھوڑے گا، بُرا سلوک ہوگا تو اس کا اظہار بھی ہو کر رہے گا اور اس کے نتائج بھی نمایاں ہوں گے۔ چلتے چلتے محض سلام کرنے اور مزاج پوچھنے کے انداز ہی سے مخاطب کے ساتھ آپ کے رویّے اور سلوک کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ مسکراتا ہوا چہرہ حسنِ اخلاق کا بہترین مظہر ہے۔ کسی کو دیکھ کر آپ کے چہرے پر بشاشت کا آجانا اس پر آپ کی توجہ اور اس سے آپ کے تعلقِ خاطر کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔ اور یہ بھی حسن سلوک ہے کہ لوگ یہ سمجھیں کہ ان کے ملنے سے آپ کو خوشی ہوئی۔

حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کا ارشاد ہے کہ "اپنے بھائی کے لیے مسکرا دینا بھی صدقہ ہے۔" بتائیے انسانیت کا اس سے زیادہ پاس کس کو ہوگا اور انسانی نفسیات کا لحاظ اس سے زیادہ کس مصلح، کس رہنما نے رکھا ہوگا۔ باہم اخوت و محبت اور یگانگت کے ایسے نکتے آپ کو کہاں ملیں گے۔ یہ بظاہر چھوٹی چھوٹی باتیں زندگی میں بڑی اہمیت رکھتی ہیں اور اکثر دُور رس نتائج پیدا کرتی ہیں۔ تعلقات بنانے اور بگاڑنے، رشتوں کو توڑنے اور جوڑنے میں ان چھوٹی چھوٹی باتوں کو بڑا دخل ہوتا ہے، بلکہ اکثر اہم باتوں کے مقابلے میں چھوٹی باتیں ہی انسانی تعلقات پر زیادہ اثر انداز ہوتی ہیں۔ حسنِ سلوک انسان کو وہ طاقت اور وہ کشش عطا کرتا ہے جس سے وہ دلوں کو مسخر کر لیتا ہے اور انسان کی سچی خدمت انجام دیتا ہے۔ ایک میٹھا بول بعض وقت مایوس و دل شکستہ انسان کو ولولۂ تازہ عطا کرتا ہے۔ ہمت افزائی کا ایک جملہ حوصلوں کو بلند اور عزائم کو جوان کر دیتا ہے۔ یہ سب حسنِ سلوک کے کرشمے ہیں۔ بڑے سے بڑا آدمی اگر

Marfat.com

اس نعمت سے محروم ہے تو سمجھیے کہ وہ انسانیت کے حقیقی جوہر سے محروم ہے اور سچی خوشی اس کے پاس کبھی نہیں پھٹکے گی۔

انسان جتنا بڑا ہوگا اتنا ہی اس کا طرزِ عمل اور برتاؤ شائستہ اور شریفانہ ہوگا۔ بڑائی کا مطلب ہی یہ ہے کہ آپ حسنِ سلوک کی دولت سے مالا مال ہوں۔ انسانی تمدن کی یہ خصوصیت ہے کہ بڑے اور چھوٹے ایک دوسرے کے محتاج ہیں۔ بڑوں کو چھوٹوں کا تعاون درکار ہے اور چھوٹوں کو بڑوں کی مدد مطلوب ہوتی ہے۔ تمدن کی گاڑی دونوں پہیوں سے چلتی ہے۔ اس طرح انسان کو اپنے معاشرے کے مختلف افراد سے ملنا جلنا اور ان کے درمیان رہنا پڑتا ہے۔ پڑوسی کی مثال لیجیے۔ آپ کتنے ہی امیر ہوں اور آپ کا پڑوسی کتنا ہی غریب اور بے سہارا ہو، بہرحال وہ آپ کے قریب ہے، آپ کو اس کی خوشی اور اس کی تکلیف کا سب سے پہلے علم ہوگا اور آپ ایک دوسرے کے رنج و راحت میں سب سے پہلے شریک ہو سکتے ہیں۔ اگر آپ ایسا نہیں کرتے تو آپ اچھے پڑوسی نہیں ہیں اور اچھے پڑوسی نہیں تو اچھے انسان بھی نہیں ہو سکتے۔ آپ کے حسنِ سلوک کا سب سے پہلا مستحق آپ کا پڑوسی ہے۔ سرکارِ دو عالمؐ نے اس نکتے کو کس خوبی سے بیان فرمایا ہے:

"اگر تیرے ہمسائے تجھے اچھا کہتے ہیں تو تو واقعی اچھا ہے۔ اگر تیرے بارے میں تیرے ہمسائے کی رائے خراب ہے تو تو ایک برا آدمی ہے۔" (بخاری)

اسلام کی تعلیمات کا خلاصہ یہ ہے کہ مومن کا ہر کام اس طرح ہو کہ اس سے معلوم ہو کہ یہ مومن کا کام ہے اور مومن و غیر مومن کا فرق ظاہر ہو۔ حتیٰ کہ اگر ایک مومن کسی کے گھر پر جا کر دروازہ کھٹکھٹائے تو اس عمل سے بھی اندازہ ہو جائے کہ یہ ایک ایسا فرد ہے جو اللہ پر ایمان رکھتا ہے اور اپنے ہر عمل میں اس کے احکام کا خیال رکھتا ہے۔ ایک مومن کا ہر عمل اس کے ایمان کا مظہر اور عکس ہوتا ہے اور ایک کافر کا عمل اس کے کفر کا آئینہ۔ دین کا فرق اور طرزِ زندگی کا فرق انسانوں کے کردار، برتاؤ اور اخلاق میں منعکس ہوتا ہے۔ حسینیت اور یزیدیت زندگی کے ہر شعبے میں اپنا اپنا کردار ادا کرتی ہے۔ مومن کا ہر عمل اس کے ایمان کی شہادت دیتا ہے۔ طرزِ حیات اور طریقِ عمل سے انسانوں اور انسانوں کے درمیان ایک واضح خطِ امتیاز کھنچ جاتا ہے۔

Marfat.com

فرائض کی انجام دہی

انسان کہ جو شعور اور ارادے کی دولت سے بہرہ ور ہے اور وہ انسان کہ جو جبلّی طور پر مُعاشرتی زندگی گزارنے کا پابند ہے وہ مطلق العنان نہیں ہو سکتا، کیوں کہ اقدار و اصُول کی پابندی کے بغیر نہ باہمی رَوابط کی فضا خوش گوار ہو سکتی ہے نہ تعمیری جدوجہد کا جذبہ دلوں میں موج زن ہو سکتا ہے، اور یہ دونوں باتیں اجتماعی اور مُعاشرتی زندگی کے لیے لازمی ہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ رُوئے زمین پر بسنے والے انسان کے لیے فرائض کے تعیّن کا حق ریاست، قانون یا خود مُعاشرہ اور اُس کے افراد میں سے کسے حاصل ہے؟ انسانی تاریخ اِس سوال کے متعدّد جواب پیش کرتی ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ انسان اِس میدان میں تجربات کے مراحل سے گزر چکا ہے۔ اُس نے یہ حقیقت تو تسلیم کر لی ہے کہ ہر انسان کے کچھ نہ کچھ فرائض یقیناً ہیں، لیکن یہ مسئلہ آج تک حل نہیں ہو سکا کہ ان کا تعیّن کون کرے گا؟ اِس انسانی مشکل کا حل اسلام پیش کرتا ہے۔ اسلام انسان پر یہ حقیقت آشکار کرتا ہے کہ جو تمھارا خالق ہے اُس کو تمھاری زندگی کے مقاصد کے تعیّن کا حق ہے اور اُس کو تمھیں یہ حکم دینے کا اختیار ہے کہ تمھیں اپنے ساتھ، دوسروں کے ساتھ، اور خود اُس کے ساتھ کس طرح رہنا ہے؟ اسی آسمانی صراحت اور وضاحت سے فرائض کا صحیح طور پر تعیّن ہو سکتا ہے۔ کسی چیز کی فرضیت میں یہ نکتہ بھی مُضمَر ہوتا ہے کہ اس کی ادائی سے قاصر رہنے کی صورت میں کسی بالاتر ہستی کے سامنے جواب دہی ضروری ہے۔ فرائض کی ادائی کا دُوسرا پہلو یہ ہے کہ اگر یہ ٹھیک ادا ہو گئے ہیں تو اُن کی جزا بھی ملے گی اور جزا دینے والی ہستی نے اعلان کر دیا ہے کہ:

أَنِّي لَآ أُضِيعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنكُم ۝ (آلِ عمران - ۱۹۵)

یعنی "تم میں سے کسی عمل کرنے والے کے عمل کو اللہ تعالیٰ ضائع نہیں کرتا۔"

لہٰذا یہ تصوّر قطعی غلط ثابت ہوتا ہے کہ انسان خود اپنے فرائض کا دائرہ متعیّن کر سکتا ہے، اور اُن کی ادائی کا معیار مقرر کر سکتا ہے۔

Marfat.com

اسلام نے اپنے نظامِ فکر و عمل میں حقوق کے بجائے فرائض کی ادائی پر زور دیا ہے۔ "حق"، جسے قرآنی اصطلاح میں جزا کہتے ہیں، دراصل ثانوی حیثیت رکھتا ہے۔ اللہ کے احکام کی کامل اطاعت، رسول کا مکمل اِتّباع اور جسم و جان پر اللہ کی بلاشرکتِ غیرے حکمرانی کی شرائط اگر پوری ہو جائیں تو پھر یقینِ کامل رکھنا چاہیے کہ اَجر مل کر رہے گا۔ اس لیے کہ اس نے فرمایا ہے:

إِنَّ اللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ ۝ (التوبہ۔ ۱۲۰)

یعنی "اللہ نیکوکاروں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔"

اِسی طرح یہ بھی ارشاد فرمایا ہے کہ:

إِنَّا كَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ ۝ (الصٰفٰت۔ ۸۰)

یعنی "ہم اسی طرح احسان کرنے والوں کو جزا عطا کرتے ہیں۔"

فرائض کی ادائی کی اہمیّت کا احساس سورۃ النسأ کی اس آیت میں دلایا گیا ہے:

إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَن تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَىٰ أَهْلِهَا ... (النسأ۔ ۵۸)

یعنی "بے شک اللہ تمھیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں، اہلِ امانت کے حوالے کر دو۔"

اِس آیت کے سیاق و سباق پر مکمل طور پر غور نہ کرنے کی وجہ سے ہم امانت کے حقیقی تصوّر تک نہیں پہنچ پاتے، اور یہ بھی نہیں سمجھ پاتے کہ اہلِ امانت کے مفہوم میں کتنی وسعتیں اور پہنائیاں ہیں۔ دراصل امانت سے مراد کوئی ایسا گنج پنہاں نہیں ہے کہ جو زمین کے کسی گوشے میں رکھ دیا گیا ہے، بلکہ انسان کو اللہ نے فکر و عمل کی جو صلاحیت اور قوت بخشی ہے اس کا صحیح اور دیانت دارانہ استعمال تقاضائے امانت ہے۔

اب آپ خود ہی غور فرمائیے کہ انسانوں کے باہمی روابط کے دائرے اس سے زیادہ کیا ہو سکتے ہیں کہ ایک تاجر ہو دوسرا خریدار، ایک صنعت کار ہو دوسرا صارف، ایک مزارع ہو دوسرا زمیں دار، ایک عام انسان ہو دوسرا سربراہِ مملکت۔ اسلام یہ چاہتا ہے کہ یہ سارے تعلّقات امانت کے تصوّر پر مبنی ہوں اور کوئی اللہ تعالیٰ کی مقرّرہ حدُود سے تجاوز کرنے کی جرأت نہ کرے۔ اس نے سب کے فرائض الگ الگ مقرر کر دیے ہیں اور ان سب کے لیے ایک جامع لفظ امانت کا استعمال کیا ہے، کیوں کہ فرض شناسی کا منبع اور سرچشمہ تصوّرِ امانت ہی ہے۔

انسان کی اپنی اولاد بھی اللہ کی امانت ہے جس کی صحیح تعلیم و تربیت والدین کے فرائض میں ہے۔ اور ترمذی کی حدیث ہے کہ "اگر کسی شخص نے اپنی لڑکیوں کی کفالت کی، اُن کو مہذّب و شائستہ بنایا، اُن کو تعلیم دی تو قیامت میں اُسے شہید کا ثواب ملے گا۔" بعض

Marfat.com

حدیثوں میں اولاد کا لفظ ہے جس میں لڑکے اور لڑکیاں دونوں شامل ہیں۔ اگر ان کی کفالت اور تعلیم و تربیت امانت کے تصوّر کے ساتھ ہوتی ہے تو اجرِ عظیم کا وعدہ ہے۔ دُوسری جانب اولاد کو صاف اور واضح الفاظ میں والدین کی اِطاعت اور ان کے اکرام و احترام کا حکم دیا گیا ہے اور خلاف ورزی کرنے والے کے بارے میں یہ کہا گیا کہ وہ گناہِ کبیرہ کا مرتکب ہوتا ہے۔ اقربا کے فرائض میں صلۂ رحم کو ضروری قرار دیا گیا۔ چھوٹوں کے فرائض میں بڑوں کی تعظیم ضروری قرار دی گئی اور بڑوں کے فرائض میں چھوٹوں پر شفقت ضروری بتائی گئی۔

پروردگارِ عالم سے ہمارا رشتہ عبد اور معبُود کا ہے، خالق اور مخلوق کا ہے اور اس نے ہمیں جس چیز کا بھی حکم دیا ہے وہ ہم پر فرض ہے اور اس کی ادائی میں ہم جس قدر غفلت اور کوتاہی سے کام لیں گے ہمارا اخلاقی معیار گرتا چلا جائے گا اور ہم آخرت میں بھی مُستوجبِ عُقوبت ٹھیریں گے اور دنیا میں بھی رُسوا ہوں گے۔

آپ غور فرمائیے کہ اگر کوئی نماز نہیں پڑھتا، روزہ نہیں رکھتا، حج نہیں کرتا تو یہ صحیح ہے کہ حقوق اللہ ادا نہیں کرتا، لیکن کیا نفسیاتی طور پر یہ فیصلہ خلافِ واقعہ ہوگا کہ ایسا شخص غیر ذمّہ دارانہ زندگی گزار رہا ہے اور اس کی یہ لاپروائی اور اُس کا غیر ذمہ دارانہ طرزِ عمل صرف عبادات تک نہیں ہوگا بلکہ یقیناً دوسرے مُعاملات تک بھی ہوگا۔ اللہ کا فرض ادا نہ کرنے والا بندوں کے معاملے میں بھی غیر ذمّہ دار ہوگا۔ غیر ذمّے داری شعورِ امانت کے فقدان سے پیدا ہوتی ہے۔ فرائض سے غفلت اور لاپروائی پورے مُعاشرے کو فساد میں مبتلا کر دیتی ہے۔ تاجر اگر راست باز نہ ہو، مزدور اگر دیانت دار نہ ہو، حاکم اگر عادل نہ ہو، عالم اگر فیّاض اور باعمل نہ ہو، پڑوسی اگر قابلِ اعتماد نہ ہو تو مُعاشرے میں فساد اور ابتری کا پھیل جانا یقینی ہے۔ اسلام نے فرائض کی ادائی کے لیے اور اس کی اہمیت کا احساس دلانے کے لیے امانت کا تصوّر اُبھار کر پورے مُعاشرے کو فرض شناس، متحرک اور فعّال بنا دیا ہے۔ ارشاد ہے:

مَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِىْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا ..... (طٰہٰ : ۱۲۴)

یعنی "جس نے میرے احکام سے رُوگردانی کی اُس کی زندگی تنگ ہو جائے گی۔"

یہ آیت دراصل فرائض کی ادائی میں کوتاہی پر ایک تنبیہ ہے۔ دُعا ہے کہ اللہ ہمیں اپنے عائد کردہ فرائض کی تکمیل کرنے والا بنائے اور ہمارے اعمال و اخلاق کو اس حُسن و جمال سے مزیّن فرمائے کہ جو فرض کی امانت ادا کرنے والوں کا حق ہے۔ آمین

Marfat.com

میانہ روی

افراط و تفریط، انتہا پسندی، شدّت اور بے اعتدالی اُن خصوصیات میں شامل ہیں جن کو کبھی مفید اور پسندیدہ قرار نہیں دیا گیا۔ اس کے برعکس میانہ روی اور اعتدال کو ہمیشہ قابلِ تعریف قرار دیا گیا ہے اور ہمیشہ دیا جاتا رہے گا۔ افراط و تفریط چاہے زندگی کے کسی بھی شعبے میں ہو اور کسی کام میں بھی اس کا مظاہرہ کیا جائے، نتائج و اثرات کے لحاظ سے نقصان رساں اور مایوس کن ہوتی ہے۔ بُرے اعمال تو ایک طرف رہے اچھے اعمال اور نیک افعال میں بھی انتہا پسندی اچھی اور مستحسن نہیں ہے۔ اسلام دینِ فطرت ہے اور اسی لیے اس کا دیا ہوا نظامِ حیات نہایت مکمّل، متوازن اور ایک معتدل نظام ہے۔ افراط و تفریط کی اس نے کسی شعبۂ زندگی میں بھی اجازت نہیں دی ہے۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم جب منصبِ نبوّت پر فائز ہوئے اور آپؐ کو دعوتِ حق کے اعلان کا حکم دیا گیا تو آپؐ نے اس حکم کی تعمیل میں لوگوں کو دینِ حق کی جانب بلانا شروع کیا، لیکن اس وقت عرب کے لوگ اس قدر بے راہ تھے اور کفر و شرک کی اتنی تاریکی میں تھے کہ حق کی روشنی میں ان کے لیے کشش نہ رہی تھی۔ ان کی بے حسی نے ان کو اِس اعلانِ حق پر بھی کان نہ دھرنے دیا۔ رحمتِ عالمؐ کو معلوم تھا کہ دینِ حق کی یہ آخری دعوت فیصلہ کن ہے۔ جو اس دعوت کو قبول کرے گا وہ رحمتوں اور نعمتوں سے نوازا جائے گا اور جو اس سرچشمۂ فیض سے منہ موڑے گا وہ ذلّت و رسوائی کے غار میں دھکیل دیا جائے گا اور خدا کے قہر سے نہ بچ سکے گا۔ اپنی قوم کی غفلت دیکھ کر حضورؐ کا دل دُکھتا اور آپ ملول ہوتے۔ اللہ تعالیٰ نے جب آپ کو دینِ اسلام کے لیے اس قدر پریشان اور ہلکان دیکھا تو فرمایا:

مَآ اَنْزَلْنَا عَلَیْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓى ۙ (طٰہٰ: ۲)

یعنی: "ہم نے آپ پر قرآن اس لیے نہیں اتارا ہے کہ آپ اس طرح اپنے آپ کو ہلکان کریں۔"

اس ارشادِ ربّانی پر غور فرمایئے۔ دینِ حق کا معاملہ ہے، اُس کی دعوتِ عام کا

Marfat.com

مرحلہ درپیش ہے۔ خدا کا آخری پیغمبر اپنی قوم کی حالت پر غمگین ہے، لیکن اس میں بھی شدت پر ٹوکا جا رہا ہے اور بتایا جا رہا ہے کہ اس کتاب کے نزول کا مقصد یہ نہیں ہے کہ خدا کا رسول اپنا جی ہلکان کرے۔ توازن و اعتدال کی اہمیت اس سے زیادہ کیا ہوگی کہ قیام حق میں بھی اس کو ملحوظ رکھنے کی ہدایت فرمائی گئی ہے۔ میانہ روی کی تاکید صرف اسی مسئلے تک محدود نہیں ہے، بلکہ اسلام کی امتیازی خصوصیات میں توازن و اعتدال اور میانہ روی شامل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ حکیم کو الکتاب کے علاوہ المیزان بھی کہا گیا ہے اور مسلمانوں کو امّتِ وسط کے خطاب سے نوازا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا (البقرہ: ۱۴۳)

یعنی: "اور ہم نے تمھیں امّتِ وسط بنایا ہے"۔

مسلمانوں کو امّتِ وسط کہہ کر واضح کر دیا گیا ہے کہ درمیان کا راستہ اور اعتدال کا طریقہ ان کے نمایاں اوصاف میں شامل ہونا چاہیے۔ چناں چہ غلو سے پرہیز، انتہا پسندی سے گریز اور میانہ روی اسلام کی بنیادی تعلیمات میں شامل ہیں مسلمانوں کو صاف بتا دیا گیا کہ:

وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً اِلٰى عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا ○

(بنی اسرائیل: ۲۹)

یعنی: "نہ اپنے ہاتھ کو اپنی گردن سے باندھے رکھ نہ اس کو بالکل ہی کھول دے کہ بعد میں حسرت زدہ بن کر بیٹھا رہ جائے"۔

اس آیتِ پاک کا منشا یہ ہے کہ نہ تو آدمی اتنا کنجوس بن جائے کہ اللہ تعالیٰ کی عطا کی ہوئی دولت کو کسی چیز میں خرچ ہی نہ کرے اور اپنی، اپنے خاندان کی اور اپنے اعزا کی جائز ضروریات بھی پوری نہ کرے اور اپنے آپ کو اور اپنے متعلقین کو بلاوجہ تکلیف میں مبتلا رکھے اور نہ اتنا فراخ دست اور فضول خرچ ہو کہ جا اور بے جا خرچ کرے، نمود و نمائش میں پیسہ ضائع کرے اور آمدنی کا لحاظ کیے بغیر مصارف کو بڑھا لے۔ یہ دونوں طریقے غلط ہیں اور میانہ روی کے خلاف ہیں۔ دونوں صورتوں میں تکلیف ہے اور دونوں کا نتیجہ مایوسی اور تباہی ہے۔ بخل کی عادت انسان کو اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں سے لطف اندوز نہیں ہونے دیتی اور فضول خرچی سے بالآخر انسان

Marfat.com

تنگ دست ہو کر دوسروں کا محتاج ہو جاتا ہے۔ اسی لیے اعتدال اور میانہ روی کی تاکید فرمائی گئی ہے۔ سورۃ الفرقان میں ارشاد ہوتا ہے:

وَالَّذِينَ إِذَا أَنفَقُوا لَمْ يُسْرِفُوا وَلَمْ يَقْتُرُوا وَكَانَ بَيْنَ ذَٰلِكَ قَوَامًا ه (الفرقان: ۶۷)

یعنی: "اللہ کے نیک بندے وہ ہیں کہ جب خرچ کرتے ہیں تو نہ اسراف کرتے ہیں اور نہ بخل برتتے ہیں، بلکہ ان دونوں کے درمیان معتدل رہتے ہیں۔"

دیکھیے کتنی صاف ہدایت ہے اور کس قدر وضاحت سے سمجھا دیا گیا ہے کہ میانہ روی مومن کی صفت ہے۔ مومن نہ ضرورت سے زیادہ خرچ کرتا ہے اور نہ ضروری خرچ کے موقع پر ہاتھ روکتا ہے، بلکہ معتدل رہتا ہے اور میانہ روی کو اپنا کر زندگی کو حسن و خوبی سے گزارتا ہے۔

سرکارِ دو عالم ؐ کی حیاتِ طیبہ ہمارے لیے بہترین نمونہ ہے اور توازن و اعتدال کی اعلا ترین مثال بھی ہے۔ بعض صحابۂ کرام ؓ عبادت میں غلو برتنے لگے تھے اور پیرویِ حق کے جوش میں اعتدال کو نظر انداز فرمانے لگے تھے۔ آپ ؐ نے ان کو ٹوکا اور میانہ روی کی تلقین کی۔

ایک حدیث میں ہے کہ:

"اعتدال، یعنی ہر کام کو افراط و تفریط کے بغیر کرنا نبوّت کا پچیسواں حصہ ہے۔"

اسی طرح سرکار ؐ کا ایک اور ارشاد ہے:

لوگو! میانہ روی اختیار کرو، میانہ روی اختیار کرو، میانہ روی اختیار کرو، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نہیں تھکتا ہے، مگر تم تھک جاتے ہو۔

ہمارا دن رات کا مشاہدہ ہے کہ جو لوگ اعتدال کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیتے ہیں اور شدت اور انتہا پسندی کو اختیار کر لیتے ہیں، اُن کی زندگی سے اعتدال کے ساتھ ساتھ امن و سکون بھی رخصت ہو جاتا ہے اور ان کے معاملات اتنے اُلجھ جاتے ہیں کہ ان کی ساری قوتیں اور وقت کا بیشتر حصہ ان کے معاملات کو سلجھانے میں ہی صرف ہو جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ راحت سے محروم ہو جاتے ہیں۔ اس کے برعکس جو لوگ اپنے معاملے میں میانہ روی کو ملحوظ رکھتے ہیں وہ مصائب میں مبتلا نہیں ہوتے اور ان کے متعلّقین اور احباب بھی اُن سے شاکی نہیں ہوتے۔ میانہ رو افراد خود بھی پُرسکون زندگی گزارتے ہیں اور دوسروں کے بھی کام آتے ہیں۔

Marfat.com

میانہ روی سب کے لیے ضروری ہے اور ہر کام میں ضروری ہے۔ صرف دنیاوی معاملات اور معاشی مسائل ہی میں میانہ روی مفید نہیں ہے، بلکہ دینی معاملات میں بھی اعتدال مستحسن ہے۔

اب میں ایک اور نکتے کی طرف آپ کو متوجہ کرنا چاہتا ہوں۔ جب ہم یہ کہتے ہیں اور مانتے ہیں کہ اسلام دینِ فطرت ہے اور ایک مکمل نظام ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ بے اعتدالی سے، جو ایک غیر فطری کیفیت ہے، بچنا چاہیے اور اس طرح زندگی بسر کرنی چاہیے کہ جس میں حقوق اور فرائض کے درمیان توازن ہو۔ نہ اپنے فرائض کو فراموش کرنا یا اُن سے غفلت برتنی چاہیے اور نہ اپنے حقوق سے اپنے نفس کو محروم کرنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ سختی کو پسند نہیں فرماتا۔ اس نے اپنے دین کو آسان بنایا ہے تاکہ لوگ سختی اور شدّت سے گھبرا کر ترکِ دین پر مائل نہ ہوں۔

حضورؐ کا ارشاد ہے کہ:

استقامت اختیار کرو اور تم ہرگز احاطہ نہ کر سکو گے۔ جس قدر اعمال کی طاقت رکھتے ہو اُسی قدر کرو۔

شدّت اور غلو کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوتا ہے کہ آدمی چند دن تو جوش میں کثرت سے عبادت کرتا ہے، لیکن جوش ٹھنڈا ہو جانے پر سرے سے عبادت اور فرائض کو ترک کر دیتا ہے۔ اسی لیے ہدایت فرمائی گئی ہے کہ میانہ روی کے ساتھ عبادت کرو تاکہ اس پر قائم رہ سکو۔

ہمیں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اگر اللہ اور اس کے رسولؐ کے احکام کے مطابق زندگی گزاری جائے تو مسلمان کا ہر فعل عبادت ہے۔ نماز روزہ تو عبادت ہے ہی، لیکن اگر حدود اللہ کا خیال رکھا جائے تو ہمارا سونا جاگنا، اٹھنا بیٹھنا، پڑھنا لکھنا، ملنا ملانا، بیوی بچوں میں وقت گزارنا، روزی کمانا، خوش طبعی کرنا، غرض ہر کام عبادت ہے، اس لیے کسی ایک کام میں شدّت اور دوسرے کاموں میں غفلت کسی طرح اچھی اور مستحسن نہیں ہے۔ سرکارِ دو عالمؐ کا ایک اور نہایت جامع ارشاد ملاحظہ فرمائیے:

خَیْرُ الْاُمُوْرِ اَوْسَاطُھَا

یعنی "بہترین اعمال وہ ہیں جن میں اعتدال کو ملحوظ رکھا جائے۔"

احکامِ ربّانی اور ارشاداتِ نبوی بالکل واضح طور پر رہنمائی کرتے ہیں کہ اعتدال کی

Marfat.com

راہ اور میانہ روی اختیار کی جائے۔ اس کا اطلاق ہمارے سب ہی اعمال و افعال پر ہوتا ہے، ہماری عبادتوں پر بھی جس کا ذکر میں کر چکا ہوں اور ہماری روزمرہ کی زندگی پر بھی، مثلاً ہمیں اپنی بول چال اور گفت گو میں میانہ روی اختیار کرنی چاہیے۔ میانہ روی یہی ہے کہ ہم رات کو بعد نمازِ عشا جلد سو جائیں اور صبح فجر کی اذان کے وقت اٹھ جائیں۔ کھانے پینے میں بھی اعتدال کی ضرورت ہے۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ ہم بھوک اور ضرورت سے زیادہ کھا لیں اور نہ یہ مناسب ہے کہ جسم ضروری غذا پانی سے محروم رہ جائے۔

حاصلِ کلام یہ ہے کہ عافیت اور صحت اسی میں ہے کہ ہم اعتدال کا راستہ اور میانہ روی اختیار کریں۔

Marfat.com

اعتدال

قرآنِ مجید و فرقانِ حمید کتاب اللہ ہونے کی حیثیت سے ساکنانِ ارض کے لیے سب سے بڑی کتاب ہے، اور ایک دستورِ حیات ہونے کی حیثیت سے ایک ایسی کتابِ دستور ہے کہ اس کے بعد سچے انسان کو تلاش حقائق کے لیے پریشان ہونے کی ضرورت ہے نہ سرگرداں ہونے کی حاجت۔ حق کے متلاشیوں کو قرآنِ حکیم میں ہر چیز مل جاتی ہے۔ زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے کہ قرآن نے اس کے لیے رہ نمائی نہ عطا کی ہو۔ کرۂ زمین پر جن انسانوں نے قرآنِ کریم کی کرامت کو اور کتابِ عظیم کی عظمت کو اور صحیفۂ آسمانی کی رفعت کو سمجھا ہے اور قرآنِ مجید اور رضائے الٰہی کے سامنے سرِ تسلیم و رضا خم کیا ہے، سرفرازی اور سربلندی اُن کی قسمت ہوئی ہے، اور آج بھی متعدد اقوام و ملل نئے عنوانات کے ساتھ اس کتابِ حیات سے روشنی اور نور حاصل کر کے درخشاں و تابندہ ہیں۔ اور جنھوں نے اس نورِ مسلسل کی تابندگی سے صرفِ نظر کیا ہے اُن کی قسمت میں اقوامِ تابندہ کی بندگی لکھ دی گئی ہے اور ضلالت اور غلامی ان کا مقدر بن گئی ہے۔ یہ قانونِ قدرت ہے اور اٹل قانون ہے جس میں کبھی کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے، اور نہ اب ہو سکتی ہے اور نہ آئندہ تا قیامِ قیامت اس میں کوئی تبدیلی ہوگی۔

اس دنیا میں ایک پُرمقصد زندگی گزارنے کے لیے قرآنِ مجید نے ہر شعبۂ زندگی میں انسان کو رہ نمائی عطا کی ہے اور جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم ایک نمونۂ کامل واکمل کی حیثیت سے کل کائناتِ بشری کے لیے بھیجے گئے۔ قرآن اور رسول ؐ انسان کو اشرف المخلوقات قرار دیتے ہیں اور انسان کے جسم و صحت کی حفاظت پر بڑی واضح ہدایات اور نہایت صریح احکامات عطا فرماتے ہیں۔

اس وقت ہم قرآن حکیم کی ایک آیت پر غور کرتے ہیں:

وَلَا تُسْرِفُوْا اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ۔ (الانعام: ۱۴۱)

یعنی "بے اعتدالی نہ کرو۔ خدا بے اعتدالیاں کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔"

Marfat.com

ضروریات و خواہشات کی تکمیل کے بارے میں قرآنِ مجید کی یہ ہدایت حفظِ صحت کے سلسلے میں انتہائی ہمہ گیر اور جامع مفہوم کی حامل ہے۔ اس آیت کریمہ میں اعتدال پر انسان کو متوجہ کیا گیا ہے۔ اگر ہم غور کریں اور اپنی روزمرّہ کی زندگی پر ایک امتحانی نظر ڈالیں، اور اپنے اعمال و افعال کا ایک تنقیدی جائزہ لیں تو اس آیتِ قرآنی کا مفہوم سمجھنا ہمارے لیے ذرا بھی مشکل نہیں ہے۔

آپ کھانے پینے پر غور کیجیے۔ اگر لذیذ اور عمدہ کھانا سامنے آگیا ہے تو کتنے انسان ہیں کہ دامنِ احتیاط پکڑ کر راہِ اعتدال پر چلتے ہیں؟ اور کتنے انسان ہیں کہ جو اپنے معدے کی گنجائش کا اور اپنی قوتِ ہضم کا جائزہ لے کر کھانے سے اس وقت ہاتھ کھینچ لیتے ہیں کہ جب ابھی معدے میں کھانے کی گنجائش موجود ہو!

ہم سب خوب جانتے ہیں کہ انسان پر لذت غالب آجاتی ہے اور اعتدال کا مفہوم اوجھل ہو جاتا ہے اور وہ اس حقیقت اور اس حدیثِ رسول کو فراموش کر دیتا ہے کہ "اَلْمَعِدَۃُ بَیْتُ الدَّاءِ" یعنی معدہ بیماریوں کا گھر ہے۔ اور پھر انسان نہ صرف بدہضمی کا شکار بن جاتا ہے، بلکہ اپنی صحت کے لیے خطرات مول لے لیتا ہے اور اپنی عافیت تک سے صرفِ نظر کر لیتا ہے۔

پینے کا حال بھی کھانے سے مختلف نہیں ہے۔ انسان ذوق و شوق میں نہ جانے کیا کیا پی رہا ہے اور اُسے اعتدال کا ذرا بھی پاس ہے نہ لحاظ۔ ایک طرف اس کا حال یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے اس حکم کو بھول جاتا ہے کہ:

وَکُلُوْا مِمَّا رَزَقَکُمُ اللّٰہُ حَلٰلًا طَیِّبًا (المائدہ: ۸۸)

یعنی: "حلال اور پاک چیزیں کھاؤ۔"

اور دوسری طرف اس کی کیفیتِ فہم کا یہ عالم ہے کہ وہ ذرا بھی اس پر غور نہیں کرتا کہ وہ جو پی رہا ہے اور پینے کھانے پر جو خرچ کر رہا ہے خود وہ اور اُس کا ملک اُس کا متحمل بھی ہے یا نہیں۔ ماکولات و مشروبات کی جو انواع و اقسام کثیر زرِ مبادلہ خرچ کر کے ہم نے اپنے لیے فراہم کر لی ہیں، غور کرنے کی چیز یہ ہے کہ کیا وہ ہماری حقیقی ضرورتیں ہیں یا تکلفاتِ محض؟ سمجھنے کی چیز یہ بھی ہے کہ ان کا فائدہ ہمارے جسم کو پہنچ رہا ہے یا وہ لوگ ان حقیقی فوائد سے متمتع ہو رہے ہیں جو ان کے موجد ہیں اور ہمیں بھجوانے والے ہیں۔ اس صورتِ حال پر ذرا گہرائی کے ساتھ غور کیجیے اور دوبارہ اس پوری آیت

Marfat.com

پر غور کیجیے کہ:

كُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا (الاعراف: ۳۱)

"کھاؤ پیو مگر بے اعتدالی نہ کرو" کیوں کہ

اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ (الاعراف: ۳۱)

"خدا بے اعتدالیاں کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔"

کھانے پینے کے بارے میں ان کلماتِ چند سے صحیح بات سامنے آجاتی ہے کہ ہمیں اعتدال کو ہمیشہ ملحوظ رکھنا چاہیے۔ ہمیں زندہ رہنے کے لیے کھانا پینا چاہیے، نہ کہ کھانے پینے کے لیے زندہ رہنا۔ یہ نہ صرف ہماری صحت کے لیے ضروری ہے، بلکہ ہماری ملّی اور ملکی عافیت کا تقاضا بھی یہی ہے کہ ہم حدودِ اعتدال سے باہر قدم نہ رکھیں اور اس حقیقت کو پوری طرح ذہن میں رکھ لیں کہ بھوک سے زیادہ کھانے والے کو اللہ تعالیٰ پسند نہیں فرماتا۔ مشہور قول ہے:

اِنَّ اللّٰهَ يُبْغِضُ الْاَكْلَ فَوْقَ شِبْعِهٖ

ہادیٔ برحق جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحت کو عظیم نعمت قرار دیا ہے اور حفظِ صحت کی ہدایت فرمائی ہے۔ اپنی صحت کی حفاظت انسان کا حق بھی ہے اور فرض بھی۔ صحت کی حفاظت انسان کی ذاتی ضرورت بھی ہے اور قومی اور ملی حاجت بھی ہے۔ ذاتی اس لیے ہے کہ اگر وہ بیمار ہے تو اپنے فرائض ادا نہیں کر سکتا اور اپنی صحت کو پُر مسرت نہیں بنا سکتا ہے، کیوں کہ صحت ہی سب سے بڑی مسرت ہے۔ جو انسان نعمتِ صحت سے محروم ہو گیا سمجھ لینا چاہیے اور یقین کر لینا چاہیے کہ وہ ہر مسرت سے محروم ہو گیا۔

صحت، ملکی اور قومی ضرورت اس بنا پر ہے کہ قوم کے بیمار اور صحت سے محروم افراد ایک صحت مند قوم اور تن درست ملت نہیں بنا سکتے اور ایک ایسی قوم جو مجموعی طور پر بیمار اور نحیف و نزار ہو نہ صرف یہ کہ کرۂ ارض پر اپنی حقیقت کو تسلیم نہیں کرا سکتی، بلکہ اپنے وجود کو بھی باقی نہیں رکھ سکتی، زمانے کے تھپیڑے اسے خس و خاشاک کی طرح اڑا دیں گے۔

اگر مسلمان صحت مند نہیں ہے اور ملّتِ اسلامیہ بیمار ہے تو باور کرنا چاہیے کہ یہ سب سے بڑا عذاب ہے۔ اس کا صریح مطلب یہ ہو گا کہ صحت مند اور طاقت ور اقوام

Marfat.com

اپنی جسمانی طاقت اور اپنی صحت مند صلاحیت کی بنا پر اس پر غلبہ پالیں گی اور اعلاءِ کلمۃ الحق والی امت اپنے حقیقی فرائض کی ادائی سے محروم ہو جائے گی اور اس کی بیماری اسے افکارِ غیر تک قبول کرنے پر مجبور کر دے گی۔ اب ضرورت ہے کہ ہم اپنی صحت کو حقائق کے اس آئینے میں بھی دیکھیں اور من حیث القوم حفظِ صحت پر توجہ کریں۔

میں نے ابھی کہا ہے کہ حفظِ صحت آپ کا ذاتی معاملہ بھی ہے اور ایک فریضۂ قومی بھی۔ آپ کی صحت اور صحتِ ملّی لازم و ملزوم ہیں۔ میں آپ کو اس طرف متوجہ کرنا چاہتا ہوں کہ ہماری ملّت میں بے شمار افراد ایسے ہیں کہ جو اصول حفظِ صحت کا مفہوم نہیں سمجھتے۔ ان کی اس لاعلمی نے اُن کو اور اُن کے گھر کو بیماریوں کی آماج گاہ بنا رکھا ہے۔ ضرورت ہے کہ آپ اِن افرادِ ملّت پر توجّہ کریں اور صحت کی باتیں اُن تک پہنچا دیں۔ یہ ایک مقدّس فریضہ ہے اور افرادِ ملّت کو یہ مقدّس فریضہ ضرور ادا کرنا چاہیے۔

مجھے اس وقت حضرت داؤد علیہ السّلام کا ایک بڑا اچھا قولِ صحت یاد آیا ہے، میں اسی پر اپنے اس خطاب کو ختم کرتا ہوں:

الصِّحَّةُ تَاجٌ عَلٰی رُءُوسِ الاَصِحَّاءِ لَا يَرَاهُ اِلَّا الْمَرْضٰى

اس قولِ داؤدؑ کا مطلب یہ ہے کہ صحت ایک ایسا تاج ہے جو صحت مندوں کے سر پر ہوتا ہے، مگر یہ صرف مریضوں کو نظر آتا ہے۔

Marfat.com

غم خواری و ہمدردی

ہمدردی و غم خواری انسانیت کے ایسے اوصاف ہیں کہ ان کے ذریعہ سے ہر معاشرے میں محبت و الفت کا جذبہ کارفرما نظر آتا ہے۔ اسی کے ذریعہ سے ایک کامیاب معاشرہ اس طرح افراد کو ایک دوسرے سے مربوط رکھتا ہے جس طرح دیوار کی اینٹیں ایک دوسرے کو سہارا دیے رہتی ہیں۔ ایک کامیاب، خوش حال اور ترقی یافتہ معاشرے کی پہچان یہی ہے کہ افراد ایک دوسرے کے ساتھ ہمدردی اور باہمی دوستی و محبت کا برتاؤ کریں۔ ایک دوسرے کے کام آئیں۔ ایک کی تکلیف کو دوسرا اپنی تکلیف سمجھ کر اسے دور کرنے کی کوشش کرے۔ بیمار کی تیمارداری کرے، مستحق افراد کے ساتھ فیاضانہ سلوک کرے تاکہ معاشرے کے کسی طبقہ میں محرومی کا احساس پیدا نہ ہو۔ اور مشکلات ایسی نہ ہو جائیں جن کا حل نہ مل سکے۔

ایک دوسرے کے کام آنا ہمدردی ہے، لیکن ہمدردی کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ وہ بے لوث اور بے غرض ہو۔ اگر ایک شخص دوسرے کے ساتھ اس لیے ہمدردی کرے کہ آئندہ اس سے بہتر بدلہ ملنے کی امید ہو یا وہ ہمدردی کے بدلے احسان مندی اور شکر گزاری کا اظہار کرے گا یا اس کی ہمدردی کا لوگوں میں چرچا ہوگا اور اس کی عزت میں اضافے کا سبب ہوگا، تو ایسی ہمدردی اسلامی شریعت میں مطلوب نہیں ہے۔ اسلامی ہمدردی کا جذبہ محض اس لیے ابھرنا چاہیے کہ اس کا مقصد خالقِ کائنات کی خوشنودی اور ضمیر کی طمانیت ہو۔ انسان جب کسی کے ساتھ بے لوث ہمدردی کرتا ہے تو اسے ایک عجیب روحانی لذت اور خوشی حاصل ہوتی ہے۔ یہی لذت و مسرت ہمدردی کا مقصدِ اعظم ہونا چاہیے۔

احادیث میں آیا ہے کہ ایمان کی علامت یہ ہے کہ جب کوئی نیکی کرے تو اسے فرحت و انبساط حاصل ہو اور جب کوئی گناہ سرزد ہو تو اس کا ضمیر اسے ملامت کرے۔

ہمدردی خوش حال معاشرے کی بنیاد ہے۔ انسانی ترقی کی جان ہے۔ قومی سربلندی کا وسیلہ ہے۔ کوئی قوم دنیا میں ترقی کا وہ مقام حاصل نہیں کر سکتی جو ترقی یافتہ قوموں نے کسی دور میں بھی حاصل کیا ہے جب تک اس کے افراد میں باہمی ہمدردی کا جذبہ کارفرما نہ ہو۔ جب

Marfat.com

مسلمانوں میں آپس کی ہمدردی اور اخوت کا جذبہ پیدا ہوا تو وہ دنیا کی ترقی یافتہ قوم بن گئے۔ آج امریکا اور یورپ میں جو شاندار مادی ترقی ہوتی ہے وہ بھی بڑی حد تک باہمی ہمدردی کے جذبہ ہی کی مرہون منت ہے۔

ہمدردی ہی کی بلند ترین صورت ایثار ہے۔ ہمدردی کا مطلب یہ ہے کہ ہم اپنے کھانے میں دوسرے بھوکے پڑوسی کو شامل کر لیں، لیکن ایثار کا مطلب یہ ہے کہ ہم اپنا پورا کھانا بھوکے کو کھلا دیں اور خود بھوکے سو رہیں۔ ہمارے پاس جو دولت ہے اس میں سے اگر ہم اپنے بھائیوں پر بھی خرچ کریں تو یہ ہمدردی کی مثال ہوگی، لیکن حاتم طائی کی سی مثالی فیاضی نہ ہوگی کہ سب کچھ اپنے بھائیوں کے حوالہ کر کے خود اللہ پر بھروسا کر کے بیٹھ رہیں۔ یہ ایثار ہے۔ ایک پیاسا اگر دوسرے پیاسے کو آدھا گلاس پانی دے اور خود آدھے ہی گلاس پر قناعت کرے تو یہ ہمدردی کی مثال ہوگی، لیکن اگر پورا گلاس ہی دوسرے کے حوالے کر دے تو یہ ایثار کی مثال ہوگی۔

غرض ایثار فیاضی کا سب سے بڑا اور سب سے آخری درجہ ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ دوسروں کی ضرورتوں کو اپنی ذاتی ضرورت پر مقدم رکھا جائے۔ خود بھوکا رہے اور دوسروں کو کھلائے۔ خود تکلیف اٹھائے اور دوسروں کو آرام پہنچائے۔

قرآنِ کریم نے حضورؐ کے صحابہ کرامؓ کی اس اخلاقی عظمت کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا ہے:

ویؤثرون علی انفسھم ولو کان بھم خصاصہ (سورہ حشر: ۹)

یعنی: "وہ اپنی تنگ دستی اور غربت کے باوجود اپنے اوپر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں"

صحابہ کرامؓ پر آں حضرتؐ کی تربیت کا یہ اثر ہوا تھا کہ سب کے سب ایثار کے شاندار نمونے بن گئے تھے۔ چناں چہ جب مکہ کے مسلمان مہاجرین مدینہ منورہ تشریف لائے تو مدینہ کے انصار نے ان کو اس طرح ہاتھوں ہاتھ لیا کہ اس کی مثال انسانی تاریخ میں شاذ و نادر ہی ملے۔ انصار نے ان کو اپنے گھر دیے۔ باغ دیئے، کھیت دیے، اپنی محنتوں میں ان کو شریک کیا اور خود ہر طرح کی تکلیفیں اٹھا کر انھیں آرام پہنچایا۔ پھر جب بنی نضیر کی زمین مسلمانوں کے ہاتھ آگئی اور حضورؐ نے دو انصاریوں کے سوا باقی ساری زمین مہاجروں کو دے دی تو انصار کی پیشانیوں پر کوئی بل نہیں آیا۔ ان کا یہ غیر معمولی ایثار خود اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں ایسا پسندیدہ ثابت ہوا کہ سورۂ حشر میں خاص طور پر ان کی مدح و ستائش کی گئی۔

ایک دفعہ ایک بھوکا آدمی رسول اللہؐ کی خدمت میں آیا۔ اتفاقاً اس وقت پانی کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس لیے آپؐ نے فرمایا جو شخص آج کی رات اس کو اپنا مہمان بنائے گا اللہ تعالیٰ اس پر رحم کرے گا۔

Marfat.com

آخر یہ سعادت ایک انصاری صحابیؓ کو حاصل ہوئی۔ وہ اسے اپنے گھر لے گئے۔ اتفاقاً ان کے گھر میں بھی کچھ نہ تھا۔ چناں چہ بچوں کو بھوکا سلادیا اور خود میاں بیوی بھوکے رہ گئے اور جو کچھ مختصر سا کھانا تھا وہ مسافر کو کھلا دیا۔ صبح کو جب وہ صحابیؓ رحمتِ عالمؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپؐ نے اللہ کی خوش نودی کی بشارت دی۔

صدرِ اول کے اکثر مسلمان ایثار کی ایسی مثال قائم کر گئے کہ اب تک عقل حیران ہے کہ حضورؐ کی تربیت نے کس طرح ان کی کایا پلٹ دی تھی۔ خود تکلیف اٹھاتے دوسروں کو آرام پہنچاتے۔ خود بھوکے رہتے اور مہمانوں اور مسافروں کو کھانا کھلاتے۔ یہ امر نسبتاً آسان ہے کہ ابنائے جنس کے ساتھ ہمدردی ہو، لیکن اپنے محدود وسیلے کو دوسروں پر خرچ کر دینا اور خود اللہ پر بھروسا کرنا اور خالص توکل اختیار کیے رہنا اور لطف یہ کہ پیشانی پر نہ بل آئے نہ کسی سے اس کا تذکرہ ہو، ایثار ہی کی مثال ہے۔

جنگ بدر کے بعد مکّہ والوں کو جب قیدی بنایا گیا اور انھیں صحابۂ کرامؓ کے حوالے کیا گیا تو ان کے ایثار، فیاضی اور ہمدردی کے ایسے حیرت انگیز مرقعے نظر آئے جنھیں ہم انسانیت کا اعلیٰ جوہر کہہ سکتے ہیں۔ ذرا غور تو کیجیے، دشمن اور وہ بھی کفار، جب ان کی حفاظت میں آئے تو بعض ایسے صحابی جن کی معاشی حالت بہت اچھی نہ تھی خود معمولی کھانا کھاتے اور قیدیوں کو اچھا کھانا کھلاتے۔ گویا قیدیوں کے آرام کا اس طرح خیال رکھتے تھے جیسے ان کے مہمان ہوں۔ آج بیسویں صدی میں بھی جنگی قیدیوں کے ساتھ ایسا حسنِ سلوک نہیں کیا جاتا اور نہ ان کے معاملہ میں کسی قسم کی ہمدردی یا غم خواری اور ایثار کی مثالیں سننے میں آتی ہیں۔

ہمدردی اور ایثار کے سلوک کے لیے حضورؐ نے حسنِ تربیت سے صحابۂ کرامؓ میں جیسی آمادگی پیدا کر دی تھی اور جس کا مظاہرہ اسیرانِ بدر کے معاملے میں ہوا، اس پر آج کی ترقی یافتہ دنیا بھی انگشت بہ دنداں ہے۔ اس سے یہ بات خود بخود عیاں ہو جاتی ہے کہ مسلمان دوسرے مسلمان کو تو اپنا بھائی سمجھتا ہی تھا، لیکن عام انسانی ہمدردی میں کفر و اسلام کی تفریق بھی ختم ہو جاتی تھی ورنہ یوں مسلمان بھائیوں کے ساتھ ایثار و ہمدردی و غم خواری تو ایمانی شعار بن چکی تھی۔

آج ہم مسلمان آپس میں غم خواری و ہمدردی اور ایثار کا ایک دوسرے کے ساتھ سلوک کریں تو ہمارا معاشرہ بھی دنیا کا بہترین معاشرہ بن جائے۔ آئیے دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ہم پاکستانیوں کے دلوں میں ہمدردی اور ایثار کے جذبات پیدا کر دے۔

Marfat.com

ہمدردی اور ایثار

اللہ تبارک و تعالیٰ نے موجودات کو کس انداز سے پیدا فرمایا اس کے لیے ہم قرآنِ مجید و فرقانِ حمید کی تین آیتوں پر غور کرنا چاہتے ہیں۔

الَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰی ۝ وَالَّذِیْ قَدَّرَ فَهَدٰی ۝ (اعلیٰ: ۲-۳)

یعنی: "وہ خالق حقیقی جس نے ہر چیز پیدا کی پھر اس میں مکمل مناسبت و ہم آہنگی پیدا کر دی اور وہ جس نے ہر وجود کے لیے قدر مقرر کی پھر اس پر (زندگی کی) راہ کھول دی۔"

صُنْعَ اللّٰهِ الَّذِیْۤ اَتْقَنَ كُلَّ شَیْءٍ (النمل: ۸۸)

یعنی: "یہ اللہ کی کاریگری ہے کہ اس نے ہر چیز کمالِ درستی اور استواری کے ساتھ بنائی۔"

وَخَلَقَ كُلَّ شَیْءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِیْرًا ۝ (الفرقان: ۲)

یعنی: "اور اس نے ہر چیز کو پیدا کیا، اس میں صحیح تناسب اور توازن کو ملحوظ رکھا۔"

پس جو خالق دو جہان ہر چیز کو کمالِ درستی اور کمالِ صحت کے ساتھ بناتا ہے وہ انسان کا بھی خالق حقیقی ہے اور وہ انسان کو عقل اور وصفِ صنعت و ایجاد عطا کر کے اپنا نائب مقرر کرتا ہے اور اشرف المخلوقات قرار دیتا ہے، یعنی تمام مخلوقات میں انسان کو سب سے اچھا قرار دیتا ہے۔ انسان کا یہ مقامِ شرف و بلند یقیناً محض اس لیے متعین نہیں ہوا ہے کہ وہ سیدھا ہے اور تمام مخلوق ٹیڑھی ہے اور نہ انسان کا یہ وصف فقط اس وجہ سے ہو سکتا ہے کہ وہ صنعت و ایجاد پر قدرت رکھتا ہے بلکہ انسان تمام مخلوقات میں اشرف اور اچھا اس لیے ہے کہ اس میں ایسی صفات بھی ہیں جو دوسری مخلوقات میں موجود نہیں ہیں۔

انسان کی بہت سی تعریفیں کی گئی ہیں۔ ماہرینِ علوم و فنون نے انسان کا تعارف مختلف پیرایوں اور مختلف انداز و الفاظ میں کرایا ہے، مگر حقیقی اور سچی تعریف یہ ہے کہ انسان اس مخلوق کا نام ہے جو کسی دوسرے کو تکلیف میں دیکھے اور اذیت پاتے یا کسی مصیبت و پریشانی میں مبتلا دیکھے تو اس کا دل متاثر ہو اور رحم سے پسیج جائے

Marfat.com

اور اس کی سب سے بڑی اور پہلی خواہش یہ ہو کہ جس ذریعہ سے ممکن ہو اُسے تکلیف سے بچالے۔

میرے نزدیک یہی جذبۂ رحم و ترحّم جسے میں انسان کا ایک لازمی خاصہ سمجھتا ہوں اور جسے انسانیت کا جزوِ اعظم سمجھتا ہوں ہمدردی کہلاتا ہے اور جب یہ جذبۂ ہمدردی اس حد تک بڑھ جائے کہ انسان دوسروں کو خود پر ترجیح دینے لگے اور اپنے ذاتی مفادات سے صرفِ نظر کر کے اور اپنی ضروریات اور اپنی خواہشات کو بھول کر دوسروں کے کام آنے پر خود کو آمادہ و تیار کرے تو یہ ایثار کہلاتا ہے۔ یہ صفات یعنی ہمدردی و خلوص اور ایثار ایک دوسرے کی تکمیل کرتی ہیں اور انسان کی انسانیت کو مکمل کرتی ہیں۔

ہم مسلمان ہیں۔ ہم بس اللہ تعالیٰ کو خالقِ دو جہاں تسلیم کرتے ہیں اور جنابِ محمّد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی آخر الزمان۔ اللہ تعالیٰ کی کتاب قرآن کریم اور جناب رسولؐ کی سنّت و حدیث ہمارے لیے حرفِ آخر ہیں اور ہم اپنی زندگی کا اصول مقرر کرنے کے لیے اور زندگی کا ضابطہ اور نمونہ بنانے کے لیے صرف کتاب و سنّت ہی سے روشنی حاصل کرتے ہیں، کیوں کہ ہم جانتے ہیں اور آج کی دنیا کا ہر انسان جانتا ہے اور تسلیم کرتا ہے کہ قرآن و حدیث نبوی نے اس دنیا میں رہنے کے جو اصول و ضوابط اور قاعدے مقرر کر دیے ہیں ان سے بہتر و بلند ہرگز کوئی دوسرا ضابطۂ حیات اس دارِ فانی میں موجود نہیں ہے۔

ہمارا موضوع ہے ایثار و ہمدردی اور ہم یہ دیکھتے ہیں کہ قرآنِ حکیم اس موضوع پر ہر انداز و بیان سے ہماری رہنمائی کرتا ہے اور پھر جب ہم شارحِ قرآن حضور اکرمؐ کی حیاتِ طیّبہ پر کسی بھی حیثیت سے نظر ڈالیں تو آپؐ کی ساری زندگی ایثار و محبّت، خلوص و ہمدردی اور قربانی سے عبارت ملتی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ہادیِ برحقؐ جب علم و ہدایت لے کر نکلتے ہیں تو ایک بات بھی ایسی نہیں ارشاد فرماتے کہ جس پر خود عامل نہ ہوں۔ ایثار و قربانی کی جب دعوت دیتے ہیں تو خود آپؐ کے پیٹ پر پتھر بندھے ہوتے ہیں اور آپؐ دوسروں کے لیے غذا کا سامان کرتے ہیں۔ ہمدردی کا جب درس دیتے ہیں تو خود مجسّم نمونۂ ہمدردی ہوتے ہیں۔ انسان تو انسان آپ کو یہ تک گوارا نہیں ہوتا تھا کہ قافلے کا ایک جانور بھی تکلیف میں ہو۔ اونٹ کی خالی کوکھ دیکھ کر ارشاد فرماتے ہیں:

Marfat.com

لوگو! اِن بے زبانوں کے بارے میں خدا سے ڈرو۔ اور ہدایت فرماتے ہیں کہ جب تم کسی جانور پر سفر کرو اور ایسے مقام سے گزرو جہاں اس کا چارا گھاس وغیرہ ہو تو اسے مہلت دو کہ کھالے اور جب کسی صحرا سے گزرو تو تیزی سے راستہ طے کرو کہ جانور زیادہ بھوکا پیاسا نہ رہے۔ خلوص و محبّت کا جب سبق دیتے ہیں تو سراپا اخلاص ہوتے ہیں۔ آپؐ کی رفعتِ خلوص کا اس سے زیادہ ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ دنیا کا ہر سچّا انسان آپؐ سے محبّت کرتا ہے۔ آں حضرتؐ نے اپنے مسلسل عمل سے سراپا ایثار اور ہمدرد اصحاب اس قدر کثیر تعداد میں پیدا کر دیئے کہ دنیا کبھی ان سے خالی نہیں ہو سکتی۔ حتیٰ کہ خود قرآن صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے جذبۂ ایثار کو سراہتا ہے:

وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۚ (الحشر: ۹)

یعنی: "اور یہ لوگ دوسروں کو خود پر ترجیح دیتے ہیں خواہ خود بھوکے سو جائیں۔"

ہمدردی اور خلوص اور ایثار وہ اعلا صفات ہیں جو انسان کو اشرف المخلوقات بنانے کی تکمیل کرتی ہیں۔ اگر کوئی انسان ان دونوں صفتوں سے محروم ہے اور ایک دوسرے کا ہمدرد نہیں ہے تو وہ ہرگز انسانِ کامل نہیں ہو سکتا، بلکہ ایک معاشی حیوان سے زیادہ اس کی کوئی حقیقت نہیں رہ جاتی۔

کتاب و سنّت نے ایثار و خلوص اور ہمدردی کو انسانیت کی بلندیاں، بلکہ خاصۂ انسانیت قرار دیا ہے۔ ہر مسلمان ایثار پیشہ اور مخلص بنا اور یہی انفرادی ایثار و خلوص فلاحِ عام بنا۔ تاریخ اسلام اس پر گواہ ہے کہ جب تک مسلمانوں کا یہ وصف و خاصّہ رہا ان کے ہاں اور ان کی ہر سوسائٹی اور ان کے ہر ملک میں خیر و فلاح کا دور دورہ رہا۔ اگر آج یہ صورت حال نہیں ہے تو اس کی وجہ بس یہی ہے کہ ہم میں سے ہر شخص نفسا نفسی میں مبتلا ہو چکا ہے۔ ایک انسان پیٹ بھر کر کھانا کھا رہا ہے اور اس کا پڑوسی فاقہ کر رہا ہے۔ ایک طبقہ ہے کہ دادِ عیش دے رہا ہے اور ایک طبقہ ہے کہ مشقّت کی چکّی میں پس رہا ہے۔ ایک کھیت میں پانی کی فراوانی ہے، مگر دوسرا سوکھ رہا ہے اور کسی کو اس صورتِ حال سے ہمدردی نہیں ہے۔ ایک طبقہ علاج معالجے کی فراوانی سے فائدہ اٹھا رہا ہے اور ملک کی بڑی اکثریت اس سہولت سے محروم رکھی جا رہی ہے۔ جو معاشرہ انسانیت کی ان پستیوں میں چلا جائے اگر وہاں افراتفری پیدا ہو جائے

Marfat.com

اور اگر وہاں انتشار و افتراق کا دور دورہ ہو جائے تو اس میں کون سی تعجّب کی بات ہے۔

زندگی کے ہر شعبے میں ہماہمی اور نفسا نفسی کا جو بازار آج گرم ہے اُس کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے کہ ایثار و ہمدردی جیسے بلند و ارفع اور بنیادی اوصافِ انسانی کو ہم نے پسِ پشت ڈال دیا ہے۔ ہمیں اس کے اسباب پر غور کرنا چاہیے کہ ملک میں ایک صنعت کار صنعتوں کے گروپ پر گروپ بنا رہا ہے اور دوسرا انسان سڑک پر سڑے ہوئے پھلوں کے کچالو بنانے پر کیوں مجبور ہے۔ اس غیر اسلامی صورتِ حال میں توازن پیدا کرنے کے لیے ایثار و ہمدردی کے جذبات کو بروئے عمل لانا چاہیے اور سمجھنا چاہیے کہ انفرادی خلوص فلاحِ عام بن جاتا ہے اور اپنے نفس کی قربانی میں وہ حقیقی معجزہ ہے کہ جس سے تمام معجزے ظہور میں آتے ہیں اور ہمیں یہ بھی فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ اگر خلوص مفقود ہو جائے گا تو طاقت ناپید ہو جائے گی، وہ طاقت جس سے دنیائے اسلام آج محروم ہے۔

لہٰذا اگر معاشرے کو پُرسکون بنانا ہے اور عزّتِ نفس کے ساتھ زندگی بسر کرنا ہے تو ہم میں سے ہر ایک کو ایثار پیشہ بننا چاہیے اور ہم میں سے ہر شخص کو ایک دوسرے کا ہمدرد ہونا چاہیے۔

میں اپنے کلمات کو ایک حدیث نبوی پر ختم کرتا ہوں:

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تری المومنین فی تراحمھم و توادھم و تعاطفھم کمثل الجسد الواحد اذا اشتکی منہ عضو تداعی لہ سائر الاعضاء بالسھر والحمّٰی (متفق علیہ)

یعنی: "تم اہلِ ایمان کو آپس میں ایک دوسرے سے رحم و ہمدردی کا برتاؤ کرتے ہوئے اور ایک دوسرے سے محبّت کرتے ہوئے دیکھو گے تو تم خیال کرو گے کہ یہ سارے کے سارے گویا جسدِ واحد ہیں کہ اگر جسم کا کوئی ایک حصّہ بھی کسی تکلیف میں ہو تو سارا جسم بخار اور بے خوابی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔"

Marfat.com

ایک دوسرے کی مدد

اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت ایسی بنائی ہے کہ اپنے ابنائے جنس کی مدد کرنے اور ان کے کام آنے کی خواہش خود اس کے اندر موجود ہے۔ اس کے ساتھ ہی فطری طور پر اور جبلّی طور پر انسانی ضروریات اور زندگی کے تقاضے ایسے ہیں کہ آدمی بڑی حد تک دوسروں کے تعاون اور اپنے ہم جنسوں اور اپنے ہم نفسوں کی مدد کا محتاج ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ باہمی تعاون کا، آپس میں ایک دوسرے کی مدد کرنے کا اور ایک دوسرے کے کام آنے کا جذبہ ایک فطری اور جبلّی انسانی تقاضا ہے۔ انسان کو انسان بنانے، اور بنائے رکھنے، اور اسی طرح اس کی حیاتِ انفرادی نیز اجتماعی زندگی کی تشکیلِ نو اور برقراری میں یہ جذبہ اساسی اہمیت رکھتا ہے۔ انسان اگر اس فطری جذبے سے اور اس جبلّی تقاضے سے محروم ہوتا تو رنگ و بو سے بھرپور اس دنیا کا وجود ہی نہ ہوتا۔

ہم میں سے ہر ایک جانتا ہے کہ جو لوگ ایک دوسرے کی مدد کرنے کے فطری جذبے کی آب یاری اور اس مقدس جذبے کی پرداخت سے محروم رہ جاتے ہیں زندگی کی بہاریں ان کے لیے خزاں کے مترادف ہوتی ہیں، اور وہ اس معمورۂ ہستی اور اس بھری پُری دنیا میں رہنے کے باوجود حقیقتاً تنہا زندگی گزارتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ ہم میں سے ہر ایک کو اس عذابِ دنیا سے محفوظ رکھے۔

دراصل تعاونِ باہمی اور ایک دوسرے کے کام آنے اور ایک دوسرے کی مدد کرنے کا جذبہ ہی اس دنیا کی بہار اور اس کی ساری رونقوں کا حقیقی سبب ہے، اور نہ صرف یہ بلکہ انسان کی بہت سی صلاحیتیں صرف اسی لیے ابھری اور پروان چڑھی ہیں کہ وہ اپنی زندگی کو اور اپنی صلاحیتوں کو دوسروں کے لیے نفع بخش اور کار آمد بنانا چاہتا ہے۔

یہ جذبۂ خدمتِ خلق، جو انسان کے لیے فطرت کا سب سے بڑا اور سب سے زیادہ کار آمد عطیہ ہے، انسان کی سیرت و کردار اور اس کی شخصیت کی تعمیر میں اس طرح بھی حصّہ لیتا ہے کہ دوسروں کی مدد کرنے اور ان کے کام آنے کی نیک خواہش اسے خود غرضی کی دنائت اور اپنی

Marfat.com

ذات کے خول میں بند ہو کر رہ جانے کی پستی سے بچاتی ہے۔

آپ انسان کی تاریخ کا مطالعہ کریں اور انسانوں کی زندگیوں کو اپنے مطالعے کا موضوع بنائیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ گلشنِ ہستی کے سب سے نمایاں، سب سے زیادہ خوش بودار، دل آویز اور حیات بخش پھول وہی ہیں جنھوں نے اپنی زندگی کو دوسرے انسانوں کی خدمت اور مدد کے لیے وقف کر دیا۔ سب سے زیادہ تابناکی ان ہی کے نصیب میں آئی ہے جنھوں نے دوسروں کے لیے چراغ روشن کیے۔ سب سے زیادہ نام ور وہی ٹھہرے جنھوں نے خلقِ خدا کی خدمت گزاری کی مصروفیت میں خود کو بھلا دیا۔ جنھوں نے اوروں کی ضروریات اور احتیاجات کی تکمیل میں اپنے آپ کو نظر انداز کیا، وہی آسمانِ دنیا کے جگمگاتے تارے بنے۔ گویا انسانیت کی تاریخ میں سب سے زیادہ روشن ابواب وہ ہیں جو "وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ہ" کی تفسیر تھے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے پسندیدہ بندوں کی اس سرشت کی جانب اشارہ فرمایا ہے کہ وہ اللہ کی دی ہوئی صلاحیتوں اور اس کے بخشے ہوئے عطایا اور اس کے عنایت کیے ہوئے ہدایا کو دوسروں کے لیے صرف کر دیتے ہیں۔

انسانی زندگی کی بعض ضرورتیں اور ایسے مواقع جن میں انسان کو دوسرے کی مدد درکار ہوتی ہے، مختلف قسم کے ہیں۔ ان میں سے بعض تو وقتی اور عارضی ہوتے ہیں اور کچھ ان سے قدرے زیادہ اور بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جو ساری زندگی یا اس کے بڑے حصے سے تعلق رکھتے ہیں۔ پھر بعض تقاضے اور ضرورتیں انفرادی نوعیت کی ہوتی ہیں اور کچھ انسانوں کے ایک بڑے گروہ سے متعلق ہوتی ہیں، اور بعض کا تعلق ساری انسانیت سے ہوتا ہے۔ ان صورتوں اور ان تقاضوں میں زمانے کے پھیلاؤ اور اطلاق کی وسعت کے لحاظ سے سب سے اہم وہ تقاضے ہیں جن کا تعلق ساری نوعِ انسان سے اس حد تک ہے کہ ان کی وسعت میں دنیا اور آخرت دونوں آ جاتے ہیں۔ یوں کہیے کہ اس لحاظ سے ان کی وسعت لامحدود و بے نہایت ہے۔

اب دیکھیے کہ اللہ کے جن بندوں نے انسانوں کی اس ضرورت کی تکمیل کے لیے سب کچھ قربان کر دیا وہ کون ہیں؟ اس سوال کے جواب میں، میں اور آپ ہی نہیں ساری دنیا متفق و یک زبان ہے کہ یہ مقدس ہستیاں وہ ہیں جنھیں مشرق سے مغرب تک ہر جگہ اور ہر زمانے میں انبیا اور رسل کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔ ان مقدس ہستیوں نے اور ان قدسی نفسوں نے انسانوں کی مدد اس طرح کی کہ انھیں وہ راہ صاف صاف دکھا دی جو دونوں زندگیوں اور دونوں جہانوں میں صلاح و فلاح اور امن و سکون کی راہ ہے۔ ایک دوسرے کی مدد ایک انسانی تقاضا

Marfat.com

ہے اور اس مدد کا سب سے بڑا میدان یہ ہے کہ ہم جو اُن مقدس ہستیوں کے نام لیوا ہیں، ان پر ایمان رکھنے کے دعوے دار ہیں اور تمام انبیاء کے سردار حضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے اُمتی ہونے کے اعزاز پر مفتخر ہیں، ہمارا اور ہم میں سے ایک ایک فرد کا اولین فرض یہ ٹھہرتا ہے کہ حضورؐ کے اتباع اور پیروی میں ساری انسانیت کی مدد اس طرح کریں کہ اسے وہ راہ دکھا دیں جس پر چل کر اسے دنیا میں امن وسکون اور آخرت میں اللہ کی رضامندی اور خوشنودی حاصل ہو سکے۔ اگرچہ یہ دنیا کا مشکل ترین کام ہے، لیکن اس عظیم ذمہ داری کی تکمیل کا بیڑا اٹھانے والوں کا اعزاز بھی سب سے اعلا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اس فرض کی ادائی پر کمربستہ ہو جانے والوں کے بارے میں قرآن حکیم میں ارشاد فرمایا ہے:

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ (آل عمران: ۱۱۰)

یعنی "تم بہترین امت ہو جسے لوگوں کے فائدے کے لئے وجود بخشا گیا ہے۔"

مسلمانانِ پاکستان! میں دعوت دیتا ہوں کہ آپ اس صورتِ حال پر غور فرمائیں اور ہمت وعزم کر کے پاکستان میں ایسا معاشرہ قائم کریں کہ ہر انسان دوسرے انسان سے محبت کرنے اور اس کی مدد کرنے کی عظیم ذمہ داری قبول کرے۔

اللہ تعالیٰ ہماری مدد فرمائیں۔

Marfat.com

خوش کلامی

مسند ابن حنبل میں مروی ہے ایک بار ایک صحابی نے پوچھا:
"یارسول اللہ سب سے زیادہ ڈر کس کا ہونا چاہیے؟"
حضور اکرم، نورِ مجسّم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زبانِ مبارک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:
"اس کا!"

اور پھر ارشاد فرمایا، "خوش کلامی جنّت کی اور بد کلامی دوزخ کی نشان دہی کرتی ہے۔"

خوش کلامی درحقیقت خوش اخلاقی ہے اور خوش اخلاقی قطعی طور پر ایمان ہے۔ ایمان اور اخلاق دونوں ہم معنی ہیں اور ہم مفہوم ہیں۔ اگر انسان کے اخلاق بلند ہیں تو لازماً وہ خوش کلام بھی ہوگا۔ دراصل خوش کلامی اور خوش گفتاری یعنی آپس میں احترام و اکرام اور اخلاق سے بات کرنا اخلاق کی بلندی کا مظہر ہیں۔

قرآنِ مجید و فرقانِ حمید کی سورۃ الاسراء میں اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَقُلْ لِّعِبَادِيْ يَقُوْلُوا الَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ط (اسراء: ۵۳)

یعنی "اور میرے بندوں سے کہہ دو کہ وہ جو بات کہیں خوش کلامی کے ساتھ ہو۔"

اب قرآنِ حکیم کی صرف ایک آیت کا کیا ذکر، واقعہ یہ ہے کہ قرآنِ کریم حسنِ کلام کی اعلاترین مثال ہے۔ اس صحیفہ ربانی نے رمضان المبارک میں نازل ہو کر ساری دنیا میں ایک انقلابِ توحید برپا کر دیا۔ دنیا کی کوئی قوم اور کوئی ملّت ایسی نہیں ہے کہ جو قرآن سے متاثر نہ ہوئی ہو۔ قرآن نے انسان کے شرف و عزّ پر ہر انسان کو متوجہ کیا اور انسانوں میں محبّت باہمی کو بلند تر درجہ دیا۔ اخلاق کو ہر چیز کی بنیاد بنایا اور حسنِ کلامی کے ساتھ درسِ خوش کلامی دیا۔

تاریخ اقوام و ملل اس کی شاہد ہے کہ کبھی اور کسی بھی دور میں بد کلامی نے کسی انسان کو کوئی فائدہ نہیں پہنچایا ہے، اور خوش کلامی نے ہمیشہ فتح پائی ہے اور دلوں کو مسخّر کر لیا ہے۔ درحقیقت انسان فطرت سے جنگ نہیں کر سکتا۔ بد کلامی قطعی طور پر ایک غیر فطری عمل ہے اور خوش کلامی انسان کی فطری طینت اور خصلت ہے، اور اس کی جبلّت ہے۔

Marfat.com

ہم سب جانتے ہیں اور خوب جانتے ہیں کہ:

خوش کلامی زبان کا صدقہ ہے۔

خوش کلامی علم کی اولادِ معنوی ہے۔

خوش کلامی صراطِ مستقیم کی طرف لے جاتی ہے۔

خوش کلامی ایسی طاقت ہے کہ جو صداقت کو الفاظ کا جامہ پہناتی ہے۔

خوش کلامی سے ہزاروں بار قیامِ امن کا پلہ جھک گیا ہے۔

خوش کلامی اور صداقت انسان کو بے خوف بنا دیتی ہے۔

ہم صرف ایک بات جانتے ہیں اور وہ یہ کہ مسلمانوں کے ہادیِ برحق جناب رسول اللہ ﷺ ہیں۔ آپ ایسے عظیم و جلیل رہ نما اور ہادی ہیں کہ آپ کی زندگی کا ہر ہر لمحہ ہمارے سامنے ہے۔ دنیا کا کوئی لیڈر، کوئی رہ نما اور کوئی دوسرا انسان ایسا نہیں ہے کہ جس کی زندگی کے لمحات شب و روز عیاں ہوں اور واقعاتِ ماہ و سال ظاہر ہوں، سب کے سامنے ہوں اور اس کا کوئی راز نہ ہو۔ ایسی مثال تاریخِ انسانیت میں ایک ہی ہے، اور وہ مثال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں اور خوب جانتے ہیں کہ ہمارے رسول، سرورِ کائنات، فخرِ موجودات ؐ نے ہمیشہ خوش کلامی سے کام لیا ہے۔ آپ ؐ نے ہمیشہ نرم گفت گو فرمائی ہے۔ آپ ؐ نے ہمیشہ محبت کی بات کی ہے۔ ذرا غور فرمائیے۔ حیاتِ رسول ؐ کا ایک ایک لمحہ مہمات سے عبارت ہے۔ آپ ؐ ایک ایسے انقلابِ عظیم کے بانی ہیں کہ جو اس عالمِ ارض کے لیے وجہِ رحمت بنا۔

تحریکِ اسلامی کو کام یاب بنانے میں اور ایک انقلابِ عظیم برپا کرنے میں آں حضرت ؐ کا ہر لمحہ مسائل سے دوچار رہا۔ اور آپ ؐ نے ہر مسئلے کو خوش اسلوبی اور خوش کلامی سے حل کر لیا۔ اور پھر اسلام کی روشنی نے بالآخر اقطارِ عالم کو روشن کر دیا۔

ہم رسولِ پاک ؐ کے امتی ہیں۔ امتِ محمدی ؐ میں ہمارا شمار ہونا ہمارے لیے باعثِ فخر اور سببِ انبساط ہے اور موجبِ نجات ہے۔ یہ فخر و ابتہاج اس وقت صحیح اور بجا ہو سکتا ہے کہ جب ہم رسولِ پاک ؐ کے اسوۂ حسنہ کو اپنائیں، ان کی بتائی ہوئی راہوں پر چلیں اور ان کے اصولِ زندگی کو اختیار کریں۔

آئیے، بسم اللہ کریں اور آج یہ فیصلہ کریں کہ اب ہم ہمیشہ خوش کلامی کو اختیار کریں گے۔ یقین کیجیے کہ یہ فیصلہ اگر ہر فردِ وطن کر لے تو پاکستان کی قسمت بدل سکتی ہے۔ ایمان، اخلاق اور خوش کلامی معاشرے کی ہر خرابی کو دور کر سکتی ہے۔

اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ ہمیں فہم و فراست کی نعمتوں سے مالا مال فرمائیں اور حُسنِ عمل کی توفیق عطا فرمائیں۔

Marfat.com

حلم و بُردباری

حلم اور بُردباری ان اخلاقی صفات میں سے ہے جو افراد کے لیے انفرادی طور پر اور اقوام کے لیے اجتماعی طور پر کامیابی، عزت و عظمت اور ترقی و بلندی کا ذریعہ بنتی ہیں۔ حلم کی وجہ سے انسان کے نفس میں وہ قوتِ برداشت اور وہ اطمینان پیدا ہوتا ہے کہ کسی حالت میں بھی قوتِ غضب غالب نہیں آتی۔ ایک حلیم انسان کی مرضی و منشا کے خلاف کوئی بات ہو یا اس کو کتنی ہی تکلیف پہنچائی جائے وہ شور و شغب سے گریز کرتا ہے اور صبر و ضبط سے کام لے کر تکالیف کو برداشت کرتا ہے۔

انسان کو اللہ تعالیٰ نے بہترین فطرت اور احسنِ تقویم پر پیدا کیا ہے۔ اس کی فطرت میں وہ تمام داعیات رکھے ہیں کہ جن کی بنا پر وہ اچھائیوں کی طرف راغب ہوتا ہے اور برائیوں سے گریز اور اعراض کرتا ہے۔ صفاتِ حمیدہ انسان کو فطرتاً پسند ہیں اور خصوصیاتِ رذیلہ اس کو ناپسند ہیں۔ خیر سے اس کو محبت ہے اور شر سے اس کو بُعد ہے۔ اور یہ وہ خصوصیت ہے جس میں کسی انسان کا، بلکہ کسی قوم یا قبیلے کا کوئی امتیاز نہیں بلکہ ہر انسان اور ہر قوم اعلا اخلاق کی دل دادہ اور قدر دان ہوتی ہے اور اخلاقی عیوب سے نفرت کرتی ہے۔ جھوٹ، فریب، ظلم، ناانصافی، تشدد، طعن، بدگوئی، غیبت، چغل خوری، فساد اور اسی قسم کے عیوب کو کبھی پسندیدہ نہیں سمجھا اور کہا گیا۔ اس کے برعکس سچائی، صاف گوئی، ہمدردی، ایثار، رفاقت، تعاون، رحم، انصاف، رواداری، نرم روی، خلوص و بے غرضی، عفو و درگزر، شیریں کلامی، خوش مزاجی، صلح و صفائی، میل ملاپ اور حلم و بردباری کو ہمیشہ اور ہر قوم میں پسندیدہ اور مستحسن سمجھا گیا ہے اور ان صفات کے حامل افراد اور اقوام کی ہمیشہ قدر و منزلت کی گئی ہے اور کی جاتی رہے گی۔ حد یہ ہے کہ جو افراد ان صفاتِ حسنہ سے محروم ہوتے ہیں وہ خود بھی اس محرومی پر مُتأسّف اور ملول ہوتے ہیں اور اخلاقی عیوب پر کبھی فخر و مسرت کا اظہار نہیں کرتے۔ عام طور پر لوگ اپنے اخلاقی عیوب کو چھپاتے اور ان کے وجود سے انکار کرتے ہیں۔ یہ بات خود ثابت کرتی ہے کہ بد اخلاقی خود بد اخلاق کی نظر میں بھی بُری ہے اور اخلاقِ حسنہ بہر حال قابلِ احترام ہیں۔ خصوصاً ایک مسلمان نیکیوں کا شیدائی، نیک لوگوں کا مداح اور برائیوں کا دشمن ہوتا ہے، حتیٰ کہ اس کی زندگی کا مقصد ہی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر قرار دیا گیا ہے، یعنی وہ نیکی کا

Marfat.com

حکم دیتا ہے اور برائیوں سے روکتا ہے۔ اس کا مقصدِ وجود اور اس کی جماعت کا نصب العین ہی اشاعتِ خیر اور امتناعِ شر ہے۔ حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو مکارمِ اخلاق کی تکمیل کے لیے ہی مبعوث فرمایا گیا تھا۔

ایک شخص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ مجھے کچھ نصیحت فرمائیے! آپ نے فرمایا غصہ نہ کیا کرو۔ اس شخص نے کہا، کچھ اور نصیحت فرمائیے، مگر آپ نے پھر بھی یہی فرمایا کہ غصہ نہ کیا کرو۔ اور کئی بار یہی بات دہرائی۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کا ارشاد ہے کہ "غضب ایک قسم کا جنون ہے۔ غصہ کرنے والا خود بعد میں نادم ہوتا ہے اور اگر وہ نادم نہ ہو تو سمجھ لینا چاہیے کہ اس کا جنون مستحکم ہو چکا ہے۔" حقیقت یہ ہے کہ غصہ اور غضب سے مغلوب ہو جانے والا انسان عاقل نہیں کہلا سکتا اور اس کو بعد میں پچھتانا پڑتا ہے، لیکن جو شخص غصے سے مغلوب نہ ہو وہ بُردبار اور حلیم ہے اور معاشرے میں عزت واحترام کا مستحق ہے۔ حلم کے ذریعہ سے انسان بڑی سے بڑی مشکلات پر غالب آجاتا ہے اور سرکش سے سرکش افراد کو قابو میں کر لیتا ہے۔ ایک حلیم آدمی نہ صرف یہ کہ ہر دل عزیز ہوتا ہے اور لوگوں میں پسند کیا جاتا ہے، بلکہ وہ خود بھی سکون و آرام سے رہتا ہے۔ جب کوئی آدمی اپنے عزیزوں اور دوستوں کے ساتھ خلوص و محبت سے رہتا ہے تو اس کو ان کے دکھ درد میں بھی شریک ہونا پڑتا ہے اور تکلیفیں بھی برداشت کرنی پڑتی ہیں۔ اپنی مرضی کے خلاف کام کرنے پڑتے ہیں۔ اپنے جذبات کا خون کرنا پڑتا ہے۔ وہ دوستوں کی خاطر بہت سی مصیبتیں جھیلتا اور اذیتیں برداشت کرتا ہے، لیکن اس کے ذریعہ سے اس میں روحانی بلندی پیدا ہوتی ہے، اس کا نفس جلا پاتا ہے، اس کے قلب میں گداز پیدا ہوتا ہے اور اس میں صبر، برداشت، تحمل اور حلم و بردباری جیسی اعلا صفات پیدا ہوتی ہیں جو اس کو انسانیت کے بلند مرتبے پر فائز کرتی ہیں۔ ایسا سلیم الطبع اور بردبار انسان معاشرے اور قوم کے لیے خیر و برکت کا وسیلہ بن جاتا ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث ہے کہ "جو مسلمان لوگوں کے ساتھ مل کر رہتا ہے اور ان کی طرف سے پہنچنے والی تکلیفوں کو برداشت کرتا ہے وہ اس شخص سے کہیں بہتر ہے جو لوگوں سے الگ تھلگ رہتا ہے اور ان کی طرف سے پہنچنے والی تکلیفوں پر برداشتہ خاطر ہو جاتا ہے۔" ارشادِ ربانی ہے: وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ (التوبہ: ۷۱)

یعنی: "مومن مرد اور مومن عورتیں آپس میں ایک دوسرے کے دوست اور معاون ہیں۔"

بُردباری اور حلم ایک ایسی صفت ہے جو خود اللہ تعالیٰ کی صفاتِ حسنہ میں شامل ہے:

Marfat.com

إِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ (البقرہ: ۲۲۵)

یعنی: "اللہ تعالیٰ بڑا معاف کرنے والا بُردبار ہے۔"

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حلم اللہ تعالیٰ کی پسندیدہ صفات میں سے ہے نبی اکرمؐ نے فرمایا کہ:

"تم میں دو خصلتیں ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ پسند کرتا ہے، بُردباری اور نرم روی۔"

ایک بار ایک دیہاتی حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے مسجد کے صحن میں بیٹھ کر پیشاب کر دیا، کچھ لوگ اسے مارنے کو دوڑے، حضورؐ نے دیکھا تو انھیں روکا اور فرمایا "اسے کیوں مارتے ہو، ایک ڈول پانی بہا دو۔ اس امت کو تو لوگوں کے لیے آسانیاں فراہم کرنے کے لیے بھیجا گیا ہے۔ انھیں مشکلات میں ڈالنے کے لیے نہیں۔"

ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہیں تشریف لے جا رہے تھے۔ صحابہ کرامؓ آپؐ کے ساتھ تھے۔ حضورؐ موٹے کپڑے کی چادر اوڑھے ہوئے تھے۔ ایک دیہاتی نے چادر پکڑ لی اور اس طرح گھسیٹی کہ آپؐ کی گردن پر نشان پڑ گئے، مگر حضورؐ نے ایک لفظ بھی نہیں کہا، بلکہ مسکراتے ہوئے دریافت فرمایا کہ کیا بات ہے؟ اس نے اپنی ضرورت بتائی جو حضورؐ نے پوری فرما دی۔

یہ ہیں حلم و بردباری کی وہ مثالیں جو انسان کو عظمت و رفعت عطا کرتی ہیں۔ حضور نبی اکرمؐ کی حیاتِ پاک میں تحمل، برداشت، حلم و بردباری کی بے شمار مثالیں اور واقعات ہیں۔ درحقیقت وہ بے مثال حلم تو کسی دوسری شخصیت میں ملنا ہی مشکل ہے۔ اور انسانی تاریخ آپ سے بڑھ کر حلیم و بردبار ہستی پیش کرنے سے قاصر ہے۔ اشاعتِ اسلام میں حضورؐ کو جن جن اور جیسی جیسی مشکلات اور مصائب و آلام کا سامنا کرنا پڑا ہم اس کا تصور کر کے بھی کانپ جاتے ہیں، لیکن حضورؐ کبھی ان چیزوں پر توجہ نہیں فرماتے تھے اور آپ کے پیشِ نظر صرف یہ بات رہتی تھی کہ مسلمانوں سے کوئی ایسا فعل سرزد نہ ہو جائے جو حلم کے خلاف ہو اور اس کے نتیجہ میں اس مقدس و عظیم مقصد کو نقصان پہنچے جس کے لیے آپ بھیجے گئے تھے۔

جب ایک بلند نصب العین پیشِ نظر ہو اور وہ دل و جان سے بھی زیادہ عزیز ہو تو پھر انسان میں غیر معمولی خصوصیات پیدا ہو جاتی ہیں اور اس کے کردار میں عُلو آ جاتا ہے اور وہ ایسے مُحیّرُ العُقول کارنامے انجام دیتا ہے کہ دنیا دنگ رہ جاتی ہے۔ مقصد کی محبت انسان میں حلم پیدا کر دیتی ہے کیوں کہ مقصد حاصل کرنے اور منزل تک پہنچنے کے لیے راہ کی مشکلات اور لوگوں کی مخالفتیں برداشت کرنے کی صلاحیت جب تک ترقی نہ پائے، رکاوٹوں پر عبور حاصل نہیں کیا جا سکتا۔

Marfat.com

شرم وحیا

شرم وحیا انسان کا وہ فطری وصف ہے کہ جو اُسے بہت سی بُرائیوں سے محفوظ رکھتا ہے۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے تو شاید بے جا نہ ہو کہ انسانی شرافت، عزت، پاک دامنی اور پاک بازی کی بنیاد ہی حیا پر ہے۔ جو لوگ جتنے زیادہ حیادار ہیں ان کا دامن اُسی حد تک بُرائیوں سے پاک رہتا ہے۔ شرم وحیا والے لوگ بُرائیوں کا ارتکاب ہی نہیں کر سکتے۔ اس لیے کہ جو لوگ بے حیائی اور بے شرمی کو گوارا ہی نہیں کر سکتے وہ اس کا ارتکاب کیوں کر اور کیسے کر سکتے ہیں۔

ایک پودا ایسا بھی ہوتا ہے چھوئی موئی کا کہ جسے اگر چھو دیا جائے تو وہ سمٹ جاتا ہے۔ اسے لجونتی کہتے ہیں یعنی شرم وحیا والا پودا، یعنی ایسا پودا کہ جو لمس اور چھونا بھی گوارا نہیں کر سکتا۔ یہی حال حیادار انسانوں کا ہوتا ہے۔ وہ بدگوئی کرنے والوں کے قریب سے گزریں تو شرم سے گردن جھکا کر تیز قدموں کے ساتھ آگے نکل جاتے ہیں۔ اگر اتفاقاً ان کی نظر میں کوئی ناگفتنی بات آجائے تو شرم سے پانی پانی ہو جاتے ہیں اور نگاہیں پھیر لیتے ہیں۔ ایسے لوگ کوئی ایسا کام نہیں کرتے جس پر انگشت نمائی ہو۔ پھر حیا کا وصف ان میں یہ خوبی بھی پیدا کر دیتا ہے کہ انھیں بُری بات سے ایسی نفرت ہو جاتی ہے کہ اگر کوئی اور بھی اسے کر رہا ہو تو اس طرف نظریں نہیں اٹھا سکتے۔ حیادار لوگ انسانی روپ میں فرشتے ہوتے ہیں۔ یقیناً فرشتے بھی ان کے اِس وصف پر آفرین کہتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ حیا کا ملکوتی وصف انسان کو فرشتوں کی صف میں لا کھڑا کرتا ہے۔

ہمارے رسولِ اکرمؐ شرم وحیا کے مجسّم نمونہ تھے۔ آں حضرتؐ کی شرم وحیا کا یہ حال تھا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم محسوس کرتے تھے کہ اس وصف میں بھی آپؐ نمایاں ترین حیثیت رکھتے ہیں۔ بخاری شریف کی ایک حدیث سے آں حضرتؐ کے اسوۂ حسنہ کے اس پہلو پر روشنی پڑتی ہے کہ ”رسول اللہ پردہ نشین کنواری لڑکی سے بھی زیادہ شرمیلے تھے۔“

آں حضرتؐ کے اس وصف کی شہادت قرآن حکیم میں بھی موجود ہے:

اِنَّ ذٰلِکُمْ کَانَ یُؤْذِی النَّبِیَّ فَیَسْتَحْیٖ مِنْکُمْ ز (احزاب: ۵۳)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے صحابۂ کرام کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا ہے: ”تم دیر تک رسول اللہؐ

Marfat.com

کے پاس بیٹھے رہتے ہو جس سے آپؐ کو تکلیف ہوتی ہے، لیکن آپؐ شرم کے مارے اپنی اس تکلیف کا اظہار نہیں کرتے۔"

اس کا مطلب یہ ہے کہ آں حضرتؐ کو حیا کا اس قدر پاس تھا کہ بعض اوقات آپؐ کو تکلیف بھی ہوتی تو بھی آپؐ شرم و حیا کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے تھے۔

شرم و حیا کا وصف انسان میں پیدائشی طور پر ہوتا ہے۔ کسی میں زیادہ کسی میں کم۔ اگر مناسب ماحول میسر آئے اور تربیت بھی کی جائے تو یہ وصف نہ صرف قائم رہتا ہے بلکہ بڑھتا رہتا ہے۔ اس کے برخلاف بُرے ماحول اور بُری صحبت سے رفتہ رفتہ حیا کا وصف کم ہوتا جاتا ہے اور بے حیائی اور بے شرمی غالب آجاتی ہے۔ اس لیے اسلام نے اس فطری انسانی وصف کی مناسب نگہداشت کا حکم دیا ہے۔ اور اُن تمام باتوں سے منع کیا کہ جو اس وصف کو کم کرنے والی ہیں۔ قرآنِ حکیم بعض بُرائیوں کے بارے میں ہدایت فرماتا ہے:

"لَا تَقْرَبُوْهَا" یعنی: "ان باتوں کے قریب بھی نہ جانا"۔

یہ احتیاط اس وجہ سے ہے کہ آنکھوں میں شرم باقی رہے، اور دیدے کا پانی نہ مر جائے۔

دیدوں کا پانی مر جانا بھی اسی وقت بولتے ہیں کہ جب کسی کی آنکھوں میں شرم و حیا باقی نہ رہے۔

رسول اللہؐ کے ایک صحابی نہایت شرمیلے اور حیادار تھے، اس وجہ سے ان کا بھائی اُن پر ناراضی کا اظہار کر رہا تھا۔ آں حضرتؐ نے دیکھا تو فرمایا کہ اس پر غصہ نہ کرو، کیوں کہ حیا ایمان سے ہے، یعنی حیا ایمان کا ایک جز ہے۔ جس طرح ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ تمام فواحش و منکرات سے پرہیز کیا جائے۔ اسی طرح حیا بھی تمام بُرائیوں بلکہ بُرے خیالات تک سے انسان کو روکتی ہے۔ حیا انسان کا ایک ایسا وصف ہے جس کے متعلق رسول اللہؐ نے فرمایا کہ:

اَلْحَیَاءُ لَا یَأْتِیْ اِلَّا بِخَیْرٍ (بخاری) یعنی: "حیا سے صرف بھلائی ہی پہنچتی ہے۔"

ایسا وصف جس میں بھلائی ہی بھلائی ہو، ایسا وصف جو ہمارے ایمان کا جز ہو، اس کی ہمیں زیادہ سے زیادہ پاس داری کرنی چاہیے اور حفاظت کرنی چاہیے، تاکہ بُرائیوں سے ہمارا دامن ملوّث نہ ہو اور ہم خیر، نیکی اور شرافت و عزت کی زندگی بسر کر سکیں۔

حاصلِ کلام یہ ہے کہ حیا ایک ایسا وصف ہے جو انسان کو طبعاً بُرائیوں کے تصور سے دور رکھتا ہے۔ جو لوگ باحیا ہیں وہ شرافت کے بلند ترین مقام پر فائز ہیں۔ جن لوگوں میں حیا ہے وہ بدکرداری کی سوچ ہی نہیں سکتے۔ اُس کا ارتکاب اُن کے لیے ناممکن ہے۔

صحابۂ کرامؓ، جن کی تربیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی تھی، ان کی زندگیوں میں بھی شرم و حیا کا وصف بہت نمایاں نظر آتا ہے۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہٗ کے بارے میں رسول اللہؐ

Marfat.com

نے ایک مرتبہ ارشاد فرمایا کہ اُن کی شرم و حیا فرشتوں کے لیے بھی قابلِ رشک ہے۔ رسول اللہؐ نے ایک مرتبہ ارشاد فرمایا کہ دورِ جاہلیت کے جو اقوال اور محاورے باقی رہ گئے ہیں ان میں ایک قول ہے کہ:

"اِذَا لَمْ تَسْتَحِیْ فَافْعَلْ مَا شِئْتَ" یعنی: "اگر تم شرم و حیا نہیں کرتے تو پھر چاہے جو برائی کرتے رہو کوئی تمھیں روکنے والا نہیں۔"

شرم و حیا اور اس کی اہمیت اور فضیلت کے بارے میں جو کچھ کہا جا چکا ہے اُس پر میں ایک اضافہ یہ کرنا چاہتا ہوں کہ دیگر انسانی طبائع اور عادات کی طرح جب اس وصف میں بھی مبالغے کو دخل مل جائے تو یہ آدمی کے لیے نقصان دہ ہوتا ہے۔ وہ شرم و حیا جو آدمی کو خیر، بھلائی اور علم حاصل کرنے سے روکے، قابلِ ترک ہے اور اس ایک معاملے کے علاوہ تمام دیگر امور میں شرم و حیا ایک لازمی انسانی صفت ہے، بلکہ تمام انسانی صفات کی سرتاج ہے، کہ رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ:

"اَلْحَیَاءُ نِصْفُ الْاِیْمَانِ" یعنی: "حیا نصف ایمان ہے۔"

اب میں حیا اور شرم کے ذیل میں پاکستان کی بات کرتا ہوں۔

پاکستان حتمی اور یقینی طور پر اس لیے عالمِ وجود میں آیا تھا اور منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوا تھا کہ ہم مسلمانوں نے اپنے اللہ سے یہ وعدہ کیا تھا کہ جب پاکستان بن جائے گا تو یہاں قرآن کا دستور نافذ ہوگا اور حکومت اللہ کی ہوگی اور شریعت اسلام کی ہوگی۔ یہی ہمارا نظریۂ حیات قرار پایا۔ اور سچ یہ ہے کہ صرف اسی نظریۂ حیات کے سائے میں اور قرآن و سنّت کی روشنی میں ہم اقوامِ عالم میں اپنا تشخص قائم کر سکتے ہیں۔ اس کے بغیر ہمیں کوئی جانے گا اور نہ پہچانے گا۔

اب پاکستان میں نفاذِ شریعت کی جدوجہد جاری ہے۔ ہر پاکستانی پر لازم ہے کہ وہ خلوصِ دل سے تعاون کرے اور احکامِ شریعت کو اپنا کر اور اسلامی اخلاق اور اسلامی اقدار کا عملی نمونہ بن کر اس عظیم مقصد میں شریک ہو۔ بلا شک و شبہ حیا جزِ ایمان ہے اور حیا آبروئے مرد و زن ہے۔ اور حیا عینِ اخلاق ہے۔ اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ ہماری مدد فرمائیں۔

Marfat.com

محنت و مشقّت

اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے انسان کی تخلیق اس نہج پر فرمائی ہے کہ اسے نہ صرف زندگی گزارنے کے لیے بلکہ زندگی کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے، اس کے تقاضوں کی تکمیل کے لیے جدوجہد میں مصروف اور کاموں میں مشغول رہنا ضروری ہے۔ وسائل حیات کی تحصیل میں تگ ودو اور جستجو اور بقائے حیات کا سامان کرنے کی کوشش وکاوش، جس میں دست وبازو استعمال ہوں اور ذہن وجسم کی صلاحیتیں کام آئیں، محنت ومشقت سے عبارت ہے۔ یہی نکتہ ہے جس کی طرف قرآن مجید میں ان الفاظ میں اشارہ کیا گیا ہے:

لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي كَبَدٍ ۝ (البلد: ۴)

یعنی "ہم نے انسان کو مشقت میں پیدا کیا ہے۔"

انسان کے مشقت میں پیدا کیے جانے کا مفہوم یہ ہے کہ اسے دنیا میں نہ صرف اپنی زندگی کے لیے بھاگ دوڑ کرنی پڑے گی بلکہ جیسا کہ اس آیت سے آگے مضمون سے ظاہر ہوتا ہے اسے اپنی اس جدوجہد کے ثمرات میں اللہ کے ان بندوں کو بھی شامل اور شریک کرنا پڑے گا جنھیں اللہ نے اس کا زیر دست بنایا ہے یا جو کسی عارضی یا مستقل جسمانی یا ذہنی معذوری کی وجہ سے خود اپنے لیے سامانِ حیات اور وسائل زندگی حاصل کرنے پر قدرت نہیں رکھتے۔

ایک اور بات جو اس جگہ لائق توجہ ہے اور ایک نکتہ جو تفکر وتدبر کا متقاضی ہے، یہ ہے کہ آج ہمارے سامنے یہ دنیا، جس میں ہم زندگی گزار رہے ہیں، جس رنگ میں ہے یہ سدا سے ایسی نہیں ہے۔ آج ہمیں اپنے اسلافِ بعید اور اسلافِ قریب کے مقابلے میں پُر از راحت زندگی گزارنے کا جو ساز وسامان میسر ہے وہ پچھلوں کے لیے ناقابلِ تصور تھا۔

درحقیقت ہماری آج کی اس بارونق اور تابندہ دنیا کا گوشہ گوشہ اور چپّا چپّا ہمیں ان انسانی کوششوں کی یاد دلاتا ہے اور اس محنت ومشقت کے تصور پر آمادہ کرتا ہے کہ جو

Marfat.com

ہم سے پہلے لوگوں نے کی اور جس کے ثمرات سے آج ہم مستفید ہو رہے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ زندگی کو بہتر بنانے کی جدوجہد اور اس راہ میں محنت اور کدوکاوش صرف اپنے اور اپنے متعلقین کے خیال سے ضروری نہیں بلکہ ہمیں اس میں آئندہ آنے والی نسلوں کے حقوق کا بھی لحاظ رکھنا ہے۔ میں نے یہ جو کچھ کہا ہے اس کا ماحصل یہ ہے کہ انسان کی انسانیت کا اور آدمی کی آدمیت کا تقاضا ہے محنت ومشقت، یعنی اپنے ذہن وجسم کو خود اپنے اور اللہ کے دوسرے بندوں کی ضروریات کی تکمیل کے سلسلے میں مصروفِ کار رکھنا۔

دوسروں کی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے مصروفِ عمل رہنا تو یقیناً عبادت ہے لیکن اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ خود اپنے جسم اور اپنی ذات سے متعلق ضرورتوں کی تکمیل کی جدوجہد بھی عبادت میں داخل ہے بشرطیکہ فکر صالح ہو اور مقاصدِ حیات بلند وارفع ہوں۔ اس بنا پر محنت ومشقت، جو درحقیقت وسیلہ ہوتی ہے کسب واکتساب کا اللہ کو بھی محبوب ہے اور اللہ کے بندوں کی نظروں میں محمود ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے:

اَلْکَاسِبُ حَبِیْبُ اللّٰہِ

یعنی "وہ شخص جو جدوجہد میں مصروف ہو اللہ کا محبوب ہے"۔

جس طرح ہر عبادت کی کچھ شرائط ہیں اور اس کے کچھ مقررہ آداب واحکام ہیں اسی طرح اس عبادت کی صحت کا انحصار بھی بعض احکام وہدایات کی تکمیل وبجاآوری پر ہے۔ آدمی کسبِ معاش کے سلسلے میں جو محنت ومشقت کرتا ہے وہ اگر اس میں اسلام کی تعلیمات کا لحاظ اور خیال رکھے تو اس کا درجہ بہت اعلا وارفع ہے۔ محنت ومشقت کی عظمت ورفعت اس بنا پر بھی ہے کہ تقریباً سارے انبیائے کرامؑ نے حصول معاش کے لیے محنت ومشقت کی ہے۔ ان قدسی نفس حضرات میں سے اکثر نے معماری، نجاری، حدادی، گلہ بانی، پارچہ دوزی، زراعت اور تجارت کو اپنا پیشہ اور حصول واکتسابِ معاش کا وسیلہ بنایا تھا۔ اس سے ایک بات یہ بھی نکلتی ہے کہ کسی پیشے کو کم تر جاننا یا شان کے خلاف سمجھنا اسلامی تعلیمات کے منافی ہے۔

جب گفت گو ہو رہی ہو محنت ومشقت کی اور ذکر ہوا انبیائے کرامؑ کا تو جو بات ذہن میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ مادّی ساز وسامان سے لیس اور پُرتعیش وسائلِ زندگی سے لبریز اس دنیا میں ان مقدس ہستیوں کے چھوڑے ہوئے آثار بھی نظر آتے ہیں اور ان

Marfat.com

حضرات کی دی ہوئی اقدار کا سرمایہ بھی موجود ہے۔ ان پاکیزہ ہستیوں نے خیر کے ان آثار اور بھلائی کی ان اقدار کو قائم کرنے کے لیے جو محنت و مشقت کی ہے اس کی مکمل تصویر حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کا سب سے نمایاں پہلو ہے۔

انسان کو اللہ تعالیٰ نے بڑی صلاحیتوں سے نوازا ہے۔ عقل و فکر کی توانائیاں اسے بخشی ہیں اور عمل کی طاقتیں ودیعت کی ہیں۔ صحت و تن درستی سے اسے مالامال کیا ہے۔ تفکر و تدبر کی توانائیوں سے اسے ممتاز وجود کی حیثیت دی ہے۔ ان تمام نعمتوں سے مالامال انسان کا یہ فرض ہے اور قدرت اس سے توقع رکھتی ہے کہ انسان اس دنیا کو گہوارۂ امن بنانے کی جدوجہد کرتا رہے گا، اور یہ کہ انسان محنت و مشقت سے کبھی جی نہیں چرائے گا اور یہ کہ یہ محنت و مشقت اور یہ جدوجہد اور یہ کوشش و کاوش اس لیے ہوگی کہ وہ اور اس کے عزیز و اقارب اور اس کے ہمسائے اس سے خوش ہوں گے اور وہ انسانی فلاح و خیر کا سامان کرے گا۔

اب آخر میں جو بات کہنی چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ حصولِ معاش اور وسائلِ حیات کی تکمیل کے لیے تو ہر وقت اور ہر جگہ جدوجہد ہو رہی ہے۔ لیکن ہم میں سے کتنے ایسے خوش نصیب ہیں جنھوں نے انبیائے کرامؑ سے پائے ہوئے ورثۂ دین کی بقا، تقویت اور اس کے قیام و احیا کو اپنی محنت و مشقت کا مقصد قرار دے رکھا ہے؟ یہ جسم و جان، یہ قوتیں اور صلاحیتیں، یہ زورِ بازو اور یہ ذہنِ رسا جو ہمیں عطا ہوا، سب کچھ اللہ کی عطا و دین ہے۔ ہم پر اس منعمِ حقیقی کی طرف سے یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ ہم اس کے ان عطایا کو جہاں اپنی اور اپنے متعلقین کی ضروریات کی تکمیل کی راہ میں صرف کرتے ہیں وہیں ان کا ایک حصہ اللہ کے دین اور انبیائے کرامؑ کے بتائے ہوئے طریقۂ زندگی کے نفاذ کے لیے بھی صرف کریں۔

مجھے اس وقت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک دعا یاد آتی ہے۔ وہ یہ ہے:

"اَللّٰهُمَّ لَا تَجْعَلِ الدُّنْيَا اَكْبَرَ هَمِّنَا وَلَا مَبْلَغَ عِلْمِنَا"

یعنی: "اے اللہ کہیں ایسا نہ ہو کہ دنیا اور دنیاوی زندگی ہی ہماری تمام مساعی کا آخری مقصد اور ہمارا مبلغ علم بن کر رہ جائے۔"

یہ دعا بذاتِ خود ہمارے لیے دعوتِ فکر ہے۔ یہ دعا اور یہ فکرِ رسولؐ پاکستان کے ہر مسلمان کے لیے دعوتِ فکر ہے۔ ہماری مساعی اور ہماری سعی و جدوجہد اور ہماری محنت و مشقت کا منتہائے مقصود یہ ہونا چاہیے کہ ہم انسان کی عظمت اور اس کے شرف کا اعتراف اور ادراک

Marfat.com

کریں اور اس بنیاد پر معاشرے میں بھائی چارہ اور امن اور محبت باہمی قائم کریں۔ اور اس پاک فضا میں اللہ کے دین کی سربلندی اور سرفرازی کا سامان کریں۔ ہمارا ہر قول و فعل اللہ کے دین کی عظمت کے لیے ہونا چاہیئے اور ہماری محنت و مشقت اعلائے کلمۃ الحق کے لیے ہونی چاہیے۔

اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ ہمیں توفیق عطا فرمائیں کہ ہم من حیث الملّت پاکستان میں نظامِ شریعت الٰہی نافذ کریں اور اسلام کے سائے میں بڑھ کر صفِ اقوام و ملل عالم میں امتیاز و تشخّص کے ساتھ کھڑے ہو سکیں۔

Marfat.com

جاں فشانی

عمل سے زندگی بنتی ہے اور کام یابی بھی حاصل ہوتی ہے۔ عمل کسی مقصد کے لیے ہوتا ہے، مقصد کے بغیر عمل نہ ممکن ہے اور نہ مستحسن۔ مقصد ہی سے عمل کو دوام حاصل ہوتا ہے۔ صرف عمل ہی نہیں خود زندگی بھی مقصد ہی سے روشن ہوتی ہے اور اپنی بقا کے لیے زندگی بھی مقصد کی محتاج ہے۔ بقولِ اقبال:

زندگانی را بقا از مدعا است

مقصد انسان میں حرکت، لگن اور جذبہ و ایثار پیدا کرتا ہے۔ ایک اچھے اور اعلا مقصد کے لیے خلوص انسان کی فکری اور عملی قوتوں کو اجاگر کرتا ہے۔ عمل میں مقصد اور خلوص کی آمیزش ہو جائے تو جو مرکب تیار ہوگا اس کو ہم جاں فشانی کہہ سکتے ہیں۔

کسی کام کے لیے محنت کرنا اپنی جگہ مستحسن ہے۔ محنت اچھے افراد اور زندہ قوموں کا شعار ہے، محنت ہی سے ہر کام کی تکمیل ہوتی ہے۔ لیکن محنت، محنت میں بھی فرق ہے۔ ایک محنت تو وہ ہوتی ہے جو انسان خود اپنے لیے، اپنی زندگی کی بقا کے لیے اور اپنی معاش کے حصول کے لیے کرتا ہے اور ایک وہ ہوتی ہے جو اپنی ذات سے بڑھ کر اپنی ملت، اپنی قوم اور نوعِ انسانی کی بھلائی کے لیے ہوتی ہے۔ اس محنت کو عبادت کا درجہ حاصل ہو جاتا ہے۔ جو محنت قومی مفادات کے لیے یا انسانی فلاح کے لیے یا خدمت خلق کے جذبے سے کی جائے اور اس میں خلوص، ایثار، لگن اور مقصدیت شامل ہو وہ جاں فشانی کہلاتی ہے۔ جاں فشانی میں کسی مقصد کو حاصل کر لینے کا جذبہ، کسی کام کو حسن و خوبی سے تکمیل تک پہنچانے کی تڑپ اور ایک اعلا نصب العین کا عشق شامل ہوتا ہے۔ درحقیقت زندگی کا لطف جاں فشانی ہی میں ہے۔ جاں فشانی کے بغیر انسان نہ خود کچھ بن سکتا ہے اور نہ ملک و ملت کے لیے کچھ کر سکتا ہے۔ ایک سپاہی جب میدانِ جنگ میں ہوتا ہے تو وہ جاں فشانی کا صحیح نمونہ ہوتا ہے۔ عقل اور مصلحت اندیشی کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ دشمن کا قلع قمع کرنے کی کوشش کے بجائے سہولت اور راحت کا

Marfat.com

راستہ ڈھونڈا جائے، لیکن جاں فشانی کا جذبہ کہتا ہے کہ وطن کی بقا کے لیے دشمن کا مقابلہ کیا جائے اور اپنی تمام قوتوں سے کام لے کر وطن کی حفاظت کی جائے۔ لڑائی جان جوکھوں کا کام ہے، لیکن اس میں جو مسرّت اور قلبی اطمینان حاصل ہوتا ہے وہ ایک سپاہی کے لیے امن سے زیادہ پُرکشش ہوتا ہے۔ خطرہ مول لے کر دشمن کی طرف پیش قدمی کرنا اور اس کے علاقوں میں گھس کر اس کو تباہ کرنے کی کوشش کرنا عقل کے بس کا نہیں ہے۔ خطرات کی آگ میں کود پڑنے کے لیے جذبہ و شوق کی ضرورت ہے۔ ہر انسان کو اپنی جان عزیز ہوتی ہے، لیکن بعض موقعے ایسے ہوتے ہیں کہ آدمی اپنی زندگی کو داؤ پر لگا کر ایک مقصد حاصل کرنا چاہتا ہے۔ یہی جاں فشانی ہے اور اسی سے ملک و ملّت کی بقا ہے، اسی سے انسانیت عروج پاتی ہے۔ سرکارِ دو عالمؐ کا ارشاد ہے کہ:

"دشمن کی سرحد پر ایک رات بسر کرنا عمر بھر کی عبادت سے بہتر ہے۔"

آپ غور فرمائیے تو اس ارشادِ رسولؐ سے جاں فشانی کی اہمیت پوری طرح واضح ہو جاتی ہے۔ عام حالات میں سکون و اطمینان کے ساتھ عبادت کرتے رہنا بھی باعثِ ثواب ہے، لیکن جاں نثاری کے جذبے کے ساتھ اپنی زندگی کو خطرے میں ڈال کر اور ملک و ملّت کی حفاظت کے لیے جو وقت صرف کیا جائے وہ کہیں افضل و برتر ہے۔

حضرت عبداللہ بن ابی اوفیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ "جنّت تلواروں کے سایہ تلے ہے۔" سرکارؐ کے اس ارشاد سے بھی جاں فشانی کی اہمیت پر روشنی پڑتی ہے۔

جاں فشانی محنت، مشقت، سعی و کوشش کے بغیر انسان کوئی چھوٹے سے چھوٹا مقصد بھی حاصل نہیں کر سکتا۔ ترقی کرنے اور کامیابی کے منازل طے کرنے کے لیے تو محنت اور سعی بدرجۂ اولیٰ لازم ہے۔ قرآنِ حکیم کس بلیغ انداز میں سعی و جہد کی اہمیت کو واضح فرماتا ہے: لیس للانسان الا ما سعی (النجم: ۳۹) یعنی "انسان صرف اس کا مستحق ہے جس کی وہ سعی کرے۔"

قرآنِ حکیم اور رسولِ اکرمؐ کے ارشادات کی روشنی میں مسلمانوں نے غیر معمولی محنت اور سعی و جہد سے کام لے کر ایک دنیا کو مسخر کر لیا تھا۔ عرب کے یہ بادیہ نشین دیکھتے ہی دیکھتے صحرائے عرب سے اٹھ کر ایک عالم پر چھا گئے اور زندگی کے ہر میدان میں وہ

Marfat.com

عظیم کارنامے سرانجام دیے کہ دنیا حیرت میں رہ گئی۔ زندگی کا کوئی شعبہ ہو محنت اور جان فشانی کے بغیر کوئی کامیابی نہیں حاصل کی جا سکتی۔

سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلّم نے نہ صرف عمل کی تعلیم دی، بلکہ خود بھی ایک بہترین عملی نمونہ دنیا کے سامنے پیش کیا۔ اپنا ہر کام خود اپنے ہاتھ سے انجام دیا کرتے تھے اور کسی کام کو اپنے لیے باعثِ شرم و عار محسوس نہیں فرماتے تھے۔ ایک ضرورت مند انصار صحابیؓ آپ کی خدمت میں پیش ہوئے۔ ان کا کل اثاثہ ٹاٹ کے دو ٹکڑے اور اور پانی پینے کا ایک پیالہ تھا۔ آپؐ نے حکم دیا کہ یہ چیزیں میرے پاس لے آؤ۔ آپؐ کے صحابیؓ یہ چیزیں لے آئے اور حضورؐ کی خدمت میں عرض کیا کہ ایک ٹاٹ کے ٹکڑے کو اوڑھتا ہوں، ایک کو بچھاتا ہوں۔ پیالے سے پانی پیتا ہوں اور کوئی سامان میرے پاس نہیں ہے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ ان دونوں کو کون خریدتا ہے؟ ایک صحابیؓ نے ایک درہم کی پیشکش کی۔ حضورؐ نے فرمایا کہ اس میں کوئی اضافہ کرتا ہے؟ دو درہم کی پیشکش کی گئی۔ آپؐ نے دو درہم لے کر انصار صحابی کو دیے اور فرمایا:

"ایک درہم سے اناج خرید دا اور اپنے گھر والوں کو دیدو۔ اور ایک درہم سے ایک کلہاڑی خرید کر میرے پاس لے آؤ۔"

ضرورت مند صحابیؓ نے تعمیلِ ارشاد کی اور کلہاڑی خرید کر حضورؐ کی خدمت میں پیش کی۔ آپ نے خود اپنے دستِ مبارک سے اس کے اندر ایک لکڑی ٹھونک دی اور ارشاد فرمایا:

"جاؤ لکڑیاں کاٹ کر لاؤ اور بیچو۔ پندرہ دن سے پہلے میں تمھیں نہ دیکھوں۔"

پندرہ دن تک یہ صحابی تعمیلِ ارشاد میں سعی فرماتے رہے اور نہایت جاں فشانی کے ساتھ لکڑیاں کاٹتے اور بیچتے رہے۔ پندرہ دن کے بعد حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا:

"یارسول اللہ! پندرہ دن میں دس درہم کی آمدنی ہوئی جس میں سے چند درہم کے کپڑے خریدے اور چند درہم کا غلہ خریدا۔"

حضور صلی اللہ علیہ وسلّم نے ارشاد فرمایا:

"تمھارے لیے اس میں بھلائی ہے، اس بات کے مقابلے میں کہ قیامت کے دن بھیک کے باعث تمھارے چہرے پر ایک داغ بنا ہوا ہو۔"

Marfat.com

حضورؐ کی تعلیم یہ ہے کہ انسان محنت کر کے روزی حاصل کرے، دوسروں کا محتاج ہونا عمل سے دور رہنے کی دلیل ہے۔ آپؐ نے ہر اس طریقے کو ناپسند فرمایا ہے جس میں محنت کے بجائے کسی اور ذریعہ سے روزی حاصل کی جائے آپؐ کا فرمان ہے کہ:

مَا اَکَلَ رَجُلٌ اَطْیَبَ مِمَّا تَکْسِبُ یَدَاہُ۔

"سب سے بہتر روزی وہ ہے جس کو آدمی نے اپنی محنت سے حاصل کیا ہو"

محنت اور جاں فشانی سے گھبرانے والے جائز ذرائع کے بجائے ناجائز ذرائع سے دولت حاصل کرنے لگتے ہیں۔ اس کے نتائج نہ صرف ان کی ذات کے لیے بُرے نکلتے ہیں، بلکہ پوری قوم اس سے متاثر ہوتی ہے اور عام آدمی کی زندگی تلخ ہو جاتی ہے بھیک مانگنا اور رشوت لینا بھی اسی زمرے میں شامل ہے۔ ظاہر ہے کہ بھیک مانگنے والا نہ صرف ناجائز ذرائع اختیار کرتا ہے بلکہ وہ محنت اور جاں فشانی کے نتیجے میں حاصل ہونے والے اچھے جذبات سے بھی محروم ہو جاتا ہے ایثار و اعتماد کی صفات اس میں غائب ہو جاتی ہیں اور وہ کاہلی، آرام طلبی اور خود غرضی جیسے عیوب میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ آپؐ کا ارشاد ہے کہ رشوت لینے والا اور رشوت دینے والا دونوں جہنم میں جائیں گے۔ مسلمانوں کو جہاد کی تعلیم دے کر جاں فشانی کو ان کی زندگی کی امتیازی خصوصیت بنا دیا گیا ہے۔ آج ہماری سب سے بڑی ضرورت محنت اور جاں فشانی ہے۔ محنت کی کمی نے ہماری قومی زندگی میں بہت سے مسائل پیدا کر دیے ہیں۔ ان مسائل کے حل کے لیے جاں فشانی کی ضرورت ہے۔ اگر آج ہم سہل انگاری، آرام طلبی اور سہولت پسندی کی عادت چھوڑ کر عملِ پیہم، محنت، مشقت اور جاں فشانی کو اپنا شعار بنائیں تو نہ صرف یہ کہ ہم بہت سی مشکلات پر قابو پا سکتے ہیں، بلکہ ترقی و خوش حالی کی منزلیں بھی طے کر سکتے ہیں۔ ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ محنت کے بغیر راحت حاصل نہیں ہوتی۔ جاں فشانی سے ہی عزت حاصل ہوتی ہے، اس لیے اگر ہم عزت، راحت اور سہولت چاہتے ہیں تو ہمیں سخت جاں فشانی سے کام لے کر مشکلات پر غالب آنا پڑے گا۔ ہم اپنی مشکلات خود ہی دور کر سکتے ہیں کوئی دوسرا ہماری مشکلات ختم نہیں کر سکتا۔ جاں فشانی کا پھل سہولت و راحت ہے قرآن حکیم ہمیں بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ مشکلات برداشت کرنے والوں، مصیبت جھیلنے والوں اور جاں فشانی کرنے والوں کو سہولت عطا فرماتا ہے: اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا۔

Marfat.com

شجاعت

شجاعت کے لیے دوسرا لفظ بہادری ہے۔ یہ وصف انسانیت اور انسان کا ایک بڑا جوہر ہے۔ ہر زمانے میں شجاعت کی غیر معمولی قدر رہی ہے۔ دیومالائی زمانوں میں بھی کہانی ہمیشہ شجاعت و بہادری کے گرد گھومتی رہی ہے۔ کوئی بھی معاشرہ ہو، ہر معاشرے میں اور ہر تہذیب میں جو اشخاص شجاع یا بہادر ہوتے تھے انھیں ہیرو کی حیثیت حاصل ہوتی تھی۔ یہاں تک کہ سردار اور بادشاہِ وقت بھی ایسے لوگوں کی ہمت افزائی کرتے رہے ہیں اور شجاع اور بہادروں کے ساتھ عزت و احترام کا سلوک کیا جاتا رہا ہے۔ مختلف ملکوں کے افسانوی ادب کا مطالعہ کیا جائے تو یہ ایک مشترک حقیقت نظر آئے گی کہ شجاعت کا تذکرہ بطورِ خاص ہوتا تھا اور بہادروں کی غیر معمولی عزت افزائی کی جاتی تھی۔ دنیا بھر کے کلاسیکی ادب میں بہادری اور شجاعت کی داستانیں، کہانیاں اور واقعات ایک اہم تاریخی سرمایہ ہیں۔ ایرانیوں کے ہاں رستم ان کا سپہ سالار تھا جو مسلمانوں کے مقابلے میں شکست کھا کر مارا گیا تھا۔ لیکن فردوسی نے شجاعت و بہادری کی داستانیں اُس سے وابستہ کر کے اُسے ایران کا ہیرو بنا دیا۔ ایسا ہیرو کہ برصغیر کے بعض مسلمان بھی، جو ایرانی زبان و ثقافت سے متاثر تھے، وہ سمجھنے لگے کہ رستم واقعی کوئی مسلمان بہادر تھا۔ چناں چہ ہمارے ہاں کے مسلمان پہلوان رستمِ زماں اور رستمِ ہند جیسے القاب کو اپنے لیے باعثِ امتیاز سمجھنے لگے۔

شجاعت بے شک مردانگی اور بہادری کا ایک ایسا وصف ہے جو انسان کو محترم اور معزز بنا دیتا ہے، لیکن اسلام سے پہلے جو مذاہب تھے انھوں نے شجاعت کو اس کا صحیح مقام عطا نہیں کیا تھا۔ بلکہ اسے ظلم و ستم اور خوں ریزی کا ذریعہ سمجھ کر اُس کی ہمت شکنی کرتے تھے۔ شجاعت اور بہادری کا اظہار ایک فطری انسانی داعیہ ہے۔ اسلام، جو دینِ فطرت ہے اور انسانی فطرت کی صحیح خطوط پر تربیت و تہذیب کا داعی ہے، اس جذبے کو فنا کرنے کو نہیں کہتا بلکہ اس کا رُخ اچھائی کی طرف موڑ دیتا ہے۔ اسلام نے پہلی بار یہ نکتہ واضح کیا کہ قوت و شجاعت کوئی بُری چیز نہیں ہے بلکہ یہ اچھے کارنامے اور خدمات انجام دینے کا بہترین وسیلہ ہے، اگر اسے صحیح طور پر کام میں لایا جائے۔ شجاعت کی مثال ایسی ہے جیسے تلوار یا دوسرے ہتھیار کہ یہ اگر نیک انسانوں کے ہاتھ میں ہوں تو مظلوموں کی حمایت اور ظلم کے تدارک کا

Marfat.com

کام کر سکتے ہیں اور اگر بُرے ہاتھوں میں ہوں تو قوموں کو آزادیوں سے محروم کرنے اور افراد کو مظالم کی چکّیوں میں پیسنے کے کام بھی آ سکتے ہیں۔ اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شجاعت کو سراہا اور اس کے موقعوں کی نشاندہی فرمائی اور بتایا کہ شجاعت کو حق کی مدد کرنی چاہیے اور باطل کو مٹانے کے لیے اسے کام میں لانا چاہیے۔ اگر مسلمان شجاعت کے وصف سے مُتّصِف نہ ہوں تو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فرض ادا نہیں کر سکتے ظلم و ستم کی روک تھام نہیں کر سکتے۔ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ جب تم بُرائی کو دیکھو تو اُسے قوت کے ساتھ مٹانے کی کوشش کرو۔ یہ عزیمت و دعوت کا اعلا مقام ہے۔ اسی لیے اس مقام کا حاصل کرنا صرف شجاع اور بہادر کے حصہ میں ہی آ سکتا ہے۔ ورنہ جو لوگ شجاعت سے محروم ہیں وہ زیادہ سے زیادہ دل ہی میں کڑھتے رہیں گے اور ایمان کے ضعیف ترین درجے پر قائم رہیں گے۔

مسلمانوں کو قرآن میں حکم دیا گیا ہے:

یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا لَقِیْتُمُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوْهُمُ الْاَدْبَارَ ۝ (الانفال: ۱۵)

یعنی: ”اے ایمان والو! جب تم کافروں سے میدانِ جنگ میں مقابل ہو تو ان کو پیٹھ مت دو۔“

اسی سورۂ انفال آیت (۴۵) میں مزید فرمایا:

یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا لَقِیْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا ....

یعنی: ”اے ایمان والو! جب تم کسی گروہ سے مقابل ہو تو ثابت قدم رہو۔“

سورۂ فتح میں اہل ایمان کے بارے میں فرمایا:

اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ (الفتح: ۲۹)

یعنی: ”وہ کافروں پر زور آور ہیں۔“

ظاہر ہے اس طرح کی ثابت قدمی، استقلال اور حق و صداقت پر قربان ہونے کا جذبۂ شجاعت کے بغیر پیدا نہیں ہو سکتا۔ یہاں یہ دل چسپ نکتہ بھی قابل ذکر ہے اور لائق غور کہ شجاعت کا انحصار ایمان باللہ پر ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جو مسلمان نہیں ہیں وہ شجاعت سے محروم ہیں۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ ایمان سے محروم ہیں اگر وہ شجاعت رکھتے ہیں تو یہ وصف درندوں کی شجاعت کے مانند ہوگا۔ کبھی اچھائی کے لیے بھی استعمال ہوگا، کبھی بُرائی کے لیے بھی۔ لیکن شجاعت جو ایمان باللہ سے پیدا ہوتی ہے وہ صرف خیر اور نیکی کے لیے ہی استعمال ہو سکتی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ ہر اچھے وصف کے لیے تمام سمجھ دار انسانوں کے لیے ایک مکمل اور واحد قابلِ تقلید نمونہ ہے۔ چنانچہ شجاعت کا وصف بھی حضورؐ میں بدرجۂ اتم موجود تھا۔ غزوۂ حُنین میں جب مشرکین نے آپؐ کو گھیر لیا تو آپ عزم و ثبات کے پہاڑ کی طرح اپنی جگہ پر کھڑے رہے

Marfat.com

اور یہ فرمایا "میں نبی ہوں۔ یہ جھوٹ نہیں ہے۔ میں عبدالمطلب کی اولاد ہوں" یہ وہ موقع تھا کہ غنیم کے تیروں کی بارش ہو رہی تھی اور اصحاب غلط فہمی کا شکار ہو کر دور چلے گئے تھے۔ مگر آپؐ کی شجاعت کا یہ حال رہا کہ اپنی جگہ سے جنبش نہیں فرمائی۔

غزوۂ بدر میں جب مسلمانوں پر مشرکین کی یورش بڑھی تو صحابہ کرامؓ نے دامنِ نبوت میں آکر پناہ لی۔ حضرت علیؓ اس معرکے کے بارے میں بتاتے ہیں کہ "بدر کے دن جب زور کارن پڑا تو ہم لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آڑ میں پناہ لی کہ آپؐ سب سے زیادہ شجاع تھے۔ مشرکین کی صف سے اس دن آپؐ سے زیادہ کوئی قریب نہ تھا۔"

حضرت انس بن مالکؓ کہتے ہیں کہ مدینے میں ایک دن شور ہوا کہ دشمن نے چڑھائی کر دی ہے۔ یہ سُن کر لوگوں نے مقابلے کی تیاری شروع کر دی، لیکن حضورؐ نے گھوڑے کی بے زین پشت پر سوار ہو کر تن تنہا تمام ممکن محاذوں پر گشت لگا لیا اور قبل اس کے کہ لوگ میدان میں آتے آپؐ نے انھیں بتا دیا کہ کوئی خطرہ نہیں ہے۔

رسولِ پاکؐ کی شجاعت کے جوہر صرف میدانِ کارزار ہی میں نہیں بلکہ آپؐ کی ساری زندگی میں عیاں رہے ہیں۔ آپؐ نے عرب کی سنگلاخ زمین میں اسلام کا جو پودا لگایا اور جسے آپؐ نے اپنے خون سے سینچا اور اس کی حفاظت میں جس طرح جان کی بازی لگا دی، یہ آپؐ کی بے نظیر شجاعت اور بے مثل بہادری کا ایک ایسا کارنامہ ہے جس کا مظاہرہ ایک نبی ہی کر سکتا تھا، جسے اپنی پشت پر اللہ کا ہاتھ ہونے پر پورا پورا بھروسا تھا۔

حضورؐ کا ارشاد ہے کہ پہلوان وہ نہیں ہے جو اپنے سے کم زور کو پچھاڑ دے بلکہ پہلوان وہ ہے جو غصّے کے وقت اپنے نفس پر قابو رکھے۔ اس ارشادِ گرامی کی روشنی میں ہم دیکھیں تو شجاعت کے لفظی اور اصطلاحی معنی میں بہت وسعت آجاتی ہے۔ شجاعت صرف دشمن سے بے باکانہ مقابلے ہی کو نہیں کہتے، شجاعت کے جوہر صرف میدانِ کارزار میں نہیں کھلتے، ان کے مظاہرے کا میدان، جنگ ہی نہیں ہے بلکہ شجاعت اخلاق بھی ہے۔ شجاعت طاقت بھی ہے۔ شجاعت دیانت بھی ہے اور امانت بھی۔ ایک انسان مصائب کی گرفت میں ہے اور کشمکشِ بقا کر رہا ہے۔ اس حال میں ایک انسان کا دوسرے انسان کے دکھ درد میں ہاتھ بٹانا بھی شجاعت ہے۔

Marfat.com

حلال روزی اللہ کا فضل ہے

انسان پر اللہ جل شانہٗ کا سب سے بڑا فضل و کرم یہ ہے کہ اللہ نے انسان کو گویائی سے نوازا ہے، یعنی اسے زبان عطا فرمائی ہے کہ وہ اُس کے ذریعہ سے اپنے ذہن و قلب کی بات دوسروں تک پہنچا سکتا ہے اور دوسرے انسانوں کی بات سمجھ کر افہام و تفہیم اور سمجھ بوجھ سے ایک ایسا معاشرہ قائم کر سکتا ہے کہ جس کی اساس اخلاق اور جس کی بنیاد امن اور محبت ہو اور اس سے بڑا فضل و کرم یہ ہے کہ انسان کو عقل عطا فرمائی ہے، فکر کی طاقت دی ہے، سوچنے کی صلاحیت عطا فرمائی ہے فیصلے پر قدرت بخشی ہے اور اس سے بڑا فضل و کرم یہ ہے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے اشرف المخلوقات کے مقام پر فائز کیا ہے۔ یعنی اس کرۂ ارض پر جتنی مخلوقِ خدا ہے انسان کو ہر ایک پر فضیلت حاصل ہے، ہر جاندار پر اسے برتری حاصل ہے اور ہر بے جان پر اسے قدرت عطا فرمائی ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے انسان کو نیک و بد، اچھے اور برے کی تمیز سکھائی ہے تاکہ وہ اس دنیا میں اپنے لیے سیدھے راستے اور صراطِ مستقیم کا فیصلہ کر سکے اور آخرت کا سامان کر سکے۔

آپ ذرا سی دیر کے لیے غور فرمائیے کہ اگر انسان کو یہ مرتبہ حاصل نہ ہوتا اور انسان کو تمام دوسری مخلوقات پر یہ برتری اور تفوّق حاصل نہ ہوتا تو اس انسان میں اور جانور میں کیا فرق ہوتا۔ اگر انسان گویائی، فہم و فراست، دانائی اور عقل و خرد سے محروم رکھا جاتا تو پھر وہ بھی ایک ایسا ہی حیوان ہوتا جیسے اس دنیا میں دوسرے حیوان ہیں۔ اگر انسان کو حیوان پر برتری حاصل ہے، اور ضرور حاصل ہے تو پھر اس برتری کا مظاہرہ بھی ضرور ہونا چاہیے اور انسان کو اپنے عمل اور اپنے کردار و اخلاق اور اپنے سلوک و اسلوب سے ثابت کرنا چاہیے کہ اسے حیوان پر برتری حاصل ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ بھوک اور پیاس کی حالت میں ایک حیوان اور جانور جہاں اسے کچھ ملتا ہے وہیں منہ ڈال دیتا ہے۔ کسی کا مال ہو وہ ہڑپ کر جاتا ہے اور اسے اس کے جائز و ناجائز ہونے

Marfat.com

میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ وہ حرام و حلال میں کوئی تمیز نہیں کر سکتا، کیوں کہ وہ حیوان محض ہے، عقل سے خالی ہے، فہم سے عاری ہے۔

• ایک بزرگ تھے وہب ابن الوذود، ان کا مزاج یہ تھا کہ وہ کوئی چیز نہ کھاتے تھے نہ پیتے تھے جب تک یہ معلوم نہ ہو جاتا تھا کہ وہ چیز اُن تک کن ذرائع سے پہنچی ہے۔ ایک دن ان کی والدہ نے دودھ کا پیالہ پینے کو دیا۔ آپ نے پوچھا: یہ دودھ کہاں سے آیا ہے؟ اس کی قیمت کہاں سے ادا ہوئی اور کس شخص سے خریدا گیا ہے؟ ابن الوذود یہ سب کچھ معلوم کر چکے مگر اطمینان پھر بھی نہ ہوا۔ آخر میں پوچھا کہ بکری نے جس کا یہ دودھ ہے چارا کہاں کھایا تھا۔ انھیں معلوم ہوا کہ اس بکری نے ایک ایسی چراگاہ سے گھاس کھائی تھی جس پر مسلمانوں کا کسی طرح بھی کوئی حق نہ تھا لہٰذا انھوں نے دودھ پینے سے انکار کر دیا۔

والدہ معظمہ کے اصرار پر فرمایا:

بے شک اللہ رحمٰن ہے اور رحیم ہے۔ وہ رحمت کرنے والا ہے، میں اس کی رحمت کو گناہ سے آلودہ نہیں کر سکتا۔

حضرت عیسٰی علیہ السلام نے ایک شخص کو دیکھا اور اس سے پوچھا:

کیا کام کرتے ہو؟

اس نے کہا: عبادت کرتا ہوں۔

حضرت نے فرمایا: کھانا کہاں سے کھاتے ہو؟

اس نے جواب دیا: میرا ایک بھائی ہے جو مجھے کھانا کھلاتا ہے۔

فرمایا: تو پھر تمھارا بھائی تم سے زیادہ عبادت گزار ہے۔

ان دو حکایتوں سے چند نہایت اہم نکات واضح ہوئے ہیں:

سب سے اہم نکتہ حلال روزی کا پیدا ہونا ہے۔ یعنی حلال روزی وہ کہ انسان اسے اپنی محنت سے پیدا کرے، اور حلال روزی وہ ہے جو قطعی جائز ذرائع سے کمائی جائے۔ اسلام اپنے پیروؤں کو دولت کمانے کی اجازت دیتا ہے مگر اس شرط کے ساتھ کہ کمائی کے طریقوں میں اجتماعی مفاد کے لحاظ سے جائز اور ناجائز کا امتیاز قائم کیا جائے۔ یہ امتیاز اس قاعدۂ کلیہ پر مبنی ہے کہ کمائی کے وہ تمام طریقے اور راستے ناجائز ہیں جن میں ایک شخص کا فائدہ دوسرے شخص یا اشخاص کے نقصان سے ہو۔ اور کمائی کا ہر وہ طریقہ جائز ہے جس میں فوائد کا مبادلہ اشخاص کے درمیان منصفانہ طور پر ہو۔

Marfat.com

قرآن مجید و فرقان حمید نے اس قاعدۂ کلیہ کو اس طرح بیان کیا ہے:

یَاۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَاۡكُلُوۡۤا اَمۡوَالَكُمۡ بَیۡنَكُمۡ بِالۡبَاطِلِ اِلَّاۤ اَنۡ تَكُوۡنَ تِجَارَةً عَنۡ تَرَاضٍ مِّنۡكُمۡ وَلَا تَقۡتُلُوۡۤا اَنۡفُسَكُمۡ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمۡ رَحِیۡمًا ۝ وَمَنۡ یَّفۡعَلۡ ذٰلِكَ عُدۡوَانًا وَّظُلۡمًا فَسَوۡفَ نُصۡلِیۡهِ نَارًا ؕ

(النساء: ۲۹-۳۰)

یعنی "اے ایمان والو! آپس میں ایک دوسرے کے مال ناروا طریقوں سے نہ کھایا کرو، بجز اس کے کہ تجارت ہو آپس میں رضامندی کے ساتھ اور تم خود اپنے آپ کو (یا آپس میں ایک دوسرے کو) ہلاک نہ کرو۔ اللہ تمہارے حال پر مہربان ہے۔ جو کوئی اپنی حد سے تجاوز کر کے ظلم کے ساتھ ایسا کرے گا اس کو ہم آگ میں جھونک دیں گے۔"

قرآن مجید میں مختلف مقامات پر اکتسابِ مال کی جن صورتوں کو حرام قرار دیا گیا ہے وہ یہ ہیں:

رشوت، غصب، خیانت، چوری، یتیم کے مال میں بے جا تصرف، ناپ تول میں کمی، فحاشی پھیلانے والے ذرائع کا کاروبار، قحبہ گری اور بدکاری کی آمدنی، شراب کی صنعت، جُوا، بت گری، بت فروشی، بت خانوں کی خدمت، قسمت بتانے اور فال گیری کا کاروبار اور سود خوری۔

ان تمام ذرائع سے جو روزی حاصل ہو اسلام ان سب کو حرام قرار دیتا ہے۔ حلال روزی صرف اسی طرح حاصل ہو سکتی ہے کہ انسان محنت کرے، دیانت و امانت کو پیش نظر رکھے، کسی کا حق نہ مارے، کسی کو تکلیف نہ دے، فرائض اور حقوق کا خیال رکھے اور یہ سمجھ لے کہ اللہ تعالیٰ ہی رازق ہے اور وہی اکلِ حلال کا سامان کرتا ہے۔ پس اللہ ہی سے صراطِ مستقیم کی استدعا کرے۔

قناعت اور دیانت حلال روزی کے بنیادی نکتے ہیں۔ قناعت یہ ہے کہ انسان اپنی ضرورتوں کو جائز حدود میں رکھے اور ہوائے نفس میں گرفتار نہ ہو، جو اللہ نے دیا ہے اس پر صبر و شکر کرے۔ جب دیانت و امانت کا نکتہ انسان کے ذہن میں رہتا ہے اور اسے یہ احساس ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ پر سب حال روشن ہے اور اللہ ہر چیز کو جانتا ہے، تو انسان روزی کمانے کے جائز ذرائع ہی اختیار کرتا ہے اور پھر قناعت اس کا مزاج بن جاتی ہے۔

سورۃ المؤمنون میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے جس کو سرورِ کائنات فخرِ موجودات ﷺ نے

Marfat.com

امت تک پہنچا دیا ہے کہ :

" اے پیغمبرو! حلال چیزیں کھاؤ اور نیک عمل کرو"۔

اعمالِ صالح انسان کو راہ راست پر رکھتے ہیں اور وہ حلال و حرام میں تمیز کرنے کے قابل رہتا ہے۔ لیکن یہ بات کبھی فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ اگر انسان حلال کی تمیز سے غافل ہو کر حرام کھانے لگے تو وہ اعمالِ صالح سے بھی محروم ہو جاتا ہے۔

میں نے جناب وہب ابن الورد کی مثال دی ہے کہ انھوں نے اس بکری کا دودھ پینے سے انکار کر دیا جس نے ایک ایسی چراگاہ سے اپنا پیٹ بھرا تھا جس پر مسلمانوں کا کوئی حق نہ تھا۔ اکلِ حلال کی یہ معراج ہے اور ہمارے لیے نمونۂ عمل ہے۔ ہمیں اس کا اتباع کرنا چاہیے کہ یہی ہمارے لیے راہِ نجات ہے۔

حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ حضورؐ نے ارشاد فرمایا کہ کوئی بندہ حرام مال کمائے پھر اس میں سے اللہ کی راہ میں صدقہ کرے تو یہ صدقہ اس کی طرف سے قبول نہیں کیا جائے گا اور اگر اپنی ذات اور گھر والوں پر خرچ کرے گا تو برکت سے خالی ہوگا۔ اور اگر وہ اس کو چھوڑ کر مرا تو وہ اس کے لیے جہنم کے سفر میں زادِ راہ بنے گا۔ اللہ برائی کو برائی کے ذریعہ سے نہیں مٹاتا ہے بلکہ برے عمل کو اچھے عمل سے مٹاتا ہے۔

حضور سرورِ کائناتؐ کے اس قولِ فیصل کے بعد ہم کو اپنے حالات کا جائزہ لینا چاہیے اور اگر ہم غلط راہوں پر چل رہے ہیں تو سیدھی راہ اختیار کر لینا چاہیے اور سمجھ لینا چاہیے کہ قانونِ فطرت اور اصولِ قدرت یہ ہے کہ انسان نیک عمل کرے، بھلائی کی راہ اختیار کرے، انسان انسان سے محبت کرے اور کوئی تکلیف نہ پہنچائے، اپنی روزی حلال ذرائع سے کمائے، اپنی محنت سے پیدا کرے اور جو مل جائے اس پر قناعت کرے۔ دیانت و امانت ہاتھ سے نہ جانے دے۔ بے شک اللہ کے ایسے بندوں کے لیے برکت ہی برکت ہے۔

جو لوگ غلط راستے اختیار کرتے ہیں، ہم نے دیکھ لیا ہے کہ وہ کبھی خوش اور مطمئن نہیں رہ سکتے۔ وہ اس دنیا میں بھی بالآخر خوار ہوتے ہیں اور آخرت میں بھی ان کے لیے سزا ہی سزا ہے۔ حلال روزی اللہ تبارک و تعالیٰ کا فضل ہے۔ یہ اللہ کا انعام ہے۔ اللہ تمام مسلمانانِ عالم کو اعمالِ صالح کی توفیق عطا فرمائیں اور حلال روزی کے ذریعہ سے ہم پر اپنا فضل و رحم فرمائیں۔

Marfat.com

دیانت

ہر انسان ایک ایسے مُعاشرے کی تمنّا کرتا ہے جس میں امن و امان ہو، محبت و آشتی ہو، ہمدردی اور یگانگت کی فضا ہو۔ ہر انسان چاہتا ہے کہ تمام انسان امن و سکون کی زندگی بسر کریں، کسی سے کسی کو شکایت نہ ہو۔ انسانی مُعاشرے کا جو بہترین تصوّر قائم کیا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ ہر شخص کے دل میں اَبنائے جنس کی سچّی محبّت ہو، وہ آپس میں شیر و شکر ہو کر رہیں، ایک دوسرے کے دست و بازو بن کر رہیں، ایک دوسرے کے بھائی بن کر رہیں۔

سُوال یہ ہے کہ اس نیک اور پاک تمنّا کو حاصل کرنے کے لیے کون سی چیز ضروری ہے اور وہ کون سا عنصر ہے جس کے فُقدان کی وجہ سے یہ مطلوبہ ماحول پیدا نہیں ہو رہا ہے جس کی تمنّا میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اس سلسلے میں کئی اہم عناصر کی نشان دہی کی جا سکتی ہے لیکن ان تمام عناصر و عوامل کا تجزیہ کیا جائے تو بنیادی عُنصر "دیانت" ہی ثابت ہو گا۔ ہمیں باور کرنا چاہیے اور یقین کہ یہ فرشتوں کا ماحول اِنسانی بستی میں اُس وقت قائم ہو سکتا ہے کہ جب دیانت کی عمل داری ہو اور مُعاشرے کا ہر فرد دیانت کے وصف کی سختی سے پابندی کرتا ہو۔

آپس کے لین دین کے مُعاملوں میں دیانت کو مرکزی حیثیت حاصِل ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر شخص مُعاملات میں دوسروں کے حُقوق کی ادائی کا بھی اتنا ہی اہتمام کرے جتنا وہ اپنے حقوق کے حاصل کرنے کی تمنّا یا جِدّ و جَہد کرتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر تمام انسان دوسروں کے حقوق پورے اہتمام کے ساتھ ادا کریں، یعنی جس کا جس کسی پر جتنا حق پہنچتا ہو اُسے پُوری امانت اور پوری دیانت کے ساتھ رتّی رتّی ادا کر دیں تو ہم اسے دیانت کہتے ہیں۔ عَربی زبان میں اسی معنی میں امانت کا لفظ بھی ادا ہوتا ہے۔

انسان کے تعلّقات دوگونہ ہیں۔ ایک اپنے خالق اور رب کے ساتھ اور دُوسرے ابنائے جنس کے ساتھ۔ اس میں شک نہیں کہ تیسرے نمبر پر کائنات کی تمام دوسری مخلوقات کو بھی شمار کیا جا سکتا ہے۔ اسلام چوں کہ کامل اور مکمل اور اَبد تک کے لیے ایک ناقابل تبدیل ضابطۂ حیات ہے اس لیے اسلام میں ہر وہ چیز اور ہر وہ عنوان موجود ہے کہ جو قابلِ غور و فکر

Marfat.com

ہو سکتا ہے اور حسن کا تصوّر کیا جاسکتا ہے، مگر جہاں تک "دیانت" کے وصف اور اس کے اثرات کا تعلق ہے اس کا زیادہ اہتمام خالقِ ارض وسما اور ابنائے جنس کے ساتھ تعلقات ہی پر مبنی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ دیانت برتنے کا مطلب یہ ہے کہ پورے اخلاص اور جاں فشانی کے ساتھ اس کی شریعت پر چلنے اور اُسے نافذ کرنے کا اہتمام کیا جائے۔ سورۂ احزاب میں اللہ تعالیٰ نے بطورِ خاص شریعتِ الٰہی کو امانت سے تعبیر کیا ہے جو انسانوں کے سپرد کی گئی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَن يَحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْإِنسَانُ ط

(احزاب - ۷۲)

یعنی "ہم نے (خلافتِ ارض کی) اس امانت کو آسمانوں، زمین اور پہاڑوں کے آگے رکھا تو اُن میں سے کوئی اس کا بوجھ اٹھانے کو تیار نہ ہوا اور یہ سب اُس سے ڈر گئے مگر انسان نے یہ بوجھ اٹھا لیا۔"

اس کا مطلب یہ ہے کہ ہماری دیانت یہ تقاضا کرتی ہے کہ ہم اس پر پوری طرح عمل پیرا ہونے کی کوشش کریں۔

رسول اکرمؐ کی حیاتِ طیبہ تمام اچھے انسانوں کے لیے مشعلِ راہ ہے۔ جو لوگ بھی نیک اوصاف کے ساتھ دنیا میں زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں انھیں سوائے رسول اللہؐ کے کوئی دُوسرا نمونہ اس دنیا میں نظر نہیں آسکتا۔ اس کے علاوہ اگر کچھ ہے تو وہ نامکمل ہے اور ناقابلِ اعتبار۔ یہاں اخلاق کا ہر وصف مکمل، مفصّل اور حد سے زیادہ قابلِ اعتماد ہے۔ آں حضرتؐ کے بنیادی اوصاف میں "دیانت" کا وصف ابتدا ہی سے نمایاں رہا۔ چناں چہ جب آپؐ منصبِ نبوّت پر فائز ہوئے تو آپؐ نے بار بار اس وصف کا حوالہ دے کر مخاطبین کو مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ اکثر پیغمبروں کی صفت میں بھی یہ لفظ قرآن میں آیا ہے کہ انھوں نے اپنی اپنی اُمّت سے یہ کہا کہ میں تمھارے لیے امانت دار قاصد ہوں:

إِنِّي لَكُمْ رَسُولٌ أَمِينٌ۔

یعنی "جو پیغام مجھے اللہ سے ملا ہے وہ دیانت و امانت کے ساتھ تمھیں پہنچا رہا ہوں۔"

آں حضرتؐ میں یہ وصف اس حد تک نمایاں تھا کہ نبوّت سے پہلے بھی مکّہ والے آپؐ کو امین یعنی دیانت دار کہتے تھے۔

آج ساری کی ساری دنیا یہ تسلیم کرتی ہے اور ہر مذہب و قوم کا دیانت دار انسان یہ گواہی دے رہا ہے کہ محمّد رسول اللہؐ اس کائناتِ ارضی کے سب سے بڑے انسان تھے۔

Marfat.com

وہ ایک ایسے انسان تھے کہ جنھوں نے اس دنیا کے فکر و نظر میں ایک انقلابِ دیانت برپا کر دیا۔ اللہ تعالیٰ کے رسولؐ ایک ایسی شخصیت تھے کہ جنھوں نے ہماری اس دنیا کے ہر ماحول اور ہر معاشرے کو متاثر کیا ہے اور اندازِ فکر و عمل کو بدل کر رکھ دیا ہے۔

ہم گہرائی اور گیرائی کے ساتھ غور کریں تو اس انقلاب میں بنیادی چیز امانت و دیانت ہے جو اللہ تعالیٰ کے رسولِ مقبولؐ اور اس کائنات کے سب سے بڑے انسان کا طرۂ امتیاز تھا۔ تاریخ گواہ ہے اور حالات و واقعات شاہد کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی ایک لمحۂ زندگی اور کوئی ایک دقیقۂ حیات امانت و دیانت سے خالی نہ تھا۔

ایک بار کا ذکر ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص سے کچھ کھجوریں قرض لیں۔ چند روز بعد وہ شخص تقاضے کو آیا۔ آپؐ نے ایک انصاری صحابی کو حکم دیا کہ وہ اس کا قرض ادا کر دیں۔ انھوں نے تعمیلِ حکم کی، لیکن کچھ کھجوریں ویسی عمدہ نہ تھیں جیسی اس نے دی تھیں۔ اُس شخص نے لینے سے انکار کر دیا۔ انصاری نے کہا کہ تم رسول اللہؐ کی عطا کردہ کھجوروں کے لینے سے انکار کرتے ہو! وہ شخص بولا، "ہاں، رسول اللہؐ عدل نہ کریں گے تو اور کون کرے گا۔"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ مکالمہ سُنا تو آپؐ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور ارشاد فرمایا "یہ شخص سچ کہہ رہا ہے!"

اِس ایک واقعے سے، جو عام زندگی کا ایک واقعہ ہے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اللہ کے رسولؐ مُعاملات میں کس درجہ پاک صاف تھے اور دیانت و امانت کا کس درجہ پاس و لحاظ فرماتے تھے۔

اپنے خالق و مالک اور اپنے رب کے ساتھ دیانت داری کا مطلب یہ ہے کہ ہم اُس کی شریعت پر عمل کریں اور اُسے نافذ کرنے کی کوشش کریں۔ اسی طرح اپنے ابنائے جنس یعنی دوسرے انسانوں کے ساتھ دیانت کا مطلب یہ ہے کہ اُن کے جو حقوق ہم پر عائد ہوتے ہیں انھیں بے کم و کاست پورا کرنے کی کوشش کریں۔

قرآن حکیم میں ارشاد ہے:

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا ۙ (النساء - ۵۸)

یعنی "اللہ تمھیں حکم دیتا ہے کہ امانت داروں تک ان کی امانتیں پہنچا دیا کرو۔"

ہم پر سب سے بڑا فرض ماں باپ کی خدمت ہے۔ ہر انسان پر واجب ہے کہ وہ اُن کے حقوق کی ادائی میں کسی طرح کی کوتاہی نہ کرے۔ یہی دیانت کا تقاضا ہے۔ اسی طرح رشتے داروں کے حقوق ہیں۔ مسلمانوں کے حقوق ہیں۔ عام انسانوں کے حقوق ہیں ——— اچھے اور دیانت دار انسان

Marfat.com

اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ تمام حقوق پوری امانت داری کے ساتھ ادا کریں۔ کسی نے کوئی چیز امانتاً رکھوائی ہے تو اُسے اُسی طرح واپس کیا جائے۔ ماتحتوں کے جو حقوق ہیں انھیں پورا پورا ادا کیا جائے۔ ملازمت کی شرائط کے مطابق اپنا فرض ادا کیا جائے۔ تجارت میں خرید و فروخت کے جو اسلامی آداب ہیں اُنھیں ملحوظ رکھا جائے۔ اگر قوم اپنا قائد چُن لے تو حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ کے نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش کی جائے۔ یہ تمام باتیں دیانت کے تقاضوں میں شامل ہیں۔

اگر غور کیا جائے تو انسانی مُعاشرے میں جو بھی افراتفری نظر آتی ہے وہ صرف اس لیے ہے کہ مُعاشرے کے وہ افراد جن کے کردار کا براہِ راست اثر عوام پر پڑتا ہے وہ دیانت کے اصول پر پوری طرح کاربند نہیں ہیں۔ ہم میں سے ہر شخص کا فرض ہے کہ دیانت کو اپنائے اور مُعاملات میں اُسے سنگِ بنیاد بنالے۔ اگر ایسا ہو تو مُعاشرہ امن و سکون کا گہوارہ بن جائے گا۔ اور مملکتِ خداداد پاکستان نمونۂ جنّت بن جائے گی۔

اس کے برخلاف اگر مُعاملات کی بنیاد امانت و دیانت پر نہ ہو تو مُعاشرہ صحت مند مُعاشرہ نہیں کہا جاسکتا۔ افرادِ مُعاشرہ کبھی اِطمینان و سکون کا سانس نہیں لے سکتے۔ دیانت ہی سے افرادِ مُعاشرہ میں باہمی اعتماد پیدا ہوتا ہے اور اعتماد اچھے تعلقات کی بنیاد ہے۔ آنحضرتؐ اس وصف کا اس حد تک اہتمام فرماتے تھے کہ جب دشمنوں نے آپؐ کے مکان کا محاصرہ کرلیا اور آپؐ کی جان کے درپے ہوگئے اُس وقت آپؐ کے پاس اہلِ مکّہ کی جو امانتیں تھیں آپؐ نے انھیں اہلِ امانت کے حوالے کرنے کا انتظام فرمادیا۔ آپؐ نے یہ چیزیں حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کے حوالے کردیں اور انھیں یہ تاکید کی کہ پہلے لوگوں کی امانتیں ان کو واپس کریں اور پھر مدینے آئیں۔ امانت و دیانت کا یہ بڑا عجیب اور بے مثل واقعہ ہے۔

یہ واقعہ تو نبوّت کے بعد کا ہے، اس عظیم منصب پر فائز ہونے سے قبل بھی آپؐ سراپا دیانت کا ایک نمونۂ کامل تھے۔ چناں چہ رسالت کی ذمہ داری سونپے جانے کے بعد جب آپؐ کو عام تبلیغ کا حکم ہوا تو آپؐ نے لوگوں سے سب سے پہلے یہ سوال کیا کہ میری امانت و دیانت کے متعلق کیا رائے ہے؟ سب نے بالاتفاق شہادت دی کہ آپؐ ہمیشہ سے سچے اور دیانت دار رہے ہیں اور ہمیں آپؐ پر پورا بھروسا ہے۔

یہ تھا کردار ہمارے رسولؐ کا جو کائنات کے لیے رحمت و رافت بنا کر بھیجے گئے تھے۔ ہم مسلمانوں کا فرض ہے کہ آں حضرتؐ کے اُسوۂ حسنہ کو حرزِ جاں بنائیں اور آپؐ کے اخلاقِ حمیدہ کو اپنائیں۔ سچائی اور دیانت انسانی اخلاق کے بنیادی وصف ہیں۔ اس لیے ہم پاکستانی

Marfat.com

مسلمانوں کا اوّلین فرض ہے کہ ہم اپنے مُعاشرے میں دیانت داری کا چلن عام کرنے کی کوشش کریں، تاکہ دنیا کی نگاہ میں ہمیں عزّت و احترام حاصل ہو اور اس طرح ہمارے ذریعہ سے اسلامی شریعت کی برتری قائم ہو۔ لوگ یہ محسوس کریں کہ یہی وہ نظامِ حیات ہے جو دُنیا کو امن و سکون بخش سکتا ہے۔

Marfat.com

کاروباری دیانت

دیانت کی بنیاد یہ ہے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ کے ہر وقت اور ہر جگہ حاضر اور موجود ہونے پر یقین ہو اور اس بات پر ایمان ہو کہ اس کی کسی حرکت اور اس کے کسی عمل سے اللہ غافل نہیں ہے۔ یہ ایمان اور یہ یقین آدمی میں یہ احساس پیدا کرتا ہے کہ جو کام اس کے ذمّے کیا جائے یا جس ذمّے داری کا بوجھ وہ اٹھائے اسے اس طرح پورا کرے کہ گویا کوئی چوکس اور ہمہ وقت بیدار اور باخبر نگراں اُس پر نگہبان ہے۔ ایسے ایمان سے اور اس یقین سے جس انسان کا دل معمور ہو وہ کوئی کام غیر ذمّہ داری سے، تھڑدلی کے ساتھ اور ٹالنے کے انداز میں نہیں کرے گا، کیوں کہ اُسے اس بات کا یقین ہوگا اور خوف کہ اللہ سمیع و بصیر اور اللہ علیم و خبیر ہر وقت اسے دیکھ رہا ہے اور اس کی ہر غفلت اور ہر خیانت پر نظر رکھے ہوئے ہے۔ یہ ایمان انسان میں ذمّہ داری کا ایسا احساس پیدا کر دیتا ہے جس کی وجہ سے آدمی خود اپنا نگراں ہو جاتا ہے۔ یہ دیانت کا وہ مفہوم ہے جو اللہ کو مطلوب ہے۔ یہ احساس انسان کی اہلیت اور اس کی کارکردگی میں ایسی خوبی پیدا کر دیتا ہے کہ جس ملت کے افراد اس خوبی کے حامل ہو جائیں اس کا مقابلہ دنیا کی کوئی بڑی سے بڑی طاقت نہیں کر سکتی۔ مسلمان کا یہی امتیاز تھا اور اہلِ اسلام کا یہی کیریکٹر تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے سرنگوں ہوئے تو ہر طاقت ان کے سامنے سرنگوں ہو گئی اور وہ خود دنیا کی بڑی طاقت بن گئے۔ دیانت اور امانت نے ان کو اقوام و مللِ عالم میں سربلند اور سرفراز بنا دیا۔

میں جو بات آپ کے ذہن نشین کرانا چاہتا ہوں اور جو بات میں آپ کے دل میں اتارنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ دیانت داری کا تعلق براہِ راست اللہ تعالیٰ کی ذات اور ہمہ گیر وجود سے ہے اور اس کے ہمہ وقت اور ہر کام پر مطلع رہنے کے عقیدے سے ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دیانت اور ایمان لازم و ملزوم ہیں حضورؐ کا ارشاد ہے:

"جس میں دیانت نہیں اس میں ایمان نہیں۔"

کاروبار ہو یا تجارت، صنعت ہو یا حرفت اس میں دیانت و امانت کا مفہوم اور نقطۂ فکر اور طرزِ عمل یہ ہونا چاہیے کہ انسان کے یہ اعمال بنیادی طور پر انسان کی فلاح اور خیر کے لیے ہیں۔ ایک انسان جب صنعت و حرفت کے میدان میں داخل ہو یا کاروبار و تجارت کی دنیا میں قدم

Marfat.com

رکھے تو اس کے دل و دماغ میں بنیادی طور پر پوری دیانت و امانت کے ساتھ یہ بات ہونی چاہیے کہ وہ ایسی اشیا بنائے گا کہ جن سے انسانوں کو فائدہ پہنچے اور جن سے انسان کی حقیقی ضروریات کما حقہ پوری ہوں۔ یہ اشیا کسی بھی درجے میں مضر ہوں نہ ناقص۔

اِس یقین کے ساتھ کہ اللہ سمیع و بصیر ہے، سننے اور دیکھنے والا ہے، اس ایمان کے ساتھ کہ اللہ علیم و خبیر ہے، جاننے والا ہے اور خبردار، انسان جب اس ذوق و شوق کے ساتھ صنعت و تجارت کو اپناتا ہے کہ اس سے انسان کی فلاح و خیر کا سامان کرے گا تو صنعت ہو یا تجارت کسی عنوان اُس میں بددیانتی کا دخل نہیں ہو سکتا۔ میری رائے میں ہر تجارت و کاروبار اور ہر صنعت و حرفت کا بنیادی مفہوم و مطلب اور اس کی غرض و غایت فقط یہ ہونی چاہیے کہ تجارت و صنعت سے انسان کی فلاح و خیر کا سامان ہو۔ ہر انسان کو اور ہر پاکستانی کو اس بلندی پر فائز ہونا چاہیے۔

ہمارے دینِ اسلام کا یہ درس ہے کہ انسان انسان سے محبّت کرے۔ اسلام نے انسان کو مشرف کیا ہے اور شرفِ آدم کو اہمیت دی ہے اور انسان کی خدمت کو درجۂ عبادت دیا ہے۔ اسلام کے رہ نما اصول یہ ہیں کہ معاشرے کی بنیاد فلاح پر قائم ہو اور مساوات اس کی شان ہو۔ بے شک انسان کی اپنی ضرورتیں ہوتی ہیں۔ جائز حدود میں ان ضرورتوں کو پورا ہونا چاہیے۔ بایں ہمہ ہر انسان کو قناعت کی راہ اختیار کرنی چاہیے۔ یہ واضح حکم ہے کہ اپنی ضرورت سے جو مال زیادہ ہو وہ مُعاشرے کے دوسرے افراد کی فلاح پر خرچ ہونا چاہیے۔ ایک تاجر اور صنعت کار کا یہ حق ہے کہ وہ اپنی تمام جائز ضرورتیں پوری کرے مگر اس کو اپنے اس فرض سے بھی غافل نہیں ہونا چاہیے کہ اس کی تجارت و صنعت دوسروں کے لیے وجہِ خیر ہو اور انسانیت کے لیے سببِ فلاح ہو۔

کوئی صنعت اور کوئی تجارت آجر و اجیر کے اِمتزاج اور مالک و مزدور کے اتفاق کے بغیر معرضِ وجود میں نہیں آسکتی۔ فلاح و خیر کی راہیں یہاں سے پھوٹتی ہیں۔ اسلامی قانون اس ذیل میں واضح احکامات رکھتا ہے۔ وہ آجر و اجیر، صنعت کار و مزدور ان دونوں کے حقوق اور فرائض متعیّن کرتا ہے۔ تجارت و صنعت فلاح و خیر کے مراکز ہیں۔ خود ان میں فلاح و خیر کا سامان ہونا چاہیے۔ بے شک مزدور کی اُجرت اس کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے ادا کرنی چاہیے، لیکن مزدور کو بھی پسینہ آنا چاہیے، مزدوری اُسی وقت واجب ہو سکتی ہے۔ اگر کوئی قانون و دستور اُجرت اور پسینے کو لازم و ملزوم قرار نہیں دیتا تو وہ قابلِ اصلاح ہے۔ ہمارے مراکزِ صنعت و

Marfat.com

تجارت میں خیر و فلاح کو راہ ملنی چاہیئے تاکہ من حیث المجموع ملّت کی فلاح و خیر کا سامان ہو اور یہ اُسی وقت ممکن ہے کہ امانت اور دیانت کی اُس روشنی کو ہم قبول کریں کہ جو اسلام نے ہمیں عطا کی ہے۔

کاروباری دیانت کی ابتدا اس سے ہوتی ہے کہ ہم سب سے پہلے اشیائے صنعت و تجارت کے معیارات پوری تخلیقی دیانت کے ساتھ متعین کریں اور ایک بار جو معیارات اور پیمانے مقرّر کر لیے جائیں پوری دیانت و امانت کے ساتھ ان معیارات کو قائم رکھیں اور ان میں جلبِ زر کی خواہشات کے زیرِ اثر کوئی تبدیلی نہ کریں۔ معاشی دیانت اور انصاف کے ذیل میں قرآنِ مجید و فرقانِ حمید نے بڑی واضح باتیں کی ہیں۔ تجارتی مُعاملات میں بددیانتی کو بُرا کہا ہے اور اس کو عذاب قرار دیا ہے۔ سورۂ الاعراف کی ایک آیتِ کریمہ کا مطلب یہ ہے کہ حضرت شعیبؑ نے کہا:

ترجمہ: ”اے برادرانِ قوم! اللہ کی بندگی کرو۔ اُس کے سوا تمھارا کوئی خدا نہیں ہے۔ تمھارے پاس تمھارے رب کی صاف رہنمائی آگئی ہے۔ لہٰذا اوزان اور پیمانے پورے کرو، لوگوں کو اُن کی چیزوں میں گھاٹا نہ دو۔“

ایک طرف ناپ تول اور وزن اور پیمانے میں دیانت پر زور دیا ہے تو اسلام بنیادی طور پر اور قطعی طور پر کسبِ مال میں حرام اور حلال کا امتیاز کرتا ہے اور اصرار کرتا ہے کہ راہِ حق اور راہِ نجات صرف یہ ہے کہ دولت حلال طریقوں سے حاصل کی جائے۔ سورۃ النساء میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

ترجمہ: ”اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، آپس میں ایک دوسرے کے مال باطل طریقوں سے نہ کھاؤ مگر یہ کہ تجارت ہو تمھاری آپس میں رضامندی سے۔“

کاروباری دیانت کا ایک رُخ یہ ہے کہ اشیائے تیار کردہ کی قیمتیں جائز حُدود میں رکھی جائیں اور صارفین پر ناجائز بار نہ ڈالا جائے۔ بلاشبہ اس دیانت کو آجر و اجیر کا صحیح امتزاج برقرار رکھ سکتا ہے۔ اس کے باوجود اقتدارِ اعلا کو بھی مُعاشرے کے ہر پہلو پر غور کر کے اصلاحِ حال کا فرض ادا کرنا چاہیے۔ آج کے دَور میں معاشیات اور اقتصادیات کا یہ بڑا سنگین مسئلہ ہے۔ ہم جانتے ہیں اور اب تو ساری دُنیا تسلیم کرتی ہے کہ اس میدان میں اسلام نے انتہائی فطری اور قطعی قابلِ عمل روشنی دی ہے۔ پاکستان کے بھی اقتصادی اور معاشی مسائل صرف عمل سے حل ہوں گے اسلام صرف

Marfat.com

رکوع و سجود سے بحث نہیں کرتا، وہ مسجد کے باہر کے معاملات میں بھی ہماری رہنمائی کرتا ہے تجارت بظاہر دنیاداری نظر آتی ہے، لیکن حضور نبی اکرمؐ کا ارشاد ہے کہ اگر کوئی تاجر دیانت و امانت کا دامن نہ چھوڑے تو وہ قیامت کے دن انبیا، صدیقین اور شہیدوں کے ساتھ ہوگا۔ حدیث کے الفاظ ہیں: "اَلتَّاجِرُ الصَّدُوقُ الْاَمِیْنُ مَعَ النَّبِیِّیْنَ وَالشُّھَدَاءِ"۔

امام غزالیؒ نے حضرت عمر فاروقؓ کا یہ قول نقل فرمایا ہے:

"کوئی مقام مجھے بہتر نظر نہیں آتا جہاں میں مرنا پسند کروں: بجز ایسے مقام کے جہاں میں اپنے بال بچوں کے لیے خرید و فروخت کرسکوں"۔

حضرت ابراہیم بن ادھمؒ نے اس کی تشریح فرمائی ہے۔ اُن سے کسی نے دریافت کیا: "آپ ایسے آدمی کو پسند کرتے ہیں کہ جو کاروبار میں دیانت دار ہو یا ایسے آدمی کو کہ جو خود کو زہد و عبادت کے لیے وقف کر دے؟"

انھوں نے فرمایا: "میری رائے میں سچا تاجر عابد و زاہد پر فضیلت رکھتا ہے"۔

سوال ہوا، کیوں؟ جواب: تاجرِ صادق کو اس وجہ سے فضیلت حاصل ہے کہ وہ ہر وقت شیطان کا مقابلہ کرتا رہتا ہے۔ شیطان اُسے ناپ تول اور لین دین میں گم راہ کرنے کی کوششیں کرتا ہے مگر یہ تاجرِ صادق اُس کے سامنے سرِ تسلیم خم نہیں کرتا۔

حاصلِ کلام یہ کہ صنعت و تجارت فلاح و خیر کے لیے ہونی چاہیے۔ صنعت و تجارت اور کاروبار میں دیانت و امانت کو مشعلِ راہ بنانا چاہیے۔

اے اللہ رحیم و کریم! ہمیں سیدھی راہ پر چلائیے!

Marfat.com

عدل و احسان

سورۂ نحل میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ

یعنی: بے شبہ اللہ انصاف اور احسان برتنے کا حکم دیتا ہے۔

یہ آیتِ کریمہ جمعے کے ہر خطبے میں دہرائی جاتی ہے، لیکن بہت کم لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کے اس حکم کو سمجھتے ہوں اور اس کی افادیت پر غور کرتے ہوں۔ عدل ایک ایسا وصف ہے جس کے بغیر کوئی معاشرہ پُرامن نہیں رہ سکتا، اور عدل کے بغیر کوئی قوم اطمینان کا سانس نہیں لے سکتی۔ خوش حال اور خوش گوار اجتماعی زندگی کی بنیاد ہی عدل پر ہے۔ عدل کے لفظی معنیٰ کسی چیز کو دو برابر حصّوں میں اس طرح بانٹ دینا ہے کہ ذرا بھی کمی یا بیشی نہ ہو۔ اور عدل کے اصطلاحی معنیٰ یہ ہیں کہ جو بات ہم کہیں یا جو کام ہم کریں وہ حق اور سچائی کی میزان پر پورا اُترتا ہو۔ غرض اقوال ہوں یا اعمال، وہ بہر حال اور بہر طور میزانِ عدل پر پورے اتریں! اسلامی معاشرے کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ ہر شخص کو اس بات کا یقینِ کامل ہو کہ وہ اپنے حق سے محروم نہیں ہوگا اور جس کا حق ہے وہ پورا پورا اس کو مل جائے گا۔ اسلام میں عدل و انصاف کو خاص اور زبردست اہمیت حاصل رہی ہے۔ اس لیے کہ عدل کے بغیر کوئی معاشرہ پُرامن اور صالح معاشرہ نہیں کہا جا سکتا۔ چناں چہ رسول اللہ ﷺ بطورِ خاص عدل و انصاف کا ایسا اہتمام فرماتے تھے جیسا آپ ﷺ سے قبل کبھی دُنیا میں دیکھا نہیں گیا تھا۔ صحابۂ کرامؓ رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات سے ایسے کُندن ہو گئے تھے کہ کسی معاملے میں وہ جادۂ عدل سے منحرف ہونے کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔

پاکستان میں زکوٰۃ کا نظام رائج ہو گیا ہے اور وصولیٔ زکوٰۃ کو بجا طور پر اہمیت دی جا رہی ہے۔ اس ذیل میں اسلامی عدل بے مثال حیثیت رکھتا ہے۔ زکوٰۃ وصول کرنے کے لیے جو اصحاب متعین ہوتے تھے وہ اس معاملے میں عدل کے تقاضوں پر ایسی سختی کے ساتھ

Marfat.com

عمل کرتے تھے کہ لوگ حیرت زدہ رہ جاتے تھے۔ نسائی کی ایک روایت میں ہے کہ ایک شخص ایک نہایت عمدہ کوہان دار اونٹنی لے کر حاضر ہوا جو قدرِ واجب کے مقابلے میں زیادہ تھی۔ محصّلِ زکوٰۃ نے لینے سے انکار کر دیا۔ اسی طرح جب ایک شخص نے محصّلِ زکوٰۃ کو بچے والی بکری دی تو انھوں نے کہا کہ تم پر صرف ایک بکری واجب ہے اور ہمیں حق سے زیادہ لینے کی ممانعت کی گئی ہے۔ لوگ خوشی خوشی اپنے واجبات سے زیادہ دینا چاہتے تھے لیکن محصّلینِ زکوٰۃ عدل کی راہ پر سختی سے گامزن تھے اور کوئی ایسا کام کرنا نہیں چاہتے تھے کہ عدل کے معیار سے سرِ مُو بھی تجاوز ہو جائے۔

حضرت عمرؓ وہ عظیم و کبیر شخصیت ہیں کہ جنھوں نے بطورِ احتیاط عدلیہ کو انتظامیہ سے علاحدہ کرنے کا زرّیں اصول دنیا میں پہلی بار نافذ کیا تھا اور پھر اسلام نے عدلیہ کو وہ زندگی و تازگی عطا کی کہ عدل و انصاف مسلمان کی زندگی کا جزو بن گیا۔ دورِ اسلامی میں نہ صرف عدل و انصاف بلا قیمت تھا بلکہ اس درجہ آسان تھا کہ اُس نے ہر بُرائی کا یک قلم سدِّباب کر دیا۔ اسلامی دَور کا عدل و انصاف آج کے دَور کی ہر سوسائٹی کے لیے ایک لائقِ تقلید نمونے کی حیثیت رکھتا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ عدل ایک ایسی فطری ضرورت ہے کہ اس کے بغیر امن و آشتی پر مبنی سماج کا قیام ممکن نہیں ہے۔ جس مُعاشرے میں عدل نہیں ہے اُسے جانوروں یا غیر ترقی یافتہ لوگوں کا مُعاشرہ کہا جا سکتا ہے۔

عدل کے مقابلے میں ایک دوسرا لفظ احسان ہے۔ عدل یہ ہے کہ اگر کسی کے ذمّے قرض ہے تو وہ اُسے پورے کا پورا ادا کرے۔ احسان یہ ہے کہ جس شخص نے قرض دیا ہے اگر وہ چاہے تو مقروض کے حالات کے پیشِ نظر اُسے مُعاف کر دے۔ ایک شخص نے ایک دوسرے آدمی کو قتل کر دیا تو عدل یہ ہے کہ اُسے بھی قتل کر دیا جائے، لیکن اگر مقتول کے وُرثا برضا و رغبت کچھ لے کر یا بغیر لیے قاتل کو مُعاف کر دیں تو یہ احسان ہے۔ عدل اور احسان میں ایک بڑا بنیادی فرق یہ ہے کہ عدل میں بعض اوقات دلوں کی کدورت دُور نہیں ہوتی اور انتقامی جذبہ شیطانی کاموں کی ترغیب دلاتا رہتا ہے۔ اُس کے مقابلے میں احسان میں بظاہر تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ احسان کرنے والوں کا نقصان ہو گیا لیکن حقیقتاً اس سے محبت و رواداری اور ہمدردی کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے۔ خاندانی دشمن بھی بہترین خاندانی دوست بن جاتا ہے اور اس خوش گوار ماحول کا نتیجہ امن اور خوش حالی ہوتا ہے۔

Marfat.com

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَكَ وَبَیْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ ○ (حٰمٓ سجدہ: ۳۴)

یعنی: "بدی کا بدلا اچھائی سے دو۔ تم دیکھو گے کہ تمھارے ساتھ جس کی عداوت پڑی ہوئی تھی وہ جگری دوست بن گیا ہے۔"

یہ بھلائی جس کی ترغیب مسلمانوں کو قرآن دیتا ہے یہ ہے کہ اگر تمھارا کوئی بھائی تم پر زیادتی بھی کر بیٹھے تو اُسے معاف کر دو اور بجائے بدلہ لینے کے اُس کے ساتھ احسان کرو!

عدل، موسوی شریعت کا طرۂ امتیاز ہے اور احسان عیسائی شریعت کی بنیاد ہے۔ اسلام نے دونوں کے بین بین ایک ایسی متوازن راہ منتخب کی جس پر چل کر عدل بھی قائم رہے اور احسان کا دروازہ بھی بند نہ ہو بلکہ بعض معاملات میں احسان کی ایسے خوب صورت لفظوں میں ترغیب دلائی کہ نیک اور صالح مسلمان عدل کا مطالبہ کرنے کے بجائے احسان کرنے میں اپنی سعادت سمجھے۔ قرآنِ حکیم میں بار بار عدل کی تاکید کی گئی ہے اور ہر معاملے میں عدل و انصاف قائم رکھنے پر زور دیا گیا ہے۔

معاشرے میں یتیموں کی بے کسی و بے بسی کا ہر شخص کو احساس ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں مسلمانوں کو خاص طور پر یتیموں کے حق میں انصاف کو ملحوظ رکھنے کا تاکیدی حکم دیا ہے۔ عام معاملات میں روزانہ کی خرید و فروخت سے ہر خاص و عام متاثر ہوتا ہے۔ چناں چہ وزن اور پیمانے کا بطورِ خاص ذکر ہے۔ ارشاد ہے:

وَاَوْفُوا الْكَیْلَ وَالْمِیْزَانَ بِالْقِسْطِ (انعام: ۱۵۲)

یعنی: "اور ناپ اور تول انصاف کے ساتھ پورا کرو۔"

عدالتی معاملات میں عدل و انصاف کی اہمیت ہر شخص جانتا ہے۔ اس کے متعلق سورۂ بقرہ میں فرمایا: وَلْیَكْتُبْ بَّیْنَكُمْ كَاتِبٌۢ بِالْعَدْلِ (البقرہ: ۲۸۲)

یعنی: "تمھارے باہمی معاملات کو کوئی لکھنے والا انصاف کے ساتھ لکھے۔"

عدل و انصاف کے قیام پر اصرار کرتے ہوئے دو باتوں کا خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے۔ ایک یہ کہ اگر مقدمے کا ایک فریق قرابت دار ہو تو بھی انصاف کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹے اور دوسرے یہ کہ اگر ایک فریق دشمن ہو تو بھی اُس کے ساتھ انصاف کیا جائے۔ یعنی رشتے دار کی رعایت اور دشمن کی دشمنی بھی مسلمان کو جادۂ عدل سے منحرف نہ کرے۔

قرآنِ حکیم میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

Marfat.com

فَمَنْ عُفِيَ لَهُ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوْفِ وَاَدَاءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ (البقرہ: ۱۷۸)

یعنی: عدل کے ساتھ جب احسان کا ذکر قرآنِ حکیم میں آیا ہے تو اس کا اندازِ فکر و عمل یہ ہے کہ عدل و انصاف کے تمام تقاضوں کو پورا کیا جائے، لیکن انصاف و احسان کو اختیار کر کے باہمی رواداری اور خوش دلی کی فضا پیدا کرنے کو ترجیح دی جائے۔"

سورۂ آلِ عمران میں کہا گیا ہے۔

وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ یعنی "اللہ تعالیٰ احسان کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔"

ہم اپنے پیارے پاکستان کو گہوارۂ عدل و انصاف بنانے کے دل و جان سے آرزومند ہیں۔ ہماری یہ ایک فطری اور بہترین خواہش ہے کہ ہم اس ارضِ پاک کو اسلامی اقدار سے مالا مال کر دیں، کیوں کہ ہم یہ خوب اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہی راستہ سلامتی کا ہے اور یہی طریقہ امن و آشتی کا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں قرآنِ حکیم کی روشنی عطا فرمائیں اور ہادیِ برحق ﷺ کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق۔

Marfat.com

وَالَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ
وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيُفْسِدُوْنَ
فِى الْاَرْضِۙ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ
سُوْٓءُ الدَّارِ ؀ (الرعد : ۲۵)

وہ لوگ جو اللہ کے عہد کو مضبوط باندھ لینے کے بعد توڑ ڈالتے ہیں، جو ان رابطوں کو کاٹتے ہیں جنہیں اللہ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے اور جو زمین میں فساد پھیلاتے ہیں وہ لعنت کے مستحق ہیں اور ان کے لیے آخرت میں بہت برا ٹھکانا ہے۔

سماجی بُرائیاں

Marfat.com

بے جا تمنائیں

قرآنِ مجید و فرقانِ حمید میں شیطان کا ایک قول نقل کیا گیا ہے۔ یہ بات شیطان نے اس وقت کہی تھی کہ جب اسے اس کے تکبّر اور غرور اور اللہ تعالیٰ کے حکم کی اطاعت سے انکار پر راندۂ درگاہ کیا گیا تھا اور اس نے اللہ تعالیٰ سے مخاطب ہو کر کہا تھا کہ میں اپنی آج کی اس اہانت کا بدلہ ابنِ آدم سے لوں گا:

وَقَالَ لَأَتَّخِذَنَّ مِنْ عِبَادِكَ نَصِيبًا مَّفْرُوضًا ۙ وَّلَأُضِلَّنَّهُمْ وَلَأُمَنِّيَنَّهُمْ

(نسا ۱۱۸-۱۱۹)

یعنی: "شیطان نے کہا تھا کہ میں تیرے بندوں سے (اُن کے اوقات، مساعی اور مال و دولت کا) ایک حصہ لے کر رہوں گا اور میں انھیں آرزوں اور تمناؤں میں الجھا کر رکھ دوں گا۔"

انسان کا ہر فعل اور اس کا ہر عمل کسی مقصد کے لیے ہوتا ہے اور اس کی ہر حرکت کا کوئی نہ کوئی منشا ضرور ہوتا ہے اور اس کے ہر اقدام کی کوئی غایت ضرور ہوتی ہے۔ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا کہ انسان کا کوئی فعل و عمل اور اس کی کوئی حرکت یا اقدام کسی مقصد و منشا سے خالی اور کسی غایت سے عاری ہو۔

آپ غور فرمائیے کہ آپ آنکھ کھولتے ہیں دیکھنے کے لیے، کان لگاتے ہیں سننے کے لیے، زبان ہلاتے ہیں بات کرنے کے لیے، قدم اٹھاتے ہیں چلنے کے لیے، پھیپڑے پُھلاتے ہیں سانس لینے کے لیے۔ وغیرہ وغیرہ۔

اب بات پیدا یہ ہوتی ہے کہ آپ جب آنکھ دیکھنے کے لیے کھولتے ہیں اور دیکھتے ہیں تو آپ دیکھتے کیا ہیں؟ یہ آنکھ اچھا بھی دیکھ سکتی ہے اور بُرا بھی دیکھ سکتی ہے۔ کان اچھا بھی سُن سکتے ہیں اور بُرا بھی سن سکتے ہیں۔ زبان اچھا بھی بول سکتی ہے اور بُرا بھی بول سکتی ہے۔ قدم اٹھا کر آپ سیدھے راستے یعنی صراطِ مستقیم پر بھی چل سکتے ہیں اور آپ کے یہ قدم آپ کو راہِ حق سے بھٹکا بھی سکتے ہیں۔ سانس صاف و تازہ ہوائیں لے کر آپ اپنی صحت کی حفاظت کر سکتے ہیں اور آپ یہ بھی کر سکتے ہیں کہ گندہ اور ناصاف ہوائیں

Marfat.com

سانس لیں اور اپنی صحت کو بگاڑ لیں۔

ثابت یہ ہوا کہ انسان کا ہر فعل و عمل یقیناً اور قطعاً کسی نہ کسی مقصد کے لیے ہوتا ہے، مگر اس مقصد کا فیصلہ انسان کے دل و دماغ کرتے ہیں۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے انسان کو فکر و عقل کی قوتیں، فہم و ادراک کی صلاحیتیں اور سمجھنے کی طاقتیں عطا فرمائی ہیں۔

انسان کے ماحول میں اس کے گرد و پیش، بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ اس دنیا میں اچھی اور بری دونوں چیزیں موجود ہیں۔ یہ قطعی طور پر انسان کے اختیار میں ہے کہ وہ اچھائی کو قبول کرے یا برائی کو اختیار کرے۔ اس قبول و اختیار پر نتائج اور عواقب کا انحصار ہے۔ انسان اچھائی اختیار کر کے سر بلند و سرفراز بھی ہو سکتا ہے اور برائی اختیار کر کے قعر مذلت اور گمنامی کے گڑھے میں خود کو ڈال سکتا ہے۔

اگر بہ نظر غائر اور بہ نگاہ عمیق دیکھا جائے اور پوری گہرائی میں جا کر غور و فکر کیا جائے تو آپ ایک نتیجے پر پہنچیں گے کہ تمنائیں اور آرزوئیں مقاصد کو جنم دیا کرتی ہیں اور یہ آرزوئیں اور تمنائیں حق و صداقت پر بھی مبنی ہوتی ہیں اور بے جا اور غلط بھی ہوتی ہیں۔ حق اور بجا تمناؤں سے نیک مقاصد جنم لیتے ہیں اور بے جا تمناؤں سے غلط اور گمراہ کن مقاصد کی راہ کھلتی ہے۔

راندۂ درگاہ ہونے پر شیطان نے کہا تھا کہ میں انسان کو آرزوؤں اور تمناؤں میں الجھا کر رکھ دوں گا۔ ظاہر ہے کہ یہ وہی تمنائیں ہو سکتی ہیں کہ جو بے جا ہوں۔ شیطان بے جا آرزوؤں ہی میں الجھا سکتا ہے اور بے جا تمناؤں ہی میں انسان الجھ کر راہ مستقیم سے بھٹک سکتا ہے۔

ہر چند کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو شیطان کے بہکاوے اور فریب سے ان الفاظ میں خبردار کیا ہے:

يَعِدُهُمْ وَيُمَنِّيهِمْ ۖ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطَانُ إِلَّا غُرُورًا (النساء: ۱۲۰)

یعنی: "یہ شیطان لوگوں کو وعدوں کے سبز باغ دکھائے گا۔ انھیں تمناؤں اور آرزوؤں میں گرفتار کرے گا۔ مگر یہ سمجھ لو کہ شیطان کے یہ سارے وعدے اور یہ سبز باغ دھوکے کی ٹٹی سے زیادہ نہ ہوں گے۔"

اس کے باوجود انسان ورغلانے میں آجاتا ہے اور ان چیزوں کی خواہشیں پیدا کر لیتا ہے کہ جن کا اُسے استحقاق نہیں ہوتا اور تمناؤں کی گرفت میں آجاتا ہے کہ اس کے متعین مقام کی بنا پر وہ پوری نہیں ہو سکتیں۔ بے جا تمناؤں سے غلط مقاصد پیدا ہوتے

Marfat.com

ہیں اور غلط مقاصد انسان کو غلط راہوں پر ڈال دیتے ہیں اور انسان پر ان کی گرفت ایسی شدید ہوتی ہے کہ وہ اپنا سکون اور آرام کھو دیتا ہے اور مصائب و آلام کا شکار ہو جاتا ہے۔

اب آگے چلنے سے پہلے ہمیں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کے قولِ فیصل کے مطابق عالم اور جاہل برابر نہیں ہو سکتے۔ ان دو میں قدرِ مشترک اور مساوات کا عنوان صرف یہ ہو سکتا ہے کہ یہ دونوں انسان ہیں اور انسان انسان سب برابر ہیں۔ گو معاشرتی زندگی میں علم و جہل کی بنا پر ان دونوں کے مقام ایک نہیں ہو سکتے۔ ان دونوں میں حدِ امتیاز لازماً قائم کرنی ہو گی، ورنہ نظامِ معیشت و معاشرت تباہ ہو کر رہ جائے گا۔

ایک عالم مسندِ حکمت و صدارت پر اگر متمکن ہے اور فائز ہے تو اُس کا یہ مقام اس کی صلاحیت اور ودیعت کردہ حکمت کی وجہ سے متعین ہوا ہے۔ ایک مقابلتہً کم علم اور حکمت سے ناواقف و نابلد انسان کا اپنے علم و فضل میں اضافے کی کوشش کے بغیر یہ تمنّا کرنا کہ وہ مسندِ حکمت و صدارت پر فائز ہو جائے بلا شبہ بے جا تمنّا ہے۔ اپنی کوتاہی علم کے باوجود اور اپنی عدم صلاحیت کے باوصف اس نے اپنی بے جا تمنّا کو پورا کرنے کی کوشش کی تو لازماً غلط راہوں پر چلنا ہو گا جو اُسے منزلِ مقصود تک تو نہیں پہنچائیں گی، مگر وہ پریشانیوں میں ضرور مبتلا ہو جائے گا اور اگر کسی غلط حادثے کی بنا پر وہ مسندِ حکمت پر قابض ہو گیا تو پھر وہ اپنے جہل اور اپنی عدم صلاحیت کی وجہ سے کاموں کو خراب کرے گا۔

انسانی زندگی سے ایسی بے شمار مثالیں دی جا سکتی ہیں اور واقعہ یہ ہے کہ اگر ہم اپنی زندگیوں کا جائزہ لیں تو اس زندگی میں جو عدم سکون اور ناعافیت اور بے اطمینانی ہے اس کی تہ میں بے جا تمنّاؤں کا وجود ملے گا۔

قناعت انسان کے اوصاف میں ایک اہم وصف ہے۔ انسان کو زندہ رہنے کے لیے اور اطمینان کی سادہ زندگی بسر کرنے کے لیے جو کچھ میسّر ہے اس پر قناعت کرنی چاہیے اور حقیقی ضرورت سے زیادہ حاصل کرنے کی جستجو سے پرہیز کرنا چاہیے، کیوں کہ جب قناعت کی صفت اور وصف سے انسان محروم ہو جاتا ہے تو پھر بے جا تمنّائیں جنم لیا کرتی ہیں اور بے جا تمنّائیں درحقیقت ایک چکّر ہے جس میں انسان الجھ کر رہ جاتا ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

لَيْسَ بِاَمَانِيِّكُمْ وَلَآ اَمَانِيِّ اَهْلِ الْكِتٰبِ ؕ مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ ۙ وَلَا يَجِدْ لَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ۝ (نساء: ۱۲۳)

Marfat.com

یعنی: "خوب سمجھ لو۔ امیدوں، آرزوؤں اور تمنّاؤں سے نہ اہلِ کتاب کا کام چلے گا نہ تمھارا، خدا کا قانون تو یہ ہے کہ جو بھی بُرا کام کرے گا اس کا بدلہ دیا جائے گا۔ اس کے باوجود بھی اگر کوئی اپنی زندگی خدا کی نافرمانی میں گزار کر آخرت میں حاضر ہو اور اس کا سارا توشہ اس کی بے جا تمنّائیں اور غلط امیدیں ہی نکلیں تو پھر خدا کے دربار میں نہ تو اُسے اپنا کوئی دوست ملے گا نہ مددگار۔"

اس تمام گفت گو سے، ہم اِس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ بے بنیاد توقّعات، جھوٹی آرزوئیں اور بے جا تمنّائیں انسان کو سب سے بڑا نقصان یہ پہنچاتی ہیں کہ وہ اپنی ذمّے داریوں کو بھول جاتا ہے اور اپنے فرائض سے صرفِ نظر کر لیتا ہے۔ عمل کہ جو درحقیقت نجات کا سب سے بڑا ذریعہ ہے اس سے غافل ہو جاتا ہے۔ ایک طرف بے جا تمنّائیں اور دوسری طرف بے عملی، اس کا نتیجہ سوائے حسرت و یاس اور نامرادی کے اور کچھ نہیں نکل سکتا۔

Marfat.com

فرائض سے کوتاہی

ایک کسان جب زمین میں دانہ ڈالتا ہے تو اس کے دل و دماغ اس ایک دانے کے پھوٹنے، اس کے ننھے سے حسین پودے بننے اور پھر ایک قدآور درخت بن جانے کو دیکھنے کے لیے تیار رہتے ہیں اور اس کے ثمرات کے آرزومند۔ کسان جانتا ہے کہ یہ تقاضائے فطرت ہے کہ زمین میں جب دانہ ڈالا جاتا ہے تو وہ پھوٹتا ہے، پودا بنتا ہے اور دانے کی مناسبت سے ایک درخت کی شکل اختیار کرتا ہے۔ فطرت کا یہ تقاضا بھی اس لیے پورا ہوتا ہے کہ دانے کے لیے سازگار ماحول ہوتا ہے، یعنی پولی اور مناسب زمین، پانی کی متوازن مقدار، ہوا کی معتدل موجودگی، سورج کی قدرتی تمازت وغیرہ فطرت کو جنم دینے کے لیے بھی فطرت درکار ہے اور اگر یہ کہا جائے تو بجا ہوگا اور صحیح کہ اس کرۂ آب و گل اور اس کرۂ ارض اور اس زمین کی ہر شے بہ ہر طور اور بہ ہر لحاظ تابع فطرت ہے۔ جب تک فطرت کے تقاضے پورے ہوتے رہتے ہیں اور جب تک فطرت کی عمل داری رہتی ہے استواری رہتی ہے، لیکن جب فطرت کی خلاف ورزی کو روا رکھا جاتا ہے اور فطرت سے جنگ کی جاتی ہے حالات استوار نہیں رہ سکتے اور ان کا دگرگوں ہو جانا لازمی اور یقینی ہے۔

دانۂ گندم سے خوشۂ گندم کا معرضِ وجود میں آجانا فطرت ہے اور اس فطری عمل کے لیے دیگر فطری تقاضے ضروری ہیں۔ اسی طرح آپ ایک انسان کے بارے میں سوچ سکتے ہیں۔ اس کی پیدائش کے عمل سے لے کر اس کے دمِ واپسیں تک، اس کے سارے اعمال و افعال تابعِ فطرت ہیں، پیدا ہو کر رفتہ رفتہ بڑا ہونا، جوان ہو کر بوڑھا ہونا اور بوڑھا ہو کر عمرِ طبعی تک جانا اور پھر دوسری دنیا کو منتقل ہو جانا ایک ایسا فطری عمل ہے کہ جو بغیر کسی تبدیلی کے جاری و ساری رہتا ہے۔ اس عمل کے جاری و ساری رہنے کے لیے ایک ماحول کی ضرورت ہے اور ایک ایسے ماحول کی ضرورت ہے جو افراط و تفریط سے پاک ہو اور اعتدال کے دائرے میں ہو اور حدودِ فطرت میں ہو۔

Marfat.com

فطرت اور قدرت کا مزاج اور اصول افراط و تفریط نہیں ہے، بلکہ اعتدال ہے خیر الامور اوسطہا۔ فطرت درمیانی راہ کی متقاضی ہے اور اسی میں سلامتی پاتی ہے۔ اگر ہم فرائض سے بحث کریں تو یہاں بھی ہمیں فطرت کے دامن میں پناہ لینی ہوگی۔ ایک پوری انسانی زندگی ادائیِ فرض سے عبارت ہے، یعنی اپنی پوری زندگی میں انسان کو اپنے لیے، دوسروں کے لیے اور لازماً خالقِ کائنات اور پروردگارِ عالم کے لیے فرائض ادا کرنے ہوتے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ حیاتِ انسانی کا دوسرا نام فرائض کی ادائی ہے تو صحیح ہوگا۔ آپ حیات و زندگی پر کسی بھی انداز سے غور کریں آپ کو فرائض بہ ہر عنوان ملیں گے۔ یہ فطرت کا تقاضا ہے جسے رد نہیں کیا جا سکتا، یعنی انسان کو حیاتِ مستعار ملی ہے تو اس کے ساتھ دین و دنیا کے فرائض بھی اس کے لیے متعین ہوئے ہیں اور ان فرائض کی ادائی اسے بہ ہر حال کرنی ہے، مگر قدرت اور فطرت یہاں بھی اپنے متعین و مخصوص اصولوں کے ساتھ کارفرما ہے۔ فرائض کے ساتھ اس نے حقوق بھی عطا کر دیے ہیں اور متعین کر دیے ہیں، یعنی فطرت نے انسان کو زندگی دے کر محض فرائض میں نہیں جکڑ دیا ہے، بلکہ فطرت نے اسے حقوق بھی دیے ہیں۔ ان حقوق اور ان فرائض کے درمیان اعتدال قائم کرنا ایک صحیح معاشرے کو وجود میں لانے کے ہم معنیٰ ہیں، یعنی جب فرائض ادا ہوں گے اور حقوق ملیں گے اور اُن میں توازن و اعتدال قائم ہوگا تو ایک اچھا معاشرہ وجود میں آئے گا۔

شکمِ مادر میں وجود اور پیدا ہونے کے بعد سے تا انتہائے زندگی انسان تمام فطری تقاضوں کو پورا کرتا ہے۔ دانۂ گندم سے خوشۂ گندم تک کسان جس طرح منہمک و آرزومند رہتے ہیں بالکل اسی طرح والدین کا حال ہے کہ جو اپنی اولاد کو ابتدا سے لے کر انتہا تک کامیاب و کامران دیکھنا چاہتے ہیں۔ والدین نقیبِ فطرت ہوتے ہیں اور اولاد کی رہنمائی کا عظیم فرض انجام دیتے ہیں۔ یہ وہ فرض ہے کہ جو فطرت اور قدرت نے ان پر عائد کیا ہے، وہ اس فرض سے کوتاہی نہیں برت سکتے۔ اس باب میں کوتاہی فطرت سے جنگ کے مترادف ہے۔ اِس عظیم فرض کی ادائی کا صلہ دو صورتوں میں والدین کو ملتا ہے: ایک یہ کہ اولاد کی عظمت ان کی نام آوری اور اطمینان کا باعث بنتی ہے۔ دوسرے یہ کہ اولاد ان کے آرام و آسائش کا سامان کرتی ہے۔ اولاد کا یہ فعل اولاد کا فرض اور والدین کا حق ہے۔ اس فرض اور حق کے درمیان اعتدال اور توازن کا برقرار رہنا ضروری ہے۔ اگر اس میں کوئی رخنہ پڑے گا تو اس کے نتیجے میں لازماً افتراق و انتشار پیدا ہوگا، کیوں کہ

Marfat.com

یہ رخنہ فطرت سے جنگ کے ہم معنیٰ ہے اور ہم خوب جانتے ہیں کہ فطرت سے جنگ انسان کے لیے ہرگز فائدہ رساں نہیں ہو سکتی۔ اس روشنی میں قرآنِ مجید و فرقانِ حمید کے اس حکم پر غور کیجیے:

وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حُسْنًا

یعنی: "اور ہم نے انسان کو اپنے والدین کے ساتھ نیک سلوک کرنے کا حکم دیا ہے۔"

ہم یہ خوب جانتے ہیں اور اس پر ہمارا ایمان و یقین ہے کہ اس ارضی زندگی کے بعد ایک دوسری زندگی بھی ہے، بلکہ اصل زندگی تو وہی ہے کہ جو ارضی زندگی کے بعد متعین و مقدّر ہے۔ ارضی زندگی درحقیقت جہاد سے عبارت ہے، یعنی اس دنیا کی زندگی انسان کے لیے ایک جہاد کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس جہاد کی جہت یہ ہے کہ جب تک یہ دنیا قائم و دائم ہے اس میں حیاتِ انسانی بے مقصد نہ رہے، بلکہ وہ قدرت و فطرت کے ہر منشا کو پورا کرے اور اس طرح چراغ سے چراغ جلتا رہے اور شعلۂ حیات روشن رہے اور جب شمعِ زندگی بجھے تو انسان کے ساتھ اعمالِ حسنہ ہوں کہ دوسری دنیا کے لیے وجۂ ثواب اور ذریعۂ نجات بن سکیں۔ یہ تمام صورت ایک جہاد کے بغیر ناممکن ہے۔ زندگی بہر صورت ایک جہاد ہے اور جہاد انسان پر فرض کیا گیا ہے اور اس فرض سے کوتاہی کو غلط قرار دیا گیا ہے۔ قرآن مجید میں اس بارے میں جو ارشاد ہوا ہے اس کے معنیٰ یہ ہیں:

"جہاد کرنا تم پر فرض کیا گیا ہے اور تم کو (طبعاً) گراں معلوم ہوتا ہے اور یہ بات ممکن ہے کہ تم کسی امر کو گراں سمجھو اور وہ تمہارے حق میں خیر ہو اور یہ (بھی) ممکن ہے کہ تم کسی امر کو مرغوب سمجھو اور وہ تمہارے حق میں باعثِ خرابی ہو اور اللہ جانتے ہیں اور تم (پورا پورا) نہیں جانتے۔"

میرے نزدیک جہاد کے معنیٰ یہ ہیں کہ انسان کو احکامِ الٰہی کی ہر حال میں تعمیل کرنی چاہیے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے انسان کے لیے جو راہ متعین کر دی ہے، بس اس راہ پر چلنا چاہیے اور اس سمت میں بہر حال جہاد کو ذریعہ بنانا چاہیے۔ یہ فرض ہے اور اس فرض کی ادائی کے بعد انسان کو اس دنیا میں اور آخرت میں تمام آسانیاں اور فراوانیاں میسر آ جاتی ہیں۔ اسی لیے قدرت سوال کرتی ہے کہ:

"پھر تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟"

قدرت نے ایک طرف یہ بات واضح کر دی ہے:

Marfat.com

"انسان کو (ایمان) کے بارے میں صرف اپنی ہی کمائی ملے گی۔"

تو دوسری طرف واضح طور پر یہ کہہ دیا ہے کہ:

"اور جو شخص احکامِ الٰہی سے تجاوز کرتا ہے وہ اپنے اوپر ظلم کرتا ہے۔"

اس تمام بیان سے یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ انسان کے لیے یہ کسی طرح بھی سُود مند نہیں ہو سکتا کہ وہ احکامِ خداوندی اور فرائضِ متعینہ سے غفلت برتے اور ہر انسان کو یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیئے کہ فرض ادا کرنے کے بعد ہی حقوق متعین ہوتے ہیں۔ یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ فرائض ادا کیے بغیر حقوق حاصل ہو جائیں اور نہ یہ ممکن ہے کہ فرائض ادا ہو جائیں اور حقوق نہ ملیں۔ اگر ہمیں اس دنیا میں اور دوسری دنیا میں سرخ رُو ہونا ہے تو فرائض سے کوتاہی نہیں برتنی چاہیے۔

ہمارے فرائض دوسروں کے حقوق ہیں، اپنے ان فرائض میں جو کوئی بھی کوتاہی کرے گا وہ دوسروں کے حقوق تلف کرے گا اور حقوق و فرائض کے توازن سے محروم معاشرہ، خوش حال معاشرہ نہیں ہو سکتا۔ ایک خوش حال معاشرے کے لیے حقوق و فرائض کا خوش گوار توازن ضروری ہے۔

Marfat.com

کام چوری خیانت ہے

اسلامی شریعت میں خیانت بہت بڑا اور بہت بُرا جرم ہے۔ خیانت میں جھوٹ اور بے ایمانی، دھوکا، فریب اور دغا بازی سارے رذائل شامل ہیں۔ سب سے پہلے خیانت کے معنی سمجھ لینے چاہییں۔ ایک انسان کا جو حق دُوسرے انسان کے ذمّے واجب ہو اُس کے ادا کرنے میں ایمان داری نہ برتنا بد دیانتی اور خیانت ہے۔ عام طور پر لوگ خیانت کو محض اس معنی تک محدود سمجھتے ہیں کہ اگر ایک کی چیز دوسرے کے پاس امانت ہو اور وہ اُس میں بے جا تصرّف کرتا ہو یا مانگنے پر واپس نہ کرتا ہو تو یہ کُھلی ہوئی خیانت ہے۔ بے شک یہ کھلی ہوئی خیانت ہے، لیکن خیانت کا مفہوم اس سے زیادہ وسیع ہے۔ مثلاً کسی کی کوئی چھپی ہوئی بات کسی دوسرے کو معلوم ہو یا کسی نے دوسرے پر بھروسا کر کے کوئی اپنا بھید اس کو بتایا ہو تو اُس کا کسی اور پر ظاہر کرنا بھی خیانت ہے۔ اسی طرح جو کام کسی کے سپُرد ہو اس کو وہ دیانت داری کے ساتھ انجام نہ دے تو یہ بھی بہت بڑی خیانت ہے۔ اس طرح عام مسلمانوں کے خلاف یا قومی اور ملّی مفاد کے خلاف قدم اٹھانا بھی ملت سے بد دیانتی ہے۔ دوست ہو کر دوستی نہ نباہنا بھی خیانت ہے۔ بیوی میاں کی وفاداری نہ کرے، یہ بھی خیانت ہے۔ دل میں کچھ رکھنا اور زبان سے کچھ کہنا اور عمل سے کچھ اور ثابت کرنا یہ بھی خیانت ہے۔

اسلام کی شریعت میں ساری خیانتیں یکساں ممنوع ہیں۔ چناں چہ سورۂ انفال میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا "اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسولؐ کی خیانت نہ کرو اور نہ آپس کی امانتوں میں جان بوجھ کر بد دیانتی کرو۔"

کام چوری ایک بدترین قسم کی خیانت ہے۔ کام چوری کی خیانت میں جھوٹ اور چوری کی بُرائیاں شامل ہیں، دھوکا اور فریب کا عنصر پنہاں ہے اور قومی اور ملّی مفاد کے خلاف کام کرنے کے مترادف ہے۔ ان تمام بُرائیوں کے ساتھ ایک بہت ہی تکلیف دہ بُرائی یہ ہے کہ کام چوری کے ذریعہ سے جو رزق حاصل کیا جائے گا اُسے اکلِ حلال نہیں کہا جا سکتا اور اکلِ حلال کی اہمیت کا یہ حال ہے کہ اگر حلال رزق نہ کھایا جائے تو نہ عبادت قبول ہوتی ہے اور نہ ایسے

Marfat.com

آدمی کی کوئی دُعا مقبولِ بارگاہ ہوسکتی ہے۔ عبداللہ ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ حضورؐ نے ارشاد فرمایا کہ "کوئی بندہ حرام مال کھائے، پھر اُسے اللہ کی راہ میں صدقہ کرے تو یہ صدقہ اس کی طرف سے قبول نہیں کیا جائے گا۔ اور اگر اپنی ذات اور گھر والوں پر خرچ کرے گا تو برکت سے خالی ہوگا۔ اگر وہ اس کو چھوڑ کر مرا تو وہ اُس کے جہنم کے سفر میں زادِ راہ بنے گا۔"

سورۂ قصص میں ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ نے قرآنِ حکیم میں اس واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہ حضرت موسیٰؑ نے جب حضرت شعیبؑ کی بکریوں کو پانی پلا دیا تو حضرت شعیبؑ کی بیٹی نے باپ سے کہا کہ بہترین آدمی جسے آپ ملازم رکھنا چاہتے ہیں وہ ہے جو مضبوط بھی ہو اور دیانت دار بھی۔"

قرآنِ حکیم میں لفظ "امین" استعمال ہوا ہے جس کے معنی ایمان دار اور دیانت دار کے ہیں۔ یعنی ملازم کے لیے اہم ترین شرط یہ بھی ہے کہ وہ خیانت نہ کرتا ہو۔ یعنی کام چور نہ ہو، کیوں کہ ملازم کی خیانت یہی ہے کہ وہ وقتِ مقررہ کے اندر ایمان داری اور محنت کے ساتھ کام نہ کرے۔ اگر وہ ارادتاً کاہلی اور سُستی کرتا ہے یا کام پورا نہیں کرتا تو اللہ اور اس کے رسولؐ کی نگاہ میں وہ بدترین قسم کی خیانت کا مرتکب ہوتا ہے۔

حضرت اکرم نورِ مجسّم صلی اللہ علیہ وسلم جن بُری باتوں سے اللہ کی پناہ مانگا کرتے تھے اُن میں سے ایک خیانت بھی ہے۔ ابوداؤد کی ایک روایت ہے کہ آپؐ فرمایا کرتے تھے کہ "الٰہی! مجھے خیانت سے بچائے رکھنا کہ یہ بہت بُرا اندرونی ساتھی ہے۔"

آں حضرتؐ نے فرمایا ہے کہ "راست گو سوداگروں کو قیامت میں صدیقوں اور شہیدوں کے ساتھ اٹھایا جائے گا۔" یہاں "راست گو" کی شرط اس لیے لگائی گئی کہ اگر وہ ایسا نہ کرے تو خیانت کا مرتکب ہوگا اور عذاب کا مستحق ہو جائے گا۔ اسی طرح آں حضرتؐ نے محنت مزدوری کے ذریعے سے کسبِ معاش کو حلال ترین چیز فرمایا لیکن اس شرط کے ساتھ کہ کام چوری نہ کی جائے۔ اگر محنت مزدوری میں کام چوری کی جائے تو یہ رزق حلال کے بجائے حرام ہو جائے گا۔ اور خیانت کا جرم بھی ثابت ہو جائے گا۔

کام چوری کا مطلب یہ ہے کہ مقررہ وقت میں اور قبول کردہ اور مقررہ اُجرت میں اتنا کام نہ کیا جائے جتنا کرنا چاہیے یا پورا وقت کام نہ کیا جائے یا کام میں سُستی اور کاہلی برتی جائے۔ ایسی تمام صورتوں میں کہ مقررہ اُجرت جو مقررہ وقت کے لیے اور اندازاً معیّنہ کام کے لیے ادا کی جاتی ہے وہ وصول کرلی جائے اور کام پورا نہ کیا جائے تو یقینی طور پر یہ خیانت کی ایسی بُری

Marfat.com

شکل ہے کہ وصول کردہ اُجرت ناجائز سمجھی جائے گی اور اس طرح رزق حرام ہو جائے گا۔

خیانت کی کراہیت کا اندازہ حضرت ابن مسعودؓ کی اُس روایت سے بھی واضح ہو جاتا ہے جس میں انھوں نے کہا کہ اللہ کی راہ میں مارا جانا ہر گناہ کا کفارہ ہے لیکن خیانت کا نہیں ہے۔ آپ نے فرمایا کہ قیامت کے دن بندے کو لایا جائے گا اگرچہ وہ اللہ کی راہ میں شہید ہوا ہو اور کہا جائے گا کہ "تم امانت لاؤ اور ادا کرو۔" وہ کہے گا "اے اللہ اب کیسے لاؤں؟" کہا جائے گا کہ اُس کو دوزخ کے ہاویہ میں لے جاؤ۔"

یہ بات صاف ہے کہ صلوٰۃ امانت ہے۔ وضو امانت ہے۔ تول بھی امانت ہے۔ ناپ بھی امانت ہے، اور ایمان داری اور محنت کے ساتھ کام کرنا بھی امانت ہے۔ اگر کوئی کام کرنے والا پیداوار کی مقررہ یا معیّنہ مقدار اپنی کام چوری کی وجہ سے دے نہیں سکتا اُس کی مثال ایسی ہے کہ اُس نے امانت پوری پوری واپس نہیں کی۔ اور خیانت کا مجرم ہوا۔ اور اُس نے اُجرت پوری وصول کی یعنی کم کام کے لیے زیادہ اجرت وصول کی اور خیانت کے ساتھ عہد پورا نہ کرنے کا مجرم بھی ہوا۔ اور جو رزق حاصل کیا اس میں حرام کا عنصر شامل کر لیا۔ قرآنِ حکیم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

ترجمہ: "اے ایمان والو! تم آپس میں ایک دوسرے کا مال ناجائز طریق سے مت کھاؤ۔"

یہ آیت ایک اصولی حیثیت رکھتی ہے جس میں ہر اس مال کو حرام بتایا گیا ہے جو کسی ناجائز طریق سے حاصل کیا گیا ہو۔ کام چوری میں بھی کم کام کر کے زیادہ اجرت وصول کرنا شامل ہے۔ جو یقیناً ناجائز ہے۔

پاکستان میں اخلاق و آداب میں موجودہ انحطاط درحقیقت اِسی وجہ سے ہے کہ حقوق و فرائض میں عدم توازن پایا جاتا ہے۔ قول اور فعل میں تضاد ہے اور عام انسان جھوٹ اور سچ میں تمیز نہیں کر رہا ہے۔ یہ چیزیں اسلامی مُعاشرے کے لیے سازگار نہیں ہیں اور اِن کی موجودگی کی وجہ سے ہم من حیث المجموع بڑی پریشانیوں میں گھرے ہوئے ہیں۔

ہماری یہ ذہنی و فکری، جسمانی اور روحانی، مالی اور اقتصادی، معاشی اور مُعاشرتی پریشانیاں ہرگز اُس وقت تک رفع نہیں ہوں گی جب تک ہم پاکستان میں شریعتِ اسلامی کو اختیار نہ کریں گے۔ انسان کا شرف و امتیاز اُس وقت تک قائم نہ ہو گا جب تک ہم قرآن اور سنّت کو رہنما نہیں بنائیں گے اور جب اِنسان کی عزّت و احترام اور اُس کا شرف قائم ہو جائے گا تو پاکستان سے بلاشبہ ساری بُرائیاں بھی دُور ہو جائیں گی۔

حضرت عمرؓو بن عبسہ فرماتے ہیں: میں نے نبی اکرمؐ سے پوچھا: "ایمان کیا ہے؟" آپ

Marfat.com

نے فرمایا: ”ایمان نام ہے صبر اور استقامت کا۔“

یعنی ایمان یہ ہے کہ انسان اللہ کی راہ اپنے لیے پسند کرے اور اِس راہ میں جو مشکل آئے اسے برداشت کرے اور اللہ کے سہارے آگے بڑھتا جائے۔ نیز انسان اپنی کمائی اللہ کے محتاج اور بے سہارا بندوں پر اللہ کی خوشنودی کے لیے خرچ کر کے خوشی محسوس کرے۔ یہ ہے صبر و استقامت۔

آئیے، ہم دستِ دُعا دراز کریں۔ اے اللہ امّتِ مُسلمہ پاکستانیہ پر اپنا رحم فرما اور اُس کو کام چوری اور خیانت کے عذاب سے بچا اور اس کو صراطِ مستقیم پر چلنے کی توفیق عطا فرما۔

Marfat.com

ذخیرہ اندوزی اور چور بازاری

نیکی کی طرح بدی کی بھی قسمیں ہیں۔ ان میں کچھ تو ایسی ہوتی ہیں جن کا تعلق محض فرد سے ہوتا ہے، اور دوسری اپنے اثرات کے لحاظ سے ہمہ گیر، وسیع اور متعدی ہوتی ہیں۔ جس طرح وہ نیکی کہ جس کا تعلق محض فرد کی ذات سے ہو ہلکی اور کم درجے کی ہوتی ہے، بالکل اسی طرح وہ بدی اور برائی جس سے دوسرے متاثر ہوں، نوعیت میں شدید خیال کی جاتی ہے۔ اس کی شدت کا عالم یہ ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص کسی ایسی بُرائی پر عامل ہو جس کے اثرات دوسروں پر پڑتے ہیں تو اس کے نتیجے میں اس کے وہ اچھے اعمال بھی ضائع کر دیے جاتے ہیں جن کا تعلق محض اس کی ذات سے ہو۔ آپ نے وہ حدیث ضرور پڑھی یا سنی ہو گی جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ قیامت کے دن ایک عابد زاہد کو احکم الحاکمین کی عدالت میں حاضر کیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ اسے اپنے احسانات گنوائے گا اور سوال فرمائے گا کہ اُس نے ان انعامات سے متمتع ہونے کے شکر کے طور پر کیا کیا، تو یہ شخص اپنی عبادات کا حساب پیش کرے گا۔ اس کے بعد اس کے وہ بد اعمال سامنے لائے جائیں گے جن سے دوسروں کو نقصان ہوا، تکلیف پہنچی یا ان کے حقوق ضائع ہوئے، اور اس طرح ہر ایسی بدی کے مقابلے میں اس کی نیکیاں بے باق ہوتی جائیں گی، یہاں تک کہ اس کی نیکیوں کا سارا سرمایہ گویا پگھل کر رہ جائے گا۔ اور دوسروں کے جو حقوق اس کے ذمّے باقی رہ جائیں گے اُن کے بدلے میں متاثر ہونے والوں کے گناہ اس کے ذمّے کر دیے جائیں گے اور اس طرح نیکیوں کا ایک سرمایہ دار اور ذخیرہ اندوز مفلس ہو کر رہ جائے گا۔

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ دل کے روگ، ضمیر کی بیماریاں، اخلاق کی کمزوریاں اور روح کی خرابیاں بدترین صورت اختیار کر لیتی ہیں اگر ان کے اثرات دوسرے لوگوں تک پہنچنے لگیں۔

چور بازاری اور ذخیرہ اندوزی بھی ایسی برائیوں میں سے ہیں جن کے اثرات بد سے دوسرے لوگ بلکہ پورا معاشرہ متاثر ہوتا ہے۔ چور بازاری ایسی بدی نہیں ہے جس کا تعلق صرف ایک فرد سے ہو، اس کے اثرات محدود نہیں غیر محدود ہیں۔ چور بازاری کرنے والے ان بدترین افراد میں شمار

Marfat.com

ہوتے ہیں جو معاشرے کی بنیادوں کو کمزور کرنے اور اجتماعی ضمیر کو مجروح کرنے کے ذمے دار ہیں۔

چوری ایک بُرا فعل ہے، ایک گناہ ہے، اور چور کو کسی نظام میں بھی اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا، لیکن چور بازاری اس سے ہزار درجہ بُرا اور گھناؤنا فعل ہے۔ چور کے فعل کا نقصان صرف اس فرد یا ان افراد تک محدود رہتا ہے جن کا مال اس نے چرایا، لیکن چور بازاری کا مرتکب بے شمار افراد کو تکلیف پہنچاتا ہے اور اپنے ذاتی فائدے کی خاطر معاشرے کے قانون کو ٹھکرا کر لوگوں کو پریشانی میں مبتلا کرتا ہے اور پھر ان کی پریشانی سے اپنے لیے راحت اور آسائش خریدتا ہے۔ چور بازار ایسی دولت کا طالب ہوتا ہے جس کا وہ مستحق نہیں ہے اور اس دولت کے لیے وہ معاشرے کے ایسے اصولوں کو قربان کرتا ہے جو اجتماعی راحت کے لیے وضع کیے جاتے ہیں۔

اسلام بنیادی طور پر ایک فلاحی دین ہے اور کسی ایسے فعل کی اجازت نہیں دیتا جس سے اللہ کی مخلوق کو تکلیف پہنچتی ہو اور جس کے اثراتِ بد سے سوسائٹی کا ڈھانچا متاثر ہوتا ہو۔ چور بازاری اور ذخیرہ اندوزی سرمایہ دارانہ نظام کے ان قبیح اور مکروہ ہتھکنڈوں میں سے ہیں، جو وہ سرمایہ کو چند ہاتھوں میں مجتمع کرنے کے لیے اختیار کرتا ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام کو عام لوگوں کی مشکلات سے کوئی غرض نہیں ہوتی، بلکہ وہ تو انفرادی آزادی کے احترام کے نام پر افراد کو دولت جمع کرنے اور سرمایہ کو اکٹھا کرنے کی کھلی چھوٹ دیتا ہے۔ اس وجہ سے اس نظام میں تاجر اور صنعت کار کو پوری آزادی ہوتی ہے کہ وہ ہر طریقے سے عوام کی جیبوں سے پیسہ نکلوائے اور پھر اس دولت کی مدد سے مزید دولت بڑھانے کے طریقے اختیار کرے۔ اسلام ہرگز اس کی اجازت نہیں دیتا۔ وہ شخصی آزادی کا تو احترام کرتا ہے، لیکن اجتماعی فلاح کی قیمت پر نہیں۔ وہ کسی فرد کو اتنی آزادی نہیں دیتا کہ وہ اپنی راحت کی خاطر دوسروں کی راحت کو، دوسروں کے فائدے کو، دوسروں کے اطمینان اور سکون کو قربان کر دے۔ اسی لیے اس نے انفرادی آزادی کو حد سے نہیں بڑھنے دیا اور فرد اور اجتماع کے درمیان وہ بے مثال اور عدیم النظیر توازن پیدا کیا ہے جو سراسر فلاح و سعادت کا باعث اور ذریعہ ہے۔

اسلام نے دولت کو چند ہاتھوں میں جمع ہونے سے روکنے کے لیے متعدد بنیادی تدابیر اختیار کی ہیں۔ زکوٰۃ کا نظام، عشر، سُود کی سختی سے مُمانعت اور وراثت کا قانون۔ یہ سب اسی لیے ہیں کہ تقسیمِ دولت کا سلسلہ جاری رہے، اور دولت کے فوائد سے زیادہ سے زیادہ لوگ مستفید ہوں۔

چور بازاری کرنے والے اپنی دولت سے فائدہ اٹھا کر لوگوں کی ضرورت کی چیزیں خرید لیتے ہیں اور ان کو ذخیرہ کر کے اور صحیح داموں پر فروخت نہ کر کے اللہ کی مخلوق کو اذیت میں مبتلا کرتے

Marfat.com

ہیں اور جب لوگ پریشان ہو کر ان کے پاس آتے ہیں تو وہ ان سے منھ مانگی قیمت وصول کر کے اپنی دولت میں اضافہ کرتے ہیں۔ اسلام تجارت کو عبادت سمجھتا ہے اور تجارت کی عظمت کا اس سے بڑھ کر کیا ثبوت ہوگا کہ خود اللہ کے محبوب رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے تجارت فرمائی ہے۔ تجارت ایک اچھا شغل اور ایک مفید پیشہ ہے۔ تمدّن کی عمارت جن ستونوں پر استوار اور قائم ہے ان میں تجارت بھی شامل ہے، لیکن کون سی تجارت؟ وہ تجارت جو تاجر کے لیے مناسب منافع اور عوام کی خدمت کی بنیاد پر ہو۔ اور وہ تجارت جس کا مقصد دیانت اور امانت کا فروغ ہو اور وہ تجارت جو باہمی اعتماد اور تعاون کی فضا ہموار کرے۔ وہ تجارت نہیں جس کی اساس چور بازاری، ذخیرہ اندوزی اور ہوسِ زر پر ہو۔

اسلام نے خراب مال کی فروخت کی اجازت نہیں دی ہے۔ حد سے زیادہ منافع لینے سے روکا ہے، مال کو روک کر قیمتیں بڑھانے کی حوصلہ شکنی کی ہے۔ مال کم تولنے اور کم ناپنے کی ممانعت کی ہے۔ اس لیے کاروبار میں ہر غلط کام اسلام کے خلاف ہے، اور مسلمان کے شایانِ شان نہیں ہے کہ وہ کوئی ایسی حرکت کرے جس سے اللہ کے بندوں کو ایذا پہنچے۔ مسلمان تاجر تو لوگوں کے لیے سکون کا باعث ہوتا ہے۔

یاد رکھیے اسلامی نظام کے قیام کے لیے ہمیں اپنی تجارت کو سب سے پہلے مسلمان کرنا ہوگا، کیوں کہ لوگوں کا واسطہ سب سے پہلے اور سب سے زیادہ تجارت ہی سے پڑتا ہے اور وہ اسی سے متاثر ہوتے ہیں۔ لہٰذا تجارت کو اسلامی اصولوں پر استوار کیے بغیر ہم اسلامی نظامِ زندگی کو پائیدار بنیادوں پر ہموار نہیں کر سکتے۔

میں اپنے پیارے ہم وطنوں سے درخواست کرتا ہوں اور ان کو مشورہ دیتا ہوں کہ انسان کی عزت کریں، اپنے ہر ہم وطن کا احترام کریں۔ اپنے وطن کے ہر انسان کو اپنا بھائی سمجھیں اور اس سے بھائی کا سلوک کریں۔ بھائی کو تکلیف نہیں پہنچائی جا سکتی اور انسان کا حق نہیں مارا جا سکتا۔ یہ سب سے بڑا گناہ ہے۔ ایسا گناہ گار، دین ہو یا دنیا، زمین ہو یا آسمان وہ کہیں بھی فلاح نہیں پا سکتا اور نہ وہ کبھی سُکھی رہ سکتا ہے۔ چور بازاری اور ذخیرہ اندوزی کرنے والا بے شک گناہ گار ہے اور وہ پاکستان کو کم زور کرنے کا مجرم ہے۔ اس سے بڑا جرم اور کیا ہوگا کہ ہم جس وطن میں عزت اور آرام کی زندگی بسر کرتے ہیں اسی کو کم زور کر دیں۔ یاد رکھیے اس سے ہماری آزادی خطرے میں پڑ جائے گی اور غلامی کا طوق ہمارے گلے میں پڑ جائے گا۔

Marfat.com

حسد

حسد ایک بدترین جذبہ ہے اور اس کے برے اثرات لامحدود ہیں۔ اگر غور و فکر کیا جائے تو معاشرے کے اکثر و بیشتر جرائم کا محرک یہی جذبۂ سیاہ ہے۔ اس سے انسان کا دل ویران اور تباہ ہو جاتا ہے، عمل کی قوت سلب ہو جاتی ہے اور ناکامی و محرومی کی آتشِ سوزاں حاسد کی تقدیر بن جاتی ہے۔

اللہ تعالیٰ جب اپنے کسی بندے کو مال و دولت، علم و فضل یا کسی اور خوبی سے نوازتا ہے تو بعض لوگ یہ چاہتے ہیں کہ اللہ کی یہ نعمتیں اس سے چھین لی جائیں اور وہ خوار و رسوا ہو جائے۔ اسلامی اخلاق کے اعتبار سے اس مکروہ ترین جذبہ و خواہش کا نام حسد ہے اور یہ وہ اخلاقی پستی ہے جس سے بچنے کی تاکید قرآن و سنت میں بے شمار مواقع پر آئی ہے۔

عہد رسالت میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو ایمان و قرآن کی دولت عطا فرما کر ان کو جس طرح عزت اور سرفرازی بخشی تھی اس پر یہودیوں کو بڑا حسد تھا۔ وہ اس اعزاز و سربلندی کو دیکھ کر کڑھتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے حسد کا تذکرہ سورۃ النساء کی اس آیت میں فرمایا ہے:

أَمْ يَحْسُدُونَ النَّاسَ عَلَىٰ مَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِن فَضْلِهِ ۖ (النساء: ۵۴)

یعنی "کیا اللہ نے جو اپنا فضل مسلمانوں پر فرمایا ہے اس پر یہ حسد کرتے ہیں؟"

یہی نہیں کہ یہودی مسلمانوں کی خوش حالی یا ان کی عزت و وقار کو دیکھ کر کڑھتے تھے بلکہ وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ مسلمانوں سے یہ دولت چھین لی جائے۔ ارشاد ربانی ہے:

وَدَّ كَثِيرٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَوْ يَرُدُّونَكُم مِّن بَعْدِ إِيمَانِكُمْ كُفَّارًا حَسَدًا مِّنْ عِندِ أَنفُسِهِم ۔۔۔ (البقرہ: ۱۰۹)

یعنی "اکثر اہل کتاب اپنے دلی حسد کی وجہ سے یہ چاہتے ہیں کہ تم ایمان لانے کے بعد پھر کافر ہو جاؤ۔"

حسد دوسروں کے زوالِ نعمت کی بدترین خواہش کا نام ہے۔ حاسد کے دل میں یہ

Marfat.com

بات بھی پوشیدہ ہوتی ہے کہ فضل و کمال والے لوگ نعمتوں سے محروم ہو کر اس کی طرح تہی مایہ اور تہی دست بھی ہو جائیں تو انھیں کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔ منافقین کی اس بداخلاقی کا تذکرہ کرتے ہوئے سورۃ النساء میں فرمایا گیا:

وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوْا فَتَكُوْنُوْنَ سَوَآءً ۔۔۔ (النساء: ۸۹)

یعنی "ان کی خواہش ہے کہ جس طرح یہ خود کافر ہو گئے ہیں، تم بھی کافر ہوتے تاکہ دونوں برابر ہو جائیں۔"

حسد کا بدترین محرک بغض و عداوت ہے۔ انسان کو جب کسی سے نفرت و عداوت ہوتی ہے تو وہ یہ چاہتا ہے کہ اس کی خوبیاں اس سے چھین لی جائیں اور یہ رنج و مصیبت میں گرفتار ہو جائے۔ اس کی مسرت کے لیے یہ کافی ہے کہ جاہ و مال اسے نصیب ہو یا نہ ہو اس کا دشمن ضرور اس سے محروم ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ نے منافقین کے حسد کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ ۚ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَآءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ ۚ وَمَا تُخْفِيْ صُدُوْرُهُمْ اَكْبَرُ ؕ (آل عمران: ۱۱۸)

یعنی "وہ چاہتے ہیں کہ تمھیں تکلیف پہنچے، دشمنی تو اُن کی باتوں سے ظاہر ہو چکی ہے لیکن جو کچھ ان کے دلوں میں پوشیدہ ہے وہ اس سے بھی بڑھ کر ہے۔"

پھر فرمایا:

اِنْ تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ ۖ وَاِنْ تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ يَّفْرَحُوْا بِهَا ؕ (آل عمران: ۱۲۰)

یعنی "مسلمانو! اگر تمھیں کوئی فائدہ پہنچتا ہے تو ان منافقوں کو برا معلوم ہوتا ہے، اور اگر نقصان پہنچتا ہے تو یہ خوش ہوتے ہیں۔"

حسد کا ایک دوسرا محرک ذاتی فخر و غرور بھی ہے۔ اگر ہم چشموں اور برابر والوں میں کوئی کسی بلند منصب تک پہنچ جاتا ہے تو ایک تنگ دل اور بداخلاق آدمی کو یہ گراں گزرتا ہے، اس لیے کہ اس سے اُس کی عظمت و انفرادیت چھن جاتی ہے اور اُس جیسے اور دوسروں کی موجودگی میں اُس کے لیے فخر و غرور کا موقع نہیں رہ جاتا۔

حسد ہی کے محرکات میں اپنی سرداری اور برتری اور دوسروں کو سرنگوں دیکھنے کی خواہش بھی ہے۔ کفار قریش مسلمانوں کی جماعت کو افلاس اور پریشان حالی کی وجہ سے حقیر نہیں کہتے تھے، بلکہ اس بنا پر کہتے تھے کہ وہ ان کے حلقۂ اطاعت سے نکل کر صرف ایک

Marfat.com

اللہ کے پرستار اور رسولؐ کے مطیعِ فرمان ہو گئے تھے، اس لیے وہ حسد کی بنا پر ان کو حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔

بہت سے کم زور اخلاق کے لوگ مقاصد کے اشتراک کی وجہ سے بھی حسد میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ مثلاً ایک باپ کے متعدد بیٹے کبھی باپ کی توجہ اپنی طرف زیادہ جذب کرنے کے لیے باہم رشک و حسد کرنے لگتے ہیں اور جدال و قتال پر بھی آمادہ ہو جاتے ہیں۔ جن لوگوں میں جاہ پرستی اور ریاست طلبی ہوتی ہے وہ عموماً اس اخلاقی گندگی میں ملوّث دیکھے جاتے ہیں، کیوں کہ وہ کسی کو اپنا شریک و سہیم نہیں دیکھ سکتے۔ یہودیوں کے حسد کی خاص وجہ یہی تھی کہ ان کو علمی اور مذہبی برتری حاصل تھی۔ اسلام نے ان کی شاہانہ ریاست کا خاتمہ کر دیا۔ اس لیے وہ اہلِ اسلام سے جل اٹھے۔ ان سارے اسباب کے تذکرے سے یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہیے کہ بے سبب حسد نہیں ہوتا۔ حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں بہت سے ایسے بد طینت اور خبیث النفس لوگ موجود ہوتے ہیں جو ہر شخص کی اچھائی پر حسد کرتے ہیں خواہ ان کو اس سے کوئی تعلق ہو یا نہ ہو۔

اسلام نے مسلمانوں کو باہمی اخوت کے رشتے میں منسلک کر کے حسد کے مذموم جذبے کی سخت مذمت کی اور ہمیں متنبہ کیا کہ ہم اگر اس بد اخلاقی کے مرتکب ہوئے تو اخوت کا شیرازہ بکھر جائے گا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تمام اخلاقی برائیوں سے دور رہنے کی سخت تاکید فرمائی جو اخوت و محبت کو نفرت و عداوت سے بدل دیں۔ آپؐ نے فرمایا:

"بدگمانی سے بچو، کیوں کہ بدگمانی سب سے زیادہ جھوٹی بات ہے۔ لوگوں کے عیوب کی ٹوہ میں نہ رہو، باہم حسد نہ کرو نہ ایک دوسرے سے بے تعلق رہو، نہ باہم بغض رکھو، بلکہ اے اللہ کے بندو! بھائی بھائی بن جاؤ۔"

ابوداؤد کی حدیث ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

"تم لوگ حسد سے بچو، کیوں کہ حسد نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے جس طرح آگ لکڑی کو کھا جاتی ہے۔"

حقیقت یہ ہے کہ حسد سب سے زیادہ خطرناک بد اخلاقی ہے۔ اس جذبے کی پرورش سب سے بڑی انسانی کوتاہی ہے۔ انسان کا مقامِ عظمت و رفعت یہ ہے کہ وہ اپنے ذاتی کمالات میں اضافہ کرے۔ اپنے جہل کو دور کر کے روشنیِ علم سے اپنے قلب و نظر کو منوّر

Marfat.com

کرے۔ ایثار اور قربانی کے عالی و بلند معیارات سے جسدِ حسد کو مسمار کر ڈالے۔ قناعت کی راہ اختیار کرے اور یہ یقین کامل کر لے کہ مال اور دولت کبھی دائم نہیں ہو سکتے۔ اس کے برعکس عشق و محبت، اخوت اور انسانیت کبھی پامال نہیں ہو سکتے۔ انسان کا مقام ہی یہ ہے کہ وہ انسانیت کے اس اعلیٰ مرتبے پر پہنچ جائے اور یہ وہ مقام ارفع و بلند ہے کہ حسد کو یہاں راہ نہیں مل سکتی۔

Marfat.com

غیبت

اسلام ایسا معاشرہ قائم کرنا چاہتا ہے جس میں ہر مسلمان اور ہر انسان کی عزت و آبرو محفوظ رہے، اور ان کے باہمی تعلقات میں تلخی پیدا نہ ہو۔ اسلام افراد کو ایسی تمام اخلاقی برائیوں سے پاک دیکھنا چاہتا ہے جن سے مسلمانوں کا وقار مجروح ہوتا ہو، یا جن سے ان کی عزت و آبرو کو صدمہ پہنچتا ہو، اور انسانیت و شرافت پامال ہوتی ہو۔

مسلمانوں کے عیوب کی پردہ دری جتنی غیبت کی مذموم عادت سے ہوتی ہے، شاید کسی اور بداخلاقی سے نہیں ہوتی۔ اس لیے قرآن کریم میں غیبت کی سخت ممانعت آئی ہے، ارشاد ہوا ہے:

لَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا ط (الحجرات: ۱۲)

یعنی "تم میں سے کوئی کسی کی غیبت نہ کرے۔"

قرآن کریم نے غیبت کی مذمت کرتے ہوئے اس کے لیے ایک خاص تمثیلی پیرایۂ بیان اختیار کیا ہے، تاکہ لوگ اس مکروہ ترین عادت کی برائی کو سمجھ سکیں، فرمایا گیا:

اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا۔۔۔ (الحجرات: ۱۲)

یعنی "کیا تم میں سے کوئی یہ گوارا کرے گا کہ اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھائے۔"

اس آیت کریمہ میں یہ حقیقت ذہن نشین کرائی گئی ہے کہ انسان کا گوشت دراصل اس کے فضل و شرف کی بنا پر حرام قرار دیا گیا ہے، لہٰذا ہر وہ چیز جو اس کے ناموس و وقار کو صدمہ پہنچائے، حرام ہے۔

بارہا یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ مغلوب الغضب قسم کے لوگ خاص طور پر اس وقت کہ جب وہ شائستگی سے محروم ہوں، اپنے حریفوں سے لڑتے ہوئے غصے کی شدت میں ان کا گوشت نوچ لیتے ہیں، بلاشبہ یہ ایک بہیمانہ حرکت ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص اپنے حریف کے مر جانے کے بعد اس مذموم فعل کا ارتکاب کرے یعنی اس کا گوشت نوچ لے تو انتہای اخلاقی دنائت کے ساتھ یہ ایک بزدلانہ فعل بھی ہے۔ اس طرح اگر کوئی شخص کسی کے رُو در رُو

Marfat.com

اس کی برائی کرے یقیناً یہ بھی کوئی پسندیدہ بات نہیں ہے، لیکن یہی برائی اگر پیٹھ پیچھے کی جائے تو یہ شدید اخلاقی پستی ہے اور ایسی ہی ہے جیسے مرے ہوئے آدمی کا گوشت نوچنا۔ اس سے انسان کی سنگ دلی، اس کی شقاوت اور بے رحمی کا اظہار ہوتا ہے، اور یہ حرکت اس لطف و محبت کے خلاف ہے جو اسلام مسلمانوں میں پیدا کرنا چاہتا ہے۔

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد احادیث میں غیبت کرنے والے کے انجام بد کی وضاحت فرمائی ہے۔ ابوداؤد کی حدیث ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ:

شبِ معراج میں میرا گزر ایسے لوگوں کی طرف ہوا جن کے ناخن تانبے کے تھے اور وہ ان سے اپنے چہروں اور سینوں کو نوچ رہے تھے۔ میں نے جبریل سے پوچھا یہ کون لوگ ہیں، انھوں نے کہا یہ وہ لوگ ہیں جو دوسروں کا گوشت کھاتے تھے اور ان کی عزت و آبرو کو صدمہ پہنچاتے تھے،،

یہ اصولِ دنیا بھی ہے اور سُنّتِ الٰہیہ بھی کہ گناہ جس درجے کا ہو سزا بھی اسی درجے کی ہو۔ غیبت اگر بھائیوں کا گوشت نوچنے کے مترادف ہے تو سزا بھی یہی دی گئی کہ وہ اپنا گوشت نوچتے رہیں۔

ابوداؤد ہی کی دوسری حدیث ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، لوگو! نہ مسلمانوں کی غیبت کرو، نہ ان کے عیوب کی تلاش میں رہو، کیوں کہ جو شخص ان کے عیوب کی تلاش میں رہے گا اللہ تعالیٰ بھی اس کی عیب جوئی کرے گا۔ اور جس کی عیب جوئی اللہ کرے گا اُس کو اُس کے گھر کے اندر ہی رسوا کر ڈالے گا۔

غیبت کے متعلق ایک عام غلط فہمی یہ ہے کہ یہ کسی کی غیر موجودگی میں اس کو برا کہنے کا نام ہے۔ بلاشبہ لغت میں اس کے یہی معنی ہیں، لیکن اسلامی اخلاق میں، غیر موجودگی کی قید نہیں ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ سے یہ حدیث مروی ہے کہ لوگوں نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ غیبت کس کو کہتے ہیں؟ آپؐ نے فرمایا! تمھارا اپنے بھائی کی اس چیز کا ذکر کرنا غیبت ہے جسے وہ ناپسند کرے۔ لوگوں نے کہا اگر میرے بھائی میں وہ عیب موجود ہو تو پھر؟ فرمایا اگر موجود ہے تو تم نے اس کی غیبت کی اور اگر نہیں ہے تو بہتان لگایا۔

اس سے معلوم ہوا کہ کسی کی موجودگی میں اس کی برائی کرنا بھی غیبت ہے۔ اس سے یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ اسلام بُروں کی برائی بیان کرنے کو یک قلم روک دینا چاہتا ہے۔ اسلام نے خود کافروں کی ساری برائیاں کھول کھول کر بیان کی ہیں۔ امت کے افراد بھی

Marfat.com

دوسروں کی برائیاں، جو اُن میں موجود ہیں، بیان کر سکتے ہیں، اگر مقصود اصلاح و تنبیہ ہو۔ ایک مظلوم کو ظالم کے ظلم و ستم کی داستان بیان کرنے کا حق حاصل ہے، شرعی حکم معلوم کرنے کے سلسلے میں بھی برائی بیان کی جا سکتی ہے۔ لوگوں کو کسی کے شر اور فتنے سے بچانے کے لیے بھی برائی بیان کی جا سکتی ہے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ایک شخص کو قبیلے کا بدترین آدمی فرمایا۔ تمام دینی اور معاشرتی جرائم کا علانیہ ارتکاب کرنے والوں کو بھی برا کہا جا سکتا ہے، اور ان کی برائی بھی بیان کی جا سکتی ہے۔

پھر بھی اسلامی ضابطۂ اخلاق باہمی معاملات میں ان حدود سے متجاوز ہو کر کسی کی برائی کرنے کا مخالف ہے، قرآن شریف میں فرمایا گیا:

لَا یُحِبُّ اللّٰہُ الْجَھْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ ؕ (النسا : ۲۱)

یعنی "اللہ تعالیٰ کو بدگوئی پسند نہیں آتی، مگر جو مظلوم ہو۔"

غیبت انسانی خوبیوں کی عمارت کو منہدم کر دیتی ہے اور اخلاق کے سارے سوتوں کو خشک کر دیتی ہے۔ معاشرے پر اس کے ہولناک اثرات میں یہ بھی ہے کہ افراد میں باہم بغض و عداوت کی آگ بھڑک اٹھتی ہے اور کبھی کبھی اس کے شعلے پوری قوم کو اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں۔ غیبت کے اسباب مختلف ہوتے ہیں، حسد، تکبر، اور سوئے ظن کی دبی ہوئی چنگاری لوگوں کو غیبت پر اُبھارتی ہے۔ اسلام یہ چاہتا ہے کہ ایک مسلمان ان تمام اخلاقی رذائل سے پاک ہو۔ اس لیے غیبت خواہ زبان سے ہو یا عمل سے، اشارے سے یا کنائے سے، طنز کی شکل میں ہو یا تعریض کی صورت میں، بہر حال مذموم ہے۔ ہم جب بھی کسی کا ذکر کریں، اپنے قلب کو ٹٹول لیں، اپنے الفاظ کو تول لیں، کیوں کہ ہمارے منہ سے نکلنے والی ہر بات کو فرشتے لکھ لیتے ہیں؛

مَا یَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَیْہِ رَقِیْبٌ عَتِیْدٌ ○ (قٓ : ۱۸)

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے غیبت کرنے کو بھی ناپسند فرمایا اور غیبت سننے کو بھی گناہ بتایا۔ بخاری کی حدیث ہے، آپ نے فرمایا کہ جس نے دوسروں کے بارے میں ایسی بات سنی ہو جو انھیں ناگوار ہو تو اس کے کان میں قیامت کے دن سیسا پلایا جائے گا۔

طحاوی کی حدیث ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے لوگوں نے پوچھا کہ غیبت کے گناہ کا کفارہ کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: جس کی تم نے غیبت کی ہے اس کی مغفرت کے لیے اللہ سے دعا کرو، یہ ہی کفارہ ہے۔

Marfat.com

ہم پاکستان میں ایک اسلامی معاشرہ قائم کرنے کی جدوجہد کر رہے ہیں۔ ہماری آرزو ہے کہ پاکستان میں ہر انسان دوسرے انسان سے محبت کرے اور باہمی عزت کا ماحول پیدا کیا جائے۔ ہم چاہتے ہیں کہ پاکستان میں اخلاق کا بول بالا ہو اور حسنِ اخلاق اور حسنِ معاشرت اور حسنِ سلوک سے ہر پاکستانی آراستہ ہو، ہمیں اس میں کامیابی ضرور ہو سکتی ہے۔ مگر ہمیں غیبت کے گناہ سے خود کو بچانا ہوگا۔ اللہ تعالیٰ ہماری مدد فرمائیں۔

Marfat.com

خیانت

اللہ تعالیٰ جلّ شانہ نے چاند اور ستاروں کو آسمان کی زینت قرار دیا ہے۔ جس طرح چاند ستارے زینتِ آسمان ہیں اسی طرح انسان اِس زمین کی زینت ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ اجرام فلکی کا قیام وقرار اور ان کی بقا ان کی کشش باہمی پر منحصر ہے۔ آفتاب ومہتاب کی گردش، ستاروں کی روش اور اجرام فلکی کا نظم ونظام یہ سب ایک دوسرے سے مربوط ہے اور باہمی ربط وضبط سے یہ نظام قائم ودائم ہے۔ آسمانوں کا یہ سارا نظم وضبط اور ربط وتعلق ایک امانت باہمی ہے جو اللہ تبارک وتعالیٰ کی عظمت وجلال کی رہین منّت ہے۔ اس سارے نظام میں خیانت ممکن نہیں ہے۔ خیانت کی ایک رمق اس سارے نظام کو تہ وبالا کر سکتی ہے۔

اس کرۂ ارض پر اور اس زمین پر، کہ جو بجائے خود اس سارے نظام کا ایک حصہ ہے جس کا ذکر میں نے ابھی کیا ہے، انسان کا وجود نہ صرف یہ کہ اس زمین کی زینت ہے بلکہ امانتِ باہمی کا ایک نظام ہے کہ جو یہاں جاری ساری ہے۔ جب تک انسان اور انسان کے مابین امانت ومفاہمت کا نظام قائم اور باقی ہے اس زمین کا نظم ونسق اور حسن وجمال قائم رہے گا۔ اور جب میں یہ کہوں تو بجا ہوگا کہ بالکل اسی طرح زمین کی رونق اور زینت اور اس کی بہار کا انحصار انسانوں کے درمیان اخوت اور برادری اور اعتماد باہمی پر ہے۔

انسانوں کے درمیان موجود اعتماد کو جو چیز سب سے زیادہ نقصان پہنچاتی ہے وہ ہے خیانت۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ امانت وہ انسانی اور اخلاقی صفت ہے کہ جو اس زمین کو پُر بہار بناتی ہے اور اس پر بسنے والے انسان کی زندگی کو تابندگی عطا کرتی ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ انسان کو ایک پُر سکون اور امن واطمینان سے بھرپور زندگی کی راہ دکھاتا ہے۔ انسانوں کو اس فطری واخلاقی صفت کو برقرار رکھنے اور اس کی حفاظت کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔

Marfat.com

قرآن مجید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَىٰ أَهْلِهَا ۙ (النساء: ۵۸)

یعنی "اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں اہلِ امانت کو پہنچا دیا کرو۔"

دوسری طرف خیانت کی ممانعت ان الفاظ میں کی گئی ہے،

لَا تَخُونُوا اللَّهَ وَالرَّسُولَ وَتَخُونُوا أَمَانَاتِكُمْ ... (الانفال: ۲۷)

یعنی "اللہ اور اس کے رسول کے معاملے میں خیانت نہ کرو اور آپس میں ایک دوسرے کے معاملات میں بھی خیانت سے بچو۔"

امانت کو عام طور پر مادّی اشیا کی حفاظت سے متعلق سمجھا جاتا ہے، لیکن اس آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ امانت کا مفہوم اور اس کا اطلاق اس سے کہیں زیادہ وسیع ہے، اس لیے کہ آدمی اور اللہ اور رسول کے درمیان مادی امانت سے زیادہ لائق تصور معنوی امانتیں ہیں، اور اس ممانعت کے حکم میں یہ بات داخل ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی بندگی کے تقاضوں کے معاملے میں کوئی کوتاہی نہ کرے، رسولؐ کو مطاع اور صاحبِ امر سمجھ لینے کے بعد اس کے احکام و تعلیمات کی ادائی میں کسی کوتاہی کا مرتکب نہ ہو۔

اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ خالق دوجہاں ہے، وہی خالق ارض و سما ہے اور تمام کائنات اور کائنات کی ہر چیز اور آسمان و زمین کی ہر شے کو اللہ نے پیدا کیا ہے۔ اللہ نے انسان کو پیدا کیا کہ عبد و معبود کے مابین رشتۂ بندگی قائم ہو، اس رشتۂ بندگی میں رخنہ اندازی خیانت کی تعریف میں آتی ہے۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہادیِ برحق ہیں، ان کی ہدایت سارے عالمِ ارض کے لیے ہے اور مسلمانوں پر اس ہدایت کی پابندی لازمی ہے اور فرض اور پابندی کا یہ عہد بھی ایک امانت ہے اور جب مسلمان اس امانت کا حق ادا کرنے میں کوتاہی کرتا ہے تو یہ بھی خیانت ہے۔ امانت داری کو اسلامی طریقِ زندگی میں جو اہمیت حاصل ہے اس کا سب سے واضح اظہار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمانِ مبارک سے ہوتا ہے کہ:

لَا دِيْنَ لِمَنْ لَا أَمَانَةَ لَهُ

جس میں امانت داری نہیں اس کا دین بھی معتبر نہیں۔

امانت و خیانت کے اس بیّن مفہوم اور واضح مطلب کو سمجھنے کے بعد ہمارے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ ہم آج کے حالات کا جائزہ لیں اور غور و فکر کریں کہ ہم اس وقت

Marfat.com

کہاں کھڑے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ آج کے معاشرے میں انحطاطِ اخلاق اور انتشار و پراگندگی کے اسباب و محرکات کی فہرست میں خیانت بے حد اہم سبب ہے۔ خیانت انسانی روح کو مکدّر اور فکر کے سرچشموں کو خشک کر دیتی ہے، معاشرتی اور اجتماعی ہیئت کی عمارت کو منہدم کر دیتی ہے۔

حسنِ معاشرت، تعاون اور حقوقِ باہمی کی نگہداشت سے حاصل ہوتا ہے۔ اجتماعی نظام کی بنیاد ہی حقوق اور فرد و جماعت کے ربطِ باہم پر ہے۔ خیانت کرنے والا ان سارے حقوق کو پامال کرتا ہے، اور معاشرتی قوانین کی خلاف ورزی کر کے اپنے غیر تربیت یافتہ ہونے کا اعلان کرتا ہے۔ خائن ذلّت، رسوائی اور پستی کو قبول کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتا۔ ایک تاجر خیانت کی راہ سے ذلّت کی منزل کو پہنچ جاتا ہے، مزدور و ملازم خیانت کی وجہ سے اپنا اعتماد کھو بیٹھتے ہیں۔ ذمہ داریوں کے احساس کے بغیر عظمت اور سعادت حاصل نہیں ہو سکتی، ہماری اہم ترین ذمہ داری، محنت و مشقت کے ساتھ ساتھ دیانت ہے، اور خیانت اس کی ضد!

اگر ہم اسلام کی تاریخ اور اس کے ارتقا پر بہ نظرِ غائر اور بہ نظرِ عمیق غور کریں تو ہم بلا خوف و خطر اس حقیقت کا اظہار کر سکتے ہیں کہ اسلام کے عروج کی ہر داستان امانت سے وابستہ ہے۔ ہر شعبۂ حیات میں اور زندگی کے ہر پہلو کو امانت کے تابع رکھا ہے اور خیانت کی تحقیر کی ہے اور خیانت کو غیر اسلامی قرار دیا ہے۔ اگر دیانت و امانت نہ ہوتی تو اسلام کا عروج ممکن نہ ہوتا۔

ہم اسی اسلام کے ماننے والے ہیں اور ہم اسی اسلام کے نام لیوا ہیں اور پیرو ہیں۔ پاکستان ایک اسلامی ریاست ہے اور اس مملکت میں مسلمان بستے ہیں اور حاکم ہیں، اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ ہم پاکستان کو تنزّل کی طرف لیے جا رہے ہیں اور اس کے ساتھ ہم بہ حیثیت قوم و ملت تنزّل کی گرفت میں ہیں۔ کیا ہمارے مسلسل تنزّل کا سبب یہ نہیں ہے کہ ہم دیانت سے غافل ہو کر خیانت کے بازاروں میں سرگرم عمل ہیں؟ ہماری صنعت و تجارت تنزّل کی گرفت سے باہر نہیں ہے۔ ہمارا ملّی وقار تنزّل کی جراحتوں سے زخمی ہے اور اس سے جگہ جگہ خون ٹپک رہا ہے۔ ہماری عظمت و رفعت کو کوئی تسلیم نہیں کرتا۔ ہم پاکستان میں ہوں یا پاکستان سے باہر، ہمیں مقام عزت حاصل نہیں ہے۔ ہم نے خیانتوں کے جال میں پھنس کر اپنی خودی کو مسمار کر لیا ہے اور پاکستان کی خودی کو

Marfat.com

ہم نے مجروح کر دیا ہے۔

ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے خیانت کو بدترین بداخلاقی قرار دیا ہے، یہ فیصلہ الٰہی ہے اور اس میں کوئی تبدیلی نہیں آ سکتی۔ پس ہمیں چاہیے کہ ہم خود کو بدل ڈالیں اور خیانت کو ترک کر کے راہِ راست اختیار کریں اس کے بغیر ہم نہ سربلند ہو سکتے ہیں اور نہ سرفراز۔ اللہ تعالیٰ ہماری مدد فرمائیں۔

Marfat.com

نفاق

افراد اور ان کے باہمی تعلقات بسا اوقات بہت پیچیدہ اور نازک مرحلے پر آجاتے ہیں۔ ایسے حالات میں نہایت سنجیدگی، دور اندیشی اور احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس نازک مرحلے کی وضاحت اس طرح کی جا سکتی ہے کہ عین ممکن ہے کہ دو اشخاص کے درمیان کسی مسئلے پر اختلاف رائے ہو جائے یا ان دونوں کو ایک دوسرے سے کچھ شکایتیں پیدا ہو جائیں، اور ایک تیسرا شخص ان دونوں سے تعلقات رکھتا ہو۔ یہاں تک تو اعتراض کی کوئی بات نہیں ہے، بلکہ یہ اس کی وسیع النظری اور شائستگی ہے کہ وہ ان دونوں کے اختلافات سے اپنے روابط و تعلقات کو متاثر ہونے کی اجازت نہیں دیتا۔ ان دونوں اشخاص کی بھی یہ رواداری ہے کہ وہ اس تیسرے شخص سے یہ جاننے کے باوجود ملتے رہیں کہ وہ ان کے حریف سے بھی ملتا ہے۔ اصل زیر بحث اصول یہ ہے کہ اس تیسرے شخص کا طرزِ عمل کیا ہونا چاہیے؟ اور خاص طور پر ان دونوں کے اختلافات کے پس منظر میں اُس کے کردار کا کیا رخ ہونا چاہیے؟

عام طور پر یہ دیکھا گیا ہے کہ اس پیچیدہ موقع پر تیسرا شخص خلوص و صداقت کے تقاضوں کو نظر انداز کرتے ہوئے ایک تک دوسرے کی بات پہنچانے کی کوشش کرتا ہے، اور دونوں کو یہ یقین دلاتا ہے کہ وہ اُن کا حقیقی بہی خواہ ہے۔ اس ریشہ دوانی کے نتیجے میں دونوں کے تعلقات میں مزید خرابی اور ابتری پیدا ہونے لگتی ہے، اور باہمی کشیدگی نزاع کی حد تک پہنچ جاتی ہے۔ اور اس نزاع کا سبب عام طور پر یہی تیسرا شخص ہوتا ہے۔ یہ صورت افراد کے ساتھ بھی ہوتی ہے اور اقوام کے ساتھ بھی۔

اسلام اس طرزِ عمل اور اس کردار کو نفاق سے تعبیر کرتا ہے، اور اس کو انسان کی شدید اخلاقی پستی قرار دیتا ہے، یہ چغل خوری سے زیادہ مذموم حرکت ہے، کیوں کہ چغل خور تو صرف ایک فرد کی بات پہنچاتا ہے، منافق دونوں تک ایک دوسرے کی بات پہنچاتا ہے!

منافقت اور دو رُخے پن کے لیے صرف یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ ایک کی بات دوسرے

Marfat.com

تک پہنچانے تک محدود ہو، اسلام اُس گفت گو کو بھی نفاق اور دورُخے پن ہی سے تعبیر کرتا ہے جو غیر مخلصانہ ہو۔ انسان جب کوئی ایسی بات کسی سے کہے جسے خود اس کا دل تسلیم نہ کرتا ہو یہ منافقت ہے۔ مثلاً کسی کے منہ پر اس کی تعریف کردی جائے اور پسِ پشت اس کی برائی کی جائے، یہ بھی منافقت ہے۔ ابتدائے عہد اسلام میں مخالفین اور منافقین کا طرزِ عمل یہی تھا۔ قرآن پاک نے ان کی اخلاقی پستیوں کے ضمن میں ان کے دورخے پن کو کھول کھول بیان کیا ہے، ارشاد ہے:

وَاِذَا لَقُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا وَاِذَا خَلَوْا اِلٰی شَیٰطِیْنِهِمْ قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ ۝ (البقرہ: ۱۴)

یعنی "جب وہ ایمان والوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے، اور جب تنہائی میں اپنے شیطانوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں، ہم تمھارے ساتھ ہیں، ہم مسلمانوں کو بناتے ہیں۔"

معاشرتی حیثیت سے ایسے آدمیوں کو اردو میں منافق اور دورُخا کہتے ہیں اور عربی میں ذوالوجہین کہتے ہیں۔ حدیث نبوی میں ایسے لوگوں کے لیے شدید وعید آئی ہے۔

بخاری کی حدیث ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ روز قیامت تم دورُخے آدمی کو سب سے بُرا پاؤ گے، جو کچھ لوگوں کے پاس جاتا ہے تو اس کا رخ کچھ اور ہوتا ہے، اور دوسروں کے پاس جاتا ہے تو اس کا رخ کچھ اور ہوتا ہے۔

مسلم کی حدیث ہے کہ دنیا میں جن کے دو رُخ ہوں گے قیامت میں اس کے منہ میں آگ کی دو زبانیں ہوں گی۔

ایک دوسرے کی بات اگر پوری صحت و دیانت کے ساتھ اور اصلاح کی نیت سے پہنچادے تو یہ دورُخا پن نہیں ہے۔ منافقت یہی ہے کہ حاشیہ آرائی کے ساتھ باتیں کہہ کر مخالفت بڑھائی جائے، اور دونوں کو اپنی دوستی کا بھی یقین دلایا جائے یا پھر کسی سے وہ بات کہی جائے جس کی تصدیق اس کا قلب نہ کرتا ہو۔

حضرت ابن عمرؓ سے کسی نے سوال کیا کہ ہم لوگ جب اپنے اُمرا کے سامنے جاتے ہیں تو کچھ اور کہتے ہیں اور جب وہاں سے نکلتے ہیں تو کچھ اور کہتے ہیں، آپ کے خیال میں یہ طرزِ عمل کیسا ہے؟ حضرت ابن عمرؓ نے کہا کہ ہم لوگ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں اس کو نفاق سے تعبیر کرتے تھے، خوشامد بھی نفاق ہی کی ایک قسم ہے۔

حضرت ابو درداءؓ فرماتے ہیں کہ بعض لوگوں کے سامنے ہم ان کو دکھانے کے لیے ہنس

Marfat.com

دیتے ہیں، حال آنکہ ہمارے دل ان پر ملامت کرتے ہیں، یہ نفاق ہے۔ اس طرح کا نفاق اور دورخاپن دنیوی مفاد کے حصول اور خود غرضی کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔

دیلمی میں حضرت ابوہریرہؓ سے یہ حدیث مروی ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جاہ و مال کی محبت نفاق کو دل میں ایسا ابھارتی ہے کہ جیسے پانی پودے کو۔

یاد رکھیے، نفاق کی دیمک جب نظامِ اجتماعی کے ستونوں کو چاٹنے لگتی ہے تو ساری عمارت منہدم ہو کر نمونۂ عبرت بن جاتی ہے۔ افراد کا افراد سے تصادم، اقوام کا اقوام سے تصادم، یہ جنگ و پیکار اور رستاخیز سب کچھ نفاق اور دورُخے پن کا نتیجہ ہے۔ اسلام ہمیں تاکید کرتا ہے کہ ہم قول و عمل دونوں کو نفاق سے پاک رکھیں، کیوں کہ جو کچھ ہم کہتے ہیں، اگر اس پر عمل نہیں کرتے تو یہ عمل کا نفاق ہے، اور اگر ہم کچھ کہتے ہیں اور دل اس کی تردید کرتا ہے، تو یہ قول کی منافقت اور اس کا دورخاپن ہے۔ اگر ہم تاریخ کا غائر اور گہرا مطالعہ کریں اور اقوام و ملل کے عروج و زوال کی داستانوں کو بہ نگاہِ عبرت پڑھیں تو ہم لازماً اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ نفاق قوموں کے زوال کے اسباب میں سے ہے۔ نفاق اقوام و ملل کے لیے پیامِ مرگ ثابت ہوا ہے۔ ماضی میں بھی ایسا ہی ہوا ہے اور آنے والے ہر زمانے میں نفاق ملامت کی علامت ہوگا۔

تو اے برادرانِ وطن! لازم ہے کہ ہم اپنے فکر و نظر پر نگاہِ عمیق ڈالیں اور اپنے قول و عمل پر غور کریں، اگر ان میں آمیزشِ نفاق ہے تو اس عذاب سے خود کو نکالنے کی جدوجہد کریں کہ پاکستان کی سربلندی اور سرفرازی کے لیے نفاق سے پرہیز لازمی ہے۔

Marfat.com

بدگمانی

پُر امن اور طمانیت بخش اور سچا انسانی معاشرہ وہی ہوتا ہے کہ جس کے افراد باہمی اعتماد رکھتے ہوں۔ جہاں کسی کو کسی کی نیت پر کوئی شک وشبہ نہ ہو، کسی کو کسی کے اخلاص ووفا کی جانب سے کوئی بدگمانی نہ ہو، ہر شخص ایک دوسرے کی سازش، جارحیت اور ایذا کوشی سے محفوظ ہو، اور کسی کا آئینۂ قلب کسی کی طرف سے مُکدّر نہ ہو۔

فرد اور جماعت دونوں کی مصلحتوں کا تقاضا ہے کہ ہر اس طرزِ عمل اور ہر اس طریق فکر سے اجتناب اور پرہیز کیا جائے کہ جو افراد کے درمیان بدگمانی اور سوئے ظن پیدا کرنے کا موجب ہے۔ اس لیے کہ جب فضا مکدر ہو جاتی ہے تو ہر شخص اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھنے لگتا ہے۔ عدمِ تحفظ کا احساس اجتماعی نشاط و مسرت کے اسباب سَلب کر لیتا ہے۔ یہ وہ اخلاقی مرض ہے جس کی وجہ سے پورا معاشرہ جسدِ بے روح ہو جاتا ہے، نفرت وعداوت کی آگ بھڑک اٹھتی ہے، اور سارے افراد کو جلا کر خاکستر کر دیتی ہے۔

بدگمانی ایک ذہنی مرض ہے اور یہ مرض وہم کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ حقیقت پسند تو مین اوہام کو کوئی اہمیت نہیں دیتیں۔

قرآن حکیم نے اس وہم کے مضر نتائج کی طرف بڑے بلیغ انداز میں اشارے کیے ہیں اور بدگمانی سے ہمیں دامنِ اخلاق کو پاک رکھنے کی سخت تاکید کی ہے، ارشاد ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اجْتَنِبُوا كَثِيرًا مِّنَ الظَّنِّ إِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ إِثْمٌ (الحجرات: ۱۲)۔

یعنی "اے ایمان والو، ظن وگمان سے بہت کام نہ لیا کرو، یقیناً بعض بدظنی گناہ ہے۔"

ہر شخص کی نیت کو مشکوک سمجھنا اہلِ ایمان کا شیوہ نہیں۔ مسلمانوں کو صاف صاف یہ بتا دیا گیا ہے کہ بدگمانی اگرچہ ذہنی اور قلبی مرض ہے، لیکن اپنے مضر اور مہلک اثرات کی وجہ سے اللہ کے نزدیک صریحاً گناہ اور کھلی ہوئی معصیت ہے۔

قرآن شریف کی ایک دوسری آیت میں اس بدترین اخلاقی مرض کو قوموں کی تباہی وبربادی کا سبب قرار دیا گیا ہے:

Marfat.com

وَظَنَنْتُمْ ظَنَّ السَّوْءِ ۖ وَكُنْتُمْ قَوْمًا بُورًا ○ (الفتح ۱۲)

یعنی تم نے ایک دوسرے کے بارے میں برا گمان رکھا اور تم ہلاک ہو جانے والی قوم تھے۔"

بدگمانی کی ایک نوعیت تو وہ ہے جس کا تعلق افراد اور ان کے معاملات سے ہے۔ بدگمانی کی دوسری نوعیت بندے اور اللہ سے تعلق رکھتی ہے۔ بعض افراد اللہ تعالیٰ کی رحمتوں کے خزانہ لازوال کی جانب سے بدگمانی کے مرض میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اس گناہ پر جہنّم کی وعید اور لعنت کا اظہار کیا گیا اور اسے شرک و نفاق کا نتیجہ قرار دیا گیا۔

بخاری کی حدیث میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اللہ کے بندو! بدگمانی سے بچو، کیوں کہ وہ سب سے زیادہ جھوٹی بات ہے۔ تم دوسروں کی ٹوہ میں نہ رہا کرو اور ایک دوسرے پر بڑھ جانے کی بے جا ہوس نہ کرو۔ نہ آپس میں حسد رکھو، نہ بغض رکھو، نہ ایک دوسرے سے منہ پھیرو، اور اے اللہ کے بندو! جیسا اللہ نے فرمایا ہے آپس میں بھائی بھائی بن جاؤ۔"

شارعِ اسلام نے بدگمانی سے صرف بچنے ہی کی تاکید نہیں کی بلکہ ان حالات و قرائن کی وضاحت کی بھی اپنے عمل سے مثال قائم کی جو بظاہر لوگوں کو شک و شبہ کا موقع فراہم کرتے ہوں۔

ابوداؤد کی حدیث ہے کہ ایک بار آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم معتکف تھے تو ایک ام المومنین رضی حاضر خدمت ہوئیں۔ آپ اُن کو پہنچانے کے لیے نکلے تو راستے میں دو اصحاب سے ملاقات ہوئی۔ وہ یہ سمجھ کر راستے سے ہٹنے لگے کہ شاید ہم لوگ بے موقع آ گئے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، لوگو، یہ میری بیوی ہیں، میں ان کو رخصت کرنے آیا تھا، صحابۂ کرام نے عرض کیا یارسول اللہ! ہمیں کوئی بدگمانی نہیں ہو سکتی اور وہ بھی آپ سے۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ شیطان انسان کے جسم میں خون کی طرح سرایت کیے ہوئے ہے۔

بدگمانی کا ذہنی مرض ایک دوسرے کے حالات کے تجسّس پر لوگوں کو اُبھارتا ہے اور شک و شبہ کی وجہ سے لوگ ایک دوسرے کی ٹوہ میں لگ جاتے ہیں۔ ابوداؤد ہی میں حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی سے یہ حدیث مروی ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک شخص لایا گیا۔ لوگوں نے کہا کہ اس کی داڑھی سے شراب ٹپکتی ہے، اس لیے یہ شراب خوار معلوم ہوتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، "ہمیں کسی کی ٹوہ میں رہنے

Marfat.com

کی ممانعت کی گئی ہے۔"

ترمذی کی حدیث ہے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ایک مسلمان پر دوسرے مسلمان کا خون حرام ہے، اس کا مال حرام ہے اور یہ بھی حرام ہے کہ وہ کسی سے بدگمانی رکھے۔

اس بدگمانی کی وجہ سے نظام عدل بھی متاثر ہوتا ہے اور بسا اوقات معاملات کے فیصلوں میں اس بدگمانی کی وجہ سے زیادتیاں ہو جاتی ہیں اور انصاف کا تقاضا پورا نہیں ہوتا۔ اس لیے حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ ارشاد فرماتے ہیں کہ جس عدل کی بنیاد بدگمانی پر ہو، وہ عدل نہیں ہے۔ آپ فرماتے ہیں، لوگو! بدگمانی سے بچو، کیوں کہ یہ عبادتوں کو برباد کر دیتی ہے اور انسانوں کو گناہوں سے گرانبار کر دیتی ہے۔

حضرت علیؓ نے بجا فرمایا کہ جب بدگمانی دل میں گھر کر جاتی ہے تو مصالحت و مفاہمت کے امکانات ختم ہو جاتے ہیں۔ یہ وہ اخلاقی برائی ہے جو انسان کی دوسری اخلاقی خوبیاں سلب کر لیتی ہے اور ان کی جگہ پر بے شمار دوسرے مذموم اوصاف پیدا ہو جاتے ہیں۔ شک و شبہ انسان کے مزاج سے استقامت چھین لیتا ہے اور اس کی قوت فیصلہ متاثر ہو جاتی ہے، کیوں کہ متشکک ذہن کا آدمی کبھی ادراک حق نہیں کر سکتا۔

سوئے ظن اور بدگمانی کے مقابلے میں اسلام حُسنِ ظن کی صفت سے ہر مسلمان کو متصف دیکھنا چاہتا ہے۔ دوسروں کے فکر و عمل پر اعتماد، ان کے اخلاص اور وفا پر اطمینان اور ایمان و تقویٰ پر بھروسا سکون و طمانیت کی دولت عطا کرتا ہے اور اللہ کے نزدیک اس حسنِ ظن کا اجر ملتا ہے۔

اسلام یہ چاہتا ہے کہ مسلمان اپنے دوسرے بھائیوں سے بھی حسن ظن رکھے۔ اللہ تعالیٰ کی رحمتوں سے بھی حسن ظن رکھے اور اس کے سارے نکوکار و پرہیزگار بندوں سے خاص طور پر حسن ظن رکھے، کیوں کہ عام بندوں کے ساتھ بدگمانی بھی بہر حال گناہ ہے، لیکن اللہ کے خاص بندوں کے ساتھ بدگمانی گناہ عظیم ہے۔

Marfat.com

حرص و طمع

جس دن سے انسان نے اس دنیا میں قدم رکھا ہے ضرورتوں کا حصار اس کے گرد وسیع سے وسیع تر ہوتا جارہا ہے۔ بلاشبہ بعض ناگزیر ضرورتیں ہیں جو ہماری بقا کے لیے ہیں اور ہماری زندگی کے تحفظ کے اسباب کی فہرست میں آتی ہیں۔ انھیں ہم فطری ضروریات کہہ سکتے ہیں۔ ان کی فراہمی کی جد و جہد منشائے شریعت کے عین مطابق ہے، لیکن لامتناہی خواہشات، ختم نہ ہونے والی ضرورتیں اور آرزوئے بے نہایت اسلام کے نزدیک حرصِ بے جا ہے۔ اس کا انجام تشنگی ہے اور ناآسودگی اس کی تقدیر ہے۔

حریص فرد اور حریص معاشرہ مادّی دولت حاصل کرنے کے لیے اخلاقی قدروں کو پامال کرتا ہوا دیوانہ وار آگے بڑھنے کی کوشش کرتا ہے۔ لالچی فرد اور حریص معاشرہ حرام و حلال کی تمیز کھو دیتا ہے۔ ایسا فرد اور معاشرہ اپنے پست اور ادنا مقاصد کے لیے خون ریزی اور سفّاکی سے بھی گریز نہیں کرتا۔ اس ایک اخلاقی دنائت اور رذالت کی وجہ سے اس میں سینکڑوں دوسری خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ حسد، بخل، قطعِ رحم، خیانت، بزدلی، بدگمانی اور عداوت کے شعلوں میں حریص انسان عمر بھر جھلستا رہتا ہے، اس کے دل کو سکون اور طمانیت کی دولت کبھی میسر نہیں آتی۔ وہ ہر اُس شخص یا ہر اُس قوم کو حریصانہ نظروں سے دیکھتا ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے مال و دولت، یا مادّی اسباب کی وسعت سے نوازا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اُس کے مال و دولت پر اِس کا قبضہ ہو جائے۔

وہ اس رزق پر قانع نہیں ہوتا جو اللہ تعالیٰ نے اسے عطا فرمایا ہے، وہ توسیعِ رزق کے صحیح اسباب یعنی جائز جد و جہد بھی نہیں کرنا چاہتا بلکہ اپنی غارت گری اور حرص و ہوس سے دوسروں کو تباہ اور اپنے آپ کو خوش حال بنانا چاہتا ہے۔ قرآن کریم نے اس کی سخت مذمت کی ہے، اس لیے کہ یہ نفس کی انتہائی دنائت و پستی ہے، ارشاد ہوا کہ:

لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلَىٰ مَا مَتَّعْنَا بِهِ أَزْوَاجًا مِّنْهُمْ ---- (الحجر: ۸۸)

Marfat.com

یعنی "اپنی آنکھیں ان چیزوں کی طرف مت پھیلاؤ جو ہم نے ان میں سے مختلف لوگوں کو فائدہ اٹھانے کو دی ہیں۔"

یہ ہی حرص و طمع کا جذبہ ہے جو ایک دوسرے کی جان لینے، اور مال چھین لینے پر ابھارتا ہے۔

ایک حدیث کے الفاظ ہیں کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، "حرص سے بچو، کیوں کہ اس نے اگلوں کو دعوت دی کہ وہ بے گناہوں کا خون بہائیں، اس نے اگلوں کو دعوت دی کہ حرام کو حلال سمجھیں۔"

ایک دوسری حدیث میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

حرص سے بچو، کیوں کہ تم سے پہلی قومیں اسی حرص کی وجہ سے تباہ ہوئیں۔ اسی کی وجہ سے انھوں نے رشتۂ حق کو کاٹا۔ حرص نے کہا تو انھوں نے بخل کیا اور اسی حرص نے ان کو فسق و فجور پر مائل کیا۔ حرص خود حریص کی انسانی زندگی کو کس طرح تباہ و برباد کرتا ہے اس کا اظہار نہایت بلیغ الفاظ میں ایک دوسری حدیث میں ہوا ہے۔

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

"بری باتوں میں انسان کو سب سے زیادہ کڑھانے والی برائی حرص ہے۔" حریص آدمی ہمیشہ اس غم میں کڑھتا رہتا ہے کہ اسے یہ نہیں ملا، وہ نہیں ملا، فلاں کے پاس یہ ہے، میرے پاس یہ نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ اور رسولِ اکرم قرآن مجید اور حدیث شریف میں نہایت واضح طور پر حرص و طمع کو خلافِ انسانیت قرار دیتے ہیں۔ حرص و طمع سے شرافت پامال ہوتی ہے اور انسان کا شرف و عز تباہ ہوتا ہے۔ اس کے باوجود ہمیں آج اپنے حالات پر غور کرنا چاہیے۔ ہمیں اپنے معاشرے پر نگاہ کرنی چاہیے اور اپنی سوسائٹی کے طرزِ فکر و عمل کا جائزہ لینا چاہیے۔ لالچ اور حرص و طمع کی ہم اس درجہ شدید گرفت میں ہیں کہ ہم نے حرام و حلال کی تمیز کھو دی ہے۔ ہمارے ہاں چوریاں ہو رہی ہیں، ڈاکے پڑ رہے ہیں اور رہزنیاں ہو رہی ہیں۔ مال و دولت ہمارا منتہائے مقصود ہو گیا ہے اور ہم اس کے لیے اخلاق کی ہر قدر کو عملاً پامال کر رہے ہیں اور انسانیت کے ہر شرف کو تباہ کر رہے ہیں، اور خود غور نہیں کر رہے ہیں کہ اس حرص و طمع نے ہمیں اقوامِ عالم کی نگاہوں میں گرا دیا ہے۔ اس کے برعکس ایک وہ معاشرہ اور سوسائٹی بھی ہے جو نورِ ایمان سے منور ہے اور اللہ کی دی ہوئی روزی پر قانع ہے۔ اسے یقین ہے کہ اگر اس نے تقویٰ اور خدا ترسی

Marfat.com

کے تقاضے پورے کرتے ہوئے صحیح خطوط پر معاشی جدوجہد کی تو کبھی تنگیِ معیشت سے دوچار نہیں ہوگی، قرآن کریم میں ہے:

وَمَن يَتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَل لَّهُ مَخْرَجًا ۝ وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ط وَمَن يَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهُ ط (الطلاق: ۲تا۳)

ترجمہ: "اور جو شخص اللہ سے ڈرتا ہے، اللہ اس کے لیے ضرور کوئی راستہ نکالتا ہے اور وہ اس کو ایسی جگہ سے روزی دیتا ہے کہ وہ سمجھ بھی نہیں سکتا اور جو اللہ پر بھروسا کرے گا اللہ اس کے لیے کافی ہوگا۔"

مال و دولت اور رزق میں ایک کو دوسرے پر فضیلت مصلحتِ خداوندی کے مطابق ہے۔ ہم حرص وطمع سے نہ تو خود تو انگر ہو سکتے ہیں نہ اللہ کے ان بندوں کو نقصان پہنچا سکتے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے وسعتِ مال و اسباب سے نوازا ہے۔ ہاں اپنے اخلاق کو تباہ و برباد ضرور کر سکتے ہیں۔

حرص، اللہ پر ایمان و توکل کے فقدان کی نشانی ہے۔ حریص انسان نہ اللہ کی تقسیم پر راضی ہوتا ہے نہ اسے اُس کے خزانۂ لازوال سے امیدیں ہوتی ہیں۔ نہ وہ انسانیت اور اخلاق کا پابند ہوتا ہے۔ اُسے نہیں معلوم کہ دولت کا حصول حرص وطمع کے ذریعہ سے نہیں بلکہ رضائے الٰہی سے ممکن ہے، کیوں کہ آسمان و زمین کے خزانوں کا مالک پروردگارِ عالم ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے:

وَلِلّٰهِ خَزَآئِنُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۔۔۔ (المنافقون: ۷)

"اور اللہ کے لیے آسمان اور زمین کے خزانے ہیں۔"

ایک مسلمان کا مقام واقعتہً یہ ہے کہ وہ حرص وطمع سے کبھی اپنے دامن کو آلودہ نہیں کرتا۔ حقیقت یہ ہے کہ ایمان اور حرص میں تضاد ہے، مومن کبھی حریص نہیں ہو سکتا، وہ طماع اور لالچی نہیں ہو سکتا۔ یہ ایمان اور اخلاق دونوں کے منافی ہے۔

نسائی کی حدیث ہے، آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"ایمان اور حرص ایک دل میں جمع نہیں ہو سکتے۔"

ترمذی کی حدیث ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حرص کی مذمت کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ:

"انسان بوڑھا ہوتا ہے مگر دو چیزیں جوان رہتی ہیں، جینے کی خواہش، اور مال کی حرص!"

طبرانی کی حدیث ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

Marfat.com

”دو بھیڑیے اگر بکریوں کے ریوڑ میں چھوڑ دیے جائیں تو وہ ان کو اتنا تباہ و برباد نہیں کر سکتے، جس قدر مال و مرتبہ کی حرص انسان کے دین و ایمان کو برباد کر سکتی ہے۔“

اللہ تعالیٰ ہمیں راہ مستقیم پر چلائیں اور ہمیں حرص کے عذاب سے محفوظ فرمائیں۔

Marfat.com

کھانے پینے کی چیزوں میں ملاوٹ

تجارت میں دھوکے اور فریب کی کئی صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک صورت تو یہ ہے کہ بُری چیز کو اچھا کہہ کر فروخت کیا جائے، یعنی مال خراب دیا جائے مگر دام پورے وصول کیے جائیں۔ دوسری صورت یہ ہے کہ مال کا عیب چھپایا جائے اور خریدار پر ظاہر نہ ہونے دیا جائے کہ اس میں یہ نقص ہے۔ بعض چیزوں میں ایسی خرابیاں ہوتی ہیں جو ظاہر میں دکھائی نہیں دیتیں۔ لیکن استعمال کرنے سے ان کا پتا چل جاتا ہے۔ اچھا تاجر خریدار کو یہ بتا دیتا ہے کہ اس میں یہ خرابی ہے، بُرا تاجر عیب چھپاتا ہے اور اپنی لفّاظی سے مال کو بے عیب ثابت کرتا ہے۔ تجارتی فریب کی ایک شکل کم تولنا بھی ہے۔ باٹ کم رکھنا یا ترازو کے پلڑے کو جھکا دینا تاکہ تول پورا نہ ہو، کم تولنے کی ترکیبیں ہیں۔ ایک اور طریقہ جو دھوکے باز تاجر استعمال کرتے ہیں دام زیادہ لینا ہے، یعنی بھاؤ سے زیادہ قیمت وصول کرنا۔ اسی ضمن میں چور بازاری یا بلیک مارکٹنگ بھی آتی ہے۔ جب کسی مال کی کھپت زیادہ ہو اور رسد کم ہو تو اس کے منہ مانگے دام وصول کرنا بھی چور بازاری کہلاتا ہے۔ اس کے علاوہ ذخیرہ اندوزی بھی تجارتی بداعمالی کی ایک بدترین شکل ہے۔ اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ عام ضرورت کی کسی چیز کو چھپا دیا جائے اور فروخت روک کر اس کا ذخیرہ جمع کیا جائے تاکہ اس چیز کی قلت پیدا ہو اور وہ لوگوں کو دست یاب نہ ہو سکے۔ اس قلّت کو مصنوعی قلّت کہتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں ضرورت مند لوگ مجبور ہو کر زیادہ قیمت دینے پر رضامند ہوتے ہیں اور زیادہ داموں کے علاوہ تاجر کی خوشامد بھی کرتے ہیں تاکہ وہ کسی طرح وہ چیز ان کو فراہم کر دے۔ کسی خاص موقع پر قیمتیں بڑھا دینا بھی تجارتی بددیانتی کی ایک قسم ہے۔ کسی خاص موسم میں یا تہوار کے موقع پر یا رمضان میں اور عید سے پہلے بہت سی چیزوں کی قیمتیں بڑھا دی جاتی ہیں۔ منافع خور تاجر جانتے ہیں کہ ایسے موقعوں پر لوگ خریداری پر مجبور ہوتے ہیں، اس لیے جتنے دام مانگے جائیں گے طوعاً کرہاً دیں گے۔ ان تجارتی بداعمالیوں میں ملاوٹ بھی شامل ہے۔ ملاوٹ ایک اعتبار سے تجارت کا بدترین

Marfat.com

طریقہ ہے اور اس کے نقصانات بہت زیادہ ہیں۔ ان نقصانات پر گفتگو کرنے سے پہلے یہ سمجھ لیجیے کہ ملاوٹ سے کیا مراد ہے۔ ملاوٹ کا اصطلاحی مطلب یہ ہے کہ کھانے پینے کی کسی چیز میں کوئی ایسی چیز ملا دی جائے جو اصل چیز سے ظاہری طور پر ملتی جلتی ہو، لیکن سستی اور کم قیمت ہو۔ چاہے اس کے خواص اور اثرات اصل چیز سے مختلف ہوں، کتنے ہی مختلف بلکہ متضاد ہوں۔ ملاوٹ کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اصل میں نقل ملا کر اصلی چیز کے دام وصول کیے جائیں۔ خریدار کو یقین دلایا جاتا ہے کہ یہ چیز اصلی اور خالص ہے اور اس میں کسی قسم کا میل نہیں ہے اور اس طرح معقول قیمت وصول کر لی جاتی ہے۔

تجارتی فریب کے جتنے طریقے بھی اختیار کیے جاتے ہیں ان میں سے جن چند کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے وہ سخت ناپسندیدہ، غلط، نقصان دہ اور معاشرے کے لیے مضر ہیں۔ ان میں سے کوئی طریقہ اچھا اور کسی مہذب سوسائٹی کے شایانِ شان نہیں ہے۔ یہ سب طریقے کوتاہ اندیشی اور حرص و آز کا نتیجہ ہیں۔ خصوصاً ایک مسلم معاشرے کے لیے تو یہ طریقے انتہائی شرم ناک ہیں۔ مسلمان کی حیثیت سے دیانت اور امانت ہماری نمایاں خصوصیت ہونا چاہیے۔ ایک سچا مسلمان اتنا قابلِ اعتماد ہوتا ہے کہ دشمن بھی اُس کی سچائی و ایمان داری پر بھروسا کر سکتے ہیں۔ ایک مسلمان کبھی دھوکا نہیں دے سکتا۔ جعل اور فریب مسلمان کے مزاج کے خلاف ہے۔ قرآنِ حکیم کا واضح ارشاد ہے:

وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْیَآءَهُمْ ۔۔۔

(الاعراف: ۸۵)

یعنی: "اور لوگوں کو ان کی چیزیں ناقص کر کے نہ دیا کرو۔"

مسلمان تاجر بہترین تاجر ہوتا ہے۔ وہ کھرا اور بے عیب مال فروخت کرتا ہے، اگر کوئی خامی ہوتی ہے تو صاف کہہ دیتا ہے۔ اُس کو یہ پسند نہیں ہوتا کہ اپنے مال کے عیب کے بارے میں خاموش رہے۔ وہ صفائی کے ساتھ اس کا اظہار کر دیتا ہے تاکہ خریدار دھوکے میں نہ رہے اور سوچ سمجھ کر خریدے اور خریداری کے بعد نہ پچھتائے۔

مسلمان تاجر کسی کو تکلیف نہیں پہنچانا چاہتا۔ وہ اپنے ایسے نفع سے نقصان کو بہتر سمجھتا ہے جس میں دوسرے کا نقصان ہو۔ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "دھوکے باز، بخیل اور احسان جتانے والا آدمی جنّت میں نہ جا سکے گا۔"

ملاوٹ ایک ایسا جعل ہے جس کے اثرات غیر محدود ہوتے ہیں۔ صرف تاجر اور خریدار تک اُس کے نقصان محدود نہیں ہوتے، بلکہ اس کے مضر اثرات پورے معاشرے

Marfat.com

کو اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ معاشرے میں خود تاجر بھی شامل ہے اور بالآخر اس کے نقصانات اس تاجر کو بھی بھگتنا پڑتے ہیں دوسری سماجی برائیوں کی طرح یہ برائی بھی متعدی ہوتی ہے اور ایک سے دوسرے کو لگتی ہے۔ اگر ایک تاجر دودھ میں ملاوٹ کرتا ہے تو دوسرا مرچوں میں۔ دودھ بیچنے والا جب مرچیں خریدتا ہے تو اس کو خالص مرچیں نہیں ملتیں اس طرح ملاوٹ سے سب ہی متاثر ہوتے ہیں۔ ملاوٹ سے معاشرے کو تین قسم کے نقصانات ہوتے ہیں۔

۱۔ مالی نقصانات۔ ۲۔ صحی نقصانات اور ۳۔ سماجی نقصانات۔

مالی نقصانات تو ظاہر ہیں اور ان کا اندازہ خریدار کو فوراً ہی ہو جاتا ہے۔ صحی نقصانات مقابلتہً آہستہ آہستہ ظاہر ہوتے ہیں۔ ملاوٹی غذائیں کھانے سے صحت پر بہت خراب اثر پڑتا ہے۔ طرح طرح کی بیماریاں پیدا ہوتی ہیں۔ خاص طور پر نظامِ ہضم پر بُرا اثر ہوتا ہے اور ہضم کی خرابی سے پورا جسمانی نظام متاثر ہوتا ہے، بلکہ بعض صورتوں میں اعصابی اور ذہنی نظام بھی مختل ہو جاتا ہے، اور ان تمام خرابیوں کا ذمے دار ملاوٹ کرنے والا تاجر ہوتا ہے۔ اس تاجر کی منافع اندوزی قوم کے کتنے ہی افراد کو صحت جیسی نعمت سے محروم کر دیتی ہے۔ افراد سے خاندان متاثر ہوتے ہیں اور اس طرح بے شمار افراد مصیبت میں پھنس جاتے ہیں۔

سماجی نقصانات میں باہمی اعتماد کا مجروح ہو جانا سرِ فہرست ہے۔ سماج کی بنیاد باہمی اعتماد پر قائم ہوتی ہے۔ اعتماد سے محروم سماج سکون و اطمینان سے بھی محروم ہو جاتا ہے۔ ملاوٹی اشیا کی خرید و فروخت کسی سماج کے افراد کو ایک دوسرے پر بھروسا کرنے سے روکتی ہے اور مایوسی اور بددلی پیدا کرتی ہے جو سماجی ترقی کے لیے زہر ہلاہل کی حیثیت رکھتی ہے۔

دوسرا سماجی نقصان بددیانت لوگوں کی مالی آسودگی اور دیانت دار اور دیانت پسند افراد کی تنگ دستی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے جس کے نتیجے میں سماجی ناہمواری پیدا ہوتی ہے۔

اسی لیے مسلمانوں کو ہر اس فعل سے روکا گیا ہے جس سے باہمی اعتماد مجروح ہوتا ہے اور جس کے نتیجے میں ایک کا فائدہ دوسرے کا نقصان ہوتا ہو۔ قرآن حکیم میں باری تعالیٰ نے مسلمانوں کو ہدایت فرمائی ہے کہ: وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ (البقرہ: ۱۸۸)

Marfat.com

یعنی: "آپس میں ایک دوسرے کا مال جھوٹ اور فریب سے نہ کھاؤ۔"

ملاوٹ کے نقصانات اور تباہ کن اثرات کو دیکھتے ہوئے اس کو ختم کرنا ہر شخص پر فرض ہو جاتا ہے۔ جب یہ برائی معاشرے میں جڑ پکڑ لے اور اس میں روز بروز اضافہ ہوتا جائے تو اس کو ختم کرنے کے لیے منظم کوششوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ حکومت کا تو یہ فرض ہے ہی کہ وہ قانون اور قوت سے کام لے کر معاشرے کو اس وبا سے نجات دلائے، لیکن ملّت کا بھی فرض ہے کہ وہ نہ صرف خود اس برائی سے بچے اور حکومت کے دیانت دار اور فرض شناس ملازمین سے بھرپور تعاون کرے، بلکہ جو ملازمین فرض شناس اور کارگزار نہ ہوں ان کو اپنے عمل سے مجبور کرے کہ وہ اپنا فرض ادا کریں اور ملاوٹ کے مجرموں کا قانون کے تحت سختی سے مواخذہ کریں۔ آپ چاہے عام شہری ہوں یا سرکاری ملازم، تاجر ہوں یا خریدار، طالب علم ہوں یا معلّم، صحافی ہوں یا وکیل، ملاوٹ کرنے والوں سے ہرگز تعاون نہ کیجیے۔ اس عدم تعاون میں آپ کو تکلیف برداشت کرنی پڑے تو خوشی سے کیجیے۔ تکلیف کے بغیر راحت نہیں ملتی۔ جانتے بوجھتے ملاوٹی اشیا خریدنا بھی ملاوٹ کرنے والوں سے تعاون کرنے کے برابر ہے۔ اگر آپ کا کوئی جاننے والا تاجر ملاوٹ کرتا ہو تو اس پر اخلاقی دباؤ ڈالیے کہ وہ اس فعلِ بد سے باز آجائے۔ اگر آپ کا کوئی دوست حکومت کے اس محکمے میں ملازم ہو جس کا کام ملاوٹ کا انسداد کرنا ہے اور وہ ملازم رشوت لے کر یا کاہلی کی بنا پر تاجروں پر سختی نہ کرتا ہو تو آپ اس کو سمجھائیے اور اس کے رویے پر ناگواری کا اظہار کیجیے۔ اگر معاشرے میں ایسے افراد کی قدر نہ ہو، بلکہ معاشرہ ان کی ہمّت شکنی کرے اور ان سے نفرت و بیزاری کا مظاہرہ کرے تو ایسے لوگ کبھی پنپ نہیں سکتے۔ ملاوٹ کرنے والوں اور ملاوٹ کی اجازت دینے والوں کو ہرگز قبول نہ کیجیے۔ ان کو سر آنکھوں پر بٹھانے کے بجائے ان کی اصلاح کیجیے۔ سب مل کر ہی سماجی برائیوں کا انسداد کر سکتے ہیں۔ برائیوں کو برداشت کرنے والے بھی معاشرے کے مجرم ہوتے ہیں۔ ملاوٹ ایک لعنت ہے۔ اس لعنت میں مبتلا لوگ ہرگز ایک مہذب مسلم معاشرے کے رکن بننے کے لائق نہیں۔ ملّت کے ہر فرد کا فرض ہے کہ اپنے قول اور اپنے عمل سے ان کو یہ احساس دلا دے اور بتا دے کہ ہمارے آقائے نام دار سرکارِ دوعالم نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کا فرمان ہے کہ:

"جو ملاوٹ کرے وہ ہم میں سے نہیں ہے۔"

Marfat.com

امتیازِ رنگ و نسل

رنگ و نسل کا امتیاز دنیا میں فساد کا ایک خاص سبب رہا ہے یعنی نسل، رنگ، زبان وطن اور قومیت کا تعصب قدیم ترین زمانے سے انسانیت کو خانوں میں تقسیم کرتا رہا ہے، اور مختلف دائرے بنا کر کچھ لوگوں کو اپنا اور ان دائروں سے باہر پیدا ہونے والوں کو غیر قرار دیتا رہا ہے۔ ان امتیازات کی کوئی عقلی و منطقی بنیاد نہیں ہے بلکہ اتفاقی پیدائش اس کی بنیاد ہے۔ کوئی ایک خاندان میں پیدا ہوا، کوئی دوسرے قبیلے میں پیدا ہوا، کوئی ایک جغرافیائی خطے میں پیدا ہوا، کوئی دوسرے خطے میں۔ لیکن اسی اتفاقی پیدائش کی بنا پر وہ سارے انسان ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔ یہ امتیاز صرف چند لوگوں کی باہمی محبت کے لیے نہیں ہے بلکہ اس نے نفرت، عداوت، تحقیر و تذلیل اور ظلم و ستم کی بدترین شکل اختیار کر لی ہے۔ اس کے لیے فلسفے گھڑے گئے۔ قوانین وضع ہوئے۔ قوموں اور سلطنتوں نے اُسے اپنا ایک مستقل مسلک بنا کر صدیوں اس پر عمل درآمد کیا ہے۔ نسل کی برتری کا جاہلانہ اور ظالمانہ تصور پچھلی جنگ میں جو خونیں منظر دکھا چکا ہے اس پر کسی تبصرے کی ضرورت نہیں ہے۔

اس عظیم ترین انسانی گمراہی اور ہمہ گیر فساد کی داستان کو پس منظر میں رکھتے ہوئے قرآن حکیم کا یہ اعلان سن لیا جائے:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُم مِّن ذَكَرٍ وَأُنثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا ۚ إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ ۝ (الحجرات۔ ۱۳)

ترجمہ: "لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا، اور پھر تمھاری قومیں اور برادریاں بنا دیں تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تمھارے اندر سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔ یقیناً اللہ سب کچھ جاننے والا اور باخبر ہے۔

اس آیت میں تین اصولی حقیقتیں قرآن پاک نے بتائی ہیں: ایک یہ کہ تم سب کی اصل

Marfat.com

ایک ہی ہے لیکن اس کے باوجود انسانی نسل کا قوموں اور قبیلوں میں منقسم ہو جانا اس بنا پر فطری ہے کہ نسل کا ارتقا مختلف قبائل و اقوام کے وجود کا تقاضا کرتا ہے اور یہ حقیقت بھی بعید از فہم نہیں ہے کہ مختلف خطّوں میں آباد ہونے والی نسلِ انسانی رنگ، خد و خال، زبان اور بود و باش کے طریقے کے اعتبار سے دُوسری قوموں سے مختلف ہو۔

مگر اس فطری اختلاف اور فرق کا یہ تقاضا تو ہرگز نہیں تھا کہ انسانوں میں پست و بلند کا تفاوت بھی پیدا ہو جائے، شریف اور رذیل کے امتیازات بھی قائم ہو جائیں، ایک نسل دوسری نسل پر اپنی فضیلت و فوقیت جتائے اور انسانی حقوق میں ایک گروہ کو دوسرے پر ترجیح حاصل ہو۔ اقوام و قبائل کا وجود تو محض تعارف و امتیاز کے لیے ہے۔ مگر آج اس تعارف کو تفاخر اور تنافر ذریعہ بنا لیا گیا ہے اور ظلم و ستم کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا ہے۔

تیسری حقیقت یہ ہے کہ اسلام انسانوں کے درمیان درجہ بندی ضرور کرتا ہے اور وہ فضیلت و برتری کا بھی قائل ہے، لیکن حسب و نسب کی بنا پر نہیں، رنگ و نسل کی بنا پر نہیں، بلکہ کردار اور سیرت کی بنا پر۔

جو خدا سے سب سے زیادہ ڈرنے والا، گناہوں سے بچنے والا، نیکی اور پاکیزگی کی راہ پر چلنے والا ہو، ایسا آدمی خواہ کسی نسل، کسی قوم، کسی قبیلے سے تعلق رکھتا ہو قابلِ اکرام و احترام ہے اور جس کا حال اس کے برعکس ہے وہ بہرحال کم تر درجے کا انسان ہے خواہ وہ کالا ہو یا گورا۔

فتح مکّہ کے بعد آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو تقریر فرمائی تھی اس میں آپؐ نے ارشاد فرمایا تھا:

> ترجمہ "شکر ہے اُس خدا کا جس نے جاہلیت کا عیب اور اس کا تکبّر تم سے دُور کر دیا۔ لوگو! تمام انسان بس دو ہی حصّوں میں تقسیم ہو سکتے ہیں، ایک نیک اور پرہیزگار جو اللہ کی نگاہ میں عزّت والا ہے، دُوسرا فاجر اور شقی، جو اللہ کی نگاہ میں ذلیل ہے۔ ورنہ سارے انسان آدم کی اولاد ہیں اور آدم کو اللہ نے مٹی سے پیدا کیا تھا۔"

ابن جریر نے ایک اور حدیث لکھی ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

> ترجمہ "اللہ قیامت کے روز تمہارا حسب و نسب نہیں پوچھے گا۔ اللہ کے ہاں سب سے

Marfat.com

زیادہ عزت والا وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔"

ابن ماجہ کی حدیث ہے:

ترجمہ "اللہ تمھاری صورتیں اور تمھارے مال نہیں دیکھتا بلکہ وہ تمھارے دلوں اور تمھارے اعمال کی طرف دیکھتا ہے۔"

حجۃ الوداع کے موقع پر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو خطبہ دیا تھا اُس میں نہایت صاف اور واضح الفاظ میں یہ ارشاد فرمایا تھا کہ اسلام میں رنگ و نسل کا کوئی امتیاز نہیں، ارشاد ہوا تھا:

ترجمہ " لوگو! خبردار رہو، تم سب کا خدا ایک ہے، کسی عرب کو کسی عجمی پر اور کسی عجمی کو کسی عرب پر اور کسی گورے کو کسی کالے پر اور کسی کالے کو کسی گورے پر کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے، مگر تقویٰ کے اعتبار سے۔ اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہو۔ بتاؤ! میں نے تمھیں بات پہنچادی ہے۔ لوگوں نے عرض کیا ہاں! یا رسول اللہ ﷺ فرمایا، اچھا تو جو موجود ہے وہ اُن لوگوں تک یہ بات پہنچادے جو موجود نہیں ہیں۔"

اسلام نے انھی تعلیمات کی روشنی میں عالم گیر برادری معلاً قائم کر کے دکھادی ہے جس میں رنگ و نسل کا کوئی امتیاز کبھی نہیں برتا گیا۔ اسلام ہی وہ دین ہے جس نے رُوئے زمین پر پھیلی ہوئی تمام نسلوں اور قوموں کو ملا کر ایک اُمّت بنادیا۔

اسلام کی نگاہ میں سارے انسان خدا کا کنبہ ہیں۔ خاندانِ بشریت کا ہر فرد ایک ہی اصل و اساس رکھتا ہے اس لیے اس کی نظر میں رنگ و نسل کا اختلاف کوئی چیز نہیں۔

رات کی تاریکی اور تنہائی میں نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا کے حضور ان مُبارک الفاظ میں اس حقیقت کی شہادت دی:

"یا اللہ انا شہید ان العباد کلھم اخوۃ۔"

ترجمہ "پروردگار! میں گواہ ہوں تیرے سب بندے بھائی بھائی ہیں۔"

اسلام کی تعلیم یہی ہے کہ

بتانِ رنگ و خوں کو توڑ کر ملّت میں گم ہوجا"

Marfat.com

Marfat.com

وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ م
يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ۔
(التوبہ : ۷۱)

مومن مرد اور مومن عورتیں سب ایک دوسرے کے رفیق ہیں،
بھلائی کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں۔

صاحبِ ایمان کا کردار

Marfat.com

مردِ مومن

تاریخ گواہ ہے کہ وہی قومیں دنیا میں سرخ رو ہوتی ہیں اور مصافِ زندگی میں اپنی برتری کا ثبوت دیتی ہیں جو یقین و ایمان کی دولت سے مالا مال ہوتی ہیں اور اپنے عقیدے کو دل و دماغ کی تمام قوتوں کے ساتھ صحیح جانتی اور مانتی ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ وہ اس عقیدے اور یقین و ایمان کے مطابق عمل بھی کرتی ہیں۔ حالات کے تقاضے بظاہر کتنے ہی خلاف ہوں اور کتنے ہی موانع ان کی راہ میں آئیں، لیکن وہ اپنے یقین میں پختہ ہوتی ہیں اور ان کا عمل ان کے عقیدے سے ہم آہنگ ہی رہتا ہے۔ بعض اوقات بڑے بڑے مالی فوائد اور مادّی منافع ان کو للچاتے ہیں اور راہ کی دشواریاں ان کے قدم روکتی ہیں، لیکن یقین اور ایمان کی دولت سے مالا مال قومیں جس راہ کو صحیح سمجھتی ہیں اس سے سرِ مو انحراف نہیں کرتیں۔ گرتی پڑتی وہ سیدھے راستے پر ہی چلتی رہتی ہیں۔ آبلہ پائی کے باوجود ان کے پاؤں نہیں لڑکھڑاتے، اور ان کا عزم متزلزل نہیں ہوتا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قوم ہو یا فرد فلاح و کامرانی کا ایک ہی راستہ ہے اور وہ راستہ ہے ایمان، عملِ صالح، حق پر قائم رہنے اور صبر کے ساتھ قائم رہنے کا راستہ۔

قرآنِ حکیم کی سورۃ العصر ایک عجیب و غریب سورۃ ہے۔ صرف تین آیات کی اس سورۃ میں ایک جہانِ معانی پوشیدہ ہے۔ اس پر جتنا غور کیجیے معانی کے اتنے ہی پرت کھلتے جاتے ہیں۔ درحقیقت اس کی تشریح و تفسیر اور تفہیم کے لیے صفحات درکار ہیں۔ غور کرنے والوں کے لیے، حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے الفاظ میں، یہی ایک سورۃ کافی ہے۔ یہ وہ سورۃ ہے جس کو تمام مسلمان اکثر نمازوں میں پڑھتے ہیں۔ آپ بھی سنیے:

وَالْعَصْرِ ۙ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ۙ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ؏ (العصر)

اس سورۃ کا اردو ترجمہ یہ ہے:

"زمانے کی قسم! بلاشبہ انسان بڑے گھاٹے میں ہے۔ ہاں مگر وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنھوں نے نیک اعمال کیے اور ایک دوسرے کو حق کی نصیحت اور صبر کی تلقین کی۔"

Marfat.com

دیکھیے کتنے بلیغ اور جامع انداز میں اور مختصر الفاظ میں اللہ تعالیٰ نے انسان کو فوز و فلاح اور سعادت و سربلندی کا راستہ بتا دیا ہے۔

دنیا کا کوئی بڑا کام یقین کے سہارے کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ انسان کوئی قدم بھی اس وقت تک نہیں اٹھاتا جب تک اس کے صحیح ہونے کا یقین نہ ہو، جس انسان کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولِ پاک پر یقین ہو وہ مومن ہے۔ جیسا کہ سورۃ الحجرات کی پندرھویں آیت میں فرمایا گیا ہے:

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ آمَنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ ثُمَّ لَمْ یَرْتَابُوْا۔۔۔۔ (الحجرات: ۱۵)

یعنی: ”مومن تو اصل میں وہ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے اور پھر شک میں نہ پڑے۔“

غور فرمائیے تو قرآن نے ”ایمان لائے“ کے بعد ”اور پھر شک میں نہ پڑے“ کے الفاظ کہہ کر اس بات کا اعادہ کیا ہے کہ ایمان و ایقان اتنا کامل ہونا چاہیے کہ اس میں کبھی شک کی دراڑ نہ پیدا ہو اور شبہات کی ذرا سی رمق بھی مومن کے دل میں نہ داخل ہو۔ شک ایک ایسی دل دل ہے جس میں پھنس کر آدمی کی رفتار سست پڑ جاتی ہے۔ بے یقینی ایک ایسا اندھیرا ہے جس میں آدمی کو زندگی کی واضح حقیقتیں بھی نظر نہیں آتیں اور وہ بینائی رکھتے ہوئے بھی مضبوط قدموں سے نہیں چل سکتا۔

ایمان کے بعد نیک اعمال کو بھی کامیابی کی شرط قرار دیا گیا ہے۔ نیک اعمال کی مثال ایسی ہے کہ جس طرح صحیح منزل کے لیے سیدھا راستہ۔ منزل کا علم ہو مگر آدمی راستہ غلط اختیار کرے تو وہ کبھی منزل پر نہیں پہنچ سکتا۔ اسی طرح عقیدہ صحیح ہو مگر اعمال غلط ہوں تو عقیدے کا کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوگا۔ اسی لیے قرآنِ حکیم نے ایمان کے ساتھ عمل کو بھی لازمی قرار دیا ہے۔ قرآن کی رو سے انسان کا کوئی عمل اس وقت تک صالح کی تعریف میں نہیں آتا جب تک وہ ایمان کے تابع نہ ہو۔ اسی لیے قرآن نے ہر جگہ عمل سے پہلے ایمان کا ذکر کیا ہے۔ کسی ایک جگہ بھی قرآن نے ایمان کے بغیر عمل کو عملِ صالح نہیں کہا ہے۔ مومن وہی ہے جو ایمان رکھتا ہو اور نیک کام کرتا ہو۔

سورۃ العصر جو ابھی آپ نے سنی اس میں صالحات کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ یہ لفظ تمام نیک اعمال اور تمام بھلائیوں پر حاوی ہے۔ چناں چہ مردِ مومن وہی ہے جو ایک طرف تو ایمان کی دولت سے مالا مال ہو، دوسری طرف وہ بھلائی کا نمائندہ ہو۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ ایک شخص مومن بھی ہو اور لوگوں کے لیے خیر و فلاح کا ذریعہ نہ ہو۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑی وضاحت سے فرمایا ہے کہ مومن وہ ہے جس کے ہاتھ اور جس کی زبان سے دوسرے مسلمان محفوظ و مامون رہیں:

اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِّسَانِہٖ وَیَدِہٖ ۝

Marfat.com

ایک اور حدیث میں ارشاد ہوا ہے کہ " اللہ کی قسم وہ مومن نہیں ہے جس کی شرارتوں سے اس کا پڑوسی مامون نہ ہو!"

ایک دوسری حدیث میں ہے کہ "مومن سب کچھ ہو سکتا ہے مگر بزدل نہیں ہو سکتا"۔

بزدلی کا مفہوم آپ سب جانتے ہیں، لیکن یہاں یہ لفظ بہت وسیع معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔ عام مفہوم کے علاوہ بزدلی کی تعریف اس شخص پر بھی منطبق ہوتی ہے جو کسی بات کو حق سمجھتا ہو مگر اس کو کسی مصلحت سے، کسی خوف سے، کسی لالچ سے حق نہ کہے۔ یعنی کتمانِ حق یا حق کو چھپانے کا مرتکب بھی بُزدل ہوا۔ اسی طرح کسی ناحق بات کو کسی دباؤ میں آکر حق کہہ دینا بھی بزدلی ہے۔ مومن بزدل کیسے ہو سکتا ہے۔ مومن کی تو شان ہی نرالی ہوتی ہے۔ ایک عام انسان بھی اگر بُزدل ہو تو وہ اپنی دوسری خوبیوں کے باوجود لوگوں کی نگاہوں سے گر جاتا ہے۔ مومن تو اس عالمِ ہست و بود کا صدر نشین ہے۔ وہ تو دنیا کی ہر دولت کو قدموں سے روندتا ہوا چلا جاتا ہے۔ اس کو احساس ہوتا ہے کہ اس کائنات میں ایک طاقت ایسی بھی ہے جو کسی کو نظر نہیں آتی مگر کائنات کی کوئی چیز اس سے پوشیدہ نہیں ہے۔ انسان کا ہر عمل چاہے وہ کتنے ہی پردوں میں چھپ کر کیا جائے اللہ تعالیٰ کے علم سے باہر نہیں ہے۔ یہی احساس و یقین اس کو صراطِ مستقیم پر چلاتا ہے۔

مردِ مومن آخرت میں اپنے کو تمام اعمال کا جواب دِہ سمجھتا ہے، اسی لیے وہ طاقت رکھنے کے باوجود بھی کسی پر بے جا ہاتھ نہیں اٹھاتا، اقتدار رکھنے کے باوصف وہ کسی کے ساتھ ناانصافی نہیں کرتا۔ وہ دوسروں کے لیے اسی چیز کو پسند کرتا ہے جو اسے اپنے لیے پسند ہوتی ہے، وہ ظلم نہیں کرتا اور ظالم کا ساتھ نہیں دیتا، وہ حق پر یقین رکھتا ہے اور حق پر قائم رہنے کی ہدایت کرتا ہے۔ مردِ مومن حق کی راہ میں پیش آنے والی مشکلات پر صبر کرتا ہے اور اپنے رفیقوں کو بھی اس کی تلقین کرتا ہے۔ وہ خود نیک ہوتا ہے اور دوسروں کو بھی نیکی کی طرف بلاتا ہے۔ وہ خود بھلائی کرتا ہے اور بھلائی کی دعوت بھی دیتا ہے۔ مردِ مومن خود کھاتا ہے تو دوسروں کو بھی بھوکا نہیں دیکھ سکتا۔ وہ ایک اچھا شوہر ہوتا ہے، وہ ایک مشفق باپ اور ایک سعادت مند بیٹا ہوتا ہے۔ وہ اپنا حق لینے سے پہلے اس کی مزدوری ادا کر دیتا ہے۔ وہ مزدور ہوتا ہے تو معاوضہ کے مطابق محنت کرتا ہے۔ وہ کام چور نہیں ہوتا۔ وہ اپنی گفتار میں، اپنے کردار میں اللہ کی برہان ہوتا ہے۔ وہ یہ جانتا ہے کہ یہ جہاں میرے لیے ہے، میں جہاں کے لیے نہیں ہوں۔ مردِ مومن دنیا کو ہیچ سمجھتا ہے۔ وہ دنیا کے لیے رحمت ہوتا ہے۔ وہ جب کوئی کام کرتا ہے تو سب سے پہلے یہ سوچتا ہے

Marfat.com

کہ اللہ کی رضا کیا ہے، اللہ کے رسول کی مرضی کیا ہے؟ مسلمانوں کی بھلائی کس میں ہے، ملت کا فائدہ کس کام میں ہے، انسانوں کے لیے بہتر راستہ کون سا ہے۔ مومن اللہ کا خلیفہ ہے، اس کا نائب ہے۔ وہ اپنے ہر فعل میں نیابت الٰہی کا حق ادا کرتا ہے۔ مردِ مومن کو جب حکومت ملتی ہے تو وہ فرعون نہیں بن جاتا، وہ خادم بن کر لوگوں کی خدمت کرتا ہے، وہ جب محکوم ہوتا ہے تب بھی اللہ کی محکومی ہی کو اوّلیت دیتا ہے۔ وہ راعی ہو، رعایا ہو، حاکم ہو، محکوم ہو، صاحبِ ثروت ہو، غریب ہو، معلّم ہو، متعلّم ہو، تاجر ہو، خریدار ہو، ہر حال میں اور ہر حیثیت میں مومن ہی رہتا ہے، مردِ مومن!

پاکستان کا خواب ایک مردِ مومن نے دیکھا تھا، پاکستان کا قیام ایک مردِ مومن کا مرہونِ منّت ہے۔ اب پاکستان کو ضرورت ہے ایسے مردانِ مومن کی کہ جو اپنے فکر و عمل سے پاکستان کو سچا پاکستان بنا دیں۔ آئیے عہد کریں کہ ہم جس حیثیت میں ہوں، جس کام میں مصروف ہوں اور جس مرتبہ پر ہوں، ہم اپنے عمل کو ایک مردِ مومن کی شان کے مطابق بنانے کی کوشش کریں گے، اور اخلاق اور اخلاص کی ہر قوت سے پاکستان کی تعمیر کریں گے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے اس عہد اور عزم میں کامیاب کرے۔

Marfat.com

مومن کا کردار

قرآنِ حکیم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

تَبٰرَکَ الَّذِیْ بِیَدِہِ الْمُلْکُ ز وَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرُنِ ۙ الَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوۃَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ط

(الملک: ۱)

یعنی: "بڑی ہی بزرگ و برتر ہے وہ ذات کہ جس کے ہاتھ میں کائنات کی سلطنت ہے اور جو ہر چیز پر قدرت رکھتی ہے۔ اور جس نے زندگی اور موت کا نظام یہ معلوم کرنے کے لیے قائم کیا کہ تم میں سے کون عمل میں اچھا ثابت ہوتا ہے۔"

ایک اور جگہ ارشاد فرمایا گیا ہے:

وَنَبْلُوْکُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَیْرِ فِتْنَۃً ط

(الانبیا: ۳۵)

یعنی: "ہم اچھے اور بُرے حالات سے دراصل تمھیں آزماتے ہیں۔"

یہ دونوں آیتیں یہ بتاتی ہیں کہ یہ دنیا مومن کے لیے امتحان گاہ ہے اور یہ رزم گاہِ حیات اس کے لیے سامانِ آزمائش ہے۔ نیز یہ کہ انسان کے لیے امتحانی نقطۂ نظر سے اچھائی اور بُرائی، خوش حالی اور فکر و غم، اچھے دن اور بُرا وقت سب کی اہمیت یکساں ہے۔

ایک مومن کا طرزِ فکر یہی ہوتا ہے اور یہی اندازِ فکر اس کی بنیادی اساس اور امتیازی کردار کا مظہر ہوتا ہے۔ اس کے برخلاف وہ شخص جو نہ تو اللہ کے حکیم ہونے پر یقین رکھتا ہے اور نہ اسے اس کی رافت و رحمت پر ایمان ہوتا ہے، اس کی حالت قرآن کے الفاظ میں یہ ہوتی ہے:

فَاَمَّا الْاِنْسَانُ اِذَا مَا ابْتَلٰہُ رَبُّہٗ فَاَکْرَمَہٗ وَنَعَّمَہٗ ۙ فَیَقُوْلُ رَبِّیْ اَکْرَمَنِ ؕ وَاَمَّا اِذَا مَا ابْتَلٰہُ فَقَدَرَ عَلَیْہِ رِزْقَہٗ ۙ فَیَقُوْلُ رَبِّیْ اَھَانَنِ ج

(الفجر: ۱۶)

یعنی: "انسان کا حال تو یہ ہے کہ جب اس کا رب اسے اپنے کرم اور اپنی نعمتوں سے سرفراز کرتا ہے تو وہ اتراتا ہوا کہتا پھرتا ہے کہ میرے رب نے مجھے نوازا ہے اور جب اللہ اسے تنگی اور تنگ دستی میں مبتلا کر کے اس کا امتحان لیتا ہے تو شکایت کرنے لگتا ہے اور کہتا پھرتا ہے کہ اللہ نے مجھے ذلیل کر دیا۔"

یہ رویّہ اور یہ اندازِ فکر دراصل خالص مفاد پرستانہ ذہن کا عکاس ہے۔ یہ ذہن ان لوگوں کا ہوتا ہے جن کا منتہائے نظر محض دنیاوی زندگی کا ساز و سامان ہوتا ہے اور جن کا عقیدہ قرآن

Marfat.com

کے الفاظ میں یہ ہوتا ہے کہ:

مَا هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَآ اِلَّا الدَّهْرُ (الجاثیہ: ۲۴)

یعنی: "یہ کہ اس دنیوی زندگی کے علاوہ اور ہے بھی کیا؟ رہا مرنا جینا تو اگرچہ اس سے چھٹکارا نہیں مگر موت تو بس زمانے کے ہاتھوں واقع ہوتی ہے۔"

اس کے برخلاف ایک مومن جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں ساری زندگی کو آزمائش خیال کرتا ہے۔ حیات مستعار کا ہر لمحہ مومن کی آزمائش سے عبارت ہے۔

دراصل جو بات سمجھنے کی ہے اور اچھی طرح سمجھ لینے کی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس کائنات کو اور ان تمام اشیا کو جو اس کائنات میں ہیں، انسان کے فائدے کے لیے اور اس کی ضرورتوں کی تکمیل کے لیے ایک خاص نظم و ترتیب کے ساتھ تخلیق فرمایا ہے۔ اور جس طرح حرکت انسانی زندگی کی علامت ہے اسی طرح کائنات کی حیات کا مظہر بھی تغیّر ہے۔ جو بات میں کہنا چاہتا ہوں یہ ہے کہ جس طرح انسانی زندگی کے حالات ہمیشہ یکساں نہیں رہتے اسی طرح کائنات کے حالات بھی بدلتے رہتے ہیں۔

تغیر و تبدّل کے اس باقاعدہ نظام سے بسا اوقات ایسی صورتِ حال پیدا ہو جاتی ہے کہ جو بعض افراد کے لیے یا بعض افرادی گروہوں کے لیے بظاہر ناموافق ہوتی ہے۔ یہ عدمِ موافقت بعض اوقات تو معمولی نوعیت کی ہوتی ہے اور کبھی اس قدر ہمہ گیر اور دور رَس ہوتی ہے کہ اس سے افراد یا انسانی گروہوں کی زندگی بُری طرح متاثر ہوتی ہے۔ پھر کبھی تو ان حالات کی تہ میں افراد و اقوام کی بعض کوتاہیوں اور غلطیوں کے نشانات ملتے ہیں اور کبھی ایسا بظاہر نامعلوم اسباب کی بنا پر ہوتا ہے۔ عدمِ موافقت کی اس صورتِ حال سے سب انسان یکساں طور پر متاثر ہوتے ہیں اور ہمیشہ سے ہوتے آئے ہیں اور ہمیشہ تا قیامِ قیامت ہوتے رہیں گے۔ لیکن خاص طور پر اہلِ ایمان کے لیے ایسے حالات اس امر کے موقعے فراہم کرتے ہیں کہ وہ اپنے عمل اور اظہارِ ردِّعمل کے ذریعہ سے یہ ثابت کریں کہ وہ اللہ کے سچے فرماں بردار بندے ہیں۔ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی سراپا رحیم و کریم ذات اور اس کی حکمت اور اس کی رحمت پر یقین نہیں رکھتے وہ ان حالات کو اپنے لیے صرف مصیبت خیال کرتے ہیں، لیکن ایک مومن اس قسم کے حالات سے جو انسان کے لیے بہرصورت ناگزیر ہیں دل برداشتہ نہیں ہوتا بلکہ نرم و سخت حالات اور سرد و گرم حالات ایک مومن کے قویٰ اور اس کی فکر کے لیے مہمیز ثابت ہوتے ہیں اور اس کے لیے یہ موقع فراہم کرتے ہیں کہ وہ اپنے کردار کو اجاگر کرے۔ دنیا کو امتحان گاہ سمجھنے سے انسان کی پوری زندگی متاثر ہوتی ہے اور زندگی کے ہر فعل کے

Marfat.com

بارے میں انسان کا نقطۂ نظر تبدیل ہو جاتا ہے۔ جو لوگ اس دنیا کی زندگی کو مستقل سمجھتے ہیں وہ اس زندگی میں پیش آنے والے اچھے بُرے واقعات اور سرد و گرم حالات کو بھی اسی اندازِ نظر سے دیکھتے ہیں کہ جو فعل اس دنیاوی زندگی میں فائدہ بخش اور راحت بخش ہے وہی اچھا فعل ہے، چاہے اس کے نتائج ابنائے جنس کے لیے اور مجموعی طور پر معاشرے کے لیے کتنے ہی مضر ہوں۔ اس کے برعکس مومن کی نگاہ وسیع اور دور رس ہوتی ہے، وہ جانتا ہے کہ جو فعل دنیا میں فائدہ پہنچا رہا ہے ضروری نہیں ہے کہ وہ دوسری زندگی کے نقطۂ نظر سے بھی مستحسن ہو، لہٰذا ہر کام کرنے سے پہلے سوچ لو کہ یہ کام جو بظاہر نفع بخش اور خوش کن معلوم ہو رہا ہے اللہ کے نزدیک بھی اچھا ہے یا نہیں۔

بعض اعمال ایسے ہوتے ہیں جو محدود نگاہ سے دیکھے جائیں تو ان میں کوئی خرابی یا نقصان نظر نہیں آتا، چناں چہ لوگ ان کو کر گزرتے ہیں اور اپنے کو کامیاب و بامراد سمجھتے ہیں، لیکن وہ اعمال دراصل غلط اور نقصان رساں ہوتے ہیں، ان کے فوری نتائج تو بڑے خوش گوار معلوم ہوتے ہیں، لیکن دیرپا اثرات نہایت درجہ تباہ کن اور بھیانک ہوتے ہیں۔ ایک مومن کی شان یہ ہے کہ وہ ہمیشہ دور رس نتائج کو ترجیح دیتا ہے اور بہت سے فوائد سے دست بردار ہو جاتا ہے کیوں کہ عقیدۂ آخرت اور یوم الحساب کے تصوّر کی وجہ سے اس کی نظر میں وسعت اور دور اندیشی پیدا ہو جاتی ہے۔

مختصر الفاظ میں مومن کا کردار اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے کو اللہ بزرگ و برتر کے سامنے جواب دہ سمجھتا ہے اور اس کا پورا کردار اس محور پر گردش کرتا ہے کہ اس کے ہر ہر عمل کا ریکارڈ رکھا جا رہا ہے جس کے لیے اس کو لازماً جزا اور سزا کے مراحل سے گزرنا ہوگا۔

مومن خوفِ الٰہی کے ساتھ ساتھ انسان دوستی کے جذبے سے بھی سرشار ہوتا ہے اور اپنے ہم جنسوں کے لیے بھی سراپا رحمت و رافت ہوتا ہے۔ وہ اپنے ہم عقیدہ افراد کے لیے خصوصاً ریشم کی طرح نرم ہوتا ہے، لیکن جب مسئلہ حق و باطل کا ہو تو وہ فولاد ہوتا ہے۔

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

عقیدۂ آخرت کی بنا پر مومن کا ہر کام دیانت اور امانت کا حامل ہوتا ہے اور وہ ایسے مواقع پر بھی کہ جب کوئی اس کو دیکھنے والا، روکنے ٹوکنے والا نہ ہو کوئی کام اصول اور اخلاق کے خلاف انجام نہیں دیتا۔ وہ دوستوں کا دوست، گھر والوں کا ہم درد، رفیقوں پر شفیق، پڑوسیوں پر مہربان، غریبوں کا حامی، محسنوں کا احسان مند اور بزرگوں کا ادب کرنے والا ہوتا ہے۔

Marfat.com

مومن کی پہچان

اسلام سے پہلے، اور اب بھی سوائے اسلام کے، دُوسرے اکثر مذاہب میں یہ جاہلانہ تصوّر پایا جاتا ہے کہ آدمی کو اللہ سے اپنا تعلق ظاہر کرنے کے لیے عام لوگوں کی روش سے ہٹ کر چلنا چاہیے۔ اِس بنا پر مذہبی لوگ اپنی چال ڈھال، طرزِ بود و باش، لباس اور اس کی تراش خراش میں امتیازی خصوصیات اختیار کرنے پر متوجّہ رہتے ہیں اور ان میں سے بیشتر اس وجہ سے عام ماحول سے کٹ جانے کو اپنی پہچان اور اس سے عدمِ تعلق کو اپنی شناخت بنائے ہوئے ہیں۔

اِس سے دو بہت بڑی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں: ایک تو یہ کہ مخصوص مذہبی ہیئت بنانے والا خود کو دوسروں سے برتر اور اعلیٰ سمجھنے کے مرض میں مبتلا ہو جاتا ہے، اور دُوسری یہ کہ عام لوگوں میں یہ احساس پیدا ہونے لگتا ہے کہ مذہب یا اللہ سے تعلق معاشرے کے ایک خاص طبقے کے لیے مخصُوص ہے۔

اِسلام مذہبیت کے اس قسم کے تصوّر کو تسلیم نہیں کرتا۔ اس کے نزدیک مذہبی اور عام لوگوں کی کوئی تخصیص و تمیز معتبر نہیں ہے۔ اسلام اپنے تمام ماننے والوں کو مومن کا نام دیتا ہے۔ اسلام کے تقاضے سارے اہلِ ایمان سے یکساں ہیں۔

اسلام اگر انسانی گروہوں اور انسانی مُعاشرے کے لوگوں میں کوئی فرق یا امتیاز تسلیم کرتا ہے تو وہ صرف اور صرف ایمان اور غیر ایمان کا فرق ہے۔ اس لیے مومن کی حقیقی پہچان اور شناخت اُن امور سے ہوتی ہے جن کے ہونے نہ ہونے سے کفر و ایمان کا فرق پیدا ہوتا ہے۔ ان امور کا تعلق یکساں طور پر فکر و عقیدہ، قول و عمل، اخلاق و معاشرت، غرض زندگی کے ہر پہلو سے ہے اور اُن کی اس ہمہ گیری اور وسعت کے اثر سے مومن کی زندگی ایک غیر مومن کی زندگی سے صاف پہچانی جاتی ہے۔

قرآن اور حدیث کی ساری تعلیمات، اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے سب احکام مل کر مومن کی تصویر کا خاکہ بناتے ہیں۔ یہ خاکہ مومن کا معیارِ مطلوب ہی نہیں

Marfat.com

اس کی شناخت د پہچان کا ذریعہ بھی ہے۔

یہ عالم کہ اصحابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگیوں میں اس قدر واضح تھا کہ اُس کی شہادت خود اللہ نے سورۂ الفتح میں اِن الفاظ میں دی ہے:

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ۚ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرٰهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا ۡ سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ۭ (الفتح-۲۹)

ترجمہ: "محمد اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ اُن کے ساتھ ہیں وہ کفّار پر سخت اور آپس میں رحیم ہیں، تم جب دیکھو گے انھیں رکوع و سجود اور اللہ کے فضل اور اس کی خوشنودی کی طلب میں مشغول پاؤ گے، سجود کے اثرات اُن کے چہروں پر موجود ہیں جن سے وہ الگ پہچانے جاتے ہیں۔"

کون نہیں جانتا کہ ہمہ وقت اللہ کے فضل اور اس کی خوشنودی کے حصول میں مصروف یہ جماعت جنگلوں میں پہاڑوں کی چوٹیوں پر لوگوں سے الگ تھلگ نہیں رہتی تھی۔ اُنھوں نے اپنی کوئی ایسی وضع نہیں بنائی تھی جس سے لوگ انھیں اپنے سے مختلف خیال کرتے۔ وہ اپنے رب کا فضل اور اس کی خوشنودی، عام انسانوں کی طرح اپنی ضروریاتِ زندگی کو پورا کرتے ہوئے، حاصل کرتے رہے۔ ان میں کوئی تارک الدنیا راہب نہیں بنا، کسی نے بیوی بچّوں سے قطع تعلق نہیں کیا۔ اگر کسی نے ایسا کرنا بھی چاہا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سختی سے اس کی ممانعت فرمائی۔ آپؐ نے ترکِ دُنیا اور رہبانیت کو سراسر خلافِ اسلام قرار دیا اور فرمایا:

لَا رَهْبَانِيَّةَ فِي الْاِسْلَامِ

یعنی: "اس نمائشی دین داری کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں!"

اس سے ظاہر ہے کہ مومن کی پہچان اور اس کی شناخت اس بات سے ہوتی ہے کہ وہ اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لیے کوئی خود ساختہ طریقہ ایجاد نہیں کرتا بلکہ ایک عام انسان کی حیثیت سے اپنے معمولاتِ زندگی کو پُورا کرتے ہوئے اللہ کی اتاری ہوئی کتابِ ہدایت کے احکام اور اس کے بھیجے ہوئے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات اور آپؐ کے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے اسوہ کی پیروی کے ذریعے سے اللہ کی رضا جوئی میں لگا رہتا ہے۔ درحقیقت ایمان ایک ایسی کیفیت کا نام ہے جس کے مظاہر صاحبِ ایمان کی زندگی کے ہر ہر گوشے سے عیاں ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کے تمام اعمال کا تعلق اور ان کا انحصار اس کے طرزِ فکر پر اور اس کی سوچ پر ہوتا ہے۔

ایمان، جیسا کہ ہم جانتے ہیں، چند امور کے بارے میں اِقرار باللسان اور تصدیق بالقلب کا نام ہے۔ یہ دونوں چیزیں براہِ راست انسان کی فکر میں تبدیلی لاتی ہیں اور یہ تبدیلی عمل بالجوارح

Marfat.com

پر منتج ہوتی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ ایک مومن کی حیثیت سے ہماری صفات کا ظہور ہمارے عمل سے ہونا چاہیے اور دراصل ہمارے اعمال کو ہماری پہچان اور شناخت ہونا چاہیے جب کہ بدقسمتی سے حال یہ ہے کہ ہمارے انفرادی افعال، اجتماعی اعمال، ہمارا اخلاق اور کردار' ان میں سے کوئی بھی ہمارے ایمان کی گواہی نہیں دیتے۔ ہماری نکبت و خواری کی حقیقی وجہ یہی ہے کہ آج ہم نے اپنا ایمانی تشخص کھو دیا ہے۔ قرآن و حدیث میں ایک مومن کی جو امتیازی خصوصیات بیان کی گئی ہیں اُن کا ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی میں دُور دُور تک پتا نہیں چلتا۔ آج ہمارا طرزِ فکر اور ہمارے اعمال کا رُخ اُن لوگوں سے ذرا بھی مختلف نہیں ہے جنھیں ہم غیر مومن سمجھتے ہیں۔ آج ہماری زندگی کوئی ایسی امتیازی تصویر دُنیا کے آگے نہیں پیش کرتی جسے لوگ دیکھیں تو ہمارے ایمان کی اور ہمارے مومن ہونے کی گواہی دیں۔

ہم ذاتی اور انفرادی طور پر، اجتماعی اور معاشرتی حیثیت سے، سیاسی اور قانونی میدان میں' تعلیم و تربیت کے لحاظ سے، اُن صفات سے عاری ہیں جو ایک صاحبِ ایمان اور ایک مومن کی مابہ الامتیاز خصوصیات ہیں یہی آج کا سب سے بڑا المیہ ہے۔

اگر ہم مومن کی حیثیت سے اپنا تشخص قائم کرنا چاہتے ہیں اور ایمان اور اسلامی اعمال و کردار کو اپنی شناخت اور پہچان بنانا چاہتے ہیں تو ہمیں اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں بحیثیت ایک شہری کے اور ایک انسان کے اللہ و رسولؐ کے احکام کی پابندی کرنی ہوگی۔ اس کے بغیر نہ ہم دُنیا والوں کے سامنے خود کو مومن کی حیثیت سے پہچنوا سکیں گے نہ آخرت میں فلاح پانے والوں کی صف میں جگہ پاسکیں گے۔

صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے سردارِ کائنات، فخرِ موجودات صلی اللہ علیہ وسلم سے استفسار فرمایا کہ اچھے معاشرے کی تعریف کیا ہے؟ نورِ مجسّمؐ نے ارشاد فرمایا:

"اچھا معاشرہ وہ ہے کہ جس میں دینے والے ہوں اور لینے والا کوئی نہ ہو۔"

اس بلیغ ارشادِ گرامی نے درحقیقت دنیا کا ہر مسئلہ حل کر کے رکھ دیا ہے اور اس میں ایک اَمر یہ بھی شامل ہے کہ ہر مومن کو ایسا معاشرہ قائم کرنے کا فرض ادا کرنا چاہیے۔

ایک مومن کا مقام یہ ہے کہ وہ اخلاق و اخلاص کی برکات سے بہرہ ور ہو۔ صدق مقال ہو اور متین و باوقار ہو۔ امین و صادق ہو۔ اللہ اور اس کے رسولؐ کی محبّت سے سرشار ہو۔ دیانت و امانت اُس کا شعار ہو۔ صبر و شکر اور قناعت اس کی متاعِ گراں مایہ ہو۔ سخاوت و ایثار اُس کی سرشت میں ہو۔ ایک مومن کی عظمت و رفعت یہ ہے کہ اُس کی ذات سے کسی کو نہ دکھ پہنچے اور نہ

Marfat.com

تکلیف۔ وہ سراپا رحم ہو اور سراپا ہمدرد۔ وہ انسان دوست ہو اور شرفِ انسانی کا پاسبان۔

نیکی کیا چیز ہے اور گناہ کیا ہے؟

اللہ کے رسولؐ نے فرمایا ہے:

"نیکی یہ ہے کہ جس سے نفس کو سکون ہو اور جس سے دل کو سکون ہو، اور گناہ وہ ہے کہ جو نفس میں خلش پیدا کرے، اگرچہ لوگ اس کے جواز کا فتویٰ دیں"

پاکستان کا ہر وہ شخص مومن ہے کہ جو اعلا انسانی صفات سے متصف ہے اور جو پاکستان میں ایک ایسا معاشرہ قائم کرنے کا فریضہ انجام دے رہا ہے کہ جہاں دینے والے ہوں اور لینے والا کوئی نہ ہو۔ ہر پاکستانی کا یہ بنیادی فرض ہے کہ وہ اس میدان میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی سعی کرے۔

Marfat.com

فراستِ مومن

ایمان صرف اعتقاد ہی نہیں ہے، بلکہ علم و حکمت بھی ہے اور دانش و بصیرت بھی ہے۔ اسی لیے ایمان کو نور اور روشنی سے بھی تعبیر کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب کو اکثر مقامات پر نور سے تعبیر فرمایا ہے، اور اہلِ ایمان کو یہ بشارت دی ہے کہ:

یخرجھم من الظلمٰت الی النور ؕ (البقرہ: ۲۵۷)

یعنی: "وہ ان کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لاتا ہے۔"

کفر، جہل اور تاریکی ہے اس لیے کہ وہ خلافِ فطرت ہے۔ جو لوگ راہِ فطرت پر گام زن ہو کر ایمان کی دولت سے ہم کنار ہوتے ہیں فکر و تدبر، ہوش و گوش، عرفانِ نفس، علمِ حقائقِ اشیا اور حاسۂ خیر و شر کی بیداری بھی انھی کو نصیب ہوتی ہے۔ قرآن پاک، انفس و آفاق میں غور و فکر کی دعوت دے کر اہلِ ایمان کو علم و آگہی کے اس مقام تک پہنچاتا ہے جسے بصیرت کہا جاتا ہے۔ یہ دولتِ ایمان اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان لوگوں کو بخشی جاتی ہے کہ جو اس کی آیات میں مسلسل غور و فکر کرتے ہیں، اور جو کائنات اور موجودات کے راز ہائے سربستہ کی جستجو میں ایمانی قوت نیز تعلیماتِ نبوی اور ہدایتِ خداوندی کی روشنی میں شب و روز مصروف و سرگرداں رہتے ہیں۔ یہ بصیرت ظاہری آثار و علائم کی پابند نہیں ہوتی، بلکہ یہ اس باریک بینی اور تہ رسی کا نام ہے کہ جو ایمانِ محکم کے فیضان کے طور پر انسان کو حاصل ہوتی ہے۔

اسی بصیرت کو احادیثِ نبویہ میں فراست سے تعبیر کیا گیا ہے، اور اس صفت کے اظہار کے لیے قرآنِ حکیم نے ہوش مند اہلِ ایمان کے لیے متوسّمین کا لفظ استعمال کیا ہے:

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّلْمُتَوَسِّمِیْنَ ۝ (الحجر: ۷۵)

یعنی: "بلاشبہ اس میں اہلِ فراست کے لیے نشانیاں ہیں۔"

سارے مفسّرین اس بات پر متفق ہیں کہ یہاں "متوسمین" سے اہلِ فراست ہی مراد ہیں۔ مختلف طبقوں میں فراست کی شرح و تعبیر متعدد انداز سے کی گئی ہے۔ مثلاً علمائے قانون اسے عدلیہ کی اصطلاح میں قاضی کی اس حق شناسی کے لیے استعمال کرتے ہیں کہ جو اسے شہادتوں اور مقدمات کے دیگر مراحل کے بعد فیصلے کے صدور کے سلسلے میں حاصل ہوتی ہے، کیوں کہ خارجی شواہد کی روشنی میں ایک مخفی حقیقت

Marfat.com

کے ادراک کے لیے فراست کی ضرورت ہوتی ہے۔ علامہ ابنِ قیم نے قاضی کی اس صلاحیت کو بھی فراست ہی سے تعبیر کیا ہے۔

لیکن محدثین اور صوفیہ کا یہ خیال ہے کہ یہ ایک ایسی چیز ہے جسے اللہ تبارک وتعالیٰ اولیا کے قلوب میں ڈال دیتا ہے اور وہ لوگوں کے حالات از روئے کرامت اور اپنی رائے اور قیاس کے صحیح استعمال کی بدولت جان لیتے ہیں۔

بہرحال فراست کی جو بھی شرح وتعبیر کی جائے حقیقت یہ ہے کہ باطنی حالات ہی کے علم سے اس کا تعلق ہے اور صحابۂ کرام کے متعدد واقعات جو اُن کی کرامتوں کے ضمن میں بیان کئے گئے ہیں دراصل اُسی فراستِ مومن کی حیثیت رکھتے ہیں جس کی طرف ایک حدیث شریف میں اشارہ فرمایا گیا کہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔

بلاشبہ عام آدمیوں کا علم ظاہری حالات تک محدود ہوتا ہے، لیکن ایمانِ راسخ اور تعلق مع اللہ کی بنا پر ایک مومنِ کامل کے علم وآگہی کے وسائل عام آدمیوں سے زیادہ ہوتے ہیں۔ اسے حقائق کا علم ان ذرائع سے بھی ہوتا ہے جن کا تعلق حواسِ خمسہ سے نہیں ہے۔ ان میں اہم ذریعہ قربِ الٰہی ہے، جو ایک مومن کو کمالِ ایمان اور کمالِ تقویٰ سے حاصل ہوتا ہے۔ یہ فراست اسی قرب کا ثمرہ ہے۔

صحاح میں یہ حدیث آئی ہے کہ حضرت عثمانِ غنیؓ کی خدمت میں ایک ایسا شخص حاضر ہوا کہ جس نے راستے میں بدنظری کے گناہ کا ارتکاب کیا تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ وہاں حضرت عثمانِ غنیؓ موجود نہ تھے، لیکن جب وہ آیا تو آپ نے مجمع سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ تم میں سے بعض لوگ میرے پاس ایسے آتے ہیں کہ ان کی آنکھوں سے زنا ٹپکتی ہے، یعنی وہ زنائے چشم کی معصیت کا ارتکاب کر کے آتے ہیں۔ میرا تو دل چاہتا ہے کہ میں ان پر حد جاری کروں۔ وہ شخص تو اس وقت محجوب وشرمندہ ہو کر خاموش ہو گیا، لیکن ایک دوسرے موقع پر اس نے حاضر ہو کر پوچھا:

امیر المومنین! کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی وحی کا سلسلہ جاری ہے؟

آپ نے فرمایا کہ نہیں، لیکن فراست باقی ہے جس کا ذکر حدیث میں ہے۔ وہ شخص خاموش ہو گیا۔

حضرت عثمانِ غنیؓ کے اس کشف کو تمام شارحین حدیث نے فراستِ مومن ہی سے تعبیر کیا اور انھوں نے بھی بہ نفسِ نفیس اسے فراست ہی کہا۔

علمائے باطن نے فراست کی حقیقت کی تفہیم کے سلسلے میں قرآنِ پاک کی ان آیات کا بھی حوالہ دیا ہے جن میں کفّار کو جانوروں سے تشبیہ دی گئی ہے کہ وہ بظاہر تو انسان ہی ہوتے ہیں، اور انسانی شکل وصورت بھی رکھتے ہیں، ان کے ہاتھ پاؤں بھی ہوتے ہیں، لیکن اس کے باوجود قرآنِ پاک نے اگر

Marfat.com

انھیں جانور کہا ہے تو بلاشبہ ان کی باطنی صورت جانوروں ہی کی ہوگی۔ مگر اس حقیقت تک وہی لوگ پہنچ سکتے ہیں کہ جو اللہ کے نور سے دیکھتے ہیں، اور متوسمین میں سے ہیں۔

انسان جب آیاتِ الٰہی پر غور وفکر کرتا ہے اور گہرائی وگیرائی کے ساتھ مطالب ومفاہیم میں تدبر کرتا ہے تو اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر اور اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ کتاب پر اس کا یقین بڑھتا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی عظمتِ شان کا احساس اسے بندگی، بے چارگی، عاجزی اور درماندگی کی طرف لے جاتا ہے۔ پھر وہ اللہ تعالیٰ ہی سے علم اور توفیق کا طلب گار ہوتا ہے اور سرِ نیاز اُسی کی بارگاہ میں جھکا کر نہایت عجز کے ساتھ کہتا ہے:

رَبِّ زِدْنِی عِلْمًا ۝ (طٰہٰ: ۱۱۴)

یعنی: "باری تعالیٰ! مجھے وسعتِ علم سے نواز دے۔"

اللہ تعالیٰ اس کی درخواست جب قبول فرماتا ہے تو اسرارِ کائنات کا دروازہ اس پر کھول دیتا ہے۔ پھر ایک مومن کو وہ بصیرت حاصل ہو جاتی ہے جس کا درجہ علمِ عام سے بہت زیادہ ہے، یعنی اشیا کے حقائق کا کشف!

بنیادی طور پر قرآنِ پاک ہی میں یہ بات بتادی گئی ہے کہ صانعِ حکیم نے کوئی چیز بے کار نہیں پیدا کی، لیکن ان کی حکمت کے شعور کا انحصار ایمانی تدبر پر ہے۔ ہم ایمان، فکرِ صحیح اور عملِ صالح کے ساتھ جس قدر بھی غور وفکر کرتے جائیں گے ہمیں فراست حاصل ہوتی جائے گی۔

بے شک ایمان وتقویٰ ہی وہ سرچشمہ ہے جس سے علم وعرفان، بصیرت وآگہی، فراست اور کشفِ حقائق کے سوتے پھوٹتے ہیں۔

ایمان وتقویٰ میں کمال کی وجہ سے بندوں کو اللہ تعالیٰ کے تقرب کا جو مقام حاصل ہوتا ہے اس کی طرف ایک حدیثِ قدسی میں اس طرح اشارہ کیا گیا ہے کہ:

"اللہ تعالیٰ خود بندوں کی آنکھ بن کر دیکھتا ہے اور اپنے بندوں کے کان بن کر سنتا ہے۔"

مادّہ پرستوں کو یقیناً اہلِ ایمان وتقویٰ کی اس فراست سے ڈرنا چاہیے۔

آج کے مسلمانوں میں اس ایمانی فراست کے مظاہر دیکھنے میں نہیں آتے تو اس کا اصل سبب ایمان کی کمزوری اور صفاتِ تقویٰ سے محرومی ہے۔ علوم وفنون کا شعبہ ہو یا ایجادات کا، یا انکشافات واکتشافات کا، زندگی کے ہر میدان میں ہمیں عظمت ورفعت اور سربلندی اور سرفرازی حاصل ہو سکتی ہے بہ شرطیکہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر ہمارا ایمان مکمل ہو، اور ہم پوری زندگی کو احکامِ خداوندی کے مطابق گزارنے میں ایک لمحہ کے لیے غفلت نہ برتتے ہوں، اخلاق واعمال کی کوتاہیوں اور لغزشوں

Marfat.com

سے بچتے ہوں، اور قلب و روح کو تمام بُرائیوں سے پاک رکھنے کی کوشش کرتے ہوں۔

ہمارے انحطاط و زوال کا عنوان اور سبب ایمانی کمزوری اور اخلاقی نادرستی کے سوا کچھ اور نہیں ہے۔ ایمانِ کامل کے فیضان سے جس طرح قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں پر علم و حکمت اور علوم و فنون کے دروازے کھلے تھے اور فراست و بصیرت کی جو ممتاز خصوصیت انھیں حاصل ہوئی تھی وہ ہمیں بھی حاصل ہو سکتی ہے، کیوں کہ ابھی اس بات کی وضاحت کی جا چکی ہے کہ یہ سب کچھ ایمانِ کامل ہی کا ثمر تھا۔ یہ ساری برکتیں اخلاقِ حسنہ ہی کی تھیں۔

آج ہمارا یہ حال ہے کہ ہم اپنی ترقی اور خوش حالی تو ضرور چاہتے ہیں، صنعت، حرفت، زراعت، علم اور حکمت میں ترقی کی بھی ہم آرزو رکھتے ہیں، مگر اس بات سے غافل ہیں کہ یہ سب ایک نکتۂ ایمان کی تفسیریں ہیں، ایمان کے کمال اور تقویٰ کے جمال سے ہماری زندگی عبارت ہے، انھی اوصاف کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے اشیا کی فطرت و ماہیت سے نقاب اٹھا دی تھی۔ ہماری نگاہوں کو بصارت کے علاوہ بصیرت بھی بخشی تھی، ایسی بصیرت جسے دیکھ کر دنیا والے حیران تھے۔

آئیے! ایمانِ کامل اور تقویٰ سے آراستہ ہو کر بارگاہِ رب العالمین میں اسی فراست کی دولت کی درخواست کریں، جس سے بہرہ ور ہونے والوں کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتے ہیں۔

Marfat.com

قومی کردار

جس طرح اشخاص اپنی چال ڈھال، شکل و صورت، لباس اور عادات سے پہچانے جاتے ہیں، اسی طرح قومیں بھی اپنی خصوصیات اور اپنے اوصاف سے پہچانی جاتی ہیں۔ افراد کی طرح اقوام کی بھی ایک شخصیت ہوتی ہے۔ یہی شخصیت ان کو دوسری قوموں سے ممتاز و ممیز کرتی ہے اور اسی کی بنا پر قوموں کی برادری میں ان کا مرتبہ و مقام متعین ہوتا ہے۔ جس طرح ایک فرد کا اپنا مخصوص مزاج ہوتا ہے اسی طرح ایک قوم کا بھی اپنا مخصوص مزاج ہوتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ قومی مزاج کے تعین میں بہت سے عوامل و اثرات کارفرما ہوتے ہیں۔ جس خطے میں کوئی قوم آباد ہوتی ہے اس کی آب و ہوا، اس کا جغرافیہ اس کا موسم اور اس کے لحاظ سے اس کی غذا، اس کا لباس متعین ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر گرم خطوں میں رہنے والوں کی غذا اور لباس کا سرد خطوں میں رہنے والوں کی غذا اور لباس سے مختلف ہونا فطری بات ہے، لیکن ان عوامل میں سب سے اہم اور فیصلہ کن عامل کردار ہے اور درحقیقت کسی قوم کا کردار ہی اس کی شناخت ہے۔ جب ہم کسی قوم کے متعلق کوئی رائے قائم کرتے ہیں یا کوئی فیصلہ کرتے ہیں تو اس کے اجتماعی کردار کو پیش نظر رکھ کر ہی کرتے ہیں تمام قومیں دنیا میں عروج و زوال اور ترقی و تنزل کی منازل سے گزرتی ہیں اور اس کی بنیاد ان کا اجتماعی کردار ہی ہوتا ہے۔

کردار اگر اعلا اور پاکیزہ ہوتا ہے تو قوم ترقی کرتی ہے، لیکن کردار کمزور اور ناقص ہو تو قوم کو زوال کا منھ دیکھنا پڑتا ہے۔ یہ ایک کلیہ ہے، یہ مسلمہ بات ہے، یہ تاریخ کا سکھایا ہوا سبق ہے اور اس کلیے میں کوئی استثنا نہیں۔ تاریخ میں کبھی اس کے برخلاف نہیں ہوا اور نہ ہو سکتا ہے۔ جن قوموں نے زندگی کی صالح قدروں اور اعلا معیاروں کو چھوڑ دیا وہ زوال آمادہ ہوئیں اور جن قوموں نے اعلا کردار کا ثبوت دیا اور صحت مند اصولوں پر قائم رہیں وہ اوج کمال کو پہنچیں۔ کمزور کردار والی قومیں نکبت و ناکامی سے کبھی نہیں بچ سکیں۔ اللہ تعالیٰ کی

Marfat.com

سنّت یہ ہے کہ اعمال کا نتیجہ سامنے آکر رہتا ہے۔ اچھے اعمال کا اچھا نتیجہ اور بُرے اعمال کا بُرا نتیجہ۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک تمام افراد اور تمام اقوام برابر ہیں۔ کسی کو کوئی فوقیت حاصل نہیں ہے۔ اگر کسی کو کوئی تفوّق حاصل ہے تو صرف ایمان اور کردار کی بنا پر۔ قرآنِ حکیم کی سورۂ یونس میں ارشادِ باری ہے:

وَلَقَدْ أَهْلَكْنَا الْقُرُونَ مِن قَبْلِكُمْ لَمَّا ظَلَمُوا ۙ وَجَاءَتْهُمْ رُسُلُهُم بِالْبَيِّنَاتِ وَمَا كَانُوا لِيُؤْمِنُوا ۚ كَذَٰلِكَ نَجْزِي الْقَوْمَ الْمُجْرِمِينَ ○ (یونس-۱۳)

ترجمہ: "تم سے پہلے کی قوموں کو ہم نے ہلاک کر دیا جب انھوں نے ظلم کی روش اختیار کی، اور اُن کے رسول ان کے پاس کھلی کھلی نشانیاں لے کر آئے اور انھوں نے ایمان لاکر ہی نہ دیا۔ اس طرح ہم مجرموں کو اُن کے جرم کا بدلہ دیا کرتے ہیں۔"

اس کے بعد کی آیت میں فرمایا گیا:

ثُمَّ جَعَلْنَاكُمْ خَلَائِفَ فِي الْأَرْضِ مِن بَعْدِهِمْ لِنَنظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُونَ ○ (یونس ۱۴)

ترجمہ: "اب ان کے بعد ہم نے تم کو زمین میں ان کی جگہ دی ہے، تاکہ دیکھیں تم کیسے عمل کرتے ہو۔"

مفسّرین نے تشریح کی ہے کہ اس موقع پر ہلاکت کے لازماً یہی معنیٰ نہیں ہیں کہ اس کی نسل کو بالکل غارت کر دیا جائے، بلکہ اس قوم کا مقامِ بلند سے گر جانا، اس کے تہذیب و تمدن کا تباہ ہو جانا اور اس کے اجزا کا پارہ پارہ ہو کر دُوسری قوموں میں گم ہو جانا بھی ہلاکت ہی کی ایک صورت ہے۔

دوسری آیت جو میں نے ابھی تلاوت کی اس سے یہ بہ خوبی واضح ہو جاتا ہے کہ سنّتِ الٰہی یہ ہے کہ جب ایک قوم اپنے کردار کی خرابی کے نتیجے میں اپنے کو گرا لیتی ہے تو اللہ تعالیٰ کسی دُوسری قوم کو موقع دیتا ہے۔ پہلی آیت میں قرآنِ حکیم نے قوموں کی تباہی و ہلاکت کی وجہ یہ بیان فرمائی ہے کہ انھوں نے ظلم کی روش اختیار کی۔ گویا قومی کردار کا سب سے خراب پہلو ظلم کا اختیار کرنا ہے۔ یہ ہمارا روزمرّہ کا مشاہدہ بھی ہے کہ جو لوگ ظلم کا طریقہ اپنا لیتے ہیں ان میں بے شمار دُوسری بُرائیاں بھی پیدا ہو جاتی ہیں۔ وہ جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ کہنے لگتے ہیں۔ انصاف نہیں کرتے، اعتدال کی راہ سے ہٹ جاتے ہیں۔ رحم، ہمدردی، عفو و درگزر سے ان کو واسطہ نہیں رہتا۔ ان کی زندگیوں سے سکون و اطمینان غائب ہو جاتا ہے۔ وہ کسی کے کام آنے کی صلاحیت کھو بیٹھتے ہیں۔ تعاون اور تعلقِ خاطر اُن کے مزاج میں نہیں رہتا۔ ظلم کو اپنانے والے کسی کی صحیح بات سننے اور جائز مطالبہ ماننے کے بھی عادی نہیں رہتے۔ وہ صبر و تحمل اور برداشت کی

Marfat.com

قوت سے عاری ہو جاتے ہیں۔ وہ اپنی بات جائز و ناجائز ہر طریقے سے منوانا چاہتے ہیں۔ وہ اپنی ہر بات کو صحیح اور حق سمجھتے ہیں۔ ان میں خوب و زشت کی تمیز نہیں رہتی۔ انسانیت اور صلہ رحمی، مروّت اور مودّت، شرافت اور صلح و آشتی کے الفاظ ظالموں کے نزدیک بے معنی ہو جاتے ہیں۔ وہ تکبر و تفاخر کو اپنا شعار بنا لیتے ہیں۔ انکسار، عاجزی، فروتنی اور کسر نفسی کی اعلا صفات سے ان کی زندگیاں بیگانہ ہو جاتی ہیں۔ وہ حلم و بُردباری سے کوسوں دُور ہو جاتے ہیں۔ بد کلامی اور بدخوئی ان کی فطرتِ ثانیہ بن جاتی ہے۔ حُسنِ کلام اور شیریں بیانی ان کے پاس نہیں پھٹکتی۔ وہ اپنے لیے ہر زیادتی کو جائز قرار دیتے اور اپنی ذات کو منبعِ خیر اور سرچشمۂ خوبی سمجھتے ہیں۔

ظلم پیشہ لوگوں کو دوسروں میں کوئی خوبی نظر نہیں آتی۔ وہ اپنی مرضی کے خلاف کوئی بات برداشت نہیں کر سکتے۔ نکتہ چینی کتنی ہی تعمیری اور صحت مند ہو ان کو گوارا نہیں ہوتی۔ ان کے نزدیک ان کا فرمایا ہوا مستند اور دوسروں کا کہا ہوا مہمل۔

اس کے برعکس جو قومیں ظلم کو روا نہیں رکھتیں، قوانینِ الٰہی سے روگردانی نہیں کرتیں اور صاحبِ کردار ہونے کا ثبوت دیتی ہیں وہ ان کم زوریوں اور بداخلاقیوں میں مبتلا نہیں ہوتیں۔ وہ حق و صداقت کی پاس دار ہوتی ہیں، انصاف ان کا طریقہ ہوتا ہے اور اعتدال ان کی راہ۔ ایثار، ہمدردی، رحم اور تعاون ان کا شعار، حلم و تحمل ان کا مزاج۔ اعلا کردار کی حامل قومیں خیر و برکت کی جویا اور نیک نفسی اور وفا شعاری کی عادی ہوتی ہیں اور سادگی، محنت اور بے ریائی کی حامل۔ ایسی قوموں کے افراد آپس میں ابریشم کی طرح نرم، مگر جب معرکۂ حق و باطل ہو تو فولاد کی طرح سخت و کرخت ہوتے ہیں۔ وہ سچ کہتے ہیں اور سچ سنتے ہیں چاہے وہ خود اُن کے خلاف ہو۔ وہ حق دار کو اس کا حق اسی طرح پہنچاتے ہیں جس طرح اپنا حق مانگتے ہیں۔ وہ فرائض کو بھی اتنی ہی اہمیت دیتے ہیں جتنی حقوق کو۔ وہ مساوات، اخوّت اور برادری کے جذبات سے مملو ہوتے ہیں۔ وہ کسی کو ایذا نہیں دیتے، خدمت میں عظمت جانتے ہیں۔ وہ اپنے کو حاکم نہیں خادم سمجھتے ہیں۔

ظلم و بدکرداری کے نتائجِ بد اور حسنِ عمل کے ثمرات کا اندازہ کرنے کے لیے اقوامِ عالم کا ایک سرسری مطالعہ بھی کافی ہو گا۔ اور تاریخ بھی نہ پڑھیے تو خود اپنے زمانے پر ایک نظر ڈال کر دیکھ لیجیے۔ ظلم کی روش اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی بیماریوں اور بُرائیوں کا مشاہدہ آسانی سے ہو جائے گا۔

اے اہلِ وطن!

میں مشورہ دوں گا کہ سب سے پہلے ہم خود اپنی حالت کا جائزہ لیں اور قرآنی بصائر و حِکَم کی روشنی میں اپنے موجودہ قومی کردار پر ایک نظر ڈالیں، آزادی کی منزل کو پانے کے لیے ہم نے،

Marfat.com

کیا کیا پاپڑ نہ بیلے تھے، کیا قربانیاں نہ دی تھیں۔ ہم نے یہ سب کچھ اس لیے کیا تھا کہ ہم ایک ایسا خطۂ زمین چاہتے تھے جہاں ہم قانونِ الٰہی کے مطابق سر اٹھا کر چل سکیں، جہاں ہم بھلائیاں پھیلا سکیں، جہاں برائیوں کو روک سکیں۔ جہاں ہم آزادی کے ساتھ اپنی تہذیب کو رواج دے سکیں، جہاں ہم ایک ایسا معاشرہ قائم کر سکیں، جس میں ظلم نہ ہو جس میں ناانصافی نہ ہو، جہاں ہر شخص پوری آزادی کے ساتھ اپنی صلاحیتوں کے مطابق آگے بڑھ سکے اور جہاں ہم قومی کردار کے ان اعلا اصولوں اور نمونوں کی پیروی کر سکیں جو ہمیں قرآن اور شارحِ قرآن ؐ نے عطا کیے ہیں۔

آج ۲۳ مارچ کے تاریخی اور یادگار دن اگر ہم پورے خلوص اور پوری یک سُوئی کے ساتھ یہ جائزہ لیں تو ہم یقیناً خسارے میں نہیں رہیں گے۔ آئیے ہم عہد کریں کہ اپنے قومی کردار کو زندہ رہنے والی قوم کے کردار کے مطابق بنائیں گے تاکہ ہم پر اللہ کی رحمتوں اور نعمتوں کی فراوانی ہو۔

لے ۱۹۸۱ء

Marfat.com

اِستقلالِ فکر

ہمارا روزمرہ کا مشاہدہ ہے اور تجربہ، کہ دنیا میں وہی افراد کامیاب و بامراد ہوتے ہیں جو اپنے خیالات، افکار اور نظریات میں یکسو اور مستحکم ہوں، اور ان کا ذہن بار بار فکری راہیں نہ بدلتا ہو۔ عمل تابع ہے فکر کے، فکر کے بغیر عمل ممکن نہیں ہے۔ یہ ضروری کہ بعض وقت فکری عمل اتنا غیر شعوری، بے ساختہ اور برجستہ ہوتا ہے کہ آدمی پر بلا سوچے سمجھے کام کر گزرنے کا الزام عائد ہو جاتا ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ جس عمل کو ہم فکر سے عاری کہتے ہیں وہ بھی فکر ہی کے تابع ہوتا ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ انسان مختلف اوقات میں اور مختلف عوامل و اسباب کے تحت کسی خیال کو اپنے دل و دماغ میں پرورش کرتا رہتا ہے اور کسی موقع پر اسی خیال کے تحت، ارادے کے بغیر، کوئی عمل سرزد ہو جاتا ہے۔ اب اگر وہ عمل غلط ہو جائے یا اس کے نتائج اچھے نہ نکلیں تو ایسا عمل کرنے والے کو موردِ الزام ٹھہرایا جاتا ہے، لیکن اس عمل کے ثمرات مفید ہوں تو واہ واہ ملتی ہے اور اس شخص کی صلاحیت و قابلیت کا سکہ جم جاتا ہے۔

دراصل فکر ایک مسلسل اور مکمل عمل ہے اور اس کی پشت پر مختلف عوامل و مراحل ہوتے ہیں، لیکن یہ ایک ذہنی اور نفسی عمل ہے اور چوں کہ یہ عمل دوسروں کو نظر نہیں آتا اس لیے اکثر اوقات اس کی اہمیت محسوس نہیں کی جاتی۔ بعض وقت یہ طویل عمل خیال کے مختلف و متصادم دھاروں کی بنا پر الجھ جاتا ہے اور اس کے نتیجے میں فکر کے زبانی، تحریری یا عملی اظہار میں پیچیدگی، بے ربطی یا عدمِ استقلال پیدا ہو جاتا ہے۔ انسانی ذہن اپنے ارد گرد کی جس چیز کو دیکھتا ہے، اس کو سمجھنا چاہتا ہے، وہ ایک چیز کا دوسری چیزوں سے رشتہ اور تعلق بھی سمجھنا چاہتا ہے۔ خود اپنے وجود پر غور کرتا ہے، دوسرے انسانوں کے وجود اور انسان و کائنات کے رشتے نیز انسان اور اللہ کے رشتے پر بھی اس کا ذہن غور و فکر کرتا ہے اور وہ کائنات میں، معاشرے میں، خاندان میں اپنی حیثیت کو متعین کرنا چاہتا ہے۔ اس غور و فکر میں اکثر اس کا ذہن غلط راہوں پر بھی چلا جاتا ہے۔ کبھی وہ پتھروں کو دیوتا سمجھنے لگتا ہے۔ کبھی موسموں کے تغیر و تبدل اس کے ذہن پر حاوی ہو جاتے ہیں۔ کبھی وہ چاند اور سورج کو معبود سمجھ بیٹھتا ہے، مگر انسان

Marfat.com

پر اسلام کا یہ بہت بڑا احسان ہے کہ وہ اس فکری انتشار سے آدمی کو نجات دلا دیتا ہے اور ایک روشن فکر عطا کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ زمین، یہ دریا، یہ پہاڑ، یہ بادل، یہ چاند، یہ سورج، یہ ہوا، یہ پانی، یہ چرند و پرند، یہ سبزہ، یہ درخت، غرض جو کچھ اس کائنات میں ہے وہ اللہ کا پیدا کیا ہوا ہے، اللہ ہی ان سب کا بنانے والا ہے، اللہ ہی کے حکم سے ان سب کا وجود ہے۔ انسان کو بھی اللہ نے پیدا کیا ہے، وہی اس کا خالق، مالک اور معبود ہے۔

قرآنِ حکیم میں ارشاد ہے:

لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ وَهُوَ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ ٥ (الشوریٰ: ۴)

یعنی: "آسمانوں اور زمینوں میں جو کچھ ہے اللہ ہی کا ہے اور وہی سب سے بڑا اور اعلا ہے۔"

قرآنِ حکیم نے واضح طور پر کائنات، انسان اور اللہ تعالیٰ کے تعلق کو متعین کر دیا ہے۔ انسان اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کا بندہ، نائب اور خلیفہ ہے، اور اپنے ہر فعل میں اللہ کے حکم کا محتاج ہے۔ اسی لیے اس کو فکر و عمل کے ہر گوشے میں اپنی اس حیثیت کو پیشِ نظر رکھنا چاہیے۔ جتنے اچھے طریقے سے وہ اپنی حیثیت سمجھے گا اور اس کے مطابق زندگی گزارے گا، اتنے ہی اچھے طریقے سے اس کی زندگی گزرے گی اور اطمینان حرب حال و ثابت قدمی کی برکات و حسنات سے بہرہ ور ہوگا اور اس کا ذہن پراگندہ اور اس کے اعمال پریشان نہیں ہوں گے۔

جو لوگ کلمۂ طیبہ کو چھوڑ کر کسی کلمۂ خبیثہ کو اپناتے اور عقیدۂ توحید کو ترک کر دیتے ہیں ان کا اطمینان ختم اور ان کی فکر ثبات و استحکام سے عاری ہو جاتی ہے، وہ کسی پہلو سے بھی فکر و عمل کی صحیح راہ نہیں پا سکتے۔ گویا فکر کا استقلال اللہ تعالیٰ کی ایک نعمت ہے۔ یہ نعمت ان ہی کو ملتی ہے جو صاحبِ ایمان ہوتے ہیں، جن کے عقائد میں اور جن کے افکار میں قرار و قیام ہوتا ہے۔ ذہن و فکر کی پراگندگی ایک عذاب ہے جس میں راہِ حق سے منحرف ہونے والے مبتلا ہوتے ہیں۔ اسی فکری انتشار کا نام گمراہی ہے۔ استقلالِ فکر اور استحکامِ فکر ایمان کی خصوصیت اور علامت ہے۔ فکر کا ثبات اور عمل کا اعتماد ایمان والوں ہی کی دولت ہے۔ ارشادِ باری ہے:

یُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَةِ وَیُضِلُّ اللّٰهُ الظّٰلِمِیْنَ قف لا وَیَفْعَلُ اللّٰهُ مَا یَشَآءُ ٥ (ابراہیم: ۲۷)

یعنی: "ایمان لانے والوں کو اللہ ایک قولِ ثابت کی بنیاد پر دنیا اور آخرت دونوں کی زندگی میں ثبات عطا کرتا ہے۔ اور ظالموں کو اللہ بھٹکا دیتا ہے۔ اور اللہ کو اختیار ہے جو چاہے کرے۔"

Marfat.com

جو لوگ تذبذب و تردّد کو چھوڑ کر استقلال اور ثابت قدمی کے ساتھ اللہ اور رسولؐ کی اطاعت پر قائم ہو جاتے ہیں، ان کی زندگی تزلزل اور ان کا فکر انتشار سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ ان کے خیالات، اخلاق، معاملات، تعلقات، عقائد، افکار سب کے سب ایک مستقل اور پائدار بنیاد پر قائم ہو جاتے ہیں۔ یہ ان برکتوں اور نعمتوں سے فیض یاب ہوتے ہیں جو ایک روشن شاہ راہ پر ثابت قدمی سے چلنے سے حاصل ہوتی ہیں۔ عام زندگی میں بھی ہمارا مشاہدہ ہے کہ جو شخص فکری پریشانی اور عقائد کی کمزوری میں مبتلا اور ذہنی پراگندگی کا شکار ہوتا ہے، کبھی ایک راستے پر چلتا ہے، کبھی دوسرے راستے پر گام زن ہوتا ہے، اس کی منزل دور ہو جاتی ہے اس کا مقصد کبھی حاصل نہیں ہوتا۔ اس کو اطمینانِ قلب اور کامیابی کی مسرت کبھی حاصل نہیں ہوتی۔ اس کی ہر سعی ناکام، اس کی ہر کوشش لاحاصل اور اس کا ہر عمل بے سود ہوتا ہے۔

قوموں کی زندگی کا بھی یہی حال ہے۔ ایمان کی طاقت، یقین کی قوت اور فکر کا ثبات ان کو راحتوں اور نعمتوں کے آسمان پر پہنچا دیتا ہے۔ ذہن کی یکسوئی اور مقصد کی پختگی اور ان کی عملی جدوجہد ان کو روحانی، ذہنی اور مادی ترقیوں سے ہم کنار کر دیتی ہے۔ اس کی ایک مثال ہماری اپنی تاریخ میں، ماضی قریب کی تاریخ میں، بھی موجود ہے۔ ۱۹۴۰ء میں ہم نے فیصلہ کیا تھا کہ ہم اپنی اجتماعی فلاح کے لیے، اپنی تہذیب کی بقا کے لیے، اپنی روحانی بحالی کے لیے ایک مملکت حاصل کریں گے۔ یہ فیصلہ ملّت کے جن قائدین نے کیا تھا ان کے ذہن یکسو تھے، ان کی فکر میں استقلال تھا اور ملّت ان کی حامی اور اس مقصد کے لیے متحد الفکر ہو گئی تھی اس لیے یہ مشکل کام آسان ہو گیا، یہ اعلا مقصد بہ عجلت حاصل ہو گیا، پاکستان کے نصب العین کی منزل تک قوم چند سال میں پہنچ گئی۔

اب مرحلہ پاکستان کی بقا کا ہے، پاکستان کے استحکام کا ہے، پاکستان کی رفعت و عظمت کا مرحلہ ہے جس سے ملّتِ پاکستان کو عہدہ برآ ہونا ہے۔ اس کے لیے فکر و عمل کے توازن و ثبات کی ضرورت ہے کہ ہم تمام توانائیوں کو بروئے کار لا کر پاکستان کو عظمتوں اور رفعتوں کی انتہاؤں تک پہنچا دیں اور اہلِ پاکستان اقوامِ عالم میں ممتاز و مشخص اور سربلند اور سرفراز ہو سکیں۔

اللہ تعالیٰ ہماری مدد فرمائیں۔

Marfat.com

Marfat.com

وَاِنْ تَعُدُّوا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ط

(ابراهیم : ۳۴)

اگر تم اللہ کی نعمتوں کا شمار کرنا چاہو تو نہیں کر سکتے۔

صحّت و زندگی

Marfat.com

زندگی صحّت سے عبارت ہے

قرآنِ حکیم کے بارے میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ ۝ يَّهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَيُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ وَيَهْدِيْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ (المائدہ: ۱۵-۱۶)

یعنی: "بے شک اللہ کی طرف سے تمہارے پاس نور اور واضح و روشن کتاب آئی۔ اللہ اس کے ذریعے سے اُن لوگوں پر سلامتی کی راہیں کھولتا ہے جو اُس کی رضا پر چلتے ہیں۔ وہ انھیں تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لاتا ہے اور صراطِ مستقیم یعنی سیدھی راہ کی طرف ان کی رہ نمائی کرتا ہے۔"

ہر شخص جانتا ہے اور ہر شخص سمجھتا ہے کہ قرآنِ حکیم امّتِ مسلمہ کا دستورِ حیات ہے اور آئین زندگی ہے۔ ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے جس میں ہر شعبۂ زندگی کے لیے نہایت واضح اور مکمل ہدایات موجود ہیں۔ "قرآنِ حکیم اور ہماری زندگی" کے سلسلۂ تقاریر میں ہمارا آج موضوعِ کلام 'حفظِ صحت' ہے اور ہمیں یہ دیکھنا اور سمجھنا ہے کہ قرآنِ حکیم نے اس باب میں بنی نوعِ انسان کی کس طرح رہ نمائی کی ہے۔ جب ہم قرآنِ حکیم کا اس نقطۂ نظر سے مطالعہ کرتے ہیں تو ہم پر یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ قرآنِ حکیم اصولِ حفظِ صحت کے لحاظ سے تمام کتبِ سماوی میں ممیز اور ممتاز ہے۔ قرآنِ کریم نے حفظِ صحت اور تن درستی سے متعلق واضح احکام اور قوانین اپنے ماننے والوں پر فرض کیے ہیں۔ میں نہایت یقین کے ساتھ اور نہایت وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ تمام کتبِ سماوی میں قرآنِ حکیم کو خاص امتیاز حاصل ہے۔ اگر ہم حفظِ صحت کے متعلق ان شان دار مگر سادہ اصولوں پر غور کریں جو قرآنِ حکیم میں مذکور ہوئے ہیں اور پھر اس پر غور کریں کہ ان کی پابندی کرنے والوں کو کس ثواب و اجر کا مستحق قرار دیا گیا ہے تو یہ بات ہم پر روشن ہو جاتی ہے کہ اگر یہ صحیفۂ آسمانی اور کلامِ ربّانی دنیا کو نہ ملتا تو اس دنیا میں صحت نام کی کوئی چیز نہ ملتی، بلکہ یہاں بیماریاں کا دور دورہ ہوتا اور ہر طرف بس تاریکی ہی تاریکی ہوتی۔

جب ہم یہ کہتے ہیں کہ اسلام میں اصولِ حفظِ صحت کا احاطہ کیا گیا ہے اور اصولِ

Marfat.com

حفظِ صحت کو وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ صفائی اور طہارت کی ضرورت اور کھانے پینے کے اصول و آداب، سونے اور جاگنے کے ضابطوں سے لے کر جسم و روح کی حفاظت اور مضراتِ صحت کے بارے میں واضح احکامات تک سب کچھ اس میں موجود ہے۔ کوئی ایسا اصول اور کوئی ایسا ضابطہ نہیں ہے کہ جس کا ذکر اسلامی تعلیمات میں نہ کیا گیا ہو۔

اور جب قرآنِ حکیم و فرقانِ حمید لوگوں کے لیے قانون بنا اور یہ کتابِ رشد و ہدایت نازل ہوئی تو یہ وہی لوگ تھے، جن پر مسلمان اور مومن کی تعریف صادق آتی اور پھر یہ امّتِ مسلمہ اور امّتِ مومنہ صحرائے عرب سے اٹھی اور دیکھتے ہی دیکھتے اقطارِ عالم پر چھا گئی اور دنیا کے ہر تاریک گوشے کو اس نے روشن اور منوّر کر دیا۔ اس کے پاس نہ زر و جواہر تھے اور نہ دولت کے انبار تھے، نہ دوسری اقوام کے مقابلے میں سامانِ جنگ تھا نہ دنیاوی رعب اور دبدبہ۔ اس امّت کے پاس کتاب و سنّت کے سوا درحقیقت کچھ نہ تھا، مگر حق یہ ہے کہ جب ان کے پاس کتاب و سنّت تھی تو بہت کچھ تھا، بلکہ سب کچھ تھا۔ یہ ایک صحت مند امّت تھی جو مدینہ منوّرہ میں بیدار ہوئی یہ جسمانی و دماغی اعتبار ہی سے صحت مند امت نہ تھی، بلکہ اس امّت کے تمام افعال اور تمام اعمال صحت مند تھے۔ یہ امّت احکامِ قرآنی کی پابند تھی اور سنّتِ نبوی کی پیرو تھی۔ جس امّت میں یہ دو بلندیاں ہوں، جس امّت میں یہ اعلا و ارفع خصوصیات ہوں، کوئی تعجب کی بات نہیں کہ اس نے ساری دنیا سے اپنا لوہا منوا لیا اور ساری دنیا کو نہایت سخت تاریکیوں سے نکال کر اسے نور آشنا بنا دیا اور صحت سے ہم کنار کر دیا۔

جب تک اسلام کی روشنی نہ پہنچی تھی خود یورپین قوموں کا یہ حال تھا کہ وہ غسل کرنے، پاک و صاف رہنے، ناخن ترشوانے اور طہارت و پاکیزگی کے دوسرے لوازم کے تصوّر سے ناآشنا تھیں۔ ان حالات میں مسلمان اللہ کا پیغام لے کر پہنچے اور انھیں بتایا کہ:

وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ ○ (التوبہ: ۱۰۸)

یعنی: "خدا پاک صاف لوگوں کو پسند کرتا ہے۔"

اس میں کون شک کر سکتا ہے کہ طہارت اور پاکیزگی کو جزوِ ایمان بنانے میں کس قدر عظیم مصلحتیں پیشِ نظر تھیں۔ جہاں تک صحت کا تعلق ہے طہارت، صفائی اور پاکیزگی کے بغیر صحت حاصل ہو ہی نہیں سکتی۔ ایک شخص جو غسل نہ کرے، صاف ستھرے کپڑے نہ

Marfat.com

پہنے، صاف و پاک ہوا پانی کو اہمیت نہ دے، وہ کیسے صحت مند رہ سکتا ہے؟ بات واضح ہو جاتی ہے۔ کتاب و سنّت کی رُو سے اسلام میں صفائی اور طہارت کو سب سے بلند مقام و مرتبہ حاصل ہے۔ قرآنِ حکیم میں بار بار طہارت پر زور دیا گیا ہے۔ ایک جگہ ارشاد ہے:

اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ التَّوَّابِیْنَ وَیُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِیْنَ O (البقرہ: ۲۲۲)

یعنی: "خدا کو وہ لوگ پسند ہیں کہ جو توبہ کرتے ہیں اور وہ لوگ پسند ہیں جو پاک و صاف رہتے ہیں۔"

پھر ایک جگہ سورۃ مدثر میں حضرت محمد مصطفےٰ صلّی اللہ علیہ وسلّم کو تاکید فرمائی:

وَثِیَابَكَ فَطَهِّرْ O لا وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ (المدثر: ۴-۵)

یعنی: "اپنے کپڑے (لباس) صاف ستھرے اور پاک صاف رکھا کرو اور ہر قسم کی غلاظت اور گندگی سے کلیتہً پرہیز کرو۔"

عربی زبان اتنی فصیح و بلیغ ہے کہ دنیا کی کوئی زبان اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ ایک ہی لفظ میں صرف ایک دو حرف کی کمی بیشی اس کے معانی و مطالب میں بہت بڑی تبدیلی اور وسعت پیدا کر دیتی ہے۔ اسم نکرہ پر صرف الف لام لا کر اس کے معانی اتنے وسیع کر دیے جاتے ہیں کہ وہ اس چیز کی ہر قسم، ہر حالت اور ہر مقدار پر حاوی ہو جاتے ہیں۔ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ میں حرف رُجز پر الف لام کے آنے سے مراد تمام قسم کی رُجز یعنی نجاست رُوحانی ہو یا جسمانی، انفرادی ہو یا اجتماعی، لباس سے متعلق ہو یا خوراک سے، مکان میں ہو یا گلی کوچے میں، عوامی گزرگاہوں میں پائی جائے یا آرام گاہوں میں، کثیر ہو یا قلیل اس سے بچنے کی تاکید کی گئی ہے اور اس سے بچنے کا حکم دیا گیا ہے۔ ان آیات کریمہ کو آپ دوبارہ سنیے اور پھر ان کے مطالب پر خوب غور کیجیے وَثِیَابَكَ فَطَهِّرْ O لا وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ (اپنے لباس کو صاف رکھا کرو اور ہر قسم کی غلاظت اور گندگی سے کلیتہً پرہیز کرو)۔

اللہ اکبر! ایک جملے میں کتنے معنی پنہاں ہیں اور کتنے مطالب ہیں اور صحت مند رہنے کا کس قدر بڑا سبق ہے! قرآن حکیم میں ایک اور جگہ ارشادِ باری تعالیٰ اس طرح ہے کہ وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَاۤءِ مَاۤءً طَهُوْرًا (اور ہم نے آسمان سے پانی اتارا جو تمھیں طاہر کرتا ہے، پاک کرتا ہے۔) (الفرقان: ۴۸)

قرآن حکیم صحیفۂ آسمانی اور کلام ربّانی ہے اور امّت مسلمہ کا دستورِ زندگی ہے۔ اسے پڑھنا، اس کی تلاوت کرنا، اس کی سورتوں اور آیتوں کو سمجھنا اور ان سے استفادہ کرنا ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے اور فرض ہے۔ پاکی اور طہارت کا اور صفائی کا

Marfat.com

جب حکم آتا ہے تو قرآن پاک کو صرف وہی لوگ ہاتھ لگا سکتے ہیں جو پاک صاف ہوں۔

میں نے ابھی عرض کیا تھا کہ اسلام نے ہمیں اصولِ حفظ صحت بتائے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس قلیل وقت میں کہ جو اس وقت میسّر ہے سب کچھ بیان کرنا ممکن نہیں ہے اس لیے میں نے حفظ صحت اور صحت مند اور تن درست رہنے کے سب سے پہلے اصول پر روشنی ڈالی ہے، یعنی آپ کو صفائی کے متعلق احکام قرآنی پر متوجہ کیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ حفظ صحت کا نہایت اہم اور بنیادی اصول صفائی اور طہارت ہے۔ اب میں صحت اور تن درستی کے بارے میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ یہ اللّٰہ تبارک وتعالیٰ کی عظیم نعمتوں میں سے ہے۔ صحت کی حفاظت کرنا اس نعمت پر اللّٰہ تعالیٰ کا شکر یہ ادا کرنے کے مترادف ہے۔ انسان جس چیز کی قدر کرتا ہے وہ اس کا اور زیادہ مستحق قرار پاتا ہے اور اس سے محروم نہیں ہوتا۔ ناقدری ایک طرح کی ناشکری ہے۔ صحت کی قدر نہ کرنا، اس کو کھو دینے کی کوشش کرنا بیماری کو دعوت دینا ہے۔ جسم اور ذہن و روح میں بڑا گہرا تعلّق ہے۔ جسم اگر صحت مند نہیں ہے تو ذہن بھی صحیح کام کرنے کے قابل نہیں رہتا اور ذہنی ذمّے داریوں کو پورا کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ جسم اگر پاک صاف نہ ہو تو روح بھی پاکیزگی سے محروم رہے گی۔ صحت کے بغیر انسان اپنے اعمال و افعال پر پوری طرح قادر نہیں ہوتا چاہے وہ جسمانی ہوں یا روحانی۔ زندگی صحت سے عبارت ہے۔ صحت کی حفاظت انفرادی افادیت بھی رکھتی ہے اور قومی اہمیّت بھی۔

افراد کا مجموعہ قوم کہلاتا ہے۔ فرد کی صحت اچھی ہوگی تو قوم بھی صحت مند ہوگی۔ حفظ صحت کی اس اہمیّت کے پیشِ نظر قومی ضروریات کے لیے صحت کا خیال ضروری ہے۔ بیمار اور کم زور قومیں نہ اپنی خوش حالی کے لیے محنت و مشقّت کر سکتی ہیں اور نہ بیرونی دشمن سے مقابلہ کر کے اپنے ملک کا دفاع کر سکتی ہیں، لہٰذا صحت مند قومیں کش مکشِ حیات میں کام یاب ہوتی ہیں اور اپنی جسمانی اور ذہنی قوتوں کو یک سوئی کے ساتھ تعمیر و ترقی میں صرف کر سکتی ہیں۔

Marfat.com

عبادات اور انسانی صحّت

جب ہم قرآن مجید و فرقانِ حمید کی بات کرتے ہیں تو یقینی اور بدیہی طور پر ہم دستورِ الٰہی کی بات کرتے ہیں کہ جس نے ایک دینِ فطرت یعنی اسلام کی طرف ہماری رہنمائی کی ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ؕ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ؕ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ۙ (الروم: ۳۰)

یعنی: "اے پیغمبر! تم ایک اللہ کے ہو کر رہو اور اس کے دین کی طرف اپنا رخ کیے ہوئے رہو۔ یہ اللہ کی بنائی ہوئی سرشت ہے جس پر لوگوں کو اس نے پیدا کیا۔ اللہ کی بنائی ہوئی بناوٹ میں ردّ و بدل نہیں ہوتا ہے۔ یہی دین کا سیدھا راستہ ہے۔"

قرآن کا دعوا ہے کہ دین اور فطرت دو متضاد چیزیں نہیں ہیں بلکہ دین انسان کی انفرادی اور اجتماعی فطرت کا عین تقاضا ہے۔ جس پر اللہ تبارک و تعالیٰ نے نوعِ بشر کو پیدا کیا اور جس میں کبھی کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔

مطالعۂ قرآن حکیم کی روشنی میں جب ہم حیاتِ طیّبہ اور سیرتِ نبی صلّی اللہ علیہ وسلّم پر غور کرتے ہیں اور حیاتِ طیّبہ کے تمام پہلوؤں پر نگاہ ڈالتے ہیں تو لاریب یہ حیات تفسیرِ قرآن ہے اور انسان کے لیے ایسی رہنما کہ اس سے بڑی رہنمائی کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ سے جب عرض کیا گیا کہ آں حضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کے اخلاق پر روشنی ڈالیں تو آپؓ نے فرمایا: "کیا تم نے قرآن نہیں پڑھا؟"

اسلام نے جن عبادات کا تصوّر انسان کو دیا ہے ان تمام میں فطرت کا نکھار ہمیں ملتا ہے۔ کوئی اسلامی عبادت فطرتِ انسانی کے خلاف نہیں ہے۔ اسلامی عبادات کا صحتِ فکری اور صحتِ جسمانی سے بڑا تعلق ہے۔ عبادات کے لیے اسلام نے صفائی اور طہارت کا بنیادی تصور دیا ہے، یعنی کوئی عبادت اس وقت تک نہیں کی جا سکتی کہ جب تک طہارت کو پیشِ نظر نہ رکھا جائے اور صفائی کا اہتمام نہ کیا جائے۔ دل اور جسم کی صفائی عبادت کی اساس ہے اور بنیاد۔ اور

Marfat.com

طہارت اور صفائی کا تعلق براہِ راست صحتِ انسانی سے ہے۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اسلام ہی وہ اوّلین مذہب اور پہلا دین ہے کہ جس نے صحت اور صفائی کو لازم و ملزوم قرار دیا ہے یعنی طہارت اور صفائی کے بغیر صحت کا تصور ممکن نہیں ہے۔ اس طرح اگر ہم غور کریں تو عبادات اور انسانی صحت میں براہِ راست تعلق ہے۔

ابن مالک سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ جسم کا پاک رکھنا ایمان کا ایک حصہ ہے۔ اَلطُّهُورُ شَطْرُ الْإِيمَانِ ۔ اور پھر کئی صورتوں میں مسلمان پر غسل فرض کیا گیا' سر اور جسم دھونے کو لازمی قرار دیا۔ غسل سے قطع نظر آپ صرف وضو کی حکمت پر غور فرمائیے کہ جو ہر نماز کا لازمہ ہے یعنی وضو کے بغیر نماز نہیں پڑھی جا سکتی۔ وضو میں آپ ہاتھ دھوتے ہیں، کلّی کرتے ہیں، ناک میں پانی چڑھاتے ہیں، کہنیوں تک ہاتھ پاک کرتے ہیں، سر پر ہاتھ پھیرتے ہیں' کانوں کو صاف کرتے ہیں اور ٹخنوں تک پیروں کو دھوتے ہیں۔ وضو تو نصف غسل سے بڑھ کر ہے اور اگر آپ پانچوں فرض نمازوں میں پانچ بار وضو کرتے ہیں تو غور کیجیے کہ آپ کس قدر اپنے جسم کو پاک و صاف کرتے ہیں اور آپ خود کو کس درجہ ہلکا محسوس کرتے ہیں نماز کو جسمانی ورزش تو قرار نہیں دیا جا سکتا مگر اس پر ضرور غور کیا جانا چاہیے کہ نمازِ عشا طویل تر نماز ہے اور عین حکمت ہے۔ علم و حکمت کے ہر دور میں رات کے کھانے کے بعد کسی نہ کسی انداز سے چہل قدمی اور حرکت کو مفید قرار دیا گیا ہے۔ جدید ترین امریکی ہیلتھ لٹریچر ہمارے پیشِ نظر ہے۔ اس میں امراضِ قلب کے لیے جو مفید ورزشیں تجویز کی گئی ہیں، وہ من وعن نماز ہیں، حتیٰ کہ ان میں دائیں بائیں گردن پھرانا تک تجویز کیا گیا ہے۔

اگر انسان کو فطرت پر یقین ہے اور قدرت پر اس کا ایمان کامل ہے اور وہ اس ایمان و ایقان کے ساتھ، عبادات کرتا ہے تو اس سے جو اطمینانِ قلب اور تسکین و راحت اسے نصیب و حاصل ہوتی ہے وہ بجائے خود صحت کی ضمانت ہے یعنی حکمِ الٰہی کی تعمیل مظاہرۂ صحت ہے اور اس کے لازمی نتیجے میں جو اطمینان و طمانیت ملتی ہے وہ صحت کی شاہراہوں کو واضح کرتی ہے۔ دین اسلام ایک فطری دین ہے اور وہ ہر اس فعل کو عبادت قرار دیتا ہے کہ جو اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے آدمی انجام دیتا ہے۔ اگر آپ اپنے کسی بھائی کو تکلیف میں دیکھتے ہیں اور غربت و عسرت میں مبتلا پا کر اس کی مدد کرتے ہیں اور خاموشی کے ساتھ اس کے مصائب کو دور کرتے ہیں تو یہ بھی عبادت ہے جس سے آپ کے دل کو راحت ملتی ہے اور آپ کا ضمیر مطمئن ہو جاتا ہے۔ دل کی راحت اور ضمیر کا اطمینان بجائے خود باعثِ صحت اور موجب تن درستی ہوتا ہے۔ ہمیں یقین رکھنا چاہیے کہ اگر کسی انسان کا دل

Marfat.com

خوش اور ضمیر مطمئن نہیں ہے تو وہ صحت جسمانی سے ضرور محروم رہے گا۔ یہ قولِ فیصل ہے اور اس نظامِ فطرت میں ہرگز کوئی تبدیلی ممکن نہیں۔ قرآنِ حکیم نے فیصلہ دے دیا ہے کہ:

اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ ط (الھود: ۱۱۴)

یعنی: "نیکیاں برائیوں کو دور کر دیتی ہیں۔"

تو بس نیکی ہی انسانی جسم اور دل کی صحت کی بنیاد بن سکتی ہے۔ ہمیں کوشش یہی کرنی چاہیے کہ ہم نیکیاں کریں۔ حدیث میں حکم ہے:

خَیْرُ النَّاسِ مَنْ یَّنْفَعُ النَّاسَ

یعنی: "بہترین انسان وہ ہے جو دوسروں کے لیے نفع بخش ہو۔"

Marfat.com

صحّت نعمت ہے

اللہ تعالیٰ نے انسان کو ہزاروں نعمتوں سے نوازا ہے۔ بعض نعمتوں کا تو انسان کو احساس واندازہ ہو جاتا ہے، لیکن بعض نعمتیں ایسی ہیں اور اتنی کثرت سے ہیں کہ ان کی فراوانی اور بہتات ان کے نعمت ہونے کا احساس نہیں ہونے دیتی۔ ہوا اور پانی کتنی بڑی نعمتیں ہیں۔ زندگی کا دارومدار ان ہی نعمتوں پر ہے، لیکن یہ نعمتیں اتنی عام ہیں کہ ان کی قدر نہیں ہوتی۔ ہاں ایسی نعمتیں جب چھن جاتی ہیں تو ان کی قدر معلوم ہوتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ ہمیں جو چیز میسر تھی وہ کتنی اہم تھی۔ صحت بھی ایک ایسی ہی نعمت ہے۔ اس کی قدر بھی عام طور پر انسان نہیں کرتا۔ جب تک اس کے اعضا اور قویٰ ٹھیک ٹھیک کام کرتے رہتے ہیں اور اس کو کوئی تکلیف نہیں ہوتی وہ صحت کے وجود ہی کا احساس وادراک نہیں کر پاتا۔ صحت کا احساس اس کو صرف اسی وقت ہوتا ہے جب صحت نہ ہو اور کوئی بیماری آگھیرے یا وہ کسی دکھ یا درد میں مبتلا ہو جائے۔ بیمار انسان کو صحت کی قدر و قیمت اسی شدت سے معلوم ہوتی ہے جس شدت سے وہ بیمار ہوتا ہے۔ معمولی بیماری صحت کی اہمیت کا معمولی احساس دلاتی ہے اور شدید بیماری نہایت شدت سے صحت کی قدر بتاتی ہے۔

صحت و تن درستی اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمتوں میں سے ہے۔ صحت کی حفاظت، اس نعمت پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کے مترادف ہے۔ انسان جس چیز کی قدر کرتا ہے اس کا وہ اور زیادہ مستحق ہو جاتا ہے اور اس سے محروم نہیں ہوتا۔ ناقدری ایک طرح کی ناشکری ہے۔ صحت کی قدر نہ کرنا گویا بیماری کو دعوت دینا ہے۔

جسم اور ذہن میں بڑا گہرا تعلق ہے۔ جسم اگر صحت مند نہ ہو تو ذہن بھی صحیح کام کے قابل نہیں ہوتا اور روحانی افعال کی انجام دہی مشکل ہو جاتی ہے۔ جسم اگر پاک صاف نہ ہو تو روح بھی پاکیزگی سے محروم رہے گی۔ صحت کے بغیر انسان کسی قسم کے افعال و اعمال پر قادر نہیں ہوتا، چاہے وہ جسمانی ہوں یا روحانی۔

زندگی صحت سے عبارت ہے۔ صحت کی حفاظت ذاتی افادیت بھی رکھتی ہے اور قومی اہمیت

Marfat.com

بھی۔ افراد کا مجموعہ قوم کہلاتا ہے۔ فرد کی صحت اچھی ہوگی تو قوم بھی صحت مند ہوگی۔ حفظِ صحت کی اسی اہمیت کے پیشِ نظر قومی ضروریات کے لیے صحت کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ صحت مند قومیں کشمکشِ حیات میں کام یاب ہوتی ہیں اور اپنی جسمانی اور ذہنی قوتوں کو یک سوئی کے ساتھ تعمیر و ترقی میں صرف کر سکتی ہیں۔ بیمار اور کم زور قومیں نہ اپنی خوش حالی کے لیے محنت و مشقت کر سکتی ہیں اور نہ بیرونی دشمن سے مقابلہ کر کے اپنے ملک کا دفاع کر سکتی ہیں۔

مسلمان زمین پر اللہ تعالیٰ کے نائب ہیں۔ اس نیابت اور خلافت کی عظیم ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے لیے صلاحیت اور طاقت کی ضرورت ہے۔ اسلام ایک انقلاب آفریں مذہب ہے۔ اس نے ہر گوشۂ زندگی میں انقلاب پیدا کیا ہے۔ جس زمانے میں لوگ مظاہر پرستی کے عادی تھے، بت پرستی کو اپنا شعار بنائے ہوئے تھے، کئی کئی خداؤں کو پوجتے تھے اس وقت اسلام نے توحید کا درس دیا۔ جس زمانے میں غسل کرنا، صاف رہنا، ناخن ترشوانا اور طہارت و پاکیزگی کے دوسرے لوازم بعض مذاہب کے نزدیک جرم تھے، اسلام نے طہارت و صفائی کا حکم دیا۔ قرآنِ پاک کو وہی ہاتھ لگا سکتے ہیں، جو پاک و صاف ہوں۔ ہر شخص جانتا ہے کہ قرآن امّتِ مسلمہ کا دستورِ حیات اور آئینِ زندگی ہے۔ اسے پڑھنا، اس کی تلاوت کرنا، اس کی ورق گردانی کرنا، اس کی سورتوں اور آیتوں سے استفادہ کرنا ہر مسلمان کے لیے ضروری اور فرض ہے۔ یہ ضرورت اس وقت تک پوری نہیں ہو سکتی جب تک کہ ہم پاک اور طاہر نہ ہوں۔ ایک موقع پر فرمایا گیا ہے کہ خدائے بزرگ و برتر اُن لوگوں کو پسند فرماتا ہے جو طاہر ہوں۔

اسلام کی ایک یگانہ خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس نے ہر نیک اور اچھے کام کو عبادت قرار دیا ہے۔ راستے کو جھاڑ جھنکاڑ سے صاف کر دینا، ناپاکی اور نجاست کو دور کرنا، غلاظت اور کوڑے کرکٹ سے نہ صرف خود دامن بچانا بلکہ دوسروں کے لیے بھی یہی چاہنا اور اس سلسلے میں امکانی مدد دینا، یہ سب نیک اور اچھے کام ہیں، اس لیے بلاشبہ یہ عبادت کے ذیل میں آتے ہیں۔ اسلام ہر بھلائی کے کام کی حوصلہ افزائی کرتا ہے اور انسانی زندگی کی بقا کے لیے ہر کوشش کو مستحسن قرار دیتا ہے۔ زندگی کی بقا اور اس کی کام یابی صحت کے قائم رکھنے میں ہے۔

حفظِ صحت کا نہایت اہم اور بنیادی اصول صفائی ہے اور صفائی اور پاکیزگی کی اہمیت اسلام میں واضح ہے۔ عبادات کا پابند مسلمان ناپاک نہیں رہ سکتا۔ اسلام نے صفائی کے احکام بڑی تفصیل کے ساتھ دیئے ہیں اور پیدائش سے لے کر موت تک ہر مرحلے پر ہر کام میں طہارت کے اصول مقرر کر دیے ہیں اور طریقے بتا دیے ہیں۔ ہر مسلمان بچہ جانتا ہے کہ نماز کے لیے روزانہ پانچ

Marfat.com

وقت وہ تمام اعضا دھونے پڑتے ہیں جو بیرونی فضا اور گرد و غبار سے متاثر اور آلودہ ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ آنکھ، ناک، کان اور گلا بھی خوب صاف کرنا پڑتا ہے۔ ان تمام اعضا کو اس طرح دھونا پڑتا ہے کہ کوئی آلودگی نہ رہ جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ وضو پورے طور پر کرنا چاہیے اور پوری طرح وضو کرنے سے اعضا کا پانی سے چپڑ لینا مراد نہیں ہے بلکہ اچھی طرح صفائی مقصود ہے۔

قرآنِ حکیم میں اللہ تبارک وتعالیٰ صفائی کے باب میں عام انسانوں کو نہیں بلکہ براہ راست حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب فرماتا ہے۔ سورۂ مدثر میں ارشاد ہے کہ "اے نبی اپنے کپڑے پاک رکھیے"۔

وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ (المدثر:۴)

خود اپنے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ التَّوَّابِينَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِينَ ۝ (البقرہ:۲۲۲)

یعنی: "اللہ تعالیٰ بدی سے بچنے والوں اور پاک صاف رہنے والوں کو چاہتا ہے اور ان سے محبت کرتا ہے"۔

اللہ کی کتاب یعنی قرآنِ حکیم کے بارے میں نہایت واضح حکم ہے کہ "نہیں ہاتھ لگاتے اسے مگر پاک صاف لوگ"۔

لَا يَمَسُّهُ إِلَّا الْمُطَهَّرُونَ ۝ (الواقعہ:۷۹)

پاکیزگی افکار کے بارے میں بھی قرآنِ حکیم کی ہدایات ہمارے لیے مشعلِ راہ ہیں۔ سورۂ مدثر کی مذکورہ بالا آیت یعنی وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ سے متصل فرمایا گیا ہے:

وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ (المدثر:۵)

یعنی: "ناپاکی اور گندگی سے پرہیز کرو"۔

اور اس کے مفہوم میں ظاہری اور جسمانی گندگی کے ساتھ فکر و خیال کی ناپاکی اور فساد بھی شامل ہے۔ اخلاق سب سے بڑی طاقت ہے۔ اسلام کی تعلیمات میں اخلاق کو بنیادی اور اعلیٰ ترین مقام حاصل ہے۔ قرآنِ حکیم میں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کی تعریف ان الفاظ میں فرمائی ہے:

وَإِنَّكَ لَعَلَىٰ خُلُقٍ عَظِيمٍ ۝ (القلم:۴)

یعنی: "اور یقیناً آپ کی ذات اعلیٰ اخلاق کا نمونہ ہے"۔

اخلاق کے بارے میں حضورؐ کے تین ارشاداتِ گرامی پر غور فرمائیے:

۱۔ "تم میں بہترین وہ ہے جس کے اخلاق اچھے ہیں"۔

Marfat.com

۲۔ "قیامت کے دن تمام نیکیوں میں سب سے زیادہ وزن حُسنِ اخلاق کا ہوگا۔"

۳۔ "تمام اہلِ ایمان میں اس شخص کا ایمان کامل ہے جو اخلاق کے لحاظ سے سب سے بہتر ہو۔"

اخلاق سے آراستہ لوگوں کے دل و دماغ پاک وصاف رہتے ہیں اور کدورتوں سے خالی ہوتے ہیں۔ ان میں کینہ اور فاسد جذبات جنم نہیں لے سکتے۔

اس تفصیل کے بعد ہر انسان اس نتیجے پر آسانی سے پہنچ سکتا ہے کہ صحت کو برقرار رکھنے کے لیے جسم کی اور ماحول کی صفائی اور پاکیزگی نہایت ضروری ہے۔ اس کے ساتھ ہی بقائے صحت اور قیام تن درستی کے لیے یہ بھی لازمی ہے کہ انسان اپنے قلب کو بھی صاف رکھے اور فکر و نظر کو پاک رکھے اور اخلاق کی بلندیوں کو حاصل کرنے میں کوشاں رہے۔ طہارت کا اعلا تر مفہوم اسی طرح پورا ہو سکتا ہے۔

حفظِ صحت کا تعلق صرف ذاتی صحت ہی سے نہیں ہے بلکہ معاشرے، ملکی اقتصادیات، قومی تہذیب، اجتماعی طرزِ زندگی، رہن سہن اور طریقِ معاشرت سے بھی ہے اور یہ تمام عوامل انفرادی اور قومی صحت پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ صحت کی نعمت سے پوری طرح مستفید اور لطف اندوز ہونے کے لیے فطرت سے قرب، اعتدال اور روحانی اطمینان کے ساتھ ساتھ بھلائی کے کاموں میں مشغولیت اور اپنے ہم جنسوں کے دکھ درد میں شرکت ضروری ہے۔ انسان جہاں اپنے فائدے کے لیے سوچتا ہے اور سعی کرتا ہے وہاں اگر وہ دوسروں کی بھلائی اور خدمت کے لیے بھی اپنی قوتوں کا کچھ حصہ صرف کرے تو اس کو طمانیتِ قلب اور روحانی سکون حاصل ہوگا۔

اطمینانِ قلب کی کمی نے آج کے انسان کو اعصابی امراض میں مبتلا کر رکھا ہے اور وہ اخلاقی لحاظ سے بھی کم زور ہو گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ پر ایمان، اس کے رسول پاکؐ کی تعلیمات پر عمل اور آخرت کی زندگی پر یقین انسان کو ذہنی اور جسمانی صحت کے اعلا ترین معیار سے ہم کنار کر سکتا ہے۔

Marfat.com

اسلام اور صحتِ جسمانی

ہم سب اس حقیقت کو جانتے ہیں اور مانتے ہیں کہ اس دُنیا میں انسان کے لیے سب سے زیادہ اہم اور سب سے زیادہ توجہ کے لائق جو چیز ہے وہ ہے مقصدِ حیات۔ اگر ہم انسانی تاریخ کا جائزہ لیں اور انسانی فطرت کو سمجھیں تو ہم پر یہ بات واضح ہو گی کہ تمام انسانی مساعی اور کوششوں اور حیاتِ انسانی کی ساری کش مکشوں اور زندگی کی تمام معرکہ آرائیوں کی تہ میں کسی نہ کسی مقصدِ حیات کا وجود اور تحفّظ کار فرما رہا ہے۔ تحفظِ مقصد کی راہ میں حائل ہونے والی ہر موجود و مفروض، بلکہ ہر موہوم، رکاوٹ کو دور کرنے کے لیے انسان ہمیشہ اور ہر دور میں جان کی بازی لگاتا رہا ہے۔ میں اِس وقت حیاتِ اقوام و ملل کے مختلف تاریخی ادوار میں متعین کیے جانے والے مقاصدِ حیات کے درست یا نادرست ہونے کے بارے میں کوئی گفت گو نہیں کروں گا، لیکن یہ وضاحت اور اعلان ضروری سمجھتا ہوں کہ ہم مومن اور مسلمان کی حیثیت سے اپنا جو مقصدِ حیات قرار دیتے ہیں اس کی اساس، خالقِ کائنات اور ناظمِ کون و مکاں کی وحی پر قائم ہے، وہ وحی کہ جو اس نے اپنے آخری رسول حضرت محمدؐ پر نازل فرمائی اور جو آج ہمارے پاس اللہ کی آخری کتاب یعنی قرآنِ مجید و فرقانِ حمید کی صورت میں موجود ہے۔

میں آپ کی توجہ جس بات کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اس کائنات کا خاکہ قطعی طور پر اس طرح مرتب اور تیار کیا گیا ہے کہ یہاں بسنے والے ہر انسان کو نہ صرف اپنے مقصدِ حیات کے تحفّظ کے لیے بلکہ اس کے ساتھ خود اپنی زندگی کے قیام و بقا کے لیے ہمہ وقت اور ہمہ جہت کوشش جاری رکھنی ضروری ہے۔ قرآنِ حکیم میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

"لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي كَبَدٍ" (سورۃ البلد: ۴)

یعنی "ہم نے انسان کو مشقت میں گھرا ہوا پیدا کیا ہے۔"

اس بلیغ بنیادی اور اساسی نکتے کو جن افراد اور جن اقوام نے سمجھ لیا انھوں نے اس کوشش اور کش مکش کی راہ کو ہی عافیت جانا اور بقائے حیات اور تحفّظِ مقصد کی جدّوجہد ہی کو اپنے لیے باعثِ امن و اطمینان خیال کیا اور اس کی تائید میں اپنی حیات کو پیہم جدّوجہد اور سعی

Marfat.com

مسلسل سے عبارت کر دیا۔

تاریخ بتاتی ہے، اور ہماری تاریخ کا ہر دور اور ہر دور کا ہر واقعہ بتاتا ہے کہ امت مسلمہ اور اس کے ہر فرد کے ذہن میں جب تک یہ نظر افروز نکتہ روشن و تابندہ رہا یہ امت ترقی کی منازل پر گامزن رہی۔ ہم جانتے ہیں اور خوب سمجھتے ہیں کہ ترقی و تقدم اور عظمت و رفعت کی راہوں کا یہ سفر ایک دشوار سفر ہے اور یہ سفر مخصوص معین اور متعین زادِ راہ کا متقاضی ہے۔ اس زادِ راہ کے بعض عناصر معنوی اور اعتقادی ہیں، اور بعض مادی اور جسمانی۔ اگر امعانِ نظر سے جائزہ لیا جائے اور فکر و نظر کی گہرائیوں کے ساتھ بات کو سمجھا جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ جہاں تک عالم اسباب کا تعلق ہے ان میں سے جسمانی عنصر کہ جو درحقیقت صحتِ جسمانی ہے، ایک مخصوص اہمیت کا حامل ہے۔ نورِ مجسم، رحمتِ عالم، حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشادِ عالی ہے کہ

اَلْمُؤْمِنُ الْقَوِیُّ خَیْرٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِ الضَّعِیْف

یعنی "کم زور مومن سے طاقت ور مومن بہتر ہے۔"

ہمیں صحتِ جسمانی کی حقیقت کی جانب ہی متوجہ کرتا ہے۔

اسلام ہمیں سکھاتا ہے کہ انسان کے پاس جو کچھ بھی ہے وہ اللہ کا عطا کردہ ہے۔ اس طرح انسان کے لیے اللہ کے تمام عطیات امانت کی حیثیت رکھتے ہیں۔ نیز اسلامی تعلیم یہ بھی ہے کہ امانت کی حفاظت ایمان و اسلام کا ایک لازمی تقاضا ہے۔ صحت بھی ان نعمتوں میں شامل ہے اور اس طرح صحت کی حفاظت اور صحت کو خطرات سے بچانے کی جدوجہد کا شمار مومن کی اساسی اور بنیادی ذمہ داریوں میں ہوتا ہے۔

صحت کو خطرات اس صورت میں لاحق ہوتے ہیں کہ انسان فطرت سے بغاوت کرے، اصولِ فطرت و قدرت کو صریحاً نظر انداز کر کے زندگی گزارنے کا فیصلہ کرے۔ فطرت متقاضی ہے کہ انسان تمام دن محنت و مشقت کے بعد رات کو آرام کرے اور نیند کا حق ادا کرے۔ مگر آج کا انسان ہے کہ باغیِ فطرت ہے۔ وہ راتوں کو جاگتا ہے اور نیند کی فطری ضرورت کو نظر انداز کرتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ انسان کی اس بغاوت نے اسے ابتلائے آلام کر دیا ہے اور اس کے دل و دماغ اس کے لیے مسئلہ بن گئے ہیں۔

ذرا اپنے ماحول پر نگاہ ڈالیے، انسان نے ورزش کو ترک کر دیا ہے اور حرکت سے لاپروا ہو کر جمود کو اس نے خوش آمدید کہا ہے۔ اس جمود نے اس کے سارے نظامِ جسم کو خفتہ کر دیا ہے،

Marfat.com

سُلا دیا ہے۔ اِسی وجہ سے اس کی صلاحیتِ فکر و عمل مفلوج ہو کر رہ گئی ہے۔ تازہ ہوا اور صاف پانی اس کے لیے بے معنیٰ الفاظ ہو کر رہ گئے ہیں۔

ہر مسلمان جانتا ہے، اور اس کا یقین و ایمان ہے کہ صحت عطیۂ خداوندی ہے اور صحت کی حفاظت اُس کا تقاضائے ایمان ہے۔ پھر وہ اس حقیقت سے بھی بہ خوبی واقف ہے اور آگاہ کہ صحت بکاؤ مال نہیں ہے کہ بازار گئے اور رُپیا دے کر خرید لائے۔ لاریب دنیا میں کوئی ایسی طاقت نہیں ہے کہ جو صحت خرید سکے۔ صحت جسمِ انسانی کی لازمی ضرورت ہے اور اللہ تعالیٰ کا عطیہ ہے جس کی حفاظت دائرۂ فطرت میں رہ کر ہی کی جاسکتی ہے۔

صحت اور صفائی میں بڑا گہرا رشتہ ہے۔ اسلام نے اپنی تعلیمات میں صفائی پر یہ درجۂ انتہا زور دیا ہے، بلکہ صفائی کو نصف ایمان قرار دیا ہے۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

"الطہور شطر الایمان

یعنی: "طہارت ایمان کا حصّہ ہے"

گندگی میں صحت کا قیام ممکن نہیں ہے۔ ماحول کی غلاظت اور گندگی دشمنِ صحت ہے۔ جسم اور اعضائے جسم کی صفائی نہ کرنے سے صحت بگڑ جاتی ہے۔ معاملات کی صفائی نہ ہو تو بھی صحت خراب ہو جاتی ہے اور فکر ضعیف۔

خلاصۂ کلام یہ ہوا کہ اسلام صحتِ جسمانی کو لازمۂ حیات قرار دیتا ہے اور صحت کی حفاظت کو جزوِ ایمان ٹھیراتا ہے۔ صحتِ جسمانی اور صحتِ فکری لازم و ملزوم ہیں، اور تعمیر و ترقی، تحریک و تبلیغ، تہذیب و تمدن، انفرادیت اور اجتماعیت، امانت و عدالت اور سیاست و دیانت کے لیے صحت اور طہارت لازمی ہیں۔

اس میدان میں اسلام ہر مسلمان کو دعوتِ فکر دیتا ہے۔ وہ دعوت دیتا ہے امتِ مُسلمہ کے ہر فرد کو، پاکستان کے ہر انسان کو کہ وہ اپنی صحت کی حفاظت کرے اور صحتِ جسمانی و صحتِ فکری کے ساتھ خدمتِ اسلام میں برسرِ عمل ہو جائے۔ اسلام دعوت دیتا ہے ہیئتِ اقتدار کو کہ وہ پوری ملت کے لیے فکر و نظر کی پوری توانائیوں کے ساتھ اسبابِ صحت فراہم کرے اور حق و توازن کی برقراری کے ساتھ میدانِ عمل میں گام زن ہو۔

Marfat.com

صحت اور اسلام

صحتِ جسمانی انسان کے لیے ایک قیمتی متاع ہے۔ اگر صحت اور تن درستی نہیں ہے اور اس سے انسان محروم ہے تو یقیناً انسان کوئی کام حسن و صحت اور خوبی کے ساتھ انجام نہیں دے سکتا۔ صحتِ جسمانی کو تاریخ کے ہر دور میں خواہ وہ کتنا ہی ماضی میں ہو، انتہائی اور بنیادی اہمیت و حیثیت حاصل رہی ہے۔ صحت اور صحت مندی کے لیے انسان نے ہر دور میں انتہائی کوششیں کی ہیں جو مسلسل مثالیں بنتی رہی ہیں صحت اور صحت مندی کی اہمیت اور ضرورت کے بارے میں نقطۂ فکر میں شروع سے آج تک کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔

تاریخ عالم میں جو اقوام اپنے منتہائے کمال کو پہنچی ہیں ان کی کامیابیوں اور کامرانیوں اور ان کے کمالات کی تاریخ سے صحت کو کسی طرح خارج نہیں کیا جاسکتا۔ بلاشبہ ان کامیاب و کامران اقوام و ملل نے صحت سے اپنا رشتہ ہمیشہ مضبوط و مربوط رکھا ہے اور صحت ہی سے مضبوطیِ رشتہ کی بدولت وہ سرفراز اور سربلند رہی ہیں۔ وہ اقوام و ملل کہ جن کی آزادیاں سلب اور ضبط ہوئیں ان میں شدید انحطاط آئے۔ اُن کے اسبابِ انحطاط میں نقصِ صحت سرفہرست رہا۔ آزادی کی ضبطی اور غلامی اپنے ساتھ اور اپنے جلو میں جہالت لائی ہے اور یہ جہالت حُسن و قبح میں فرق و امتیاز کرنے کی صلاحیت سے محروم کردیتی ہے اور ایک غلام اور آزادی سے محروم انسان نہ صرف مسائل ملک و ملّت سے غافل ہوجاتا ہے، بلکہ وہ خود اپنے مقام کو فراموش کردیتا ہے۔

جہاں تک میں مطالعہ کرسکا ہوں اور جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں اس کا حاصل یہ ہے کہ اسلام سب سے پہلا مذہب ہے اور سب سے پہلا ضابطۂ حیات ہے جس نے صحت و صفائی کو لازم و ملزوم قرار دیا ہے اور جس نے صفائی اور صحت کے رشتے کو مربوط کیا ہے۔ قرآنِ مجید اور شارعِ اسلام علیہ التحیۃ والسلام نے انسانی صحت و ثبات سے متعلق ایسی تعلیم دی ہے اور ایسی رہنمائی عطا کی ہے کہ کسی دوسری شریعت یا مذاہب نے

Marfat.com

نہیں دی۔ اس سے کسی طرح انکار نہیں ہے کہ دوسرے مذاہب و ملل میں بھی پاکیزگی و صفائی کا خیال تھا، مگر وہاں اس کی حیثیت عمومی اور ثانوی تھی۔ اسلام نے سب سے ممتاز ہو کر اصولِ حفظِ صحت اور طہارت کو ہم معنی اور ہم مفہوم کر دیا اور اس طرح حیاتِ انسانی کو ایک ایسا تخیل دیا اور ایک ایسا راستہ بتایا جس نے مسلمانوں پر کامرانیوں کے دروازے کھول دیے اور پھر انھوں نے ان ابواب کو سارے عالمِ ارضی پر واضح کر دیا اور صحت و طہارت کا وہ مفہوم اقوامِ عالم کو دیا جس سے اسلام سے پہلے انسان ناآشنائے محض تھا۔ اسلام کی روحانی تعلیم جس طرح عدیم النظیر اور عدیم المثال ہے اسی طرح صحت و طہارت کی اسلامی تعلیم بھی بے مثل اور بے عدیل ہے۔ بالکل ابتدائی زمانۂ اسلام میں جب اللہ تبارک و تعالیٰ جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نورِ ہدایت سے منوّر فرماتے ہیں تو تاکیدات میں اس تاکید کو شامل فرماتے ہیں کہ:

وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ ۝ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ (المدثر: ۴-۵)

یعنی: "اپنے کپڑے (لباس) صاف ستھرے اور مطہر رکھا کرو اور ہر قسم کی غلاظت اور گندگی سے پرہیز کیا کرو۔"

قرآن و حدیث ایک طرف اصولِ حفظِ صحت بتاتے ہیں اور ان کی پابندی پر اصرار کرتے ہیں تو اس کے ساتھ ہی صفائی اور پاکیزگی اور طہارت کی انتہائی تلقین بھی کرتے ہیں۔ سونے اور جاگنے، غذا اور پانی، دانت صاف کرنے، غسل اور وضو، تازہ ہوا، ورزش اور آرام غرض ہر موضوع پر اسلام میں ہمیں بڑی واضح ہدایات ملتی ہیں۔ مثال کے طور پر نیند کو لیجیے۔ مناسب وقت تک نیند صحت مند زندگی کے لیے ضروری ہے۔ اس سے تھکن دور ہوتی ہے، اعضائے جسمانی کو آرام ملتا ہے اور بدن کی کھوئی ہوئی طاقت بحال ہو جاتی ہے۔ قرآن کریم میں متعدد بار نیند موجب راحت و آرام قرار دی گئی ہے اور اس کا ترک کر دینا یا مناسب وقت سے کم کر دینا اسلام میں ہرگز پسندیدہ نہیں ہے۔ چنانچہ ابتدائے اسلام میں حضرت شارع علیہ التحیۃ والسلام کو جب آپ رات کا زیادہ حصہ بیداری اور عباداتِ الٰہی میں صرف فرماتے تھے، حق تعالیٰ نے تاکیدی حکم دیا:

"آپ مناسب وقت تک ضرور سویا کریں۔ بے شک رات کا جاگنا نفس کو قابو میں لانے کا بہترین ذریعہ ہے، لیکن اگر آپ طول دیں گے اور تھکن سے خود کو چور کر لیں گے (یعنی اپنی صحت خراب کر لیں گے)، تو دن کے کام اور دنیا کی

Marfat.com

ہدایت سے متعلق مہمات جلیلہ جو محنت شاقہ چاہتی ہیں کیسے انجام پائیں گی۔"
یہ تاکید قرآن کی سورۂ مزمل میں اس طرح ہے:

يَاأَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ۝ قُمِ اللَّيْلَ إِلَّا قَلِيلًا ۝ نِصْفَهُ أَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيلًا ۝ أَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْآنَ تَرْتِيلًا ۝ إِنَّا سَنُلْقِي عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيلًا ۝ إِنَّ نَاشِئَةَ اللَّيْلِ هِيَ أَشَدُّ وَطْئًا وَأَقْوَمُ قِيلًا ۝ إِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيلًا ۝ (المزمل: ۱ تا ۷)

حضورؐ کا معمول تھا کہ آپ دوپہر کے کھانے کے بعد تھوڑی دیر کے لیے آرام فرماتے تھے۔ سورۂ نور کے آٹھویں رکوع میں جہاں گھر میں داخل ہونے کے لیے خدام اور باشعور نابالغ بچوں کو اجازت لینے کا حکم ہے وہاں خاص طور پر تین اوقات ایسے بیان ہوئے ہیں کہ گھر میں ان کو بغیر اجازت داخل نہیں ہونا چاہیے۔ یعنی نماز عشا کے بعد، نماز فجر سے قبل اور دوپہر کے وقت کہ جب کپڑے اتار کر آرام کیا جاتا ہے۔

اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ دوپہر کو آرام کرنا چاہیے۔ ہم آج کے دور میں کہ جب انسان تسخیر ماہتاب کر چکا ہے اور تسخیر شمس کے لیے بے تاب ہے، نیند کے بارے میں اہل علم و فضل سے ٹھیک وہی باتیں سنتے ہیں جن کے بارے میں قرآن و اسلام میں نہایت واضح ہدایات موجود ہیں۔ اور جن کو ترک کر کے آج انسان نے اپنی صحت کو سخت خطرے میں ڈال دیا ہے۔ ایک طرف نیند کے بارے میں یہ ہدایات ہیں دوسری طرف ذرا سا زور اس بات پر ہے کہ رات جلد سو جاؤ اور صبح جلد بیدار ہو جاؤ۔

نماز عشا کے بعد حکم ہے کہ اس کے بعد فوراً سو جانا چاہیے اور بلا ضرورت رات کو دیر تک نہیں جاگنا چاہیے اور فضول باتوں میں یا کاموں میں وقت نہیں ضائع کرنا چاہیے۔ اور پھر ہدایت ہے کہ صبح پو پھٹتے ہی اٹھ کھڑا ہونا چاہیے، کیوں کہ یہ نماز فجر کا وقت ہے جو ہر مومن پر فرض ہے۔ آج دنیا امراض و آلام میں جس بری طرح مبتلا ہے اس کے اسباب کا اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو ایک اہم سبب یہ نظر آئے گا کہ آج کے انسان نے نیند اور بیداری، یعنی سونے اور جاگنے کے ان بنیادی اصولوں کو ترک کر دیا ہے۔ قرآن و حدیث نے اس باب میں جو ہدایت دی ہے آج ساری دنیا اس کی تائید کرتی ہے اور ہر اصول جو قرآن اور رسول ﷺ نے انسان کی رہ نمائی کے لیے عطا کیا ہے، ہر حال میں اس کی تائید ہوتی ہے۔ ہمیں سوچنا چاہیے کہ قرآن و حدیث کو چھوڑ کر ہم کہاں جا رہے ہیں؟

Marfat.com

صحّتِ جسم وطہارتِ فکر

قیامِ صحت اور بقائے تن درستی کا انحصار بہت سی چیزوں پر ہے۔ مثلاً حفظِ صحت کے اصولوں پر عمل کرنا، یعنی تازہ اور صاف ہوا میں سانس لینا اور اپنے رہنے سہنے کی جگہوں میں تازہ ہوا کو بلا روک ٹوک آنے جانے دینا، سورج کی اوّلین شعاع اپنے جسم پر پڑنے دینا، متوازن و مناسب غذا صحیح وقت پر اطمینان سے کھانا، تازہ اور صاف پانی پینا، بعدِ عشاء رات کو جلد سونا اور صبح نمازِ فجر سے قبل بیدار ہونا، بقدرِ مناسب ورزش کرنا اور اپنے جسم کو پاک صاف رکھنا وغیرہ۔ یہ سب کے سب اصولِ حفظِ صحت ہیں ان کا پورا پورا خیال رکھنا اس کی قطعی ضمانت ہے کہ آپ کی صحت اور تن درستی ہمیشہ قائم رہے گی اور آپ بیماریوں اور امراض سے بچے رہیں گے اور دواؤں کے غلط اور غیر ضروری استعمال سے آپ کو نجات حاصل رہے گی۔ بلاشبہ صحت اور تن درستی کا انحصار اسی پر ہے کہ ہر انسان صحت کی حفاظت کے اصول پر عمل کرے۔ ان اصولِ حفظِ صحت کے علاوہ بھی ایک حد درجہ اہم چیز ہے جس کا صحت و تن درستی سے بہت گہرا تعلق ہے اور بہت زیادہ ہے، وہ ہے صفائی، پاکی اور طہارت۔ جب ہم سرورِ کائنات، فخرِ موجودات اور ہادیِ برحق جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اعلاو ارفع تعلیمات پر غور کرتے ہیں تو ہم پر یہ بڑی عجیب و غریب حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ جناب نبیِ آخر الزمان علیہ التحیۃ والسّلام نے سب سے پہلے انتہائی اہمیت کے ساتھ تن درستی اور صفائی اور صحت و طہارت کا رشتہ قائم فرمایا اور قولِ فیصل کے طور پر تن درستی اور صفائی اور صحت و طہارت کو لازم و ملزوم قرار دے دیا۔ تعلیماتِ رسولِ برحق میں صفائی اور صحت پر بہت زیادہ زور دیا گیا ہے۔ درحقیقت جب صفائی و پاکی اور طہارت کا ذکر فرمادیا گیا ہے تو عقل و فہم کو بیدار ہو کر سمجھنا چاہیے کہ اس سے منشاد مراد جسمانی صفائی بھی ہے اور روحانی و ذہنی صفائی بھی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن و حدیث، دونوں انتہائی اہمیت کے ساتھ طہارتِ جسمانی اور پاکیزگیِ خیال و فکر پر زور دیتے ہیں جس طرح

Marfat.com

یہ ناممکن ہے کہ انسان غلاظت وکثافت کے انباروں میں جسمانی طور پر صحت مند رہ سکے اسی طرح یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ کوئی بھی انسان خیالاتِ بد اور افکارِ فاسدہ کے ساتھ اپنی صحت کو برقرار رکھ سکے۔ ایک انسان جو غسل نہ کرے، اپنے دانت اور ناک کو صاف نہ رکھے، ناخنوں کو نہ تراشے، سر اور داڑھی کے بالوں کو نہ سنوارے وغیرہ، وہ صحت مند اور تن درست نہیں رہ سکتا۔ اسی طرح انسان اپنے ماحول کو صاف ستھرا نہ رکھے تو اس کی صحت پر ضرور اس کا خراب اثر پڑے گا، کیوں کہ گندگی اور غلاظت انسان کے حواس اور قویٰ کو متاثر کرتی ہے اور خراب اثر ڈالتی ہے۔ یہی حال خیالاتِ بد اور افکارِ فاسدہ کا بھی ہے۔ ایک انسان جذباتِ حسد میں جل بھُن رہا ہے یا کینہ و بغض کا شکار ہے یا اپنے دوست یا عزیز کے خلاف مصروفِ سازش ہے، اور دوسرے انسانوں کو نقصان پہنچانے کے سامان کر رہا ہے، وہ یقیناً برائی کر رہا ہے اور ان فاسد جذبات سے اس کی نہ صرف روحانی اور ذہنی صحت متاثر ہو کر رہتی ہے، بلکہ جسمانی طور پر بھی وہ خستہ حال ہو جاتا ہے، کیوں کہ خیالاتِ ردّی و فاسد خیالات اسے شرفِ آدمیت اور انسانیت سے گرا دیتے ہیں۔ انسان کے لیے تو اشرف المخلوقات ہونا مقدّر ہے، مگر جو انسان اپنے پایۂ شرف سے گر جائے وہ صحت مند نہیں ہو سکتا اور تن درست نہیں رہ سکتا۔

تو جب ہم صحت وصفائی کی گفت گو کرتے ہیں تو ہماری مراد واضح طور پر یہ ہوتی ہے کہ انسان جسمانی اور روحانی طور پر صفائی اور پاکیزگی کا اہتمام و احترام کرے، تب ہی اس کی صحتِ جسمانی و ذہنی برقرار رہ سکتی ہے۔

قرآنِ حکیم میں اللہ تبارک وتعالیٰ صفائی کے باب میں عام انسانوں کو نہیں، بلکہ براہِ راست جناب محمّد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کو مخاطب فرماتا ہے۔

سورۂ مدثّر میں ارشاد ہوتا ہے:

وَثِیَابَکَ فَطَهِّرْ

یعنی: "اے پیغمبرؐ! اپنے کپڑے پاک رکھیے۔"

رسالت مآبؐ کا ارشاد ہے:

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْوَسَخَ وَالشَّعَثَ

یعنی: "اللہ تعالیٰ کو گندا میلا بدن اور الجھے غبار آلود بال ناپسند ہیں۔"

Marfat.com

خود اپنے بارے میں اللہ تبارک و تعالیٰ فرماتا ہے:

اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ التَّوَّابِیْنَ وَ یُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِیْنَ ○ (البقرہ:۲۲۲)

یعنی: "اللہ توبہ کرنے والوں اور پاک صاف رہنے والوں کو چاہتا ہے اور ان سے محبت کرتا ہے"۔

کتاب اللہ یعنی قرآن حکیم کے بارے میں بڑا واضح حکم ہے کہ:

لَا یَمَسُّهٗۤ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ○ (الواقعہ:۷۹)

یعنی: "نہیں ہاتھ لگاتے اسے (یعنی قرآن پاک کو) مگر پاک صاف لوگ"۔

صفائی کے باب میں مُصحفِ آسمانی کا نقطۂ نظر بالکل واضح ہے (اور اس میں فہم کے لیے کوئی اشکال موجود نہیں ہے) اس کے ساتھ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات میں صفائی و طہارت کو نہایت اہم مقام حاصل ہے۔ پاکیزگی افکار کے بارے میں قرآنِ حکیم کی یہ آیتِ کریمہ ہمارے لیے مشعلِ راہ ہے۔ سورۃ مدثر کی مذکورہ بالا آیت یعنی وَ ثِیَابَكَ فَطَهِّرْ سے متصل فرمایا گیا ہے:

وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ (المدثر:۵)

یعنی: "ناپاکی اور گندگی سے پرہیز کرو"۔

اور اس مفہوم میں ظاہری اور جسمانی گندگی کے ساتھ فکر و خیال کی ناپاکی اور فساد بھی شامل ہے۔ اخلاق سب سے بڑی طاقت ہے۔ اسلام کی تعلیمات میں اخلاق کو بنیادی اور انتہائی مقام حاصل ہے۔ قرآنِ حکیم میں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کی تعریف ان الفاظ میں فرمائی ہے:

وَ اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِیْمٍ (القلم:۴)

یعنی: "اور یقیناً آپ کی ذات اعلیٰ اخلاق کا نمونہ ہے"۔

اخلاق کے بارے میں حضور ﷺ کے تین ارشاداتِ گرامی پر اس وقت غور فرمائیے:

اِنَّ مِنْ خِیَارِكُمْ اَحْسَنَكُمْ اَخْلَاقًا

یعنی: "تم میں بہترین وہ ہے جس کے اخلاق اچھے ہیں"۔

مَا مِنْ شَیْءٍ اَثْقَلُ فِی الْمِیْزَانِ مِنْ حُسْنِ الْخُلُقِ

یعنی: "قیامت کے دن تمام نیکیوں میں سب سے زیادہ وزن حسنِ اخلاق کا ہوگا"۔

اَكْمَلُ الْمُؤْمِنِیْنَ اِیْمَانًا اَحْسَنُهُمْ خُلُقًا

یعنی: "تمام اہلِ ایمان میں اس شخص کا ایمان کامل ہے جو بلحاظ اخلاق سب سے بہتر ہو"۔

Marfat.com

جو لوگ با اخلاق ہوتے ہیں ان کے دل و دماغ پاک و صاف ہوتے ہیں اور کدورتوں سے خالی ہوتے ہیں۔ ان میں کینہ اور فاسد جذبات جنم نہیں لے سکتے۔

اس تمام گفت گو کے بعد ہر انسان صرف اسی نتیجے پر پہنچ سکتا ہے کہ صحت کی برقراری اور تن درست رہنے کے لیے جسم کی اور ماحول کی صفائی اور پاکی قطعی ضروری ہے اور اس کے ساتھ ہی بقائے صحت اور قیام تن درستی کے لیے یہ بھی لازمی ہے کہ انسان اپنے قلب کو بھی پاک صاف رکھے اور اپنے فکر و نظر کو پاک رکھے، اور اخلاق کی بلندیوں کو حاصل کرنے میں کوشاں رہے۔ طہارت کا اعلا تر مفہوم اسی طرح پورا ہو سکتا ہے۔ اب آپ بات کو اس طرح بھی سمجھ لیجیے کہ طہارت کے بغیر انسان صحت مند نہیں رہ سکتا اور اپنی تن درستی کو برقرار نہیں رکھ سکتا اور صحت اور تن درستی کے بغیر کوئی انسان کام یاب اور مسرور زندگی نہیں گزار سکتا۔ حاصلِ غور اور فکر یہ ہوا کہ طہارت کا اہتمام اور احترام کیجیے اور ہمیشہ تن درست اور صحت مند رہیے۔ صحت ایک عظیم ترین عطیۂ الٰہی ہے اور اللہ تعالیٰ یہ ہی چاہتا ہے کہ آپ اپنی صحت کی حفاظت کریں۔

Marfat.com

حفظِ صحت

اللہ تبارک وتعالیٰ کے رسولِ مقبول اور ہمارے نبی کریمؐ فخر موجودات سرورِ کائنات جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے صحت وفراغت کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے:

مَنْ اَصْبَحَ مِنْکُمْ آمِنًا فِی سِرْبِہٖ مُعَافًا فِی جَسَدِہٖ عِنْدَہٗ قُوْتُ یَوْمِہٖ فَکَاَنَّمَا حِیْزَتْ لَہُ الدُّنْیَا بِحَذَافِیْرِھَا

یعنی "تم میں سے جو شخص جسمانی اور ذہنی صحت کے ساتھ دن کی ابتدا کرے، اور اسے اس روز کی روزی مہیا ہو تو گویا اللہ کی جانب سے اسے دنیا بھر کی نعمتیں اکٹھا دے دی گئی ہیں۔"

اس ارشادِ رسولؐ کی روشنی میں یہ بات بالکل واضح ہو گئی کہ اگر صحت وعافیت اور فراغت حاصل ہے اور کھانے کا سامان موجود ہے تو انسان کو سب کچھ حاصل ہے اور یہ انسان کے لیے اللہ تعالیٰ کا سب سے بڑا عطیہ ہے۔ اب چودہ سو سال کے بعد آج عالمی ادارۂ صحت یعنی ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن نے صحت کی جو تعریف کی ہے اس کے الفاظ یہ ہیں۔

Health is a state of COMPLETE physical, mental and social wellbeing and not merely the ABSENCE of disease or infirmity.

(From the Preamble to the WHO Constitution).

یعنی: صرف بیماری یا کمزوری کی عدمِ موجودگی ہی نہیں، بلکہ مکمل جسمانی، ذہنی اور سماجی فلاح وبہبود کی حالت کا نام صحت ہے۔

عالمی ادارۂ صحت کی یہ تعریفِ صحت درحقیقت اتباع ہے قولِ رسولؐ کا کیونکہ لفظ عافیت صحتِ ذہنی پر بھی حاوی ہے اور سماجی فلاح وبہبود سامانِ غذا وخوراک کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ تو ساری دنیا کے ماہرینِ صحت نے سر جوڑ کر بیٹھ کر جو تعریف آج کی ہے ہمارے آقائے دو عالمؐ نے سب سے پہلے ہمیں یہی بات بتا دی تھی نہ صرف یہ بلکہ اس تعریفِ صحت میں درسِ عبرت وقناعت بھی دے دیا تھا اور یہ بھی ہم پر واضح کر دیا تھا کہ یہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا سب سے بڑا انعام ہے۔ دراصل صحت کی مکمل اور صحیح تعریف اس کے بغیر کی جانی ممکن نہیں ہے کہ ہم اسے تسلیم

Marfat.com

کریں کہ اللہ ہی صحت دینے والا ہے اور صحت اسی کا سب سے بڑا عطیہ ہے۔

بات پر اس طرح غور فرمائیے کہ اگر آپ صحت مند نہیں ہیں تو آپ اپنا کون سا کام ٹھیک طرح کر سکتے ہیں! فرض کیجیے کہ آپ کے دل و دماغ صحیح کام نہیں کر رہے ہیں تو آپ فلاح وفکر کا بتائیے کون سا کام اچھی طرح کر سکتے ہیں؟ اگر آپ کے جسم میں خون کم ہے تو آپ اپنی زمین میں ہل اور ٹریکٹر کیسے چلائیں گے؟ اگر آپ کی قوتیں ضعیف ہیں تو کیسے آپ پاکستان کی تعمیر و ترقی میں حصہ لیں گے؟

سچ یہ ہے کہ صحت کے بغیر آپ کوئی کام نہیں کر سکتے۔

اس صورتِ حال کی روشنی میں ہر انسان کا سب سے پہلا کام صرف یہی ہو سکتا ہے کہ وہ منشائے الٰہی کی تعمیل میں اپنی صحت کی حفاظت کرے اور اسے قائم و دائم رکھنے کے لیے فطرت کے مقررہ اصولوں پر عمل کرے۔ فطرت کے خلاف جنگ کر کے انسان صحت و عافیت کے ساتھ نہیں رہ سکتا۔ مثلاً اگر آپ رات کو سونے کے بجائے جاگتے ہیں اور دن کو جاگنے کے بجائے سوتے ہیں تو آپ کا یہ فعل منشائے فطرت کے خلاف ہے۔ قرآنِ مجید و فرقانِ حمید نے یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ:

وَجَعَلْنَا الَّيْلَ لِبَاسًا ۙ وَّجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا ۝ صلے ج (النبأ: ۱۰-۱۱)

یعنی: "ہم نے بنایا تمہارے لیے نیند کو سامانِ راحت اور اسی طرح دن کو سامانِ حصولِ معیشت۔"

اور ابتدائے اسلام میں حضرت شارعِ اسلام علیہ التحیہ والسلام کو، جب کہ آپ رات کا زیادہ حصہ بیداری اور عبادتِ الٰہی میں صرف فرماتے تھے، حق تعالیٰ جلّ شانہٗ نے تاکیدی حکم دیا کہ:

"آپ مناسب وقت تک ضرور سویا کریں۔ بے شک رات کا جاگنا نفس کو قابو میں لانے کا بہترین ذریعہ ہے، لیکن اگر آپ طول دیں گے اور تھکن سے خود کو چور کر لیں گے (یعنی اپنی صحت خراب کر لیں گے) تو دن کے کام اور دنیا کی ہدایت سے متعلق مہماتِ جلیلہ، جو محنت کی طالب ہیں کیسے انجام پائیں گی!"

یہ تاکید قرآنِ پاک کی سورۂ مزمّل میں اس طرح ہے:

يٰٓاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ۙ قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا ۙ نِّصْفَهٗٓ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا ۙ اَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا ۭ اِنَّا سَنُلْقِيْ عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيْلًا ۝ اِنَّ نَاشِئَةَ الَّيْلِ هِيَ اَشَدُّ وَطْـاً وَّاَقْوَمُ قِيْلًا ۭ اِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيْلًا ۭ

فطرت کے اصول نہایت سادہ ہیں۔ ان پر عمل کرنے کے یہ معنی ہیں کہ آپ اپنی صحت کی

Marfat.com

حفاظت کرتے ہیں۔ بعد نمازِ عشا رات کو جلد سونا، صبح فجر کی اذان سے قبل بیدار ہونا، سادہ غذا اتنی کھانا کہ جتنی جسم کو ضرورت ہے، تازہ ہوا میں سانس لینا، سورج کی روشنی جسم پر پڑنے دینا، صبح ہلکی ورزش وغیرہ یہ سب فطرت کے مقرر کردہ اصولِ صحت ہیں جن کی پابندی کر کے ہی انسان تن درست رہ سکتا ہے اور ہر انسان کو تن درست رہنا ہی چاہیے اور خود کو ہرگز ہلاکت میں نہیں ڈالنا چاہیے۔

قرآنِ مجید کا حکم ہے کہ:

لَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّھْلُکَۃِ (البقرہ: ۱۹۵)

یعنی: "اور نہ ڈالو اپنی جانوں کو ہلاکت میں"۔

قرآنِ مجید کی یہ آیت بڑے وسیع معنیٰ میں استعمال ہوئی ہے، مگر صحت کے عنوان پر اس کے معنیٰ یہی ہو سکتے ہیں کہ فطرت کے خلاف جنگ کر کے اپنی جان و صحت کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔

ہم میں سے اکثر انسان ایسے ہیں کہ تازہ ہوا کی اہمیت کو نہیں سمجھتے۔ جو لوگ دیہات میں رہتے ہیں ان کو تازہ ہوا بلا روک میسّر آجاتی ہے اور معاشی ناہمواری کے اس دور میں یہ تازہ ہوا دیہاتی بھائیوں کی صحت کو قائم رکھتی ہے، لیکن شہروں میں، بالخصوص بڑے شہروں میں، جہاں موٹروں کے انجن اور فیکٹریوں کی چمنیاں رات دن دھواں اور زہر اگلتی ہیں، شہری تازہ ہوا سے محروم رہتے ہیں۔ آج کل یہ مسئلہ بڑا سنگین ہو گیا ہے، کیوں کہ اس سے شہریوں کی صحت کو بڑا خطرہ لاحق ہو چکا ہے۔ گندگیِ ہوا کے لیے حکومت بھی غور کر رہی ہے اور مناسب اقدامات کر رہی ہے، مگر دراصل یہ فرض اب ہر شہری کا ہو گیا ہے کہ وہ ہوا کو گندہ اور خراب نہ کرے۔ اگر کسی کی موٹر خراب ہے اور دھواں دے رہی ہے تو اس کی فوراً مرمّت کرانی چاہیے، کیوں کہ موٹر کا یہ دھواں ہوا کو آلودہ کرتا ہے اور یہ آلودہ ہوا پھیپھڑوں کو خراب کرتی ہے اور خون کی سرخی کو کم کر کے انسان کو کم زور کر دیتی ہے۔ اسی طرح گرد و غبار کو دبانا ہر انسان کا فرض ہے تاکہ ہوا خراب نہ ہو۔ اسی کے ساتھ ہر شہری کو چاہیے کہ وہ بہت صبح بیدار ہو کر تازہ ہوا میں گہرے گہرے سانس لے تاکہ اس کے پھیپھڑے صاف اور خون پاک ہوتا رہے اور اس طرح منشائے الٰہی کے مطابق اس کی صحت برقرار رہے۔ دھواں اور گرد و غبار وغیرہ جس ہوا میں شریک ہوں گے وہ ضرور مضرِ صحت ہوگی۔

غذا کے بارے میں ہمارے رسولِ پاکؐ ہمیں ہدایت فرماتے ہیں کہ صاف، تازہ اور

Marfat.com

سادہ غذا کھانی چاہیے۔ دسترخوان کو سبزیوں سے آراستہ کرنے کا حکم دیتے ہیں اور یہ بھی ارشاد فرماتے ہیں کہ غذا اس وقت کھانی چھوڑ دو کہ ابھی بھوک باقی ہو۔ اس ہدایت میں سب ہی تو باتیں آگئی ہیں۔ اگر ہم اتنی ہی بات سمجھ لیں اور اس پر عمل کریں تو بیماریوں کے عذاب سے ضرور بچ سکتے ہیں۔ ضرورت سے زیادہ کھانا بہرحال مضر ہے۔ اسی طرح انواع و اقسام کے کھانے ہمیشہ کھانا بھی صحت کا ضامن نہیں ہو سکتا۔ بات سچ ہے کہ لوگ زیادہ کھانے سے بیمار ہوتے ہیں اور مرتے ہیں اور کم کھانے کی وجہ سے آفات سے محفوظ رہتے ہیں۔ یہ باتیں ان کے لیے ہیں جن کو کھانے کو میسّر ہے، مگر ہمارے ملک میں لاتعداد انسان بھوک اور افلاس کا شکار ہیں اور اس وجہ سے ان کی صحت تباہ ہے اور وہ امراض و آفات کی گرفت میں ہیں۔ یہ معاشی ناہمواری کی بدترین کیفیت ہے۔ اس مسئلے کا حل ان ہی کو نکالنا چاہیے کہ جن کو کھانے کو اتنا میسّر ہے کہ وہ کھا کھا کر بیمار ہو رہے ہیں۔

یہ ماہِ رمضان ہے۔ ایک دو باتیں یہاں اور کہہ دیتا ہوں۔ جب آپ روزہ رکھیں تو آپ کو یقین ہونا چاہیے کہ اسلامی روزہ نہ صرف طبّی فوائد کا حامل ہے، بلکہ روحانی اقدار کا بھی۔ آپ خیال رکھیں کہ رمضان المبارک میں آپ کی غذا معمول سے بڑھ نہ جائے۔ اور ایسا نہ ہو کہ افطار و سحر پُرتکلف دعوتوں کا منظر پیش کرنے لگیں۔ اگر ایسا ہوا تو نہ صرف یہ کہ آپ کو روزے کا کوئی طبّی فائدہ حاصل نہ ہوگا، بلکہ آپ روزے کے روحانی فوائد سے بھی یکسر محروم رہ جائیں گے۔ کیوں کہ روزہ تقلیلِ غذا کا نام ہے۔ روزہ اس کا نام نہیں ہے کہ آپ اپنے کام و دہن کو مرغوب و لذیذ غذاؤں سے آشنا ہونے کا موقع دیں، اپنے معدے کو ایسی غذاؤں سے بھر لیں جن کو وہ ہضم نہ کر سکے۔ روزہ کا مفہوم یہ بھی ہے کہ آپ جب غذا کو ہاتھ لگائیں تو ان لاتعداد انسانوں کے حال پر غور کریں کہ جو سحر و افطار کے بغیر حکمِ خدا اور رسولؐ پر عمل پیرا ہیں۔

Marfat.com

صحت اور تن دُرستی

صحت وتن درستی اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمتوں میں سے ہے۔ صحت کی حفاظت کرنا اس نعمت پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کے مترادف ہے۔ انسان جس چیز کی قدر کرتا ہے وہ اس کا اور زیادہ مستحق قرار پاتا ہے اور اس سے محروم نہیں ہوتا۔ ناقدری ایک طرح کی ناشکری ہے۔ صحت کی قدر نہ کرنا، اس کو کھو دینے کی کوشش کرنا اور بیماری کو دعوت دینا ہے۔

جسم اور ذہن و روح میں بڑا گہرا تعلق ہے۔ جسم اگر صحت مند نہیں ہو تو ذہن بھی صحیح کام کے قابل نہیں ہوتا اور روحانی افعال کی انجام دہی مشکل ہوتی ہے۔ جسم اگر پاک صاف نہ ہو تو روح بھی پاکیزگی سے محروم رہے گی صحت کے بغیر انسان کسی قسم کے افعال و اعمال پر قادر نہیں ہوتا، چاہے وہ جسمانی ہوں یا روحانی۔

زندگی صحت سے عبارت ہے۔ صحت کی حفاظت ذاتی افادیت بھی رکھتی ہے اور قومی اہمیت بھی۔ افراد کا مجموعہ قوم کہلاتا ہے، فرد کی صحت اچھی ہوگی تو قوم بھی صحت مند ہوگی حفظِ صحت کی اسی اہمیت کے پیشِ نظر قومی ضروریات کے لیے صحت کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ صحت مند قومیں کشمکشِ حیات میں کامیاب ہوتی ہیں اور اپنی جسمانی و ذہنی قوتوں کو یکسوئی کے ساتھ تعمیر و ترقی میں صرف کر سکتی ہیں، بیمار اور کمزور قومیں نہ اپنی خوشحالی کے لیے محنت و مشقت کر سکتی ہیں اور نہ بیرونی دشمن سے مقابلہ کر کے اپنے ملک کا دفاع کر سکتی ہیں۔

مسلمان زمین پر اللہ تعالیٰ کے نائب ہیں اس نیابت اور خلافت کی عظیم ذمّے داری سے عہدہ برآ ہونے کے لیے صلاحیت و طاقت کی ضرورت ہے۔ اسلام ایک انقلاب آفریں مذہب ہے۔ اس نے ہر گوشۂ زندگی میں انقلاب پیدا کیا ہے۔ جس زمانے میں لوگ مظاہر پرستی کے عادی تھے، بت پرستی کو اپنا شعار بنائے ہوئے تھے، کئی کئی خداؤں کو پوجتے تھے، اس وقت اسلام نے توحید کا درس دیا۔ جس زمانے میں غسل کرنا، صاف رہنا، ناخن ترشوانا اور طہارت و پاکیزگی کے دوسرے لوازم بعض مذاہب کے نزدیک جرم تھے، اسلام نے پاکی، طہارت اور صفائی کا حکم دیا۔ قرآن پاک کو وہی ہاتھ لگا سکتے ہیں جو پاک و صاف ہوں۔ ہر شخص جانتا ہے

Marfat.com

کہ قرآن امت مسلمہ کا دستورِ حیات اور آئینِ زندگی ہے۔ اسے پڑھنا، اس کی تلاوت اس کی ورق گردانی کرنا، اس کی سورتوں اور آیتوں سے استفادہ کرنا ہر مسلمان کے لیے ضروری اور فرض ہے۔ یہ ضرورت اس وقت تک پوری نہیں ہو سکتی جب تک کہ ہم پاک اور طاہر نہ ہوں۔ ایک موقع پر فرمایا گیا ہے کہ خدائے بزرگ و برتر ان لوگوں کو پسند فرماتا ہے جو طاہر ہوں۔

اسلام کی ایک یگانہ خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس نے ہر نیک اور اچھے کام کو عبادت قرار دیا۔ راستے کو جھاڑ جھنکار سے صاف کر دینا، ناپاکی اور نجاست کو دور کرنا، غلاظت اور کوڑے کرکٹ سے نہ صرف خود دامن بچانا بلکہ دوسروں کے لیے بھی یہی چاہنا اور اس سلسلہ میں امکانی مدد دینا، یہ سب نیک اور اچھے کام ہیں، اس لیے بلاشبہ یہ عبادت کے ذیل میں آتے ہیں۔ اسلام ہر نیک اور ہر اچھے کام کی حوصلہ افزائی کرتا ہے اور انسانی زندگی کی بقا کے لیے ہر کوشش کو مستحسن قرار دیتا ہے۔ زندگی کی بقا اور اس کی کامیابی صحت کے قائم رکھنے میں ہے۔

حفظِ صحت کا نہایت اہم اور بنیادی اصول صفائی ہے۔ اور صفائی اور پاکیزگی کی اہمیت اسلام میں واضح ہے عبادات کا پابند مسلمان ناپاک نہیں رہ سکتا۔ اسلام نے صفائی کے احکام بڑی تفصیل کے ساتھ دیے ہیں اور پیدائش سے لے کر موت تک ہر مرحلے پر، ہر کام میں صفائی اور طہارت کے اصول مقرر کر دیے ہیں۔ ہر بچہ جانتا ہے کہ نماز کے لیے روزانہ پانچ وقت وہ تمام اعضا دھونے پڑتے ہیں جو بیرونی فضا اور گرد و غبار سے متاثر اور آلودہ ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ آنکھ ناک، کان اور گلا بھی خوب صاف کرنا پڑتا ہے۔ ان تمام اعضا کو اس طرح دھونا پڑتا ہے کہ کوئی آلودگی نہ رہ جائے۔ سرکارِ دو عالم ؐ کا ارشاد ہے کہ وضو پورے طور پر کرنا چاہیے۔ اور پوری طرح وضو کرنے سے اعضا کا پانی سے چپڑ لینا مراد نہیں ہے بلکہ اچھی طرح صفائی مقصود ہے۔ اسلام میں صفائی کے احکام پر اتنا زور اس لیے دیا گیا ہے کہ ذرا سی بے پروائی بڑھتے بڑھتے بالکل ہی بے نیازی بن جاتی ہے اور پھر صفائی و پاکیزگی کا خیال بالکل ہی نظر انداز ہو جاتا ہے۔

حفظِ صحت کا تعلق صرف ذاتی صحت ہی سے نہیں ہے بلکہ معاشرے، ملکی اقتصادیات، قومی تہذیب، اجتماعی طرزِ زندگی، رہن سہن اور طریقِ معاشرت سے بھی ہے اور یہ تمام عوامل انفرادی اور قومی صحت پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

حفظِ صحت کے اصول نہایت سادہ اور آسان ہیں، لیکن ایک طرف تو انسان کی سہل انگاری اور دوسری جانب موجودہ زندگی کا پیچیدہ نظام ان اصولوں سے انسان کو بیگانہ کر دیتا

Marfat.com

ہے۔ مثال کے طور پر زندگی اور صحت کے لیے سب سے زیادہ ضروری چیز پاک و صاف اور تازہ ہوا ہے اور ہوا اللہ تعالیٰ کی ان نعمتوں میں سے ہے جو عام ہیں اور جن کی کوئی قیمت نہیں لیکن صنعتی ترقی نے انسان کے لیے تازہ ہوا سے استفادہ مشکل بنا دیا ہے۔ اس کے باوجود ہم چاہیں تو ذرا سی توجہ سے تازہ ہوا سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ تازہ ہوا کا ٹانک قدرت کی طرف سے بالکل مفت مہیا ہے۔ ضرورت ہے کہ ہم اس کی اہمیت کو محسوس کریں۔ اپنے مشاغل اور مصروفیات میں سے تھوڑا سا وقت کھلی ہوا میں چہل قدمی اور ہلکی سی ورزش کے لیے نکال کر ہم یہ نعمت بآسانی حاصل کر سکتے ہیں۔ اسی کے ساتھ یہ بھی بہت ضروری ہے کہ ہم سانس لینے کا صحیح طریقہ سیکھیں۔ طویل اور گہرے سانس صحت کے لیے بے حد ضروری ہیں۔ مصروفیت کی زیادتی اور کاموں میں انہماک کی بنا پر بہت سے لوگ مختصر سانس لینے کے عادی ہو جاتے ہیں نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آکسیجن کی رسد کم ہو جاتی ہے اور پھیپھڑوں کی ناصاف ہوا پورے طور پر خارج نہیں ہوتی۔ سانس کی آمدورفت صرف جسم میں ہوا کے داخلے سے ہی عبارت نہیں ہے بلکہ آکسیجن کا انجذاب بھی اس میں شامل ہے۔ ہوا سینے میں داخل ہو کر سینے کے جوف کو کشادہ کرتی ہے۔ اکثر اوقات لوگ سینے کے صرف اوپری حصے میں سانس لیتے ہیں خصوصاً وہ لوگ جو تنگ اور کسے ہوئے کپڑے پہنتے ہیں پوری طرح سانس نہیں لے سکتے اس طرح صرف سینے کے اوپری حصے میں سانس لینے کی وجہ سے نچلے حصے میں زہریلے مادے جمع ہو جاتے ہیں اور امراض صدر یا سینے کی بیماریوں کا امکان بڑھ جاتا ہے۔

گفتگو اور تقریر کرتے وقت بھی گہرے سانس لینا ضروری ہے۔ اس طرح آواز بھی بڑھ جاتی ہے اور بولنے میں قوت بھی کم خرچ ہوتی ہے نیز گلے میں خراش پیدا ہونے کا امکان بھی کم ہوتا ہے۔

ہوا کے بعد زندگی کے لیے دوسری اہم اور قیمتی چیز پانی ہے۔ پانی بھی اللہ تعالیٰ کی ایک عظیم نعمت اور اولین لازمۂ حیات ہے۔ پانی کے بغیر انسان کی زندگی محال ہے۔ ہمارے جسم کی ساخت میں پانی بکثرت شامل ہے۔ جسم اور کپڑوں کی صفائی پانی ہی سے بخوبی ہو سکتی ہے۔ پانی ہماری غذا کا ایک اہم جزو ہے اور جسم کے بہت سے کیمیائی افعال کے لیے ضروری ہے، پانی جسم سے سمّی فضلات کے اخراج میں معاون ہوتا ہے۔ یہ اچھا محلّل ہے۔ جسم کی ضروریات پوری کرنے اور پیاس بجھانے کے لیے صاف اور ٹھنڈے پانی سے زیادہ کوئی چیز مرغوب نہیں ہوتی۔ اتنی اہمیت کے باوجود بہت کم لوگ پانی کو صحت کے اصولوں کے مطابق

Marfat.com

استعمال کرتے اور اس کو آلودگیوں سے پاک رکھنے کا اہتمام کرتے ہیں۔ پانی کے برتنوں کو صاف رکھنا، باسی پانی استعمال نہ کرنا، پانی کو ڈھک کر رکھنا، پینے سے پہلے اچھی طرح دیکھنا ضروری ہے۔ جہاں تک ممکن ہو پانی ابال کر اور چھان کر پینا چاہیے۔ کھانے کے فوراً بعد زیادہ پانی پینے سے احتراز کرنا ضروری ہے۔ ضرورت ہو تو کھانے کے درمیان تھوڑا سا پانی پیا جاسکتا ہے۔ ہو سکے تو کھانے کے ڈیڑھ دو گھنٹے بعد پانی پییں۔ دو کھانوں کے درمیان پانی خوب پینا چاہیئے اس طریقے سے معدہ اور آنتیں صاف ہوتی ہیں اور غذا خوب ہضم ہوتی ہے۔

اچھی صحت کے لیے ہماری غذا کا بھی صحت کے اصولوں کے مطابق ہونا ضروری ہے۔ صحت بخش غذا کا مطلب محض پیٹ بھر لینا نہیں ہے، بلکہ غذا کو ضروری اجزا کا متوازن مجموعہ ہونا چاہیے اور تغذیہ بخش غذا کے انتخاب میں اپنی پسند اور زبان کے چٹخارے کو معیار بنانے کے بجائے جسم کی غذائی ضروریات کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔ چائے، کافی، اچار، چٹنی، مٹھائی، کیک، جام، جیلی اور دوسری نشاستہ دار ثقیل، دیر ہضم اور محرک غذاؤں کی کثرت معدہ اور جگر کو خراب کرتی اور آنتوں کی صحت مند حرکات کو متاثر کرتی ہے۔ ہماری غذا میں ان پانچ اجزا کا ہونا ضروری ہے: لحمیات یعنی پروٹین، روغنیات، نشاستہ دار اجزا، معدنیات اور حیاتین یا وٹامنز۔ غذا کا انتخاب اس طرح کرنا چاہیے کہ اس میں کم و بیش یہ تمام اجزا موجود ہوں اور ہفتے کے مختلف دنوں میں مختلف غذائی اشیا استعمال ہوں تاکہ ہر تغذیہ بخش جز جسم میں پہنچتا رہے۔ کھانا کھانے کے اوقات کی پابندی بھی ضروری ہے۔ غذا کے سلسلے میں مختصراً یہ ساری بات یوں کہی جاسکتی ہے کہ:

اپنی پسند کی مگر تغذیہ بخش غذا کھائیے۔

کم کھائیے۔

وقت پر کھائیے۔

اطمینان اور خوشی کے ساتھ کھائیے۔

حفظِ صحت کے ضمن میں اطبائے قدیم اور ماہرینِ جدید حرکت و سکونِ جسمانی کو بھی بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ حرکت و سکونِ جسمانی میں ورزش اور آرام دونوں شامل ہیں چاق و چوبند رہنے اور خوش و خرم زندگی گزارنے کے لیے ورزش نہایت ضروری چیز ہے، لیکن آج کل کی مصروف زندگی میں آدمی ورزش کو اکثر و بیشتر نظر انداز کر دیتا ہے اور اس کو غیر ضروری چیز سمجھ کر آج کل پر ٹالتا رہتا ہے۔ ورزش کے بغیر دورانِ خون میں کمی ہونے کے علاوہ جگر سست

Marfat.com

ہوجاتا ہے، معدہ کمزور اور ہضم خراب ہونے لگتا ہے۔ قلب بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ ورزش کی کمی طرح طرح سے جسم کو ضعیف کرتی ہے اور انسان بیماریوں کی آماج گاہ بن جاتا ہے۔ جو لوگ اپنی عمر کو کم کرنا نہیں چاہتے ان کو کسی نہ کسی طرح ورزش کے لیے وقت نکالنا چاہیے۔ پیدل چلنا یا کوئی کھیل پابندی سے کھیلنا بھی اچھی ورزش ہے۔

دوسرا پہلو آرام ہے۔ ورزش نہ کرنے کی طرح جسم پر حد سے زیادہ کام کا بار ڈالنا بھی صحت کے لیے سخت مضر ہے۔ کام کے بعد آرام ضروری ہے۔ آرام کے بغیر جسم دوبارہ کام کے قابل نہیں رہتا۔ ہوسکتا ہے کہ کام اور کامیابی کے جوش میں ابتدا آرام کی کمی محسوس نہ ہو، لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ توانائی کا ذخیرہ ختم ہونے لگتا ہے اور مدافعت کمزور پڑتی جاتی ہے۔ اس لیے عقل مندی کا تقاضا ہے کہ شروع ہی سے کام اور آرام میں توازن رکھنا چاہیے۔ آرام کا ایک بڑا حصہ نیند ہے۔ تکان دور کرنے، جسم کی بڑھی ہوئی حرارت کو کم کرنے کے لیے نیند نہایت ضروری چیز ہے۔ نیند کی مدت میں اختلاف ہے، اس کے علاوہ عمر کے فرق کے ساتھ نیند کے گھنٹوں میں بھی فرق ہوتا ہے۔ اس معاملے میں سب سے اچھا اصول یہ ہے کہ اپنی ضروریات کا خود اندازہ لگایا جائے اور اپنے علاوہ خاندانی عادت کو بھی پیشِ نظر رکھا جائے۔ بعض لوگ بہت کم سو کر بھی چاق و چوبند رہتے ہیں اور کچھ لوگوں کی نیند کے وقت میں ذرا بھی کمی ہوجائے تو وہ دن بھر بے چین اور مضمحل رہتے ہیں۔ اس لیے صحیح اندازہ لگا کر اپنی نیند کے اوقات خود ہی متعین کیجیے بطورِ اصول یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ بہت زیادہ سونا اور بہت کم سونا دونوں صحت کے لیے نقصان دہ ہیں۔

حفظِ صحت کے سلسلے میں ہوا، پانی، غذا، ورزش، آرام اور نیند کے علاوہ ماحول کی بھی بڑی اہمیت ہے۔ حفظِ صحت کی ان تمام باتوں سے زیادہ اہم بات میرے خیال میں روحانی اور اخلاقی پہلو کی بات ہے۔ صحت کے ان تمام اصولوں پر عمل کے ساتھ ساتھ خدا پر ایمان اور بھروسا بھی ضروری ہے۔ صحت اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سے ہے، اس کی قدر کرنا چاہیے اور اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ حدود میں زندگی گزارنا چاہیے۔ اس سے اطمینانِ قلب حاصل ہوتا ہے۔ اور خدا کا خوف دوسرے تمام خوفوں سے نجات دلا دیتا ہے۔ خوف صحت کا دشمن ہے۔ سکونِ قلب کی دولت اسی کو میسر ہوتی ہے جو اپنے اخلاق و کردار کو اور اپنی پوری زندگی کو اللہ اور اس کے رسول پاکؐ کے احکام کے مطابق ڈھال لیتا ہے۔ ایمان وہ طاقت ہے جو زندگی کے دشوار مرحلوں اور سخت راہوں سے انسان کو صحت و سلامتی کے ساتھ گزرنے کا حوصلہ بخشتا ہے۔

Marfat.com

صحتِ جسمانی

اسلام ایسا ہمہ گیر اور مکمل نظامِ زندگی ہے جس میں دین و دنیا کی تفریق نہیں ہے۔ اس میں فکر و اعتقاد کی درستی کے ساتھ ساتھ روح و جسم کی درستی کا بھی ضابطہ پیش کیا گیا ہے۔ جس طرح انسانی معاشرے سے فساد کا ازالہ اس کے مقاصد میں ہے، اسی طرح امراضِ انسانی کا مداوا بھی اس کی تعلیمات کا جزء ہے تاکہ انسان، اور خاص طور پر اللہ اور اس کے رسول پر ایمان رکھنے والا انسان، اگر ایک طرف افکار و عقائد کے اعتبار سے مکمل انسان ہو تو دوسری جانب صحتِ جسمانی کے لحاظ سے بھی نمونہ و مثال ہو۔ مسلم شریف کی ایک حدیث ہے: آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ایک صحت مند اور قوی مسلمان، اللہ تعالیٰ کو کمزور مسلمان سے زیادہ پسند ہے۔ انبیائے کرام علیہم السلام کو بھی اللہ تعالیٰ نے جہاں "علمِ خاص" کی دولت سے نوازا ہے وہاں جسمانی حسن و جمال، صحت و توانائی، بشاشت و انشراحِ قلب کی نعمت بھی خاص طور پر عطا فرمائی۔ قرآن مجید میں حکمرانی کی اہلیت کے لیے طالوت کے ذکر میں جن دو صفات کا ذکر بطور خاص آیا ہے، وہ یہ ہیں:

وَزَادَهُ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ ط (البقرہ: ۲۴۷)

ترجمہ: اللہ تعالیٰ نے ان کو علم اور جسم میں فراخی عطا فرمائی

اسی طرح حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کے بارے میں قرآن شریف میں ارشاد ہوا:

أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ (الفتح: ۲۹)

ترجمہ: وہ کافروں کے مقابلے میں بہت سخت ہیں۔

جیسا کہ اس آیت مبارکہ سے ظاہر ہے صحابہ کرامؓ کی تعریف یہ فرمائی گئی ہے کہ وہ کافروں کے مقابلے میں مضبوط، قوی اور سخت ہیں، چناں چہ شدت اور قوت، صحتِ جسمانی کے بغیر ممکن نہیں۔ اس آیت میں جس شدت کی طرف اشارہ ہے، اس سے معاندین

Marfat.com

اسلام کے ہر حملے کو پسپا کرنے والی جسمانی قوت اور شدت مراد ہے جو اچھی صحت کا نتیجہ ہوتی ہے۔ آئیے! اس پر غور کریں کہ اسلام میں صحت جسمانی کو کیا مقام حاصل ہے اور اس کو برقرار رکھنے نیز معیاری بنانے کے کون کون سے آداب وضوابط بتائے گئے ہیں۔

اسلام نے صحتِ انسانی کو خداوند تعالیٰ کی ان نعمتوں میں شمار کیا ہے جن کو غنیمت سمجھنے کی تاکید حدیث شریف میں آئی ہے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو نصیحت کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: پانچ چیزوں کو پانچ چیزوں سے پہلے غنیمت سمجھو، جوانی کو بڑھاپے سے پہلے، صحت کو بیماری سے پہلے، دولت مندی کو غربت سے پہلے، فرصت کو مشغولیت سے پہلے اور زندگی کو موت سے پہلے۔

صحت جسمانی کو غنیمت سمجھنے کی تاکید اس لیے آئی ہے کہ دینی جدوجہد کے ہر موڑ پر اس کی ضرورت پیش آئے گی۔ نظام حق کے قیام کے لیے جہاد ہو، ہوائے نفسانی کے خلاف جنگ ہو یا فضائل اخلاق کے حصول کے لیے مشقت کوشی ہو، ہر کام میں جسمانی صحت کی ضرورت ہوگی۔ اس لیے اس کے تحفظ سے غفلت درحقیقت اسلام کی تعلیم سے تغافل اور نعمت خداوندی کی ناشکری ہے۔

اب آئیے! ان اصولوں پر غور کیجیے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحتِ جسمانی کو قائم رکھنے اور اس کی حفاظت کے لیے ارشاد فرمائے۔

طب وسائنس خواہ کسی عہد کی ہو، اس پر متفق ہے کہ صحت کی حفاظت کے لیے صفائی بہت ضروری ہے۔ یہ صفائی جسم کی بھی ہے، خیال کی بھی ہے، لباس اور ماحول کی بھی ہے۔ اس کی اہمیت کا اندازہ حضورؐ کے اس ارشاد سے ہوتا ہے:

"اَلطُّھُوْرُ شَطْرُ الْاِیْمَانِ" طہارت جزوِ ایمان ہے۔ بعض روایتوں میں "نصف الایمان" کا لفظ بھی آیا ہے۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اسلام نے صحت کے اس بنیادی اصول کو کتنی اہمیت دی ہے۔ صفائی سے آگے بڑھ کر نزہت ولطافت کی بھی تعلیم دی گئی ہے، اس لیے کہ اس سے روح بشاش ہو کر جسم کو تازگی عطا کرتی ہے۔

سمرقندی نے ایک حدیث بیان کی ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "مسواک کرو اس کے کئی فائدے ہیں: منہ پاک وصاف ہوگا، خدا کی رضا حاصل ہوگی، فرشتوں کو فرحت ہوگی، بصارت میں جلا پیدا ہوگی، بلغم صاف ہوگا، بوئے دہن

Marfat.com

اچھی ہوگی اور آخری بات یہ ہے کہ نمازیں دونی ہو جائیں گی۔"

حفظِ صحت کے اصولوں میں غسل کو جو درجہ حاصل ہے، وہ محتاج تشریح نہیں ہے۔ اسلام نے ہر مسلمان کو تاکید کی ہے کہ وہ ہفتے میں کم از کم ایک دفعہ جمعہ کو غسل کرے، مسواک کرے اور خوشبو لگائے۔

جسم اور ماحول کی صفائی اور پاکیزگی کے بعد صحتِ جسمانی کو برقرار رکھنے میں نظامِ خور و نوش کا درجہ آتا ہے۔ نظامِ خور و نوش میں اکثر بے اعتدالیاں پُر تکلف اور پُر تعیش زندگی کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ آج مرغن غذاؤں کے استعمال نے انسانی صحت کو جس طرح تباہ و برباد کر ڈالا ہے، اس کی مثال نہیں ملتی۔ اللہ تعالیٰ نے اگرچہ نعمتیں بخشی ہیں اور حلال چیزوں کے کھانے سے کبھی نہیں روکا ہے لیکن اسراف سے منع فرمایا ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر چیز میں اعتدال اور میانہ روی کی تاکید فرمائی ہے، یہ اعتدال ہر چیز میں ہونا چاہیے۔ کھانے کے سلسلے میں اعتدال یہ ہے کہ انسان پُرخوری سے بچے۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ مومن ایک آنت میں کھاتا ہے، اور کافر سات آنتوں میں۔ چکنی اور مرغن چیزیں زیادہ استعمال نہ کرے، بلکہ غذا زود ہضم، سادہ اور مختصر ہو۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم زیادہ پتلی اور میدے کی چپاتی پسند نہ فرماتے۔ اصول حفظ صحت کا تقاضا ہے کہ جب تک بھوک نہ لگے نہ کھائیے۔ بیماری کی حالت میں پرہیز بھی کیجیے۔ یہ احکام نبوی ہیں۔ دستر خوان پر غم، غصہ، رنج اور گھبراہٹ کے ساتھ نہ بیٹھیے۔ خوش طبعی کا مظاہرہ کیجیے۔ اچھی گفتگو کیجیے۔ غصہ و غم، حسد و نفرت، بدخواہی اور ذہنی الجھنیں معدے پر بہت برا اثر ڈالتی ہیں۔ اس لیے حفظ صحت کے اصولوں میں خوش و خرم رہنے کی تاکید کی گئی ہے اور کہا گیا ہے کہ مسکراہٹ اور زندہ دلی انسان کو صحت مند رکھتی ہے۔

تعیش، تکلف، آرام طلبی، کاہلی اور نزاکت پسندی بھی جسمانی صحت کو نقصان پہنچاتی ہے۔ بلا شبہ انسان کو ضرورت کے مطابق آرام بھی کرنا چاہیے، سونا بھی چاہیے، کھانا بھی کھانا چاہیے، نفاست اور پاکیزگی بھی اختیار کرنی چاہیے لیکن ان سب چیزوں میں اعتدال ہو۔ کاہلی اور تعیش کے برخلاف اسلام مشقت طلبی، سخت کوشی اور محنت کی تعلیم دیتا ہے اور ان چیزوں کو اخلاق فاضلہ میں شمار کرتا ہے۔ عام محنت کے ساتھ ساتھ ریاضت جسمانی کی بھی تاکید کی گئی ہے۔ کیوں کہ صحت کی حفاظت اور اس کی بقا

Marfat.com

کے لیے یہ نہایت ضروری تدابیر ہیں۔ ریاضتوں میں تیر اندازی، گھڑ سواری، تیرا کی، کشتی اور دوڑ وغیرہ شامل ہیں۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ بن جبلؓ کو جب یمن کا گورنر بنا کر بھیجا تو تاکید فرمائی: معاذ اپنے آپ کو عیش کوشی سے بچاتے رکھنا، اس لیے کہ خدا کے بندے عیش کوش نہیں ہوتے۔

عزائم ہمیشہ مجاہدانہ ہونے چاہئیں اور صحت جسم کے ساتھ ساتھ ہمت و حوصلہ برقرار رکھنا چاہیے۔ عالی حوصلگی اور اولوالعزمی اچھی صحت کے نتائج میں سے ہے۔ کھانے پینے کی بے اعتدالی، راحت طلبی اور عیش کوشی، سونے، اٹھنے، بیٹھنے اور رہنے سہنے میں حفظِ صحت کے اصولوں سے بے پروائی نے آج ہمیں طرح طرح کے جسمانی اور ذہنی عوارض میں مبتلا کر دیا ہے۔

شاید ہم اس حقیقت کو نہیں سمجھتے کہ صحت جسمانی کا راز اس بات میں مضمر ہے کہ زندگی سادگی اور اعتدال کے ساتھ بسر کی جائے ان تمام چیزوں سے پرہیز کیا جائے جو مذہبی اور اخلاقی طور پر مذموم ہیں، اس لیے کہ خون میں سمّیت صرف زہریلی غذا ہی سے نہیں پیدا ہوتی ہے۔ بلکہ زہریلے اخلاق اور غیر فطری عادات سے بھی ہوتی ہے۔ صحتِ جسمانی کو نقصان صرف بیماریوں سے نہیں پہنچتا بلکہ بے اعتدالیوں سے بھی پہنچتا ہے۔

صحت کو برقرار رکھنے کے لیے ضبطِ نفس کی بھی عادت ڈالنی چاہیے۔ خواہشات و شہوات پر قابو رکھنا، اپنے دل کو اور خیال کو انتشار سے محفوظ رکھنا، نگاہوں کو آلودگی سے بچانا، دل و دماغ کو ہیجان سے پاک رکھنا یہ سب جسمانی صحت کے لیے نہایت ضروری تدابیر ہیں۔ آج ہمارا معاشرہ ہیجان انگیز مناظر و مظاہر کو اپنی رونق سمجھتا ہے۔ منشّیات اور مخدّرات کا بے تکلفانہ استعمال کر کے مذہبی اقدار سے اعراض برت کر انسان خود اپنی جسمانی صحت پر بھی ظلم کے پہاڑ توڑ رہا ہے۔

اب ہم میں نہ سحر خیزی ہے، نہ ریاضت کی عادت ہے، نہ ضبطِ نفس ہے، نہ عفتِ نگاہ ہے، نہ سکونِ قلب و دماغ ہے اس لیے کہ صحتِ جسمانی کے جو اصول ہمیں اللہ اور اس کے رسولؐ نے بتائے ہیں، ہم ان پر عمل نہیں کرتے۔ خداوند تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ التَّوَّابِينَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِينَ

ترجمہ: اللہ توبہ کرنے والوں اور پاک و صاف رہنے والوں کو پسند فرماتا ہے۔

Marfat.com

صحّت و طہارت

صحت اور تن درستی اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے۔ دین و دنیا کے سارے کام اس سے انجام پاتے ہیں۔ جو شخص اس دولت سے محروم ہوتا ہے وہ بہت سے دوسرے وسائل کے باوجود زندگی کی حقیقی لذّت اور مسرت سے بے بہرہ ہوتا ہے۔ اس کے لیے سرشاریٔ فکر و عمل کا وہ موقع نہیں رہ جاتا جو اُسے روحانی سرور عطا کر سکے۔ صحت کی نعمت سے محروم شخص اپنی ذاتی قوت و صلاحیت کے استعمال سے معاشرے کی صلاح و فلاح کے لیے خدمات انجام دینے کے قابل نہیں ہوتا۔ ایسا آدمی انفرادی دائرے میں بھی اپنی آرزوؤں اور تمناؤں کے باوجود خیر و سعادت کی دولت تک رسائی سے اپنے آپ کو قاصر پاتا ہے۔ یہ ایسی محرومی ہے جس کا اثر فرد و جماعت کے ظاہر و باطن پر یکساں مرتب ہوتا ہے۔ صحّت کا فقدان صرف جسم ہی نہیں بلکہ دل و دماغ، خیالات و افکار، اعمال و افعال سب کو متاثر کرتا ہے۔

اس لیے اسلام کی تعلیمات میں وہ ساری چیزیں وضاحت اور صراحت کے ساتھ بیان کر دی گئی ہیں جو حفظِ صحّت کے لیے ضروری ہیں۔ انسان کے شرف و کرامت کا انحصار اس بات پر ہے کہ وہ ظاہر و باطن، جسم و رُوح، فکر و ذہن ہر اعتبار سے صحت مند ہو اور اسلام جب نجاست و کثافت سے بچنے کی تاکید کرتا ہے اور طہارت و نظافت کی تلقین کرتا ہے تو جسمانی پاکیزگی اور مسکن و ملبس کی صفائی کے ساتھ ساتھ اخلاق و اعمال نیز قلب و رُوح کو بھی ہر طرح کی گندگی سے پاک رکھنے کی تاکید کرتا ہے۔

مفسرین نے قرآنی آیت "والرجز فاھجر" کی تشریح کرتے ہوئے قلب و روح کی ان تمام کثافتوں کا تذکرہ کیا ہے جن کا تعلق رذائلِ اخلاق سے ہے۔ اس جگہ ایک بات لائقِ غور ہے اور وہ یہ کہ فی الحقیقت انسان اور انسانی زندگی کے بارے میں ظاہر و باطن کی تفریق ہی نا درست ہے اس لیے کہ آدمی اگر حسنِ اخلاق سے متصف نہ ہو تو صحتِ جسمانی کے ظاہری اہتمام کے باوجود رُوحانی طمانیت اور لطف و مسرت

Marfat.com

سے محروم ہوتا ہے اور متعدد نفسی عوارض کا شکار ہو کر چند دنوں کے بعد صحت ظاہری بھی کھو بیٹھتا ہے۔ صحت اور تن درستی کی نعمت کی حفاظت اور نگہداشت ہمارے فرائض میں شامل ہے۔ اگر ہم اس فرض سے غفلت اور کوتاہی برتتے ہیں تو قرآنی تعلیمات اور سنتِ رسولؐ سے غفلت اور کوتاہی کے مرتکب ہوتے ہیں۔ ہم اللہ تعالیٰ کے سامنے اس نعمت کے ضیاع یا اس کے تحفظ سے غفلت کے لیے جواب دہ ہوں گے۔ یہ سوال بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ اسلام نے تحفظِ صحت کے کن اصولوں کی طرف ہماری رہ نمائی کی ہے اور وہ کون سے ضابطے ہیں جن کی پابندی ہمیں مکمل طور پر رُوحانی اور جسمانی صحت عطا کر سکتی ہے۔

یہ حقیقت محتاجِ بیان نہیں ہے کہ اسلام اپنی تعلیمات میں اجمال و تفصیل دونوں سے حسبِ ضرورت کام لیتا ہے اور بعض اوقات ایسے جامع اصول بنانے پر اکتفا کرتا ہے جن کی شرح اور جن کا اطلاق ہر صاحبِ فکر و نظر آسانی کے ساتھ اپنے حالات پر کر سکتا ہے۔ صحت اور اچھی زندگی گزارنے کے سلسلے میں اسلام کی تعلیمات پر بامعان نظر غور کر لے سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ تازہ اور صاف ہوا میں سانس لینا، رہنے سہنے کی جگہوں میں تازہ ہوا کو بلا روک ٹوک آنے جانے دینا، سورج کی اوّلین شعاعوں کا اپنے جسم پر پڑنے دینا، مناسب اور متوازن غذا صحیح وقت پر اطمینان سے کھانا، تازہ اور صاف پانی پینا، بعد عشا رات کو جلد سونا اور صبح نمازِ فجر سے قبل بیدار ہونا، بہ قدر مناسب ورزش کرنا، غسل کرنا اور اپنے جسم کو پاک و صاف رکھنا بھی یقیناً اسلامی تعلیمات میں داخل ہے اور ان ضابطوں کی پابندی اس بات کی قطعی ضمانت ہے کہ آپ کو دواؤں کے غلط اور ضروری استعمال دونوں سے نجات حاصل رہے گی۔

ان تفصیلات سے گزر کر جب ہم اسلامی تعلیمات میں حفظِ صحت کے کسی جامع اصول کی تلاش و جستجو کرتے ہیں تو ہمیں تزکیہ اور طہارت کے الفاظ ملتے ہیں جو اپنے اندر بڑی وسعت اور معنویت رکھتے ہیں۔ بلا خوفِ تردید یہ کہا جا سکتا ہے کہ اسلامی تعلیمات کا امتیاز یہ ہے کہ ان میں صحت اور طہارت کو باہم دگر مربوط کر دیا گیا ہے اور دونوں کو لازم و ملزوم قرار دیا گیا ہے۔ طہارت، صفائی اور پاکی کی تعلیم قرآن و حدیث دونوں میں یکساں اہمیت کے ساتھ دی گئی ہے اور یہی اہمیت اس غور و فکر کا تقاضا کرتی ہے کہ کیا طہارت سے صرف جسمانی صفائی مراد ہے اور کیا صحت مند اور تن درست رہنے کے لیے یہی کافی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ طہارت سے مراد پاکیزگیِ فکر و خیال بھی ہے۔ اصول اور کلیے کے طور پر

Marfat.com

اس کی توضیح اس طرح کی جا سکتی ہے کہ ہر وہ چیز جو انسان کے حواس اور قویٰ پر خوش گوار یا ناگوار اثر ڈالے اس سے صحت کا متاثر ہونا ایک لازمی امر ہے۔

حقیقی اور مکمل طہارت میں جسم اور رُوح نیز فکر اور عمل سب کی پاکی ضروری ہے۔ انسان کے شرف اور برتری کا راز اسی طہارت میں مضمر ہے اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے "الطہور شطر الایمان" کے ذریعہ سے اس کی اہمیت واضح کر دی ہے۔ اگر اس کا تعلق قلب، فکر اور ذہن سے نہ ہوتا اور صرف ظاہری پاکیزگی اور صفائی مراد ہوتی تو اسے نصف ایمان نہ کہا جاتا۔

بہرحال اسلام میں حفظِ صحت کے اصولوں میں طہارت کو اپنی وسیع معنویت کے ساتھ بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ اس لیے قرآنِ حکیم میں اللہ تبارک و تعالیٰ صفائی کے باب میں عام انسانوں کو نہیں بلکہ براہِ راست جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب فرماتا ہے۔ سورۂ مدثر میں ارشاد ہوتا ہے:

وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ ...... (المدثر: ۴)

یعنی "اے نبی اپنے کپڑے پاک رکھیے۔"

خود اپنے بارے میں اللہ تبارک و تعالیٰ فرماتا ہے:

إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ التَّوَّابِينَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِينَ ○ (البقرہ: ۲۲۲)

یعنی "اللہ توبہ کرنے والوں اور پاک صاف رہنے والوں کو پسند فرماتا ہے اور ان سے محبت کرتا ہے۔"

اس تمام گفت گو کے بعد ذہن صرف اس نتیجے پر پہنچ سکتا ہے کہ صحت اور تن درستی کی برقراری کے لیے جسم کی اور ماحول کی صفائی اور پاکی قطعی ضروری ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی بقائے صحت اور قیامِ تن درستی کے لیے یہ بھی لازمی ہے کہ انسان اپنے قلب کو صاف رکھے، اپنی فکر و نظر کو پاک رکھے اور اخلاق کی بلندیوں کو حاصل کرنے میں کوشاں رہے کہ طہارت کا اعلیٰ تر مفہوم اسی طرح پُورا ہو سکتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ طہارت کے بغیر انسان صحت مند نہیں رہ سکتا، اپنی تن درستی کو برقرار نہیں رکھ سکتا اور صحت اور تن درستی کے بغیر کوئی انسان کام یاب اور پُر مسرت زندگی نہیں گزار سکتا۔

مطالعۂ قرآنِ کریم کے دوران ایک آیت ایسی آتی ہے جہاں ہماری فکر و نظر خاص طور پر مرتکز ہو جاتی ہے۔ اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ طہارت کے سلسلے میں اسلام کی بنیادی تعلیمات پر اس نہج سے غور کرنا زیادہ مناسب ہوگا۔

Marfat.com

قرآن حکیم ایمان باللہ اور ایمان بالرسالت کے تقاضوں کے مطابق اعمال کو عملِ صالحہ سے تعبیر کرتا ہے، ایک مومنِ کامل کی زندگی کے مختلف نام ہو سکتے تھے، مگر ایمان کے سانچے میں ڈھل جانے والی زندگی کے سارے حرکات و سکنات کے لیے قرآن نے صرف ایک لفظ استعمال کیا اور وہ ہے "عملِ صالح"۔ گویا ایک مومن کی پوری زندگی عملِ صالح ہے اور یہ اصول جس طرح فرد کی زندگی پر حاوی ہے اسی طرح معاشرے کی زندگی پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ یہ حقیقت قرآنِ حکیم کی اس آیت سے ظاہر ہوتی ہے:

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً ج (النحل: ۹۷)

یعنی "مرد ہو یا عورت جو بھی ایمان اور عملِ صالح کے تقاضوں کی تکمیل کرے گا ہم اسے حیاتِ طیبہ عطا کریں گے۔"

اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ مومن مردوں اور مومن عورتوں سے ہے اور اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ یہ بشارت پورے مسلم معاشرے کے لیے ہے۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ طہارت کا اہتمام صرف فرد ہی کو نہیں سارے معاشرے کو کرنا ہے۔ عورت اور مرد دونوں کو مخاطب کرنے کا راز ہی یہ ہے کہ حیاتِ طیبہ کے وعدے میں اجتماعیت ہے۔ ہر فرد کا یہ فرض ہوتا ہے کہ وہ اسلامی تعلیمات کی روشنی میں اپنے آپ کو ہر طرح کی آلائش سے محفوظ رکھے تاکہ غیر ایمانی زندگی اور عمل سوء کے نتیجے میں معاشرہ آلودگی سے محفوظ رہ سکے اور حیاتِ طیبہ کی فضا پیدا ہو سکے۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب ہم یہ حقیقت سمجھ لیں کہ ایمان اور عملِ صالح ہر طرح کی آلودگی کے خلاف، چاہے وہ جس طرح پر بھی ہو، اعلانِ جنگ کا نام ہے۔ غیر طاہر، آلودہ اور کثیف زندگی پر نہ عملِ صالح کا اطلاق ہو سکتا ہے نہ اسے حیاتِ طیبہ نصیب ہو سکتی ہے اس لیے کہ عملِ صالح کوئی جزوی حقیقت نہیں ہے بلکہ کلی حقیقت ہے جو ایمان کے نتیجے میں ظہور پذیر ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ یہی چاہتا ہے کہ ایمان کے کسی بھی تقاضے سے مومن کبھی غافل نہ رہیں۔

ہماری کوتاہیاں اور غفلتیں ہمیں اعمالِ صالحہ کی بلند منزل تک پہنچنے سے باز رکھ سکتی ہیں، ہمارے اندر ایمانی ضعف اور نقص پیدا کر سکتی ہیں ہمیں اخلاقی، روحانی اور جسمانی کثافتوں میں مبتلا کر کے ہم کو اور پورے معاشرے کو متعفن بنا سکتی ہیں۔ اسی لیے قرآن کریم نے عورتوں اور مردوں یعنی پورے معاشرے کو ایمان و عملِ صالح کی ترغیب دے کر حیاتِ طیبہ کا وعدہ فرمایا اور واشگاف الفاظ میں اس حقیقت کا اعلان کر دیا: قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى۔ یعنی: "جس نے پاکیزگی اختیار کی اس نے فلاح پائی۔"

اللہ تعالیٰ ہمیں اور تمام مسلمانوں کو ہر طرح کی آلودگی اور کثافت سے محفوظ رکھے۔ پاک، صاف، طاہر، نظیف اور طیّب زندگی بخشے۔

Marfat.com

پاکیزگی اور صحت

اگر ہم تعلیماتِ اسلام پر ایک غائر اور گہری نگاہ ڈالیں اور اسلامی عبادات پر غور کریں تو ہمیں ایک بیّن اور ایک بہت واضح چیز جو نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ اسلام پاکیزگی، طہارت اور صفائی کو بڑی اہمیت دیتا ہے اور اس کی بڑی ہی تاکید کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کی ایک خصوصیت جس میں وہ بالکل یکتا اور منفرد ہیں، یہ ہے کہ جس ملک میں وہ پہنچے، جس خطۂ ارض پر انھوں نے اپنا پرچم کشور کشائی لہرایا، جس سرزمین کو اپنے یُمنِ قدم سے انھوں نے سعادت بخشی، وہاں سب سے پہلے کام یہ کیا کہ اسے گل وگلزار بنادیا۔ اپنی رعایا کی فلاح و آسائش اور صحت و توانائی کے لیے انھوں نے تمام وسائل صرف کر دیے اور اُسے ایک نئی زندگی سے آشنا کر دیا۔ بے شک مسلمانوں نے علم بھی پھیلایا، تہذیب و تمدن کو بھی رواج دیا، اصلاحِ معاشرہ کے فرائض بھی حسن و خوبی کے ساتھ انجام دیے، تخلیق و تعمیر کی نعمتوں سے بھی مالامال کیا۔ بہت کچھ کیا، بلکہ سب کچھ کیا۔ لیکن ان تمام کارناموں سے بالا و بلند مسلمانوں کا یہ عظیم و جلیل کارنامہ ہے کہ انھوں نے اپنے زیرنگین علاقوں میں اور ملکوں میں صفائی، پاکیزگی اور صحت و تن درستی کا اہتمام کیا کہ وہاں کی کایا پلٹ گئی۔ تاریخ کے اوراق مسلمانوں کے ان کارناموں سے مزیّن ہیں۔ اگر یہ کہا جائے تو بالکل صحیح ہوگا اور بجا کہ پاکیزگی اور صفائی کے تخیّل سے اہلِ دنیا ناواقف تھے، اسلام نے دنیا کو یہ سبق دیا۔

قرآنِ مجید و فرقانِ حمید پاکیزگی اور صفائی کا درس دیتا ہے۔ درحقیقت یہ قانونِ خدا ہے کہ مومن صاف ستھرا، پاکیزہ اور مطہّر رہے۔ اس بات کو قرآن کریم نے یہ کہہ کر بالکل واضح کر دیا ہے کہ:

فَاطَّهَّرُوْا یعنی: "پاک صاف رہو" (المائدہ: ۶)

وَاللّٰهُ یُحِبُّ الْمُطَّهِّرِیْنَ یعنی: "اللہ پاک صاف لوگوں کو پسند کرتا ہے۔" (التوبہ: ۱۰۸)

ان آیات میں ایک طرف حکم ہے کہ فَاطَّهَّرُوْا یعنی پاکی حاصل کرو اور دوسری

Marfat.com

طرف یہ مژدہ ہے کہ خدا پاک صاف لوگوں کو پسند فرماتا ہے۔ مسلمانوں کے لیے حکمِ خداوندی بہر حال واجب التعمیل ہے، وہ اس سے ہرگز رُوگردانی نہیں کر سکتے۔ چناں چہ پاکیزگی اور صفائی ان کی زندگی کا جزو بن گئی اور اُن کی فتح و نصرت کا سبب اور اُن کی کامیابیوں اور کامرانیوں کی وجہ بنی۔

اوّلین احکام جو جنابِ رسولُ اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم پر نازل ہوئے اُن میں سے ایک حکم یہ تھا۔

وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ ۝ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ

"اے نبی! اپنے کپڑے پاک رکھو اور گندگی سے بچو!"

صفائی اور پاکیزگی کا پیغام حضورؐ نے پوری امت، بلکہ پوری انسانیت تک پہنچا دیا اور ارشاد فرمایا:

اَلطُّهُوْرُ شَطْرُ الْاِيْمَانِ (مسلم)

"پاکیزگی نصف ایمان ہے۔"

اسلام میں پاکیزگی کی دو قسمیں ہیں: ایک روح کی پاکیزگی۔ روح کی پاکیزگی کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو تمام برائیوں سے پاک صاف رکھے۔ روح کی ناپاکیاں اور نجاستیں وہ بداخلاقیاں اور برائیاں ہیں جن کے اختیار کرنے سے انسان کی روح گندی اور میلی ہوتی ہے۔ رُوح کی پاکیزگی کا طریقہ یہ ہے کہ انسان ہر برائی اور گناہ سے منھ موڑ کر اپنے آپ کو اچھی عادتوں اور اچھے اخلاق سے سنوارے۔ جس قدر بھی انسان گناہوں اور برائیوں سے بچے گا اُسی قدر اُس کی روح پاک صاف اور ستھری ہوتی چلی جائے گی۔ رُوح کی پاکیزگی کا اثر جسم کی پاکیزگی پر بھی پڑتا ہے۔

دوسری پاکیزگی جسم کی پاکیزگی ہے۔ جسم کی پاکیزگی کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنے جسم کو ظاہری ناپاکیوں سے پاک صاف رکھے، گندہ اور میلا نہ ہونے دے، مثلاً غسل ہی کو لیجیے۔ صحت مندی، تازگی اور صفائی کے یہ تقاضے ہیں کہ انسان روزانہ غسل کرے۔ اور اگر پانی کی قلت یا اور کسی دوسری وجہ سے یہ ممکن نہ ہو تو ہفتے میں ایک روز جمعہ کی نماز کے لیے اس کا اہتمام ضروری ہے۔ پھر اسلام نے ہمیں یہ بھی درس دیا ہے کہ ہم دانتوں کو صاف رکھنے کے لیے پابندی سے مسواک کریں، کیوں کہ پیٹ کی بیسیوں بیماریاں دانتوں کے میل کچیل سے پیدا ہوتی ہیں۔ رسولِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا اگر مجھے اُمت کی

Marfat.com

تکلیف کا خیال نہ ہوتا تو میں مسواک کرنا ہر مومن پر فرض قرار دیتا۔

انسان کا لباس بھی جسم کی پاکیزگی اور صفائی ستھرائی کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ اسلام اگرچہ لباس میں شان و شکوہ، اسرافِ بے جا اور تکلّف کو پسند نہیں کرتا، لیکن لباس میں صفائی ستھرائی اور پاکیزگی کا مطالبہ ضرور کرتا ہے۔

ظاہری شکل و صورت کو بھی قرینے سے رکھنے کی اسلام تاکید کرتا ہے کیوں کہ یہ بات بھی پاکیزگی اور صفائی کے ضمن میں آتی ہے۔ اسلام اس کو پسند نہیں کرتا کہ کوئی آدمی اپنی شکل وحشیوں کی سی بنائے ہوئے میلا کچیلا بدن رکھے، بے تکے بال بڑھائے ہوئے پھرے۔ چناں چہ رسولِ اکرمؐ نے ارشاد فرمایا:

اِنَّ اللّٰہَ یُبْغِضُ الْوَسَخَ وَالشَّعَثَ (ترمذی)

"خدا تعالیٰ میلا کچیلا بدن اور بکھرے بال پسند نہیں فرماتا۔"

ناخنوں کے ذریعہ سے بھی بہت سی غلاظت کھانے کے ساتھ پیٹ کے اندر جاکر بہت سی معدے کی بیماریاں پیدا کرتی ہے اور ویسے بھی وحشیوں کی طرح ناخن بڑھائے ہوئے آدمی اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ رسولِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے جن دس چیزوں کو پیغمبر کی سنّت قرار دیا ہے ان میں ایک ناخنوں کا ترشنا بھی ہے۔

جسم اور رُوح کی پاکیزگی اور صفائی کے ساتھ اسلام اس ماحول کی پاکیزگی اور صفائی ستھرائی کا بھی مطالبہ کرتا ہے جس میں انسان رہتا ہے، مثلاً جس گھر میں وہ رہتا ہے اسے صاف ستھرا رکھے اور ہر ایسی چیز سے پرہیز کرے کہ جسے دیکھ کر دوسروں کو کراہیت آتی ہو یا تکلیف پہنچنے کا اندیشہ ہو، مثلاً بعض لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ وہ گھر کا کوڑا کرکٹ صاف کرکے اپنے دروازے کے سامنے سڑک پر یا گلی میں ڈال دیتے ہیں۔ اس سے ایک تو خود اُن کے گھر والوں کا پھوہڑپن ظاہر ہوتا ہے، دوسرے راہ چلنے والوں کو ان کے اس عمل سے تکلیف ہوتی ہے۔ اسی طرح راستوں میں تھوکنا، بار بار ناک میں انگلیاں ڈال کر میل نکالنا، سایہ دار درختوں کے نیچے گزرگاہوں میں پیشاب کرنا، یہ سب چیزیں صاف ستھرے ماحول کو متاثر کرتی ہیں۔ اسلام ان سب باتوں کو طہارت اور تہذیب کے خلاف قرار دیتا ہے۔

کون ہے جسے اپنی زندگی عزیز نہ ہو، جو صحت و تن درستی کا جویا نہ ہو، جو طویل عمر کا متمنّی نہ ہو، جس کے نہاں خانۂ قلب میں یہ آرزو نہ ہو کہ جب تک زندہ رہے کسی پر

Marfat.com

بار نہ بنے، ہاتھ پاؤں کام آتے رہیں، دماغ آنکھ اور زبان سلامت رہے! یہ سب کی آرزو ہے، ہر فرد اور ہر شخص کی تمنا ہے۔ لیکن کام صرف آرزوؤں سے نہیں بنا کرتے۔ اس کو بروئے کار لانے کے لیے یقینِ محکم اور عمل پیہم کی ضرورت ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ برف کو انگارہ سمجھ لیا جائے اور انگارہ برف کی صورت اختیار کر لے۔ اگر برف کی ضرورت ہے تو اُسے پیدا کرنے کے لیے وہی اسباب اور وسائل پیدا کرنے ہوں گے جو اُس کو پیدا کر سکیں۔ اگر آگ جلانی ہے تو برف کے دو ٹکڑے رگڑ کر نہیں جلائی جا سکتی۔ اس کے لیے چقماق ضروری ہے۔ غرض کوئی کام بھی ہو وہ اسی وقت انجام پا سکتا ہے کہ جب صحیح طور سے اُس کے اسباب اور وسائل بہم پہنچ جائیں۔

پس اگر صحت مند زندگی بسر کرنا مقصود ہے تو ضروری اور لابُدی ہے کہ سب سے پہلے حفظِ صحت کے اصولوں کو جانا جائے اور دیانت کے ساتھ اُن پر عمل کیا جائے یہ کیوں کر ممکن ہے کہ بد پرہیزی کا سلسلہ جاری رہے، صحت کو تباہ و برباد کرنے والی عادتوں سے پیچھا نہ چھڑایا جائے، ان تمام اصولوں کو نظر انداز کیا جائے جو صحت و تن درستی قائم رکھنے میں ممد و معاون ہوتے ہیں، ان تمام عادتوں کو اختیار کر لیا جائے جن سے صحت بگڑتی، زندگی کم ہوتی اور بیماری قابو پاتی ہے۔ اور پھر توقع کی جائے کہ ہم امر ہیں۔ مرض دوسروں کے لیے ہیں، عافیت اور صحت ہمارا حصہ ہے، کوئی بیماری ہمارے قریب بھی نہیں پھٹک سکتی۔ یہ محض خوش فہمی، بلکہ زیادہ صحیح الفاظ میں خود فریبی ہے۔ جس طرح دو اور دو چار ہوتے ہیں ٹھیک اسی طرح انسان کا کردار اور اس کا عمل اس کے مستقبل کی سلامتی یا بربادی کا غماز اور ثمرہ ہوتا ہے۔

مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں "خیرِ امت" کے خطاب سے نوازا ہے اور انھیں معروف کا حکم دینے اور منکر سے روکنے کا فریضہ سونپا گیا ہے۔ کیا یہ فریضہ کوئی ایسی قوم یا جماعت انجام دے سکتی ہے جو نحیف و ضعیف ہو، جس کی صحت خراب ہو، جو زمانے کے مصائب برداشت کرنے کی ہمت نہ رکھتی ہو؟ اس سوال کا جواب نفی میں ہی دیا جا سکتا ہے۔ پھر اگر ہم واقعی "خیرِ امت" بننا چاہتے ہیں اور وہ فرائض ادا کرنا چاہتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہم پر عائد ہوتے ہیں تو ہمیں مضبوط، توانا اور طاقت ور بننا چاہیے۔ طاقت و توانائی حاصل کرنے کے لیے ضروری اور بہت ضروری ہے کہ ہماری صحت قابلِ رشک ہو۔

Marfat.com

صفائی اور پاکیزگی

اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہر انسان کو ایک فطرت پر پیدا فرمایا ہے، اور ہر انسان کو ایک ضمیر عطا فرمایا ہے، ودیعت فرمایا ہے۔ دنیا کا کوئی بھی انسان ایک نیک فطرت اور ضمیر سے خالی نہیں ہے۔ اور انسان کو اللہ تعالیٰ نے عقل اور قوتِ فکر عطا فرما کر اسے کائنات کی ہر چیز اور ہر مخلوق سے برتر اور اشرف بنایا ہے۔ اس دنیا میں جہاں ہم رہتے بستے ہیں خیر و شر، خوب و ناخوب، اچھائیاں اور برائیاں موجود ہیں اور ہر انسان کو یہ قدرت بھی حاصل ہے کہ وہ خیر و شر، خوب و ناخوب اور اچھائیوں اور برائیوں میں سے کوئی ایک پسند کرلے۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ خیر و شر سے مستغنی اور بے پروا ہو کر ان دونوں سے آزاد ہو جائے۔ اگر اسے دنیا میں رہنا ہے اور زندہ رہنا ہے تو اوّل سانس سے آخر سانس تک اپنے لیے ضابطۂ حیات منتخب کرنا ہوگا۔ اسے ضرور یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ وہ خیر و خوبی کو اپنا کر حیاتِ مستعار گزارے، یا شر و فساد کو اپنائے یا دونوں کو اپنائے۔ اس قاعدۂ کلّیہ سے کوئی بھی انسان خالی و عاری نہیں ہوسکتا۔

اس دنیا میں خیر و شر دونوں موجود ہیں اور اس دنیا میں بسنے والے ہر انسان کو صحیح فطرت، ضمیر اور عقل عطا ہوئی ہے تاکہ وہ اس دنیا میں زندگی کے دن گزارنے کے لیے اپنی فطرت، ضمیر اور عقل سے کام لے کر اپنی راہ متعیّن کرسکے اور زندگی کا ایک نمونہ اختیار کرسکے۔ ہر انسان اپنی عقل سے کام لیتا ہے اور فطرت و ضمیر اس کے رہ نما بنتے ہیں۔ کچھ انسان ہیں کہ وہ خوب و ناخوب اور خیر و شر میں تمیز کی صلاحیت سے کام لے کر صرف اچھی راہ ہی اختیار کرتے ہیں اور کچھ انسان ہیں کہ وہ برائی کو پسند کرلیتے ہیں۔ اس اختیار و تمیز میں بہت سے اصول و عوامل کارفرما ہوتے ہیں، مگر ایک عنصر واضح طور پر یہ ہے کہ اُن کے سامنے کون سے رہ نما اُصول رہے ہیں اور کون سے عوامل ہیں کہ جو اُن کے دل و دماغ پر اثر انداز ہوئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس دنیا میں خیر و خوبی کے مبلّغ بھی ہیں اور شر و فساد کے داعی بھی موجود ہیں۔ دونوں کو آزادی ہے کہ انسانوں

Marfat.com

پر اپنے پرتو ڈالیں اور اپنے اثرات استعمال کریں۔ ان میں جو بھی زبردست ہوتا ہے وہی غالب آجاتا ہے اور معاشرہ اور سوسائٹی کا انداز اسی کے مطابق ہوجایا کرتا ہے۔ یہ ایک قاعدۂ کلّیہ ہے اور معاشرے کے ہر پہلو پر حاوی ہے۔ اگر اسی قاعدۂ کلّیہ کو صفائی اور پاکیزگی پر منطبق کریں تو اس میں کوئی امر مانع نہیں ہے۔ اس دنیا میں صفائی اور ناصفائی اور پاکیزگی اور گندگی دونوں موجود ہیں اور اس دنیا کا ہر انسان صفائی اور ناصفائی میں تمیز اور پاکیزگی اور گندگی میں فرق کر سکتا ہے۔ ہر انسان جانتا ہے کہ پھول کو سونگھنا چاہیے اور غلاظت کو دفع کرنا چاہیے، دور کرنا چاہیے۔ ہر انسان سمجھتا ہے کہ چہرے اور جسم کو صابن اور کھلی سے دھونا، صاف کرنا، پاک کرنا چاہیے اور غلاظت، مٹی اور گرد و غبار کو چہرے اور جسم پر ملنا نہیں چاہیے۔ ہر شخص اس کا احساس کر سکتا ہے کہ صاف پانی اور تازہ ہوا سے اُسے فرحت اور تازگی ملتی ہے اور گندے پانی اور آلودہ ہوا سے اس کا جسمانی نظام خراب و تباہ ہوجائے گا۔ ہر فرد و بشر محسوس کر سکتا اور جان سکتا ہے کہ زہر اسے ہلاک کرے گا اور تریاق اس کی حیات و جان کی حفاظت کرے گا۔ یہ ہر انسان کی فطرت ہے، یہ ہر انسان کا ضمیر ہے اور فطرت و ضمیر کی رہ نمائی کے لیے ہر انسان کے پاس عقل و فہم موجود ہے۔

اس کے باوجود جو انسان اپنے لیے یہ فیصلہ کرے کہ وہ پھول کے بجائے غلاظت کو سونگھے گا، صابن کے بجائے اپنے چہرے اور جسم پر گرد و غبار ملے گا، گندہ پانی پیے گا اور ناصاف ہوا میں سانس لے گا، ایسے شخص کے بارے میں صرف یہی رائے قائم کی جاسکتی ہے کہ ہر چند کہ اُس میں فطرت و ضمیر موجود ہے، مگر اسے عقل کی رہ نمائی نصیب نہیں ہے۔ نہ صرف یہ کہ اسے عقل کی رہ نمائی سے محرومی ہے بلکہ اس نے وہ علم حاصل نہیں کیا ہے یا وہ علم اس تک نہیں پہنچا ہے کہ جو خوب و ناخوب اور اچھے برے میں تمیز سکھاتا ہے۔

جب دنیا میں خیر و شر میں تمیز، خوب و ناخوب میں فرق اور اچھے برے میں امتیاز موجود نہ تھا، قرآنِ حکیم نازل ہوا اور کلام الٰہی لوگوں، دنیا والوں تک پہنچانے کے لیے رسولؐ بھیجے گئے۔ آسمانوں اور زمینوں کی ان دو طاقتوں نے کائناتِ ارضی کے بسنے والوں کے لیے نظم و ضبط کے ساتھ ایک نمونۂ حیات مقرر اور ایک طرزِ زندگی متعین کر دیا جس نے انسان کے مرتبے کو بلند تر کر دیا اور اُمت خیر و شر میں تمیز و امتیاز کے

Marfat.com

قابل بن گئی۔

قرآن کریم کے یہی رہ نما اُصول تھے کہ جن کی بدولت انسان نے صحت و مرض میں تمیز کر کے صحت کو اختیار کیا اور ان ہی رہ نما اصول کی بدولت صفائی اور ناصفائی اور پاکیزگی و گندگی میں تمیز پیدا کی۔ جب ہم اپنے موضوع "صفائی و پاکیزگی" پر غور کرتے ہیں تو قرآنِ حکیم یہاں ہماری بڑی واضح رہ نمائی کرتا ہے۔ قرآن حکیم میں جہاں صفائی اور پاکیزگی کا ذکر ہوتا ہے تو اس سے محض ظاہری صفائی اور پاکیزگی مراد نہیں ہوتی بلکہ اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ نفس و جسم، بدن اور ذہن، مکان و لباس، عقل و ضمیر، فکر و عمل، ارادے اور فعل اِن سب کو ہر قسم کی مادّی اور معنوی، ظاہری اور باطنی کدورتوں اور آلائشوں سے دور رکھا جائے۔

صفائی اور پاکیزگی اور قرآنِ حکیم کے الفاظ میں تزکیہ و طہارت کا مفہوم بہت وسیع ہے۔ اس کی اس وسعت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے تزکیہ و طہارت کو انبیائے کرامؑ کی بعثت کے مقاصد میں شامل فرمایا ہے اور اللہ نے خود اپنے بارے میں کئی جگہ قرآنِ حکیم میں ارشاد فرمایا ہے کہ وہ تم کو طاہر بنانا چاہتا ہے اور اُسے تمھارا تزکیۂ نفس مقصود ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَلٰكِنْ يُّرِيْدُ لِيُطَهِّرَكُمْ وَلِيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ ۔۔۔ (المائدہ: ۶)

یعنی: "مگر اللہ تو تمھیں پاک کرنا چاہتا ہے کہ تم پر اتمامِ نعمت کر دے۔"

اہلِ ایمان کو ان الفاظ میں [illegible] کیا گیا ہے:

رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا ۝ (التوبہ: ۱۰۸)

یعنی: "ایسے لوگ کہ جو پاک ہونا پسند کرتے ہیں۔"

اور ساتھ ہی فرمایا:

وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ ۝ (التوبہ: ۱۰۸)

یعنی: "پاک صاف لوگوں کو اللہ پسند کرتا ہے۔"

طہارت کا مفہوم وسیع ہے اور ہمہ گیر۔ اس میں ظاہری صفائی بھی شامل ہے۔ اس ظاہری صفائی کو بھی بڑی اہمیت دی گئی ہے۔ چناں چہ معمارِ حرم ابوالانبیا حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حکم دیا کہ:

طَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْقَآئِمِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ۝ (الحج: ۲۶)

Marfat.com

یعنی: "میرے گھر (کعبہ) کو طواف کرنے والوں اور قیام و رکوع و سجود کرنے والوں کے لیے پاک و صاف رکھو"

دوسری جگہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَعَهِدْنَا اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْعٰكِفِيْنَ ---- (البقرہ:۱۲۵)

یعنی: "ہم نے ابراہیم و اسمٰعیل کو اس بات کا پابند کر دیا ہے کہ وہ طواف کرنے والوں اور معتکفین کے لیے ہمارے گھر (حرم) کو پاک صاف رکھیں"

حتیٰ کہ حضرت رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کو حکم دیا کہ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ (المدثر:۴)

یعنی: "اپنے کپڑے کو پاک صاف رکھو"

ان تمام حوالوں سے اور اس تمام بیان سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن ہدایت کرتا ہے کہ انسان صفائی اور پاکیزگی اختیار کرے کیوں کہ یہی خوبی ہے اور اچھائی ہے۔ انسان کو چاہیے کہ وہ اپنے نفس کو اور اپنے جسم کو کدورتوں سے پاک صاف کرے اور رکھے، اپنی روح و بدن کو آلائشوں سے دور رکھے۔ اپنے ضمیر و عقل کو اپنے فکر و عمل کو ظاہری اور باطنی کدورتوں سے صاف رکھے اور اپنے مکان و لباس اور اپنے تمام ماحول کو صاف ستھرا رکھے۔

وہ لوگ کہ جو قرآن کی یہ رہنمائی قبول کرتے ہیں اور تعلیماتِ رسول کریمؐ کی بتائی ہوئی راہ پر چلتے ہیں، یہ دنیا بھی ان کے لیے جنّت بن جاتی ہے اور وہ لوگ کہ جو گندگی و غلاظت کو پسند کر لیتے ہیں ان کے لیے یہ دنیا جہنّم بن جاتی ہے۔

ظاہر ہے کہ جنّت ہی ہر مومن کا منتہائے مقصود ہو سکتا ہے۔ اس لیے اسبابِ جنّت اور سامانِ جنّت پر توجّہ کرنی چاہیے۔

Marfat.com

صحّت و صفائی

اسلام عرب میں نمودار ہوا۔ اس خطۂ ارض کے متعلق سب جانتے ہیں کہ اس کرۂ ارض میں اس خطۂ ارض کا کیا مقام تھا، اور اس کی کیا حیثیت تھی، لیکن اس ریگ زار عرب سے جہاں زندگی کی کوئی سہولت میسّر نہ تھی اور جہاں آسودگی کی کوئی شے حاصل نہ تھی چشمۂ اسلام پھوٹا، جاری ہوا اور اس طرح جاری ہوا کہ سارا کرۂ ارض اس سے فیض یاب ہوا اور شاداب ہوا۔ اس تاریخی حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ اس کرۂ ارض کا کوئی مقام ایسا نہیں ہے کہ جہاں اسلام کے چشمۂ فیض سے اقوامِ عالم مستفید اور مستفیض نہ ہوئی ہوں۔ یہ ناقابلِ انکار حقائق ہیں اور ناقابلِ تردید حقیقتیں ہیں کہ دنیا کے ہر ملک کو اسلام نے حکمرانی کے لیے، سماجیات میں فہم کے لیے، اخلاقیات میں اتباع کے لیے، معاشیات میں زندگی سنوارنے کے لیے، غرض ہر شعبۂ زندگی میں کچھ نہ کچھ ضرور بخشا ہے۔

کسی مذہب کی رفعت و عظمت کی اس سے بڑی دلیل اور کیا ہو سکتی ہے کہ ساری کی ساری اقوامِ ارض اس کی کسی نہ کسی صورت میں خوشہ چین ہوں۔ لاریب یہ فخر صرف اسلام ہی کو حاصل ہے اور یہ مقامِ بلند و ارفع صرف مسلمانوں کو ہی نصیب ہے کہ وہ اس صورتِ حال پر سرِ افتخار بلند کریں اور ان حقائق کو نظر انداز نہ کریں کہ جو اس عظمت و رفعت کا ذریعہ ہیں۔

جب میں غور کرتا ہوں تو اسلام کی اس رفعت و بلندی کے اسباب بہت زیادہ ہیں، لیکن میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ان تمام اسباب میں کہ جو عظمتِ اسلام کے لیے گنائے جا سکتے ہیں، ایک اہم سبب اسلام میں طہارت اور پاکیزگی کا معیار ہے۔ اسلام نے صفائی اور پاکیزگی کو جو اہمیت دی ہے وہ ان چند نہایت مضبوط ستونوں اور اصولوں میں سے ایک مضبوط تر ستون اور اصول ہے جن پر نظامِ اسلام قائم ہے، بلکہ نظامِ عالم برقرار ہے۔ قرآنِ کریم اور حدیثِ نبوی نے جو رہنما اصولِ زندگی عطا کیے ہیں ان کی سب سے بڑی

Marfat.com

خصوصیت اور سب سے بڑی اہمیت یہ ہے کہ وہ ہرگز ایسے نہیں ہیں کہ محض کسی ایک خطۂ ارض کے لیے قابلِ عمل ہوں، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اسلامی اصول اس قدر سادہ اور اس قدر مضبوط ہیں کہ کرۂ ارض کے ہر ملک و ملت کے لیے قابلِ عمل ہیں۔ اسلام عالم گیر مذہب ہے اور وہ بلا تخصیص آب و ہوا اور رنگ و نسل ہر انسان کے لیے اصول و ہدایت رکھتا ہے۔ ایسا مذہب صرف وہی ہو سکتا ہے کہ جس کی تعلیمات پر نوعِ انسانی کا ہر طبقہ اپنے خاص ماحول میں بہ سہولت اور بلا دقت عمل پیرا ہو سکے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو دنیا کے ہر ملک و ملت تک اسلامی اثرات و اصول ہرگز نہ پہنچتے۔ تاریخ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام سے پہلے دنیا کا کیا حال تھا۔ جہاں تک حفظِ صحت اور طہارت کا تعلق ہے دنیا کا یہ حال تھا کہ غسل کرنا معیوب تھا، ناخن ترشوانا غلط تھا، صفائی و طہارت کے دوسرے لوازم بے حقیقت تھے۔ قرآن نے سب سے زیادہ اہمیت کے ساتھ صفائی اور طہارت پر زور دیا اور ابتدا اس سے ہوئی کہ لَا یَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ یعنی اس صحیفہ ربّانی کو وہی ہاتھ لگا سکتے ہیں کہ جو طاہر ہوں، پاک و صاف ہوں۔ پھر ارشاد ہوا ہے کہ خدا اُن لوگوں کو پسند فرماتا ہے جو طاہر ہوں۔

ایک بنیادی بات ہمیشہ ذہن میں رہنی چاہیے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "تمھارے لیے اللہ کا رسولؐ بہترین نمونہ ہے۔" جناب محمد رسول اللہؐ کا ہر فعل و عمل قرآنی تعلیم کے مطابق تھا۔ قرآنِ کریم جب دستورِ حیات بن کر نازل ہوا تو اس پر عمل پیرا ہونے اور عمل کرانے والے جناب رسالت مآبؐ ہی تھے۔ اگر قرآن پر عمل نہ ہوتا تو یہ فقط ایک کتابِ قانون ہی رہتا۔ قرآن پر بڑی احتیاط و تسلسل اور صحت کے ساتھ عمل ہوا۔ جناب رسولؐ کا عمل، خلفائے راشدین کا عمل اور دوسرے بزرگانِ دین کا عمل، ان سب کی مثال ملنی ممکن نہیں ہے۔

جناب رسول اللہؐ نے فرمایا:

"اللہ تعالیٰ خود پاک ہے اور پاکیزہ چیز پسند فرماتا ہے۔"

ایک اور موقع پر ارشاد فرمایا: تنظفوا فان الاسلام نظیف۔ یعنی "صاف ستھرے رہا کرو کہ اسلام پاکیزہ مذہب ہے۔"

پھر ارشاد ہوا: ان اللہ یبغض الوسخ والشعث۔ یعنی "اللہ تبارک و تعالیٰ میل کچیل اور بکھرے بال پسند نہیں فرماتا۔"

Marfat.com

ان احادیث نبوی سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام کی پیروی کے لیے شرطِ اوّل طہارت اور پاکیزگی ہے۔ بالکل ابتدائی زمانۂ اسلام میں نبیؐ کو اللہ تعالیٰ نے تاکید فرمائی تھی: وثیابك فطهر والرجز فاهجر یعنی: "اپنے لباس کو صاف ستھرا رکھا کرو اور ہر قسم کی گندگی سے پرہیز کیا کرو۔" یہ ارشادِ باری تعالیٰ پُر از معانی ہے۔ گندگی اور غلاظت سے مراد ہر قسم کی گندگی ہے، خواہ وہ روح کی، خواہ وہ ماحول کی ہو۔ غور کرنے کی بات یہ ہے کہ یہ ہدایات اس دور میں جاری ہوئیں جب سارا عرب بنجر اور بے آب و گیاہ تھا۔ پانی کی قلت تھی۔ کوئی سہولت میسر نہ تھی۔ ایسے شدید حالات میں اگر پاکیزگی اور طہارت کی ہدایات نظر انداز ہو جاتیں تو کوئی تعجب نہ ہوتا لیکن اسلام نے ایسا نہیں کیا۔ پانی کی کم یابی اور نایابی کے باوصف اس نے غسل پر زور دیا ہے، دن میں پانچ بار وضو کو لازمی قرار دیا ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں صفائی اور طہارت کی کس قدر اہمیت ہے۔ اسلام کی یگانہ خصوصیت یہ بھی ہے کہ ہر نیک اور اچھا کام عبادت ہے۔ راستے کو جھاڑ جھنکار سے صاف کر دینا، ناپاکی اور نجاست کو دور کر دینا، غلاظت اور کوڑے کرکٹ سے نہ صرف خود دامن بچانا بلکہ دوسروں کے لیے بھی یہی چاہنا اور اس سلسلے میں امکانی خدمت کرنا یہ سب نیک اور اچھے کام ہیں۔ بلاشبہ یہ عبادت کے ذیل میں آتے ہیں۔ اسلام ہر نیک اور اچھے کام کی ہمت افزائی کرتا ہے۔ اس میں پاکی اور طہارت بھی شامل ہے۔

جیسا کہ میں نے شروع میں کہا ہے، اسلام کی بہت سی چیزیں دوسری قوموں اور ملکوں نے اپنالی ہیں۔ ذہنی، موروثی اور دوسرے تعصبات کے باعث اسلام قبول کرنا تو ان کے لیے آسان نہیں ہے، لیکن اسلام کے مفید اور اعلا اصولوں کو نظر انداز کرنا کسی کے لیے ممکن نہیں۔ لہٰذا اسلام کے زرّیں اصولوں کو انھوں نے اپنانا شروع کیا اور اس کے بہترین ثمرات و نتائج سے ساری اقوامِ عالم بہرہ ور بھی ہو رہی ہیں۔

مسلمان قوم کا ایک کمال یہ بھی ہے کہ اس قوم کے مذہب نے جن باتوں کی تلقین کی انھیں اس نے اپنے نظامِ زندگی کا غیر منفک حصّہ بنا لیا۔ اگر آپ نے دنیا کی سیاحت کی ہے یا دوسرے ممالک کے حالات پڑھے ہیں اور دوسرے ممالک اور اسلامی ممالک کے طرزِ زندگی کو تقابلی نقطۂ نظر سے دیکھا اور پرکھا ہے تو ضرور آپ نے دیکھا اور محسوس کیا ہوگا کہ مسلمان کتنے ہی پس ماندہ ہوں، دولت اور ثروت کے اعتبار سے بے مایہ ہوں، غربت اور فلاکت کے شکار ہوں، مگر جو چیزیں ان کے مزاج میں اسلامی تعلیم و تلقین کے

Marfat.com

باعث رچ بس گئی ہیں، دوسرے لوگ وسائل و ذرائع کی فراوانی کے باوجود اب بھی ان تک نہیں پہنچ سکے ہیں۔

اگر آپ نے کلاسیکی ادب کا مطالعہ کیا ہے اور مختلف قوموں اور ملّتوں کے کلاسیکی ادب پر آپ کی نظر ہے تو بلاشبہ آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ مسلمانوں کی محفلیں اور مجلسیں ان کے خلوت خانے اور جلوت کدے، ان کی حویلیاں اور غریب خانے، ان کے محلات، قصور اور کلبۂ احزاں اپنی صفائی اور پاکیزگی کے اعتبار سے یکتا اور منفرد تھے اور اب بھی کسی نہ کسی حد تک وہ اس خصوصیت کو قائم رکھے ہوئے ہیں۔ صاف ستھرا فرش، عود و عنبر، کیوڑے اور گلاب کا حاضرین محفل پر چھڑکاؤ، بہترین اور اعلا قسم کے عطریات کا استعمال اور لباس و پوشاک میں ان کی مہک قائم رکھنے کا اہتمام۔ غریب سے غریب شخص بھی اگر کچھ نہیں کر سکتا تو پانچ دس پیسے کی عطر کی پھریری لے کر ہتھیلیوں کو خوشبودار بنا کر رومال کو اس میں بسا لے گا۔ پھر بھی وہ پھریری بے کار نہیں ہوئی۔ اب اس کا نشیمن کان کا گوشہ ہے۔ برتنوں کے دھونے اور مانجھنے میں بھی صفائی اور طہارت کا خیال ہر درجہ ملحوظ رکھا جانا ایک ایسا شعار تھا جس سے روگردانی ممکن ہی نہ تھی۔ غرض طہارت، صفائی اور پاکیزگی کو مسلمانوں نے کچھ اس طرح مختص کر لیا تھا کہ اس نے ایک امتیازی وصف کی صورت اختیار کر لی تھی۔

آج بھی جب کہ مسلمان اپنی بہت سی عادتوں اور خصوصیتوں کو فراموش کر چکے ہیں، بعض چیزوں سے کچھ نہ کچھ لگاؤ ان کا اب بھی قائم ہے ان میں صفائی اور طہارت کی یہ عادت بھی ہے۔

البتہ ایک فرق ضرور نمایاں نظر آتا ہے۔ وہ فرق یہ ہے کہ اس عادت کا اہتمام و انصرام ذاتی حیثیت سے تو بڑی حد تک موجود ہے، لیکن اجتماعی اعتبار سے یہ عادت کچھ کم زور سی پڑتی جا رہی ہے۔ یاد رکھیے اگر ماحول صاف ستھرا نہیں، آبادی اور بستی کی فضا طہارت اور پاکیزگی سے خالی ہے تو ذاتی صفائی اور طہارت سے کچھ فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ یہ دونوں چیزیں لازم و ملزوم ہیں۔ اس سلسلے میں وہی کوششیں کارگر ہو سکتی ہیں جو ذاتی اور اجتماعی ربط و اتصال رکھتی ہوں۔ ایک آزاد، فعال اور زندہ قوم کی حیثیت سے ہمیں اپنی اس عادت کو پھر سے اختیار کرنا ہے جس نے ہمارے کردار اور سیرت میں پختگی پیدا کر دی تھی اور یہ کوئی مشکل کام نہیں صرف عزم و ارادے کی ضرورت ہے اگر عزم راسخ ہے اور ارادہ پختہ ہے تو کوئی کام بھی دشوار نہیں۔

Marfat.com

قلب اور صحّت

آج پوری دنیا میں یہ شور برپا ہے کہ امراضِ قلب وبا کی طرح پھیل رہے ہیں۔ دنیا کے ہر ملک میں طبّ و تحقیق کی تمام توانائیاں اور تمام ذرائع امراضِ قلب کی روک تھام پر صرف ہو رہے ہیں، مگر اس کے باوجود حالات بے قابو ہیں اور بعض حالات میں اسبابِ اموات میں امراضِ قلب سرفہرست ہیں۔ یہ حالات اس کے مقتضی ہوتے ہیں کہ عالمی ادارہ صحت، یعنی ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن نے اس سال قلب ہی کو اپنا موضوع بنا ہے، اور دنیا کو یہ پیغام دیا ہے کہ:

YOUR HEART IS YOUR HEALTH

یعنی جیسا قلب ویسی صحّت

اب ہم غور کرتے ہیں کہ قلب ہے کیا؟

قلب ایک آلۂ جذب و دفع ہے، اور جسم میں خون کو گردش دینا قلب کا خاص عضوی فعل ہے۔ اس کے ساتھ ہی قلب ایک عجوبہ و طلسم ہے، الحیّ القیوم کی صفت کا مظہر خاص اور بقائے حیات و صحّت کا مرکز و منبع۔

ربّ العالمین کے ارشاد کے مطابق انسان کی حقیقی فلاح و کامرانی کا انحصار قلبِ سلیم پر ہے۔ قرآنِ حکیم میں واضح طور پر بتایا گیا ہے کہ:

یَوْمَ لَا یَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ ۙ اِلَّا مَنْ اَتَی اللّٰہَ بِقَلْبٍ سَلِیْمٍ ؁ (شعرا: ۸۸ - ۸۹)

یعنی: "(قیامت کے روز) نہ مال کام آئے گا نہ اولاد، مگر اس شخص کے لیے جو اللہ تعالیٰ کے پاس قلبِ سلیم لے کر حاضر ہو"

قلب ایک دھڑکتا ہوا عضلہ ہے یا مادّی سائنس کی اصطلاح میں جسم کی مشین

لہ مراد ۱۹۷۲ء کہ عالمی ادارہ صحت کی طرف سے یہ سال قلب کے کوائف کے لیے مخصوص کیا گیا تھا اور سلوگن مختص کیا گیا تھا۔

Marfat.com

کا ڈائی نمو ہے۔ مگر حق یہ ہے کہ قلب مادّی اور روحانی عالموں کی درمیانی کڑی ہے اور قلب خالقِ ارض و سما کی تجلّی کا مقام ہے اور بقولِ مخبرِ صادق صلی اللہ علیہ وسلّم:

اَلَاۤ اِنَّ فِی الْجَسَدِ مُضْغَةً اِذَا صَلَحَتْ صَلَحَ الْجَسَدُ کُلُّهٗ وَاِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ کُلُّهٗ اَلَا وَهِیَ الْقَلْبُ

یعنی: "دیکھو! جسم میں گوشت کا ایک لوتھڑا ہے۔ جب وہ ٹھیک ہوتا ہے تو سارا بدن ٹھیک ہوتا ہے اور جب وہ بگڑ جاتا ہے تو سارا بدن بگڑ جاتا ہے۔ یہ لوتھڑا قلب ہے۔"

قلب کی دوامی اور مستمر حرکت بالذّات ہے۔ جسم کے تمام دوسرے اعضا اپنے افعال میں قلب کے محتاج ہیں، لیکن خود قلب کسی عضو کا طفیلی نہیں ہے۔ جنین میں نظامِ عصبی کی پیدائش سے پہلے نقطۂ قلب پیدا ہو کر خود بخود حرکت کرنے لگتا ہے، اور اسی حرکتِ مستمرہ سے حیات کا آغاز ہوتا ہے۔ حیات کا فیضان اوّلاً قلب پر ہوتا ہے۔ زندگی قلب ہی کے جینے سے عبارت ہے۔ قلب کا متحرک بالذّات ہونا ہی کسی دوسرے عالم سے اس کے اتّصال کو ثابت کرتا ہے، اور یہی وہ چیز ہے جس کو روح اور روحانیت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ قلب طبعی حیات اور حیاتِ شاعرہ دونوں کا مرکز اور مقامِ اتّصال ہے۔ قلب پر حواس و الفاظ کے احاطے سے ماوری حقائقِ کلّیہ کا فیضان و القا ہوتا ہے۔ قلب وجدان اور کشف و الہام کا مرکز ہے۔ اسی لیے تو قرآنِ حکیم لے کر نازل ہوئے تھے جبرئیلِ امین آپؐ کے قلب پر:

نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِیْنُ ۙ عَلٰی قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِیْنَ ۝ (شعرا: ۱۹۴-۱۹۵)

اور اسی لیے تو واضح طور پر قرآنِ حکیم میں فرمایا گیا ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں، در حقیقت وہ دل اندھے ہوتے ہیں کہ جو سینوں میں رکھے ہوتے ہیں:

فَاِنَّهَا لَا تَعْمَی الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَی الْقُلُوْبُ الَّتِیْ فِی الصُّدُوْرِ (الحج: ۴۶)

اہلِ طب و سائنس نے اس بات کو متفقہ طور پر تسلیم کر لیا ہے کہ امراضِ قلب طرزِ حیات میں فساد و خرابی کے نتیجے میں پیدا ہوتے ہیں، اور عام طور پر تسلیم کیا جاتا ہے کہ تعیّش کی زندگی امراض کے شیوع کا خاص سبب ہے، اور قلب کے امراض سے بچنے کے لیے طرزِ حیات اور عادات و اطوار کا بدلنا سب سے مقدّم ہے۔ آج مادّی تہذیب جس نے مشینی اور صنعتی پیکر میں جنم لیا ہے، انسانی معاشرے کی اکثر خرابیوں کی بنا ہے، اور یہ روحانی اقدار سے براہِ راست متصادم ہو رہی ہے۔ کھانا پینا، سونا جاگنا،

Marfat.com

پہننا اوڑھنا، چلنا پھرنا، حرکات و سکنات، جذبات و احساسات، جنسی تعلقات و اقتصادیات، انفرادی و اجتماعی اخلاقیات، صلح و جنگ، غرض تمدن و معاشرت اور انسانی حیات کے نظم و ضبط کا وہ کونسا پہلو ہے جس کو مادیت نے تہہ و بالا نہیں کر دیا ہے اور زیر و زبر کر کے نہیں رکھ دیا ہے!

آج ساری مہذب دنیا میں شور برپا ہے کہ دل حیات سے کنارا کر رہا ہے یا حیات دل کو چھوڑ رہی ہے۔ اور یہ بھی تسلیم کیا جا رہا ہے کہ امراضِ قلب کا زیادہ تر تعلق طرزِ حیات اور اخلاق و کردار سے ہے۔ دراصل یہی وہ نقطہ ہے اور یہی وہ مقام ہے کہ غور و فکر کی تمام صلاحیتوں کو بروئے کار لایا جائے اور مسئلے کا حل تلاش کیا جائے۔ اس باب میں نقطۂ فکر یہ ہونا چاہیے کہ امراضِ قلب سے نجات کی صورت یہ ہے کہ قدرت کے خلاف سرکشی سے توبہ اور زندگی کے نصب العین میں تبدیلی کی جائے، یعنی واضح تر الفاظ میں یہ کہ دنیا کی تمام طاقتوں سے بغاوت کر کے اللہ تعالیٰ کی وفاداری کی راہ اختیار کی جائے۔

قرآنِ حکیم نے اور رسولِ کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے اس دنیائے فانی میں زندگی بسر کرنے کے رہ نما اصول شرح و بسط کے ساتھ انسان کے سامنے رکھ دیے ہیں۔ یہ سارے اصول سادگی اور ضوابطِ فطرت کا انسان کو پابند کرتے ہیں۔ جب تک انسان احکامِ قدرت و فطرت کا تابع رہتا ہے اس کی صحت و تن درستی آفات سے محفوظ رہتی ہے، اور جب بھی وہ فطرت سے بغاوت کرتا ہے صحت اس کا ساتھ چھوڑ دیتی ہے۔ دراصل اصولِ فطرت سے مسلسل انحراف نے انسان کے قلب کو سب سے زیادہ اس لیے بھی متاثر کیا ہے کہ وہ خوفِ خدا سے خالی ہو گیا ہے۔ آج کے انسان نے قلب کو محض ایک پمپنگ اسٹیشن قرار دے دیا ہے، اور یہ فراموش کر دیا ہے کہ قلب، وجدان اور کشف و الہام کا مرکز بھی ہے۔ قلب کی اس مرکزیت اور حیثیت کو نظر انداز کر کے اس کی محض عضویاتی حیثیت پر توجہات مرکوز کر کے نہ ہم امراضِ قلب کے اسبابِ حقیقی کی تہہ کو پہنچ سکتے ہیں اور نہ ہمیں علاجِ امراضِ قلب میں حقیقی کامیابی حاصل ہو سکتی ہے۔

علمائے طب کے لیے یہ نہایت اہم مقامِ فکر ہے۔ آج کے اس دور میں، مرض و شفا میں نفسیات کا مقام واضح طور پر متعین ہو چکا ہے اور فکرِ قدیم و عظیم کی تائید میں آج سارا لٹریچر موجود ہے۔ قلب و دماغ کا رشتہ اور ان دونوں اعضائے رئیسہ کے

Marfat.com

درمیان رسل و رسائل کا جو معلوم اور غیر معلوم سلسلہ قایم ہے اگر ہم اس کی حقیقت کو نہیں پہنچ سکتے، بلکہ اس کی نفی کرتے ہیں، تو یہ انداز فکر کسی طرح بھی صحیح نہیں ہوسکتا۔ اس سے ناقابلِ حل مسائل پیدا ہو رہے ہیں، اور امراضِ قلب پر بند باندھنے میں ناکامی ہو رہی ہے۔

جسم میں گوشت کا ایک لوتھڑا ہے۔ جب وہ ٹھیک ہوتا ہے تو سارا بدن ٹھیک ہوتا ہے، اور جب وہ بگڑ جاتا ہے تو سارا بدن بگڑ جاتا ہے۔
یہ لوتھڑا قلب ہے۔

یہ حدیث شریف انتہائی معنی آفرین ہے۔ عالمی ادارۂ صحت کا یہ سلوگن کہ YOUR HEART IS YOUR HEALTH درحقیقت اسی حدیث شریف کا گویا ترجمہ ہے، مگر یہ سلوگن روحانیت سے خالی ہے۔ حدیث شریف قلب کی عضوی اور روحانی کیفیت دونوں پر حاوی ہے، کیوں کہ اس کے بغیر قلب کی تعریف مکمل نہیں ہوسکتی۔ خود انسان سے اگر روحانیت کو خارج کر دیا جائے تو محض ایک معاشی حیوان بن کر رہ جائے گا۔ اور اللہ تعالیٰ سے رشتہ توڑ کر وہ سکون و اطمینان سے یکسر محروم ہو جائے گا۔

ہماری صحت اور تن درستی کا انحصار قلب پر ہے۔ قلب کی صحیح کیفیت و فعل پر ہے، لہٰذا قلب کی حفاظت کے لیے ہمیں سادہ اور اطمینان کی زندگی بسر کرنی چاہیے۔ اصولِ صحت کی اور ضوابطِ فطرت کی مکمل پابندی کرنی چاہیے اور قرآن کریم کے احکام کے مطابق اور اتباعِ سنت میں اس دارِ فانی میں رہ کر حیاتِ ابدی کے لیے خود کو تیار کرنا چاہیے۔

Marfat.com

تیمارداری

حق تعالیٰ جلّ شانہٗ نے حضرت آدم علیہ السّلام کو خلیفہ بنا کر اس کرۂ ارض پر بھیجا، اور انسان اشرف المخلوقات قرار پایا تو اس سے انسان کا شرف و نجب متعیّن ہو گیا۔ انسان کی شرافت و نجابت کو برقرار رکھنے کے لیے، اور انسان کو ظلمت و تاریکی سے نور اور روشنی میں لانے کے لیے قرآن کریم میں جگہ جگہ ارشادات ہمیں ملتے ہیں اور ہدایات ملتی ہیں۔ قرآنِ کریم میں ارشاد ہوا ہے:

قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ ۙ يَّهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَيُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ وَيَهْدِيْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ○ (المائدہ: ۱۵-۱۶)

یعنی: "تمھارے پاس خدا کی طرف سے روشنی اور کتاب مبین آ چکی ہے۔ جو رضاءِ الٰہی اور امن کی راہ پر چلنا چاہتا ہے یہ کتاب اس کی رہ نمائی کرتی ہے اور ان کو ظلمت اور تاریکی سے نکال کر خدا کے حکم سے انھیں نور کی طرف لے جاتی ہے اور ان کو سیدھی راہ پر چلاتی ہے۔"

اللہ تبارک و تعالیٰ نے ہماری رہ نمائی کے لیے اپنے رسول احمدِ مجتبےٰ محمد مصطفےٰ صلّی اللہ علیہ وسلّم کو بھیجا جنھوں نے اپنے عملِ صالح سے اور جہدِ مسلسل اور سعیِ پیہم سے انسان اور انسانیت کا وہ نمونۂ کامل پیش کیا اور وہ عظیم مثال قائم کی کہ قرآن جس کا متقاضی تھا۔ اور انھوں نے وہ دائمی طریقِ زندگی اور وہ مستقل اصولِ حیات قائم کیے جن کا قرآن داعی ہے اور اللہ تعالیٰ کا یہ ارشادِ برحق روشنی بن گیا کہ:

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ

یعنی: "بے شک ہم نے اپنے رسول آیات و بیّنات کے ساتھ بھیجے اور ان کے ساتھ کتاب اتاری، میزان اُتاری تا کہ لوگ راہ اعتدال پر قائم ہو جائیں۔" (الحدید: ۲۵)

اگر ہدایاتِ ربّانی اور ارشاداتِ نبوی کی روشنی میں انسان اپنے لیے راہ متعیّن کر لے تو اس کرۂ ارض پر صرف امن ہی قائم رہ سکتا ہے اور کوئی فساد پیدا نہیں ہو سکتا۔ انسانی تنظیم کو صحیح و صالح اُصول و تصوّرات کی اساس پر کھڑا کیا جائے تو

Marfat.com

امن اور خوش حالی، معاشی توازن، جذبۂ اخوت اور مساواتِ عامہ کی ضیا باریوں سے زمین کا چپہ چپہ چمک سکتا ہے، روشن ہو سکتا ہے۔

قرآن حکیم اور احادیثِ نبوی سے رشد و ہدایت کا جو چشمہ جاری ہوا ہے اُس سے انسان کی زبان دُھلتی ہے اور ایک مومن کی زبان سے کلمۂ خیر ہی نکلتا ہے۔ اسلام نے کلمۂ خیر کو بڑی اہمیت دی ہے۔ کلمۂ پاکیزہ کے لیے قرآنِ کریم میں ارشاد ہوا ہے:

كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ أَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ ۝ تُؤْتِيْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍۢ بِاِذْنِ رَبِّهَا ؕ (ابراھیم: ۲۴-۲۵)

یعنی: "پاکیزہ کلمہ کی مثال اس پاکیزہ درخت کی سی ہے جس کی جڑیں زمین میں مضبوطی کے ساتھ گڑی ہوئی ہوں اور شاخیں بلندی میں لہرا رہی ہوں اور وہ اپنے رب کے حکم سے ہر موسم میں پھل لاتا ہے۔"

کلمۂ پاکیزہ اور عملِ خیر کے اس پس منظر کی روشنی میں اگر ہم غور کریں تو ایک مریض کی تیمار داری میں اس کی سب سے زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ مریض عدمِ صحت کی وجہ سے جسمانی اور ذہنی تکلیف میں مبتلا ہوتا ہے۔ اسے دور کرنے کے لیے دوا اور دعا دونوں کی ضرورت ہوتی ہے پھر شرفِ انسانیت اس کا بہ شدت متقاضی ہوتا ہے کہ نہ صرف مریض کے آرام کا خیال رکھا جائے، بلکہ اس کی دل جوئی بھی کی جائے اور عملِ خیر اور کلمۂ پاکیزہ سے اس کے درد کا مداوا کیا جائے۔

اسلام اپنے معاشرتی نظام کی بنیاد رنگ و نسل، وطن اور قوم پر نہیں رکھتا۔ اس کے نزدیک انسانیت میں سارے انسان برابر ہیں اور ایک دوسرے کی ہم دردی، مدد اور غم گساری کے مستحق ہیں۔ جہاں تک انسانیت کا تعلق ہے وہ ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔ اسلام انسانوں میں جس فرق کو مانتا ہے وہ فکر و نظر، خیالات اور عقائد کا اختلاف ہے۔ یہیں سے اسلامی معاشرے کی بنیاد پڑتی ہے اور اسی کی بنیاد پر مسلم اور غیر مسلم کا فرق قائم ہوتا ہے۔ فکر و نظر، خیالات اور عقائد کے اس بیّن فرق کے باوصف وہ انسانی رشتے کو منقطع نہیں کرتا۔ جہاں تک کہ انسانی ہمدردی کا تعلق ہے اسلام غیر اسلامی معاشرے کو بھی زیادہ سے زیادہ ہمدردی کا مستحق قرار دیتا ہے۔

اسلام نے تیمار داری اور عیادت کے لیے مسلم اور غیر مسلم کی کوئی قید نہیں لگائی، بلکہ ہر وہ شخص جو بیمار ہے یا کسی آزار میں مبتلا ہے جہاں تک انسانیت کا تعلق ہے ایک مسلمان کو اس سے ہمدردی کرنی چاہیے۔

Marfat.com

پھر اسلام نے تیمارداری اور عیادت کے بھی آداب سکھائے ہیں، مثلاً یہ کہ جب آپ کسی بیمار کی مزاج پُرسی کے لیے اس کے گھر جائیں تو اس سے اظہارِ ہمدردی کیجیے، اسے تسلّی و تشفّی دیجیے اور اسے اللہ کے فضل و کرم کا مژدہ سنائیے۔

حدیث میں ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم جب کسی بیمار کی عیادت کے لیے تشریف لے جاتے تو اس کی پیشانی اور نبض پر ہاتھ رکھتے، اس کی صحت کے لیے دعا فرماتے اور فرماتے کہ انشاء اللہ جلد اچھے ہو جاؤ گے۔

تیمارداری اور عیادت کے آداب میں یہ بات بھی داخل ہے کہ جب کسی مریض کے پاس جایا جائے تو اس سے پوچھا جائے کہ تمھارا دل کس چیز کو چاہتا ہے؟ اگر وہ چیز اس کے طبیب اس کو منع نہ کرتے ہوں اور عیادت کرنے والے میں اس کی قدرت بھی ہو تو وہ چیز اس کے لیے مہیّا کر دے۔

صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے ہم کو سات باتوں کا حکم دیا تھا۔ جن میں سے ایک بیمار کی مزاج پُرسی بھی ہے۔ عیادت کے آداب میں یہ بھی ہے کہ جب کسی مریض کے پاس جائیں تو نہ اس سے زیادہ باتیں کی جائیں اور نہ اُس کے پاس دیر تک بیٹھا جائے اور نہ آواز بلند کی جائے۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرمایا کرتے تھے کہ مریض کے پاس زیادہ دیر تک نہ بیٹھنا اور شور و شغب نہ کرنا سنّت ہے۔

تیمارداری اور عیادت کے آداب میں یہ بات بھی شامل ہے کہ مریض کے رشتے داروں اور متعلّقین سے بھی مریض کا حال پوچھیے اور ان کو تسلّی و تشفّی دیجیے۔ دواؤں کو لانے، طبیبوں کو دکھانے اور مریض کی دوسری خدمتوں میں اُن کی مدد کیجیے۔ غیر مسلم بیمار کی تیمارداری کرنی چاہیے اور اگر موقع ہو تو اسے انسانیت کی خوبیاں بھی سمجھانی چاہئیں، کیوں کہ بیماری میں انسان خدا سے زیادہ لو لگائے ہوتا ہے۔ ممکن ہے کہ وہ حق کو قبول کر لے۔

تیمارداری اور عیادت کے آداب میں یہ امر بھی واجب تعمیل ہے کہ جب کسی کے گھر عیادت کے لیے جایا جائے تو احتیاط سے ایسی جگہ بیٹھا جائے جہاں سے گھر کی خواتین پر نظر نہ پڑے۔

Marfat.com

عیادت کے ضمن میں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم نے یہ بھی فرمایا کہ جب تم کسی مریض کے پاس عیادت کے لیے جاؤ تو اُس سے اپنے لیے بھی دعا کی درخواست کرو، کیوں کہ مریضوں کی دعا ایسی ہے جیسے فرشتوں کی دعا۔ رسولِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم مریضوں کے لیے جو دعا فرماتے وہ یہ تھی:

اَللّٰھُمَّ اَذْھِبِ الْبَأْسَ رَبَّ النَّاسِ اِشْفِ اَنْتَ الشَّافِیْ لَاشِفَاءَ اِلَّا شِفَاءُکَ شِفَاءً لَایُغَادِرُ سَقَمًا ٥

ترجمہ: "اے اللہ! اس کی تکلیف کو دور کر۔ اے انسانوں کے رب اس کو شفا عطا فرما تو ہی شفا دینے والا ہے، تیری شفا کے بغیر کوئی شفا نہیں۔ تو اسے ایسی شفا دے کہ بیماری کا نام ونشان باقی نہ رہے۔"

جنابِ رسالت مآب صلّی اللہ علیہ وسلّم کے زمانے میں تیمارداری کی ایسی بلند روایات قائم ہوئیں کہ بعد میں اُس نے ایک مستقل فرض وفن کی حیثیت اختیار کرلی۔ اسلامی جنگوں میں خود حضرت عائشہ صدیقہؓ، حضرت فاطمۃ الزہراؓ، اور حضرت اسماء بنتِ ابوبکر صدیقؓ نے تیمارداری کی بنیادیں رکھیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے تیمارداری اور عیادت کو عبادت کا درجہ عطا فرمایا۔

Marfat.com

پانی، حیات آفریں نعمت

اللہ تعالیٰ صرف انسان، اس کائنات اور تمام مخلوقات کا ہی خالق نہیں ہے، بلکہ انسانوں کی ضروریات بھی اس کی پیدا کردہ ہیں۔ اس کا تعلق انسان کے ساتھ محض ضابطے کے حاکم ہی نہیں بلکہ رحمت کرنے والے انعام دینے والے اور احسان کرنے والے کا بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت، اپنی نعمتوں اور احسان کے مظاہر پر غور و فکر کی دعوت قرآن حکیم میں متعدد مقامات اور مختلف پیرایوں میں دی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَفِی الْاَرْضِ اٰیٰتٌ لِّلْمُوْقِنِیْنَ ۙ وَفِیْٓ اَنْفُسِکُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ○ (الذاریات: ۲۱)

یعنی: "زمین اللہ کی نشانیوں سے بھری پڑی ہے اور دور کیوں جاؤ تم خود اپنے اوپر غور کرو تم ان روشن حقائق سے کس طرح صرفِ نظر کرو گے؟"

ایک اور جگہ اپنی بے پایاں، ان گنت، بے شمار اور بے حد و حساب نعمتوں کے بارے میں فرمایا:

وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰہِ لَا تُحْصُوْھَا (النحل: ۱۸)

یعنی: "اگر تم اللہ کی نعمتوں کا شمار کرنے بیٹھو تو ایسا ہرگز نہ کر سکو گے۔"

ایک اور جگہ فرمایا ہے:

وَاَسْبَغَ عَلَیْکُمْ نِعَمَہٗ ظَاھِرَةً وَّبَاطِنَةً ؕ (لقمان: ۲۰)

یعنی: "اس نے تم پر اپنی نعمتوں کی موسلا دھار بارش برسائی ہے، کھلی آنکھوں سے نظر آنے والی نعمتیں اور ایسی بھی جو ہر ایک کو نظر نہیں آتیں۔"

خالقِ کائنات کی ان تمام نعمتوں میں سے جس نعمت کا قرآنِ پاک میں بار بار ذکر ہے وہ پانی کی نعمت ہے جس پر انسانوں کی ہی نہیں تمام جان داروں کی زندگی کا دار و مدار اور انحصار ہے۔ ایک جگہ قرآنِ حکیم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ کُلَّ شَیْءٍ حَیٍّ (الانبیا: ۳۰)

یعنی: "ہم نے ہر زندہ شے کو پانی سے وجود بخشا۔"

اس کا مطلب یہ ہے کہ زندگی اپنے وجود اور اپنی بقا کے لیے پانی کی محتاج ہے۔ زندگی

Marfat.com

بقا کے اس سامان کے حصول کا سب سے اہم اور بڑا ذریعہ بارش ہے۔ بارش کو اللہ تعالیٰ نے بندوں کے حق میں اپنی رحمت قرار دیا ہے۔ سورۃ اعراف میں ارشاد ہوتا ہے:

وَهُوَ الَّذِي يُرْسِلُ الرِّيَاحَ بُشْرًا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهِ (الاعراف: ۵۷)

یعنی: "اللہ ہی تو ہے جو اپنی رحمت کی بشارت ہواؤں کے ذریعہ سے دیتا ہے۔"

حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم سے جو سرکشی پر آمادہ تھی فرمایا تھا:

فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ إِنَّهُ كَانَ غَفَّارًا ۝ يُرْسِلِ السَّمَاءَ عَلَيْكُمْ مِدْرَارًا ۝ وَيُمْدِدْكُمْ بِأَمْوَالٍ وَبَنِينَ وَيَجْعَلْ لَكُمْ جَنَّاتٍ وَيَجْعَلْ لَكُمْ أَنْهَارًا ۝ (نوح: ۱۰-۱۲)

یعنی: اپنے رب سے اپنے گناہوں کی معافی مانگو وہ بڑا ہی معاف کرنے والا ہے۔ تم سے راضی ہوگا تو موسلا دھار بارش برسائے گا تمھیں مال و اولاد سے نوازے گا تمھارے لیے لہلہاتے باغ اگائے گا اور نہریں جاری کرے گا۔"

اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ اپنے بندوں سے راضی اور خوش ہوتا ہے تو بارش کی صورت میں ان پر اپنی رحمت برساتا ہے۔ اس آیت سے ایک نکتہ جو واضح طور پر سمجھ میں آتا ہے یہ ہے کہ بارش کے ذریعہ سے جو خوش حالی مطلوب ہوتی ہے وہ کسی ایک فرد کے لیے نہیں، بلکہ پورے معاشرے کے لیے ہوتی ہے اور اس کے لیے ضروری ہے کہ سارا معاشرہ ایسی زندگی گزارے جو اللہ کے احکام کے مطابق اور اسے خوش کرنے والی ہو، تاکہ معاشرہ مجموعی طور پر اللہ تعالیٰ کے انعامات و احسانات کا مستحق ہو سکے اور بارش ساری آبادی کے لیے بجا طور پر بارانِ رحمت ثابت ہو۔ اللہ تعالیٰ کو خوش کرنے والی باتوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اس کی نعمتوں کی قدر کی جائے۔ چناں چہ ہمیں اس کی رحمت کے ذریعہ سے حاصل ہونے والی نعمت یعنی پانی کی بھی قدر کرنی چاہیے۔ اس قدر دانی کے اظہار کا جو طریقہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سکھایا ہے یہ ہے کہ:

۱۔ اس نعمت کے میسر آنے پر اظہارِ تشکر کے لیے پانی انکسار کے ساتھ اور بیٹھ کر پیا جائے۔

۲۔ پانی پینے سے قبل اللہ کا نام لیا جائے اور پینے کے بعد اس فرحت بخش اور حیات آفریں شے کے حاصل ہونے پر اللہ کا شکر ادا کیا جائے۔

آپؐ نے پانی پینے کے جو آداب بتائے ہیں وہ یہ ہیں کہ پانی کو ڈھک کر رکھا جائے، کسی بڑے برتن سے منھ لگا کر پانی نہ پیا جائے، پانی رک رک کر اس طرح پیا جائے کہ پینے کے برتن میں سانس نہ چھوڑنا پڑے۔

آپؐ نے پانی کے ذخیروں میں یا ان کے قریب غلاظت کرنے سے منع فرمایا ہے اور عام استفادے کے پانی کو روک دینا یا فروخت کرنا ناجائز قرار دیا ہے۔ پانی ضائع کرنے سے منع

Marfat.com

فرمایا ہے اور پانی کے استعمال میں کفایت شعاری کا حکم دیا ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ خواہ تم بہتی نہر کے کنارے بیٹھے ہو تب بھی پانی کے استعمال میں اسراف سے پرہیز کرو۔

احکام الٰہی اور ارشاد نبوی کو سمجھ لینے کے بعد غور فرمایئے کہ ہمارا عمل کیا ہے اور طرز عمل کیا ہے؟ کیا ہم پانی جیسی دولت کی اسی طرح حفاظت کرتے ہیں جس طرح دوسری دولتوں کو بچا کر رکھتے ہیں؟ حالانکہ اکثر دوسری دولتیں اگر میسر نہ ہوں تب بھی آدمی زندہ رہ سکتا ہے اور رہتا ہے، لیکن پانی ایسی چیز ہے جس کے بغیر زندگی محال ہے۔ پانی ہی زندگی ہے۔ پانی کے بغیر کوئی ذی نفس تین دن سے زیادہ جسم و جان کا رشتہ برقرار نہیں رکھ سکتا۔ تین دن بھی اطبا نے زیادہ سے زیادہ حد رکھی ہے، لیکن پانی کے بغیر انسان پر جو کچھ گزرتی ہے اس کا کچھ اندازہ روزے داروں کو ہو جاتا ہے۔ پانی سرچشمہ حیات ہے، پانی ذریعہ صحت ہے، پانی وسیلہ قوت ہے۔ حیات پانی ہی سے پیدا ہوتی ہے اور پانی ہی تازگی و توانائی کا منبع ہے۔ انسان کے جسم کا بیشتر حصہ پانی ہی پر مشتمل ہے اور زندگی کے افعال پانی کے بغیر جاری نہیں رہ سکتے۔ غذا کا بیشتر حصہ بھی پانی ہی ہے۔

بعض شدید اور مہلک صورتوں میں زندگی بچانے کا واحد ذریعہ جسم میں پانی پہنچانا ہی ہے۔ اس پانی کو ہم کس بے دردی سے پھینکتے ہیں، کس بے نیازی سے ضائع کرتے ہیں اور کس بے اعتنائی سے بہاتے ہیں، اس کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ ہر شخص کا روزانہ کا مشاہدہ ہے، بلکہ عمل ہے لیکن جب پانی میسر نہیں آتا تو ایک ایک قطرے کے لیے ترستے ہیں اور تکلیف اٹھاتے ہیں۔ اگر غور کریں تو اس تکلیف کے پیدا کرنے میں خود ہمارا بھی حصہ ہے۔ ایک شہری کی حیثیت سے ہم اگر اپنی ذمہ داریاں سمجھیں تو ایسی تکالیف نہ پیدا ہوں۔ آزاد ملک کے شہری بہت سے مسائل خود حل کر لیتے ہیں۔ ذمہ دار شہریوں پر مشتمل معاشرہ سکون و فراغت کی دولت سے مالا مال ہوتا ہے۔

آج دنیا جن نازک ترین مسائل سے دوچار ہے ان میں پینے کے پانی کی فراہمی بھی شامل ہے۔ شہروں میں اور قصبوں میں صاف پانی کا میسر آنا روز بروز مشکل ہوتا جا رہا ہے۔ اس سے نئے نئے مسائل جنم لے رہے ہیں۔ خصوصاً تیسری دنیا کے ممالک کو قلت خوراک کے علاوہ جس اہم مسئلے کا سامنا ہے وہ شہری اور دیہی آبادیوں کو صاف پانی کی فراہمی کا مسئلہ ہے۔ اس لیے ہم کو اقوام متحدہ کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ جس نے اس صدی کی آٹھویں دہائی کو عشرۂ آب قرار دیا ہے۔ ۱۹۸۱ء تا ۱۹۹۰ء کے دس برسوں کو اس ضروری مقصد کے لیے وقف کر کے صحیح سمت میں ایک قدم اٹھایا گیا ہے اور اس کو دانشمندانہ کہا جا سکتا ہے۔ اس اقدام کے بعد توقع ہے کہ دنیا کے بیشتر ملکوں کی حکومتیں اپنے مصارف پر نظر ثانی کریں گی اور اس کے نتیجے میں عملی اقدامات و انتظامات کا آغاز ہو گا۔

Marfat.com

اقوام کی سطح پر منصوبہ بندی اور انتظامات کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ انفرادی طور پر اس نازک صورتِ حال کا سنجیدگی کے ساتھ جائزہ لیا جائے اور پانی کی قلت کے پیشِ نظر اس کے حصول اور استعمال میں جتنا تردّد اور جتنا تدبر اختیار کیا جا سکتا ہے کیا جائے۔ جتنی کفایت اور احتیاط ممکن ہے اس سے گریز نہ کیا جائے۔ اگر آپ نے ایک لوٹا پانی بھی ضائع ہونے سے بچایا تو یہ سمجھیے اپنے فائدے کے ساتھ ساتھ قوم اور انسانیت کی بھی خدمت کی۔ آبادی کی کثرت، دیہاتوں سے شہروں کی طرف آبادی کی منتقلی اور پانی کی بڑھتی ہوئی ضروریات سے جو مشکلات پیدا ہو رہی ہیں اور اس سے زیادہ آئندہ پیدا ہونے کا امکان ہے اس کو ذہن میں رکھیے اور پانی کے ایک ایک قطرے کو آبِ حیات سمجھیے۔

ایک مسلمان کی حیثیت سے تو یہ ہمارا دینی فریضہ بھی ہے کہ ہادیِ برحق ﷺ کی ہدایات پر عمل کریں اور اللہ کی اس نعمت کی ناقدری نہ کریں۔ اسراف سے ہمیں منع کیا گیا ہے۔ اسراف جس چیز کا بھی ہو، بُرا ہے۔ پانی جیسی چیز کا اسراف تو کسی طرح بھی گوارا نہیں ہونا چاہیے۔ اس مسئلے کی نزاکت اگر پیشِ نظر رہے تو ہم پانی کا ایک قطرہ بھی بے جا صرف نہ کریں۔ صفائی ہمارے ایمان کا جز ہے۔ پانی کو صاف رکھنے کے لیے جو تدابیر بھی ہم اختیار کر سکتے ہیں، ان سے گریز نہیں کرنا چاہیے۔

یاد رکھیے، پانی کو ضائع ہونے سے بچانا ہماری ضرورت بھی ہے اور ہمارا فرض بھی۔ صاف پانی لازمۂ حیات بھی ہے اور تقاضائے ایمان بھی۔

Marfat.com

شجرکاری

اسلام کے مزاج میں جمال اور لطافت وسادگی، حسن وشائستگی ہے۔ اپنے اس مزاج کے اعتبار سے اسلام اور مسلمین، فطرت کے آغوش میں رہ کر اور قدرت سے ہم آہنگ ہو کر ہر شعبۂ زندگی میں تعمیر کو اولیت واہمیت دیتے ہیں۔ اہلِ اسلام اس حقیقت سے آشنا ہیں اور آگاہ کہ ترقی وتعمیر ملک وملت میں درخت اور جنگلات کو بدرجۂ کمال اہمیت کا مقام حاصل ہے۔ درخت، پودے اور جنگلات بلاشبہ ایک ملک کے لیے وجۂ حسن وخوب صورتی ہوتے ہیں بلکہ ہم یہ بھی خوب جانتے ہیں کہ ان کا تعمیر میں بڑا دخل ہے، تعمیر کا کوئی تصوّر لکڑی کے بغیر ممکن نہیں ہے، پھر طوفانوں اور سیلابوں کو روکنے میں درخت اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ درخت زمین کے کٹاؤ جیسے خطرناک عمل کو بھی روکتے ہیں۔ درخت صحت انسانی کے قیام وبقا کا بھی سامان کرتے ہیں۔ یہ نہ صرف انسان کو پھل دیتے ہیں بلکہ آکسی جن خارج کر کے انسان کے پھیپڑوں کے لیے تازہ ہوا کا سامان کرتے ہیں، برقراریِ صحت کے لیے درختوں کا وجود ناگزیر ہے۔ غرض زندگی میں ہر پہلو سے درخت اہمیت رکھتے ہیں اور اس لیے درختوں کا لگانا یعنی شجرکاری اور ان کی حفاظت کرنا ہمارا فرض ہے اور ہماری ضرورت وحاجت ہے۔

قرآنِ حکیم میں کئی جگہ درخت کا تذکرہ آیا ہے۔ ہر چند کہ شجرکاری کی جو نوعیت آج موجود ہے وہ اس وقت نہیں تھی، خصوصاً ریگستانی علاقوں میں، جہاں پینے کے لیے پانی کم یاب بلکہ بعض حالتوں میں نایاب تھا وہاں درخت لگانے کی کسی باقاعدہ مہم کا تصوّر موجود نہ تھا۔ بایں ہمہ قرآن حکیم میں درخت کا تذکرہ اس طرح آیا ہے گویا وہ انسانوں کے لیے ایک متبرک، کارآمد اور مفید نعمت ہے۔ اس سلسلے میں دل چسپ بات یہ ہے کہ قرآن کی اصطلاح میں لفظ جنّت کے معنی ہی باغ کے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

جَنّٰتٌ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۝ (البروج: ۱۱)

یعنی "باغ ہوں گے جن میں نہریں بہتی ہوں گی۔"

سورۂ قصص میں حضرت موسیٰؑ کا تذکرہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ انھیں ایک درخت

Marfat.com

سے آواز آئی فِی الْبُقْعَةِ الْمُبَارَكَةِ مِنَ الشَّجَرَةِ (القصص: ۳۰) اسی طرح بیعتِ رضوان کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر تصریح فرمائی کہ یہ بیعت "درخت کے نیچے لی گئی تھی" "تَحْتَ الشَّجَرَةِ"۔ سورۂ ابراہیم میں اللہ تعالیٰ نے کلمۂ طیبہ کو شجرِ طیبہ اور کلمۂ خبیثہ کو شجرِ خبیثہ فرمایا اور اس تمثیل کا بطورِ خاص یوں تذکرہ فرمایا:

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ (ابراہیم: ۲۴)

جزیرہ نمائے عرب ایک ایسا ریگستانی خطہ تھا جسے "وادی غیر ذی زرع" کہا جاتا تھا۔ قرآن حکیم میں حضرت ابراہیمؑ کی یہ دعا مذکور ہے: "رَبَّنَا اِنِّیْ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِیْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِیْ زَرْعٍ" (اے ہمارے رب! میں نے اپنی کچھ اولاد کو ایک بے زراعت میدان میں آباد کر دیا ہے) اور اس کے بعد ہی اسی آیت میں ان کے لیے وہ اللہ سے دعا کرتے ہیں: "وَارْزُقْهُمْ مِنَ الثَّمَرَاتِ" اور انھیں کھانے کو پھل دے)۔ (سورۂ ابراہیم: ۳۷) اس طرح یہ واضح اشارہ موجود ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے اپنی اولاد کے لیے یہ دعا کرتے ہیں کہ انھیں پھل لانے والے درختوں کے لگانے اور حفاظت کرنے کی توفیق عطا فرما، کہ وہ پھلوں کے ذریعے سے اس بنجر سرزمین میں اپنا رزق حاصل کریں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس سلسلے میں صاف اور صریح ہدایتیں موجود ہیں کہ مسلمان زراعت اور شجر کاری میں زیادہ سے زیادہ دل چسپی لیں تا کہ وہ ایک جانب خوراک کے معاملے میں خود کفیل ہو جائیں اور دوسری طرف درختوں سے سفر اور حضر میں زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھائیں۔ چناں چہ بخاری و مسلم کی روایت ہے کہ ایک موقع پر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو مسلمان درخت لگاتا ہے یا کھیتی کرتا ہے اور اس سے چرند و پرند اور انسان اپنی غذا حاصل کرتے ہیں تو یہ سب اس کے لیے صدقہ بن جاتا ہے، یعنی اس پر اجر و ثواب ملتا ہے۔

اس سے زیادہ واضح اور غیر مبہم ہدایت کبھی کسی نے نہیں دی تھی۔ رسول اللہؐ نے انسانی معاشرے کے لیے درختوں کی اہمیت و افادیت کا جو صاف صاف اعلان فرمایا اس کا ایک مقصد شجر کاری کا ذوق پیدا کرنا بھی تھا۔ جزیرہ نمائے عرب میں پانی کی بے حد قلت تھی۔ جہاں کہیں پانی کا چشمہ نظر آتا تھا وہاں سبزہ زار ہو جاتا تھا اور اس لیے اسے نخلستان کہتے تھے۔ عموماً سفر کرنے والے قافلے ایسے ہی مقامات میں قیام کرتے تھے جہاں پینے کو پانی اور دھوپ کی تپش سے بچنے کے لیے سایہ دار درخت موجود ہوں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ درخت لگانے والے کو ہر حال میں ثواب حاصل ہوگا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں اصل نیکی

Marfat.com

مخلوق کو فائدہ پہنچانا ہے۔ جس کام سے اللہ کی مخلوق کو جتنا فائدہ پہنچے گا اس کام کا کرنے والا اتنا ہی زیادہ انعام واکرام کا مستحق ہوگا۔

جدید تحقیقات کے مطابق درخت سے صرف پھل ہی حاصل نہیں ہوتے۔ اور نہ ان سے صرف سائے کی نعمت حاصل ہوتی ہے۔ بلکہ شجرکاری کا کسی ملک کی مجموعی معیشت سے بڑا گہرا تعلق ہے۔ شجرکاری کے تمام فائدے اگر مستحضر ہوں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس جامع حدیث کے صحیح معنی سمجھے جا سکتے ہیں کہ "درخت چرند و پرند اور انسان سب کے لیے یکساں مفید اور کارآمد ہے"

ایک اور حدیث میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "درخت لگانے کا ثواب قیامت تک ملتا رہے گا" علما و محدثین نے اس کی تشریح کی ہے اور بتایا ہے کہ قیامت تک ثواب ملتے رہنے کا کیا مطلب ہے۔

غرض شجرکاری اسلام کی روشنی میں خدمتِ خلق کا ایسا وسیلہ ہے جس کا ثواب بے پایاں اور قیامت تک ملتا رہے گا۔ درختوں کی حفاظت کا اسلام نے اس قدر اہتمام کیا ہے کہ حرم کے علاقے میں جو درخت ہیں انھیں کاٹنا، اکھاڑنا، ضائع کرنا یا کسی درخت کی شاخ توڑنا تک ممنوع ہے۔ ممانعت درختوں کی حفاظت کے نقطۂ نظر سے خاصی اہمیت رکھتی ہے۔ گویا ایک طرف شجرکاری کی ہدایت ہے تو دوسری جانب درختوں کو نقصان پہنچانے کی ممانعت بھی ہے۔

اس روشنی اسلام میں شجرکاری اور درختوں کی حفاظت ایک فریضہ ہے۔ اس معاملے میں اہلِ پاکستان کو مثبت راہ اختیار کرنی چاہیے۔ ہر سال زیادہ سے زیادہ درخت لگانے چاہئیں اور ان کی حفاظت کرنی چاہیے اس سے ایک طرف تو سنّتِ رسول مقبول ؐ کی پیروی ہوگی اور دوسری طرف اس سے بے شمار دنیاوی فائدے حاصل ہوں گے۔

Marfat.com

Marfat.com